خدا بخش لائبریری

جرنل

پٹنہ

۹۳ - ۹۵

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

خدابخش لائبریری

جرنل پٹنہ



۹۳ - ۹۵

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

رجسٹریشن نمبر: ۳۳۳۴۴/۷۷

شمارہ: ترانوے پچانوے

قیمت: پچھتر روپے

قیمت فی پرچہ: پچیس روپے

سالانہ: ۴۰ روپے (ہندوستان)

۷۰ ڈالر ایشیا، ۱۴۰ ڈالر دیگر ممالک

۱۹۹۴

مصطفیٰ کمال ہاشمی نے لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) دہلی میں چھپوا کر خدا بخش لائبریری، پٹنہ سے شائع کیا۔

فہرست

٭ اردو رسائل ۱۹۹۳ء (کے نصف دوم) میں

اردو رسائل ۱۹۹۳ء میں

نصف ثانی

پیشگفتار

خدابخش لائبریری میں اردو کے قدیم رسائل کا بہت اچھا ذخیرہ ہے۔ ان تمام قدیم رسائل کی فہرست ماہ و سال کی تفصیلات کے ساتھ جلد ہی شائع کی جا رہی ہے۔

خدابخش میں محفوظ سارے قدیم رسائل کے مشمولات کے اشاریے بھی بنا دیے گئے ہیں۔ جن رسالوں کے اشاریے مکمل ہو چکے ہیں ان کی تعداد چھ سو کے قریب ہے۔ اب ان سب کے اندراجات کو موضوع وار بانٹا جا رہا ہے تاکہ ایک موضوع پر رسائل میں چھپی پوری دولت سے اردو ادب کے طالب علم بیک نظر بسہولت مستفیض ہو سکیں۔ موضوع وار اشاریے تقریباً پچاس جلدوں میں شائع کیے جائیں گے۔

● اس صدی کے آخری ربع میں اردو رسائل میں کیا اہم تحریریں آتی رہیں، ۱۹۷۶ء سے اس کا اہتمام کیا جا رہا ہے کہ ایسی تمام تحریروں کے اشاریے بنائے جاتے رہیں۔ ایک سال کا ایک ایسا ہی خدابخش اشاریہ مکتبہ جامعہ نے مدت ہوئی شائع کر دیا تھا۔ اب دس سالہ اشاریہ اشاعت کے لیے پریس جا رہا ہے۔ جو صدی کے آخری ربع کے پہلے دس سال کے رسائل کے مشمولات کا انڈکس ہے۔

○

صدی تقریبات کا زمانہ گزر رہا تھا کہ ایک خیال یہ بھی آیا کہ خدابخش صدی تقریبات کے بعد اردو رسائل کی کیا صورت حال ہے، ۱۹۹۲ء میں کون کون سے رسالے نکل رہے ہیں، اس کا ایک ایسا اشاریہ بن جائے جو ہر رسالے کے پورے کردار کو روشناس کرا دے۔ چنانچہ "اردو رسائل ۱۹۹۲ء" میں اس کے تحت سارے ماہنامے، سہ ماہی اور رسالے جو لائبریری میں آتے رہے ہیں بغیر کسی امتیاز کے روشناس کرانے کی کوشش کی گئی، متعلقہ صفحات کو عکس دے لیا گیا۔ ساتھ ہی ان رسالوں میں جو اہم تحریریں شائع ہوئیں ان میں کا ایک حصہ اس پیشکش میں ضمیمے کے طور پر شامل کیا گیا۔

اردو میں اس وقت ڈھائی تین سو کے قریب ایسے رسائل نکل رہے ہیں۔ ان میں ۱۹۹۲ء کے جو پرچے یہاں پہنچ سکے ان کی تعداد دو سو سے زیادہ نکلی۔ ان رسالوں میں شمع، بیسویں صدی جیسے رسائل بھی شامل ہیں، چہار رنگ، خاتون مشرق جیسے بھی، اور معارف، غالب نامہ، افکار، نقوش اور فنون بھی۔ کچھ رسالے یہاں نہیں پہنچ سکے مثلاً ابتدائی تعلیم (لاہور)، تعلیمی زاویے (لاہور)، مغربی بنگال، ہلال، بشریٰ، سرخ، نامہ بر، خبرنامہ اسلامیہ، اردو اکیڈمی، اور اسلام اور عصر جدید وغیرہ۔ ان کا ہمیں افسوس ہے۔ امید ہے ۱۹۹۳ء کے رسائل کا احاطہ کرتے وقت ان تک بھی پہنچا جا سکے گا۔ کچھ نئے پھول بھی کھلے گے۔

○

'اردو رسائل ۱۹۹۲ء' کی اشاعت کے بعد 'اردو رسائل ۱۹۹۳ء' پیش خدمت ہے۔ ۱۹۹۳ء کی یہ پیشکش دو حصوں میں ہوگی۔ پہلے حصے میں جنوری - جون' اور دوسرے میں جولائی - دسمبر کے رسائل شامل کیے گئے ہیں۔

۱۹۹۲ء کے رسائل کیلیے جیسا کیا گیا تھا کہ جتنے پرچے بھی برصغیر سے یا کہیں باہر سے ہمیں میسر آئے یا جن کے بارے میں ہمیں اطلاع مل سکی ایک بھرپور فہرست بنانے کے لیے ہم نے اُن سب کے ایک/دو/تین متعلقہ صفحات لے لیے تھے۔ ان کی مجموعی تعداد دو سو سے کچھ اوپر تھی۔ اب '۱۹۹۲ء کے ایسے پرچے جو اُس وقت ہمیں نہیں مل پائے تھے بلا لحاظ اس کے کہ وہ کس درجے کے ہیں ہم نے انہیں پیش نظر ۱۹۹۳ء کی فہرست میں بطور تتمہ شامل کرلیا ہے۔ ان میں سے کچھ ۱۹۹۲ء کے ہیں جو ہمیں اس وقت میسر نہ آسکے تھے اور کچھ ایسے ہیں جو ہیں تو ۱۹۹۲ء کے' لیکن شائع ہوئے ۱۹۹۳ء میں۔ اس طرح ۱۹۹۳ء میں اردو رسائل کی تعداد دو سو پچاس تک پہنچ گئی ہے۔ یہ وہ پرچے ہیں جو ہمیں میسر آسکے۔ (۱۹۹۲ء میں یہ تعداد ۲۰۳ تھی)۔

ریکارڈ کو مکمل کرنے کے لیے' خاص کر اس واسطے کہ پیش نظر جلد کے قاری کو بھی ایک مکمل فہرست فوری طور سے دستیاب رہے' ہم نے مناسب سمجھا کہ ۱۹۹۲ء کی مکمل فہرست کو اس جلد میں دوہرا دیا جائے۔ یہ آخر میں لگائی جارہی ہے۔

۱۹۹۳ء میں جن رسائل کو علمی/ادبی/ریسرچ کے سلسلے میں زیادہ کارآمد پایا گیا' ان کی مکمل فہرستیں دی جارہی ہیں۔ ۱۹۹۲ء میں محض کسی ایک مہینے کے شمارے کی فہرست دی گئی تھی' لیکن اب اہم رسائل کے تمام شماروں کی فہرستیں دی گئی ہیں۔

ترتیب کے آخر میں تین ضمیمے ہیں:

ضمیمہ ۱ کے تحت کچھ مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ ان میں اس بات کا التزام نہیں رکھا گیا ہے کہ یہ مضامین انہیں مجلات سے ماخوذ ہوں جن کی مکمل فہرستیں دینا ہم نے ضروری سمجھا ہے۔

ضمیمہ ۲ میں کچھ منتخب مضامین کی ایک فہرست دی گئی ہے' اس کا مقصد ان مضامین سے محض روشناس کرانا ہے، تاکہ دلچسپی رکھنے والوں کو اس کی اطلاع رہے اور اگر وہ ان تحریروں سے استفادہ کرنا چاہیں تو شماروں کے حوالے سے ان تک پہنچ سکیں۔

ضمیمہ ۳ کے طور سے ۱۹۹۲ء کے رسائل کی فہرست دی جارہی ہے تاکہ ۱۹۹۳ء کے قاری کے سامنے پوری تصویر رہے۔

——— مرتب

فہرست

تتمہ

وہ رسائل جو ۱۹۹۲ء اور ۱۹۹۳ء کے نصف اوّل کی فہرست میں شامل نہ ہو پائے

ضمیمہ۔ ۱

ادبی دانشوری

تہذیبی دانشوری

مذہبی دانشوری

شعری دانشوری

پاک دانشوری

پاک مذہبی دانشوری

شخصیات

وفیات

تاریخ علوم و فنون

ممالک اسلامیہ

متفرقات

کتابیں/رسائل

مخطوطات

ترتیب

[illegible]

ترتیب

[illegible]

ترتیب

[illegible]

ترتیب

[illegible]

آثار جدید (مئو) — نومبر/دسمبر ۱۹۹۳ء ● آج (کراچی) — جولائی۔دسمبر ۱۹۹۳ء

ترتیب

[illegible]

ترتیب

[illegible]

آج (کراچی)

ترتیب

جولائی ۱۹۳ء

آجکل

ترتیب

اگست ۱۹۳ء

ترتیب

ایک بین اقوامی ادبی ماہنامہ
آج کل
نئی دہلی

ترتیب

ترتیب اکتوبر ۱۹۹۳

ترتیب نومبر ۱۹۹۳

آج کل (نئی دہلی) نومبر/دسمبر ۱۹۹۳ | اخبار اردو (اسلام آباد) جولائی/اگست ۱۹۹۳

ترتیب

دسمبر ۱۹۹۳ء

جلد ۱۰
شمارہ ۷
جولائی ۱۹۹۳ء

فہرست

جلد ۱۰
شمارہ ۸
اگست ۱۹۹۳ء

فہرست

جلد ۱۰
شمارہ ۹
ستمبر ۱۹۹۳ء

فہرست

جلد ۱۰
شمارہ ۱۰
اکتوبر ۱۹۹۳ء

فہرست

جلد ۱۰
شمارہ ۱۱
نومبر ۱۹۹۳ء

فہرست

جلد ۱۰
شمارہ ۱۲
دسمبر ۱۹۹۳ء

فہرست

فہرست

سندھی ادب ۔ خصوصی مطالعہ

سندھی افسانہ

سندھی شاعری

فنون لطیفہ

جائزہ

[illegible]

فہرست

اردو (کراچی) ۰ اکتوبر-دسمبر ۱۹۸۹ء ۰ اکتوبر-دسمبر ۱۹۹۱ء ۰ جنوری-مارچ ۱۹۹۲ء ۰ اپریل-جون ۱۹۹۲ء

سہ ماہی اردو ۲ شمارہ (۴) ۱۹۸۹ء

اکتوبر-دسمبر ۱۹۸۹ء

فہرست

جنوری-مارچ ۱۹۹۲ء

فہرست

اکتوبر-دسمبر ۱۹۹۱ء

فہرست

اپریل-جون ۱۹۹۲ء

فہرست

[illegible]

جولائی - ستمبر ۱۹۲ء

فہرست

[illegible]

اکتوبر - دسمبر ۱۹۲ء

فہرست

[illegible]

جنوری - مارچ ۱۹۳ء

فہرست

اردو ڈائجسٹ

اس شمارے میں اگست ۱۹۹۳ء

اس شمارے میں ستمبر ۱۹۹۳ء

اس شمارے میں — اکتوبر ۱۹۲ء

فہرست شمارہ دسمبر ۱۹۸۲ء

ماہنامہ

اشراق

ترتیب
جولائی ۱۹۹۳ء کی تخلیقات

مہمان مدیر
[illegible]

ادبی البم
۳ ادارہ [illegible]

خود نوشت
[illegible]

نئی نظم
[illegible]

نئی غزل
[illegible]

نیا افسانہ، انشائیہ
[illegible]

نئی کتابیں
[illegible]

محفل
[illegible]

ترتیب
اگست ۱۹۹۳ء کی تخلیقات

مہمان مدیر
۱ ڈاکٹر سلیم اختر — اشاریہ

ادبی البم
۱۳ ادارہ [illegible]

خود نوشت
۱۵ شان الحق حقی [illegible]

یادداشتیں
۲۲ [illegible]

نئی نظم
[illegible]

نئی غزل
[illegible]

نیا افسانہ، انشائیہ
[illegible]

نئی کتابیں
[illegible]

محفل
[illegible]

ستمبر ۱۹۹۳ء کی تخلیقات

ترتیب

اکتوبر ۱۹۹۳ء کی تخلیقات

ترتیب

نومبر ۱۹۹۳ء کی تخلیقات

ترتیب

دسمبر ۱۹۹۳ء کی تخلیقات

ترتیب

اقبال (لاہور)　　　　جولائی، اکتوبر ۹۳ء

اقبال

بزم اقبال کا سہ ماہی مجلہ

جلد: ۴۰　　اکتوبر ۱۹۹۳ء　　شمارہ: ۴

مدیر اعزازی:
ڈاکٹر وحید قریشی

نائب مدیر:
راجہ فخر محمد ساجد

بزم اقبال ۰ لاہور

جولائی ۹۳ء

فہرست

فہرست　　اکتوبر ۹۳ء

اقبال ریویو (حیدرآباد) اپریل، اکتوبر ۱۹۲ ● اقبالیات (لاہور) جنوری ۹۲ء

اقبال ریویو (حیدرآباد)

اپریل ۱۹۹۲ء

فہرست مضامین

فہرست

اکتوبر ۱۹۹۲ء

موضوع: مسجد قرطبہ۔ تجزیہ و تحسین

اداریہ ——— [illegible]

....

اقبال اکیڈمی کی خبریں

[illegible]

اقبالیات

(اردو) (اقبال ریویو)

جنوری ۱۹۹۲ء

جلد نمبر ۳۲ ○ شمارہ نمبر ۴

ترتیب

العلم (بمبئی)

اگست، اکتوبر، دسمبر ۱۹۳ء

العلم

تاریخ ہائے اشاعت
فروری، اپریل، جون
اگست، اکتوبر، دسمبر

جلد : ۲ / شمارہ ۵ : اگست ۱۹۹۳ء

"العلم" رضیہ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز اینڈ ریسرچ بمبئی کا ترجمان ہے۔
اس کا مقصد اسلامی تحقیق، مطالعہ اور علمی و ادبی ثقافتی اور مسلم علما اور ادبا کی خدمت ہے۔

ترسیل مضامین کا پتہ

علی جواد زیدی [illegible]
[illegible] روڈ، [illegible]
بمبئی [illegible] ٹیلیفون : [illegible]

زر تعاون

فی شمارہ	۹ روپئے
ششماہی	۳۰ روپئے
سالانہ	۵۰ روپئے
بیرون ہند	۱۵ ڈالر

ترسیل زر کا پتہ

"العلم" [illegible] حبیب بلڈنگ
[illegible] بمبئی ۴۰۰۰۰۳
ٹیلیفون نمبر : ۳۷۵۱۰۱۹

فہرست

مقالہ نگار کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

پرنٹر و پبلشر سید غلام حسنین کراروی نے رضیہ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز اینڈ ریسرچ کیلئے مطبع [illegible] بمبئی میں چھپوا کر دفتر العلم [illegible] حبیب بلڈنگ [illegible] بمبئی سے شائع کیا۔
مدیر : علی جواد زیدی

خوش نویس : سید رضی رضوی

ہمارے لکھنے والے

• مولانا سید علی عابد [illegible] زنگی پوری [illegible]
• [illegible]
• [illegible] لکھنؤ
• [illegible]
• [illegible] حیدرآباد
• ڈاکٹر سید سکندر آغا [illegible] لکھنؤ

عظیم امروہوی کو میر تقی میر ایوارڈ

ہندوستان کے مشہور شاعر و ادیب جناب عظیم امروہوی کو حیات [illegible] کی طرف سے [illegible] کے سلسلے میں ۱۹۹۲ء کا میر تقی میر ایوارڈ حاصل ہوا۔ یہ ایوارڈ [illegible] کے ہاتھوں دیا گیا۔
ادارہ "العلم" موصوف کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔

اکتوبر ۱۹۳ء

فہرست

دسمبر ۱۹۳ء

فہرست

مقالہ نگار کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

الطاف علی بریلوی نمبر

مندرجات

مُندَرجات

ترتیب

جلد ۲۶	جولائی ۱۹۹۳ء ——— محرم ۱۴۱۴ھ	شمارہ ۷

ترتیب

جلد ۲۶	اگست، ستمبر ۱۹۹۳ء ——— صفر، ربیع الاول ۱۴۱۴ھ	شمارہ ۸، ۹

ترتیب

جلد ۲۶	اکتوبر ۱۹۹۳ء ——— ربیع الثانی ۱۴۱۴ھ	شمارہ ۱۰

ترتیبِ اوراق

افسانے

غزلیں

انشائیے

غزلیں

اس کتاب میں

آپس کی باتیں

انتظاریہ

اردو اکادمی دہلی کا ماہنامہ رسالہ

ایوانِ اردو دہلی

جولائی ۱۹۹۳ء

اگست ۱۹۹۳ء

ستمبر ۱۹۹۳ء

اکتوبر ۱۹۹۳ء

نومبر ۱۹۹۳ء

دسمبر ۱۹۹۳ء

برُہان

جلد ۱۱۲	جون جولائی ۱۹۹۳ء مطابق محرم الحرام ، صفر المظفر ۱۴۱۴ھ	شمارہ ۱-۲
۱۔ نظرات	عبدالرحمٰن عثمانی	۱
۲۔ [illegible]	[illegible]	۸
۳۔ [illegible]	[illegible]	۱۴
۴۔ [illegible]	[illegible]	۲۱

جلد ۱۱۲	اگست ۱۹۹۳ء مطابق ربیع الاول ۱۴۱۴ھ	شمارہ ۳
۱۔ نظرات	عبدالرحمٰن عثمانی	۲
۲۔ [illegible]	[illegible]	۴
۳۔ [illegible] ایک نظر	[illegible]	۱۴
۴۔ [illegible]	[illegible]	۳۰

جلد ۱۱۲	ستمبر ۱۹۹۳ء مطابق ربیع الثانی ۱۴۱۴ھ	شمارہ ۳
۱۔ نظرات	عبدالرحمٰن عثمانی	۲
۲۔ [illegible]	[illegible]	۴
۳۔ [illegible]	[illegible]	۱۳
۴۔ [illegible] ایک نظر	[illegible]	۲۱
۵۔ [illegible]	[illegible]	۲۸

جلد ۱۱۲	اکتوبر ۱۹۹۳ء مطابق جمادی الاول	شمارہ ۴
۱۔ نظرات	عبدالرحمٰن عثمانی	۲
۲۔ [illegible]	[illegible]	۴
۳۔ [illegible]	[illegible]	۱۶
۴۔ [illegible]	[illegible]	۳۲

جلد ۱۱۲	نومبر ۱۹۹۳ء مطابق جمادی الثانی ۱۴۱۴ھ	شمارہ ۵
۱۔ نظرات	عبدالرحمٰن عثمانی	۲
۲۔ [illegible]	[illegible]	۴
۳۔ [illegible]	[illegible]	۱۲
۴۔ [illegible]	[illegible]	۱۹
۵۔ [illegible]	[illegible]	۲۶

جلد ۱۱۲	دسمبر ۱۹۹۳ء مطابق رجب المرجب ۱۴۱۴ھ	شمارہ ۶
۱۔ نظرات	عبدالرحمٰن عثمانی	۲
۲۔ [illegible]	[illegible]	۴
۳۔ [illegible]	[illegible]	۱۸
۴۔ [illegible]	[illegible]	۳۳

فہرست

فہرست

فہرست

فہرست

فہرست

تحقیق (سندھ) پاکستان — شمارہ ۲ ۱۹۸۸ء، شمارہ ۳ ۱۹۸۹ء

فہرست

فہرست

تحقیق (سندھ) پاکستان — شمارہ ۴ سنہ ۱۹۹۰ء ، شمارہ ۵ سنہ ۱۹۹۱ء

فہرست

فہرست

فہرست مشمولات

فہرست مضامین

فہرست مضامین

ترتیب

تخلیق (لاہور) — **اگست ۱۹۹۳ء ، اکتوبر ۱۹۹۳ء**

ترتیب

ترجمان الاسلام (بنارس)

جولائی ۔ دسمبر ۱۹۹۳ء

فہرست مضامین

فہرست مضامین

تشکیل (کراچی)

اکتوبر ۔ دسمبر ۱۹۹۳ء

اجمال



مندرجات شمارہ جولائی ۱۹۹۳ء

مندرجات شمارہ اگست ۱۹۹۳ء







تہذیب الاخلاق (علیگڑھ) — جولائی - دسمبر ۱۹۹۳ء

مندرجات (جولائی)

مندرجات (اگست)

مندرجات (ستمبر)

مندرجات (اکتوبر)

مندرجات (نومبر)

مندرجات (دسمبر)

جامعہ (دہلی) — جولائی۔دسمبر ۱۹۹۳ء

ماہنامہ جامعہ

فہرست مضامین (جولائی)

فہرست مضامین (اگست)

فہرست مضامین (ستمبر)

فہرست مضامین (اکتوبر)

فہرست مضامین (نومبر)

فہرست مضامین (دسمبر)

فہرست (جولائی)

فہرست (اگست)

فہرست (ستمبر)

فہرست (اکتوبر)

فہرست (نومبر)

فہرست (دسمبر)

دانش (اسلام آباد) — ستمبر-دسمبر ۱۹۹۳م

بسم الله الرحمن الرحیم

فهرست مطالب

دانش شمارهٔ ۳۶

سخن دانش

بخش فارسی

بسم الله الرحمن الرحیم

فهرست مطالب

دانش شمارهٔ ۳۷

سخن دانش

بخش فارسی

دریافت (کراچی)

اگست - اکتوبر ۹۳ء ، نومبر ۹۳ء تا جنوری ۹۴ء

ذہن جدید (دہلی)

جون - اگست ۱۹۹۳ء

فہرست

فہرست

زبان وادب (پٹنہ) — جلد ۱۹۔ شمارہ ۴ — ۶

ترتیب

سب رس (حیدرآباد) — جولائی، اگست ۹۳ء

اس شمارے میں

اس شمارے میں — ستمبر

اس شمارے میں — اکتوبر

اس شمارے میں — (نومبر)

(دسمبر ۹۲ء)

اس شمارے میں

کراچی

اس شمارے میں (جولائی)

اس شمارے میں (اگست)

اس شمارے میں (ستمبر)

اس شمارے میں (اکتوبر)

سب رس (کراچی) — جولائی۔دسمبر ۱۹۹۳ء

اس شمارے میں

اس شمارے میں

سوغات (بنگلور) شمارہ ۵ — ستمبر ۱۹۹۳ء

فہرست

سوغات (بنگلور) شمارہ ۵

سہیل (گیا)

جولائی - دسمبر ۹۳ء

فہرست

فہرست

فہرست

فہرست

فہرست

فہرست

ترتیب

مرتب : [illegible]

مضامین/جائزے

افسانے/سفرنامہ

(۳)

(۲)

(۱)

نظمیں/نثری نظمیں

(۵)

(۳)

ہائیکو

(۳)

دوہے

(۳)

گیت

(۱)

غزلیں

(۹)

ترتیب

اسلامی ممالک کی کہانیاں

ترتیب

اسلامی ممالک کی کہانیاں

شمارہ نمبر ۱۰ [۱۹۹۳] جلد ۳-۴

شب خون

اگست - ستمبر ۱۹۹۳ء

اکتوبر - دسمبر ۱۹۹۳ء

ترتیب

ترتیب

ترتیب

ترتیب

ترتیب

②

جلد ۵ — جدول — شمارہ ۳

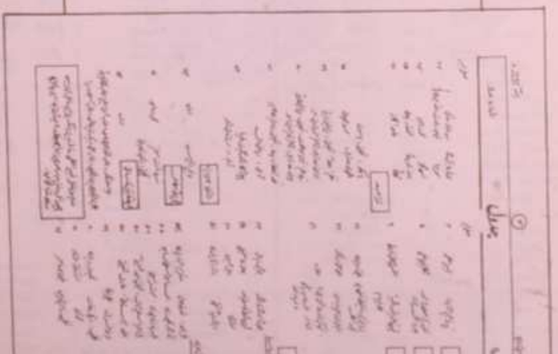
①

جلد ۵ — جدول — شمارہ ۱

②

جلد ۵ — جدول — شمارہ ۲


جدول



مجلہ غالب نامہ نئی دہلی

جولائی ۱۹۹۳ء

جلد ۱۴ —————— شمارہ ۲

ناشر و طابع : شاہد ماہلی —————— مطبوعہ : عزیز پرنٹنگ پریس، دہلی

فہرست

قیمت : ۵۰ روپے

خط و کتابت کا پتا

غالب نامہ، غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی ۲ —۱۱۰۰۰

فون : ۳۲۱۳۵۸۳
۳۳۱۶۵۱۸

فروغ (بھوبنیشور) ۳/۱۱ | فصیل (کرناٹک اردو اکادمی) شمارہ ۶۵

فروغ ادب (بھوبنیشور)

۳/۱۱

فہرست

فصیل (کرناٹک اردو اکادمی)

شمارہ ۶۵

[illegible]

سہ ماہی - فکر و نظر - اسلام آباد

جلد ۳۱ - شمارہ - ۱ جولائی - ستمبر [illegible]

فہرست

جلد ۳۱ - شمارہ - ۲ اکتوبر - دسمبر [illegible]

فہرست

فکر و نظر (علیگڑھ) ۳۰/۳، ۴، ۹۳ء

فکر و نظر (علیگڈھ) ۳۰/۳

ترتیب:

فکر و نظر (علیگڈھ) ۳۰/۴

ترتیب:

فنون (لاہور)

جولائی ـ دسمبر ۹۳ء

مندرجات

قومی زبان (آندھرا پردیش) جولائی۔ اگست ۹۳ء	

اختلافات ڈاکٹر صدیقی، اصغر آفاق، عامر سہیل، امتیاز الحق تبیان، احمد ثاقب، محب عارفی،	رفاقت حسین، احمد بخش، تقوی احمد پوری، نصیر الدین انصاری، رانا غلام شبیر، رشتاق،	یوسف حسن، امتیاز علی خان، محمد سعید، نصرت ہاشمی۔ ۳۲۱

۲

قومی زبان (آندھرا پردیش)

جولائی۔ اگست ۱۹۹۳ء

ترتیب

-۵-

ادارۂ تحریر
ادا جعفری
جمیل الدین عالی
مشفق خواجہ
مدیر
ادیب سہیل

ماہنامہ قومی زبان کراچی
انجمن ترقی اردو پاکستان

بدل اشتراک
فی پرچہ ۔۔۔ ۱۰ روپے
سالانہ عام ڈاک سے ۹۰ روپے
سالانہ رجسٹری سے ۱۴۲ روپے
بیرون ملک
سالانہ عام ڈاک سے [illegible]
سالانہ ہوائی ڈاک سے [illegible]

جنوری ۱۹۹۳ء جلد ۶۵ شمارہ ۱

مضمون نما

فروری ۱۹۹۳ء جلد ۶۵ شمارہ ۲

مضمون نما

مارچ ۱۹۹۳ء جلد ۶۵ شمارہ ۳

مضمون نما

اپریل ۱۹۹۳ء جلد ۶۵ شمارہ ۴

مضمون نما

مئی ۱۹۹۳ء جلد ۶۵ شمارہ ۵

مضمون نما

جون ۱۹۹۳ء جلد ۶۵ شمارہ ۶

مضمون نما

جولائی ۱۹۹۳ء جلد ۶۵ شمارہ ۷

مضمون نما

اگست ۱۹۹۳ء جلد ۶۵ شمارہ ۸

مضمون نما

ستمبر ۱۹۹۳ء جلد ۶۵ شمارہ ۹

مضمون نما

اکتوبر ۱۹۹۳ء جلد ۶۵ شمارہ ۱۰

مضمون نما

نومبر ۱۹۹۳ء جلد ۶۵ شمارہ ۱۱

مضمون نما

قومی زبان دسمبر ۱۹۹۳ء جلد ۶۵ شمارہ ۱۲

مضمون نما

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

غزلیں

طنز و مزاح

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

غزلیں

حاشیے

عابد علی خاں / خواجہ احمد فاروقی / شیخ داؤد

اقتباس حرف کے شاہکار انشائیے / مشفق خواجہ / انشائیے۔

کھلے خطوط / اداریہ / خبریں — ۶۰

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

غزلیں

جائزے

تذکرہ بیش کی گھوڑی / کلیات حریم / منظومات دابی / معلومات سخن / شاعری / سائنس نامہ / منتخب مجموعہ / ماہنامہ مرکزوں کی دنیا۔

کھلے خطوط / اداریہ / خبریں — ۶۱

اس شمارے میں

اس شمارے میں

اس شمارے میں

علامہ شبلی کی دو کتابوں کے نئے ایڈیشن

الفاروق: [illegible]

علم الکلام: [illegible]



اس شمارے میں (جون جولائی)

اس شمارے میں (ستمبر)

○ غزلیں

[illegible]

○ نظمیں

[illegible]

○ [illegible]

[illegible]

○ [illegible]

[illegible]

○ [illegible]

[illegible]

○ [illegible]

[illegible]

○ [illegible]

[illegible]

منشور (کراچی) — جولائی ۱۹۹۳ء

اس شمارے میں

اس شمارے میں

اس شمارے میں

اس شمارے میں

اس شمارے میں

نشور (کراچی) — دسمبر ۱۹۹۳ء



گلستان (جے پور) — جولائی دسمبر ۱۹۹۳ء

مشمولات

نقد و نظر (علی گڑھ) جلد ۱۵ شمارہ نمبر ۱ ۹۳ء

مندرجات

نقوش (لاہور) شمارہ ۱۴۱

فہرست

مقالات و مضامین

نعت

دُعا

نظم و غزل، رباعیات

افسانے

سفرنامے

نقوش (لاہور) شمارہ ۱۴۱

فن اور شخصیت

انشائیہ

تبصرے

نگار پاکستان (کراچی) جولائی۔ دسمبر ۱۹۹۳ء

"نگار پاکستان" (کراچی) جولائی ۱۹۹۳ء

● فرمان فتح پوری نمبر، مرتبہ [illegible] ●

"نگار پاکستان" (کراچی) اگست ۱۹۹۳ء

● انتخاب غزلیات میر حسن، شائع کردہ "اردو اکادمی دہلی" مرتبہ [illegible] ●

"نگار پاکستان" (کراچی) ستمبر ۱۹۹۳ء

● [illegible] مرحوم کی کتاب "[illegible]" ●

"نگار پاکستان" (کراچی) اکتوبر ۱۹۹۳ء

● [illegible] غالب از نیاز فتح پوری ●

"نگار پاکستان" (کراچی) نومبر ۱۹۹۳ء

● فرمان فتح پوری کے سات مضامین جو ۱۹۹۱ء اور ۱۹۹۲ء میں مختلف رسائل میں چھپے ●

نوائے ادب (بمبئی)

اکتوبر ۱۹۹۳ء

مندرجات

نیا دور (لکھنؤ)

جولائی، اگست ۱۹۹۳ء

عنوانات

عنوانات

عنوانات

نیا دور (لکھنؤ) — نومبر، دسمبر ۱۹۹۳ء

عُنوانات

عُنوانات

تتمہ

تتمہ

وہ رسائل جو ۱۹۹۲ء اور ۱۹۹۳ء کے نصف اوّل کی فہرست میں شامل نہو پائے

آنکھ مچولی (کراچی) جولائی ۹۳ء ● آنند ڈائجسٹ (پٹنہ) اگست ۹۳ء







ابلاغ (پشاور) اکتوبر ۹۳ء • اکرام المشائخ (بہاولپور) جنوری مارچ ۹۳ء

محکمہ تعلیم صوبہ سرحد سے منظور شدہ

ابلاغ

پشاور

نسرین سواتی

اکتوبر ۱۹۹۳

اکرام المشائخ



خانقاہ عالیہ چشتیہ ڈیرہ نواب صاحب ضلع بہاولپور

ترتیب

اداریہ

مطالعے

افسانے

غزلیں

تحقیقات

نظمیں

اِکرام المشائخ ڈیرہ نواب صاحب

جنوری مارچ ۱۹۹۳ء

حضرت مخدوم سید اکرام حسین صاحب سیکری

حکیم محمد ممتاز حسین

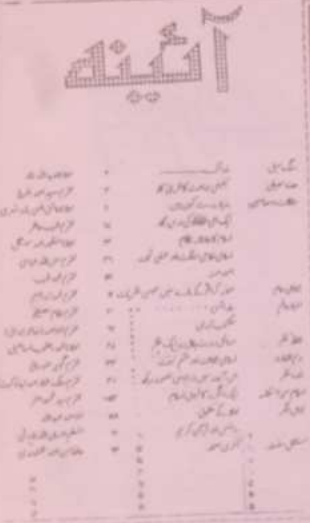
ممتاز جاوید سلیم چشتی بی اے

محمد اسلم

محمد افضل خان

فہرست


الفاروق


آئینہ


آئینہ


آئینہ

ماہنامہ

پیش رفت

دہلی

تعمیری ادب کا ترجمان

ستمبر، دسمبر

Rs. 450/-

ترتیب

☆ اپنی باتیں ☆

میزان

کامیابی

ماہنامہ تحریریں لاہور



ترتیب

ماہنامہ
تحریریں
لاہور

ایڈیٹر
زاہدہ صدیقی

اعزازی مشاورت

اعزازی مدیران

ترئین و آرائش

مقام اشاعت
چوک اردو بازار لاہور

تعمیر (جموں و کشمیر)	اکتوبر ۹۳ء	
	چوں چوں کا مربہ (بدایوں)	جولائی - ستمبر ۹۳ء

تعمیر

جلد نمبر ۳۲ شمارہ نمبر

اکتوبر ۱۹۹۳ء

نگراں :- کے . ایل . دھر

مدیر :- عبدالحق

شائع کردہ

ڈائرکٹوریٹ آف انفارمیشن حکومت جموں و کشمیر

ترتیب

مشاعرہ نمبر

چوں چوں کا مربہ

بدایوں

جلد نمبر جولائی تا ستمبر ۱۹۹۳ء شمارہ ۳۰

مدیر

اسحاق طبیب

بھان متی کا پٹارا / فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

علمی، تعمیری، مذہبی و ادبی رسالہ

مجلس المنتظر کا ماہانہ ترجمان

بیادگار صدر العلماء حضرت مولانا سید ... صاحب

حجۃ المنتظر

نوگانواں سادات مراد آباد

جلد نمبر ۶ — شمارہ نمبر ۱۲

ماہ دسمبر سنہ ۱۹۹۳ء

نگران: حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا سید قرۃ العین مجتبیٰ صاحب قبلہ

ایڈیٹر: سید کنیز عباس عابدی صاحب قبلہ

فہرست مضامین

[illegible]

جملہ خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ

حجۃ المنتظر، نوگانواں سادات، مراد آباد (یوپی)

اکتوبر ۹۳

خبر و نظر

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

شمارہ ۳

جوائنٹ ایڈیٹر: قمر الہدیٰ فریدی	ایڈیٹر: ... فوزی	منیجنگ ایڈیٹر: اختر محی الدین



فہرست:

یادگار امام المشائخ حضرت خواجہ حسن نظامی دہلویؒ

خوبصورت اور صحت مند قدروں کا ترجمان

ماہنامہ درویش لاہور

اولیاء اللہ نمبر

مقام اشاعت
المصطفیٰ
بلڈنگ
۴۳ عبد الکریم روڈ
لاہور

مدیر اعلیٰ ○ ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی

فون: ۹۳۶۵۱۵۱ فی پرچہ: ۳۰ روپے

جلد: ۵ شمارہ: ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۳ء

[illegible]

دامنِ درویش

حصہ اول

حصہ دوم

حصہ سوم

بیادگار غیاث احمد گدی

- تخلیقی ادب کی اشاعت کا پر وقار ذریعہ
- جدیدیت اور تجریدیت کے مابین توازن کی مستحسن کاوش
- نئی نسل کی ذہنی تربیت کا آرگن
- جدید ادب میں تقلیدی روش سے پیدا شدہ جمود سے انحراف
- ادب میں نئے تجربوں کی صداقت کا بے باک ترجمان
- تنقیدی ادب میں دیانتداری کا آئینہ

سہ ماہی

رنگ

دھنباد

مدیران:

شان بھارتی

آمر صدیقی

بساطِ رنگ

ترسیل زر و خط و کتابت

سہ ماہی رنگ

سرائے دھنباد - ۸۲۸۱۲۱

فی شمارہ : دس روپے

زرِ سالانہ : پچاس روپے

طابع و ناشر شان بھارتی نے ... پریس کلکتہ سے چھپوا کر سرائے دھنباد سے شائع کیا

بیادگارِ غیاث احمد گدی

- تخلیقی ادب کی اشاعت کا پروقار ذریعہ
- جدیدیت اور تجربیت کے مابین توازن کی مستحکم تلاش
- نئی نسل کی ذہنی تربیت کا آرگار
- جدید ادب میں تنقیدی روش سے پیدا شدہ جمود سے انحراف
- ادب میں نئے تجربوں کی صداقت کا بے باک ترجمان
- تنقیدی ادب میں دیانتداری کا آئینہ

سہ ماہی

رنگ

دھنباد

مدیران:
آمر صدیقی – شان بھارتی

بساطِ رنگ

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ:
سہ ماہی رنگ، بیگا، دھنباد-۸۲۸۱۲۱
فی شمارہ: دس روپے
زرِ سالانہ: پچاس روپے مع خاص نمبر

سجّاد (ساہیوال، پاکستان) جولائی ۹۳ء ● سند (نئی دہلی) ستمبر، اکتوبر ۹۳ء ● شفق (پٹنہ) ستمبر۔ نومبر ۹۳ء

سجاد

اے۔ آر۔ انصاری

اوصاف شیخ

شکیل قمر

سلیم طاہر

نمائندگان

سند

جلد ۲

شمارہ ۲

اس شمارہ کے قلم کار

فارغ ہونے کا مطلب

شفق

آہنگ شفق

محمد صدرالدین

ندوۃ القلم جامعہ ابن تیمیہ کا نقیب

طوبیٰ

جلد ۱ — ۱۴۱۴ھ ۱۹۹۳ء — شمارہ ۱

سرپرست — فضیلۃ الشیخ محمد خورشید السلفی
رئیس التحریر — فضیلۃ الشیخ [illegible] السلفی
نائب رئیس التحریر — فضیلۃ الشیخ [illegible] السلفی

مدیر: عبدالواسع
نائب مدیر: یوسف [illegible]
معاون: [illegible]

برگ و بار طوبیٰ

علم و دانش (گورکھپور) ستمبر و اکتوبر ۹۳ • مسرت ڈائجسٹ (کراچی) جولائی ۹۳ء

زیر سرپرستی دارالعلوم گورکھپور

علم و دانش

ربیع الثانی ۱۴۱۴ھ ستمبر و اکتوبر ۱۹۹۳ء

مدیر مسؤل

حکیم محمد احمد قاسمی

مدیر تحریر

محمد انعام الحق جوہر قاسمی

فی کاپی ۵ روپے

سالانہ خریداری ۵۰ روپے

خصوصی تعاون ۱۰۰ روپے

لائف ممبر ۱۰۰۰ روپے

ماہنامہ مسرت ڈائجسٹ کراچی

مدیرہ

بشریٰ صدیقہ

مدیر خصوصی — وسیم الحق صدیقی

نائب مدیرہ — طاہرہ حبیب

— یو۔ زیڈ تاثیر

— فاروقہ فی خان

— انیس صدیقی



آئینہ



[illegible]

ماہنامہ

نسیم سحر

الہ آباد

ایڈیٹر صبیحہ موہانی سحر

سرپرست: متین الحسن موہانی

معاونین ادارہ

ڈاکٹر [illegible] بیگم

زرینہ نسیم

[illegible] بانو

نگران شعبہ [illegible]

خلیل انجم (کاشی)

محمد [illegible] فاروقی اختر

غیر ممالک میں ہمارے نمائندے

- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]

قیمت 7/ روپے فی شمارہ

سالانہ قیمت ہندوستان میں ——— ۸۰/-

غیر ممالک سے ——— ۵۰۰/-

غیر ممالک سے خصوصی تعاون ——— ۱۰۰۰/-

بیادگار

حضرت مولانا حسرت موہانی علیہ الرحمۃ

الحاج عبدالستار خیری

ایس، ایم ولی الحسن

جلد ۱ — ماہ دسمبر ۹۳ء — شمارہ ۴

مجلس مشاورت

پروفیسر عنوان چشتی	جناب جمیل [illegible]
ڈاکٹر بشیر بدر	گوہر شمیم رودی
پرنسپل نثار [illegible]	الحاج انیس دہلوی
ڈاکٹر [illegible]	خلیل عشرت
[illegible] الزماں سحر	اختر شاہجہاں پوری
[illegible]	ڈاکٹر [illegible] سلطانہ نکہت
عقیل شاطر	[illegible] الاسلام نسیم

[illegible]

EDITOR, PRINTER, PUBLISHER & OWNER SABIHA MOHANI " SAHAR " -
PRINTED AT : ASRAR KARIMI PRESS JOHNSON GANJ ALLAHABAD-PUBLISHED
FROM : C 717, KARELI SCHEME, ALLAHABAD-211016.

ورقِ تازہ (مہاراشٹر) — جنوری۔مارچ ۱۹۹۳ء

نثرِ جدید کا عہد ساز

سہ ماہی

ورقِ تازہ

بھیونڈی (مہاراشٹر)

سال : پہلا — شمارہ : پہلا

یکم مارچ ۱۹۹۳ء

قیمت فی شمارہ : ۱۰ روپے

زرِ سالانہ : ۴۰ روپے

خوشنویس : عظیم خورشید

تقسیم کار : ادارہ سہ ماہی "ورقِ تازہ" ۷۰ فسانہ بلڈنگ یوسف کالونی (نادی) بھیونڈی ۴۲۱۳۰۲
ادارہ ہفت روزہ "تعمیر ٹرائبٹ" [illegible] گولڈن پارک [illegible] ۴۳۱۶

پرنٹر پبلشر : محمد تقی نے [illegible] کے لیے [illegible] پریس [illegible] سے چھپوا کر ۷۰ فسانہ بلڈنگ یوسف کالونی (نادی) روڈ بھیونڈی ۴۲۱۳۰۲ سے شائع کیا۔

ایڈیٹر : ابراہیم اختر

رابطہ : فسانہ بلڈنگ یوسف کالونی (نادی) روڈ بھیونڈی ۴۲۱۳۰۲ (مہاراشٹر)

ترتیب

ترتیب

ورقِ تازہ ــــــــ جنوری ٩٣ء

ترتیب

تتمہ

ضمیمہ

ضمیمہ-۱

ادبی دانشوری

تہذیبی دانشوری

مذہبی دانشوری

شعری دانشوری

پاک دانشوری

پاک مذہبی دانشوری

شخصیات

وفیات

تاریخ علوم و فنون

ممالک اسلامیہ

متفرقات

کتابیں / رسائل

مخطوطات

ناصر بغدادی

ادب میں گروپ بندی کا مسئلہ

تخلیقی ادب کی ترویج اور نشو و نما تخلیق کاروں کے قلم کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ ادب زندگی کا ترجمان، معاشرے کا عکاس اور عصری آگہی کا آئینہ دار اس وقت ہوتا ہے جب فنکار نہ صرف آزادیِ تحریر کی دولت سے مالا مال ہوں بلکہ ادبی فضا بھی گروہ بندی اور عصبیت کے حتمی رجحانات سے کلی طور پر آزاد ہو۔

معاصر اردو ادب کے تناظر میں اگر ہم گہری نگاہ سے دیکھیں تو اس بات کی توضیح کی چنداں ضرورت نہیں ہوگی کہ ہمارا اسّی فیصد ادب:

1. اجتماعی سوچ کا عکاس نہیں ہے۔
2. معاشرتی خصوصیت کا ترجمان نہیں ہے۔
3. عصری آگہی کا آئینہ دار نہیں ہے۔

اس کے برخلاف معاصر اردو ادب ایک ایسا میدانِ کارزار بنا ہوا ہے جہاں ادب کی بزرگ کار ہستیاں ایک دوسرے کو زیر کرنے کی کوشش میں اپنی بہترین صلاحیتوں کے مظاہرے میں مصروف ہیں۔ آزادیِ تحریر کا ذکر خارج از بحث ہے۔ ہمارے اہلِ قلم نے کبھی یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ ان کے فنی اجتہادات اور تخلیقی اختیارات کی حدود کیا ہیں۔ بعض اوقات تو محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے بیشتر لکھنے والوں کی فکری سطح اس حد پر پہنچی ہی نہیں ہے جہاں انہیں آزادیِ تحریر کے فقدان کا احساس ہوتا۔ البیئر کامیو نے بتایا ہے کہ ادب وطن کی پیداوار آزادانہ فضا کے بغیر ممکن نہیں۔ اسے اب کیا کہئے کہ ہمارا ادیب ادب کی تخلیق تو کرتا ہے مگر اس ادبی حقیقت سے ہنوز ناواقف ہے۔ ویسے خال خال چند تخلیق فن کاروں کے نثر پاروں کے بین السطور آزادیِ فکر سے محروم ہونے کی کیفیت مبہم مگر محسوس شکل میں ہمیں مل جاتی ہے۔

معاصر ادب میں انتشار اور اس کے غیر تخلیقی ہونے کے حقیقی ذمہ دار عصبیت اور گروہ بندی کے مذموم رجحانات ہیں۔ گروہ بندی ادب اور ادیب دونوں کے لئے زہر قاتل ہے۔ یہ نہ ارفع ادب کے تخلیق کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور نہ اس کی نمو پذیری کے سلسلے میں معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر معاصر ادب میں مناقشے اور مجادلے کی نیاں کیفیت نظر آتی ہے تو اس کی ایک وجہ بھی گروہ بندی اور ادبی عصبیت ہے۔ جب ادب میں تعصبات کی ضمیں ریز ہو جاتی ہیں تو ادب کی صالح قدریں کلاسیکی اور تہذیبی سیاق و سباق سے کٹ کر رہ جاتی ہیں برنارڈ شا کے خیال میں ادب کی تخلیق خود ایک اچھا کام ہے لہذا تعصبات سے اسے کامل طور پر مبّرا ہونا چاہئے۔ ای ایم فورسٹر (E.M.FORSTER) نے ایک جگہ لکھا ہے کہ تخلیق فنکار اس نصب العین سے کہیں زیادہ بلند ہوتا ہے جس کی وہ نمائندگی کرتا ہے۔ علم کا جہاد تلوار کے جہاد سے کہیں زیادہ مقدس اور موثر ہوتا ہے۔ البیئر کامیو نے نوبل انعام قبول کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ اپنی زندگی کے بدلتے ہوئے حالات میں ایک فنکار ایک زندہ معاشرے کے پرخلوص احساسات کا عکاس بن سکتا ہے مگر اس مقصد کے حصول کے لئے صداقت اور آزادی کی تلاش اور خدمت ضروری ہے

اگر ہم آج کے ادب کے سیاق و سباق میں معاصر لکھنے والوں کے ادبی کردار کا مطالعہ کریں تو ہمیں شدید مایوسی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ہمارے بیشتر لکھنے والوں کو صداقت کی تلاش سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ معاشرتی خرابیوں کی نشان دہی کی کوشش میں وہ اپنے خیالات کو منضبط ڈھنگ میں پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ وہ ادب کی نئی معنوی جہتوں کے متلاشی ہیں نہ عصری آگہی کو اپنی تحریروں میں اجاگر کرنا ان کا تخلیقی مسلک ہے۔ وہ نہ آزادی تحریر کے نقد ان کے شاکی ہیں 'نہ انسانی اقدار اور تجربے کے گوناگوں پہلوؤں کی ترجمانی ان کا نصب العین ہے۔ ان کی تحریروں کے مطالعہ سے اُن کا ادبی طرز عمل اور تخلیقی مزاج کھل کر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ بڑا لکھنے والا حیات و کائنات کا ناقابل تسخیر وجدان رکھتا ہے۔ اس کے برخلاف ہمارے دور کے بیشتر لکھنے والوں نے دیانت دارانہ ادبی تصور پر اپنا دار رکھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ انہوں نے تعصبات سے بلند ہو کر حزبی نقطہ نظر فلسفیانہ وجدان اور فکری آہنگ کو اپنانے میں دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ ادب کے بڑے اور چھوٹے جغادریوں نے جو کچھ لکھا ہے اور لکھ رہے ہیں ان کا مطالعہ کریں تو بس یہ محسوس ہوگا جیسے نئے عصری ادب کے نام پر گروہ بندی اور عصبیت کے زہر بھرے عناصر کا احاطہ کیا گیا ہے!

شہرت کی خواہش انسانی فطرت کا ایک کمزور پہلو سہی لیکن اس کی تلاش کسی جرم کا ارتکاب نہیں مگر اس کا حصول اس وقت ایک ناقابل معافی جرم بن جاتا ہے جب ہم ایسی نام نہاد ادبی تحریروں کی حوصلہ افزائی کریں جو تعصبانہ تجربے سے محروم اور مخلوط ہوتی ہیں۔ اس نوع کا سستا ادب فکری نہج اور وجدانی بنیاد سے محروم تو ہوتا ہے ہی اس کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ اجتہادات پر پہرے بھی بٹھاتا ہے اشہرت کی غرض سے ادب کے نام پر ادبی کچرے کا ارتکاز ایک ناقابل معافی ادبی جرم ہے۔

آج کا بیشتر ادب بے روح پروپیگنڈہ بازی کا دوسرا نام ہے۔ شہرت کے جھوٹے نشے میں دھت ہونے کی جھوٹی خواہش نے آج کے بیشتر لکھنے والوں کو کہیں کا نہیں رکھا ہے۔ آج ادیب کے قلم نے دانستہ طور پر ابہام اور اہمال کو اپنایا ہے تاکہ اس کے پس منظر میں وہ آفاقی صداقت' انسانی جذبات کے خلوص اور معاشرتی بہبود کے تصورات سے دامن بچا کر اپنی تحریروں کو یوں تجریدی رنگ میں پیش کرے کہ قاری کا ذہن الجھ کر رہ جائے۔ قاری کو اس طرح الجھا کر وہ محض انانیت اور تجریدی اسلوب نگارش کو بڑی دیدہ دلیری سے مخصوص علامتی لب و لہجہ اور منفرد رجحانات کا نام دیتا ہے۔ پروپیگنڈا بازوں کے نقطہ نظر سے آج کا اردو ادب جدید رجحانات کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔ ان کے بقول اس گروہ کے ہر لکھنے والے کے پاس شعور اور مشاہدے کی تیز آنکھ ہے۔ وہ پیچیدہ سماجی مسئلوں کو شدت سے محسوس کرتا ہے اور اسی شدت سے اس سلسلے میں اپنے خیالات کو مربوط اور منضبط ڈھنگ سے پیش کرتا ہے۔ سب ہی نام معتبر ہیں اور ہر تخلیق جدید ادب کے لئے فالِ نیک ہے۔ عصری ادب میں نام نہاد لکھنے والوں کا ایک جم غفیر ہے۔ سب بظاہر عصری شعور کے ترجمان اور ادب و آگہی کے مضبوط رشتے کے علمبردار ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ

گروہ بندی کے زیر اثر ایسا ادب پیدا ہو رہا ہے جس کی حیثیت کھوکھلے پروپیگنڈے سے زیادہ نہیں۔ ان تحریروں کے ایک معتدبہ حصہ کو اجتماعی شعور، عصری آگہی اور اس دور کے ذہنی و جذباتی سانچوں سے ہم آہنگ نہیں کیا جا سکتا۔

آج اردو ادب کے تقریباً ہر معتبر نام کے گرد غیر معروف بونوں کا ہجوم ہے کچھ تو حقیقتاً معتبر نام ہیں اور کچھ پروپیگنڈا بازی کے طفیل راتوں رات شہرت کے آسمان پر پہنچ گئے ہیں۔ بونوں اور معتبر ناموں کی باہمی گٹھ جوڑ کی گروہ بندی کی منظم شکل ہے۔ یہ سازشی اشتراک در حقیقت "من تراحاجی گویم تو مرا حاجی گو" کے زمانہ ساز اصول کی پیروی ہے جو اتفاق سے دونوں ہی فریقوں کے مفاد میں ہے۔ بونوں کی سب سے بڑی اور آخری خواہش کیا ہو سکتی ہے؟ یہی نا کہ وہ بھی ادب کے قد آوروں کی اگلی صف میں شامل ہو جائیں۔ ابس ابن الوقتی کا لبادہ زیب تن کرنے کے بعد جب ان و ادب کے چند معتبر ناموں کی جانب سے سبز سگنل کا عرفان حاصل ہوتا ہے تو یہی احساس معنویت (SENSE OF SINGNIFICANCE) کے ساتھ ساتھ انہیں اپنا قد بھی اونچا ہوتا محسوس ہونے لگتا ہے۔ وہ ان نام نہاد عہد ساز شخصیتوں کو زندہ جاوید کرنے کی دھن میں لفاظی اور فصاحت و بلاغت کے آزمودہ نسخوں کو آزمانے پر پوری طرح آمادہ نظر آتے ہیں۔ فرماں بردار اور سعادت مند حلقہ بگوشوں کی طرح وہ بھی اپنے ادبی مرشد کی شان میں مداح سرائی اور قصیدہ خوانی شروع کر دیتے ہیں ایسے توصیفی مضامین کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہو جاتا ہے جن میں ان SÈLF-STYLED نام نہاد ادبی شخصیتوں کے لئے بصیرت افروز اسمائے صفات (ADJECTIVES SUPER) کا استعمال کئے جاتے ہیں۔ اگر معتبر نام شاعر کا ہے تو وہ حقیقتاً طور پر میٹے اور غالب کا ہم پلہ بن جاتا ہے۔ نوش فکر اور فلسفیانہ وجدان کی حامل شاعری اس پر ختم ہو کر عصری دانش کو متاثر کرتی ہے اور اگر نامور شخصیت افسانہ نگار ہے تو موپاساں، او ہنری اور چیخوف اس کے آگے پانی بھرتے نظر آتے ہیں۔ اس پر لکھے گئے تنقید پاروں کی جھلکیاں کچھ اس انداز میں ہمیں پڑھنے کو ملتی ہیں

1. "ان کا منفرد اسلوب و لہجہ، علامتی پیرایہ اظہار اور تجریدی ڈھانچہ سب مل کر ان کی ایک نمائندہ جہت اور ان کا منفرد تشخص قائم کرتے ہیں۔"

2. "وہ جو بات کہنا چاہتے ہیں وہ تمثیل کی ترانسفارمیشن کے واسطے سے کہہ جاتے ہیں"۔

3. "اس نے اردو افسانے کو فارمولا کہانی کی دلدل سے نکالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کو پرکھنے کا تنقیدی شعور بہت مجبور دکھائی دیتا ہے۔"

قصہ مختصر یہ کہ وہ پیدائشی افسانہ نگار واقع ہوا ہے اور اس صنف ادب میں وہ حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر اتفاق سے تنقید نگار، اقد آور نام کا میدان ہو تو بیچارے ٹی ایس ایلیٹ کی عالمیت اور سلامتی نہ صرف خطرے میں نظر آتی ہے بلکہ اس کی ادبی عظمت بھی معرض ہو کر رہ جاتی ہے۔ اردو زبان کی یہ عظیم المرتبت ادبی ہستی معروضی اور منطقی تنقید کی علمبردار بن جاتی ہے۔ انتقادی ادب کی شعوری اور لاشعوری تقاضوں کو پورا کرنے والی اس ہستی پر جو مضامین لکھے جاتے ہیں ان کی جھلکیاں ان الفاظ پر ہمیں ملتی ہیں!

1. "ان کی تنقید جذبات اور تخیل کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے۔ ان کی تحریروں میں مشاہدہ، فکر اور وجدان باہم دگر آمیز ہو کر ایک وحدت میں تبدیل ہو جاتا ہے"

2. "ان کی تنقید کا انداز منفرد اور توضیح کا انداز جداگانہ ہے۔ ان کے نزدیک تنقید کا منصب تخلیقی فن پارے کی تفہیم کے سوا کچھ نہیں"۔

3. "وہ ایک مخصوص نقطہ نظر رکھنے کے باوجود ایک منصف مزاج نقاد ہیں۔ اس لئے وہ اپنے ہم عصروں کو بھی ذاتی تعصبات اور ترجیحات سے بلند ہو کر پرکھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔"

من حیث المجموع موصوف کے عہد آفریں انتقادی مضامین اردو زبان کے لئے موجب افتخار ہیں۔ استدلال ان کی تنقید نگاری کا وصف

خاص ہے قاری کو ان کی تنقیدی تحریروں میں تجزیاتی نظر اور ایک وسیع تر عصری شعور کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ وہ پڑھنے والے کو اپنی تحریر کی رنگینی سے نہیں بات کے وزن سے متوجہ اور متاثر کرتے ہیں!

یہ ہیں معتبر ادبی ناموں کے ارفع ادبی اوصاف جو بونوں کو بلا مستثنیات ان کی ہر تحریر میں نظر آتے ہیں۔ اس موڑ پر بات کا انقطاع ممکن نہیں۔ الم نشرح کی صورت استنباط کے ساتھ آگے مزید واضح ہو جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ بونوں کو یہ سب کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ سوال مشکل نہیں اور اس کا جواب بھی آسان ہے کہ گروہ بندی اور تعصبات نے ادبی دنیا کو ایک بازار بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس بازار میں ہر لکھنے والے کی حیثیت ایک دکاندار جیسی ہو گئی ہے۔ وہ جو کچھ فروخت کرتا ہے۔ اس کی معقول قیمت بھی وصول کرتا ہے۔ بورخیس (BORGES) نے کہا تھا کہ لکھنے والے کو اپنی قدر دانی (APPRECIATION) اور داد طلبی کی بابت معلوم کرنے کے لئے دوسرا جنم لینا چاہئے۔ مگر اس کی اس بات کا اطلاق و انطباق ہمارے لکھنے والوں پر کسی طور نہیں ہو سکتا ہے۔ وہ زمانے خیال و خواب ہوئے جب لکھنے والا ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ سے بالاتر ہو کر لکھتا تھا۔ اگر آج وہ کسی ادبی شخصیت کو بہ نظر استحسان دیکھتا ہے یا اپنے مضمون میں اس پر تحسین و آفرین کی بارش کرتا ہے تو اسے بھی مناسب وقت پر دوسری جانب سے داد و دہش اور شرف قبولیت کی توقع ہوتی ہے۔ یہ ادبی داوری کا مسئلہ نہیں بلکہ داد و ستد کی بات ہے اور پھر جوں ہی بونے کا کوئی افسانوی یا شعری مجموعہ طباعت و اشاعت کے مراحل طے کر کے منظر عام پر آتا ہے تو کتاب کی رونمائی کے موقع پر قد آور صاحب بونے کی "ناقابل فراموش" ادبی خدمات کو پیش نظر رکھ کر اپنے حلقہ بگوشوں کی بھیڑ میں تعریفی ریمارکس سے لبریز ایک مختصر سا مضمون پڑھ کر اس کے قد میں دو انچ کا اضافہ کر دیتے ہیں اور پھر یہی مضمون کسی مقتدر ادبی جریدے میں اشاعت پذیر ہو کر بونے صاحب کو قارئین کے سامنے ادب کا دریکتا بنا کر پیش کرتا ہے۔ اس ضمن میں ایک بونے کی شاعری پر ایک معروف نقاد کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیں۔

"روایتی اسلوب کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری ایک مابعد الطبیعاتی نہج اور بنیاد رکھتی ہے اس لحاظ سے وہ بیسویں صدی میں غزل کی روایت کے تشکیل و ارتقا کے امانت دار ہیں"

یہ ہماری علمی کم مائیگی اور ادبی تہی دامنی ہے کہ اس گرانقدر تبصرے کے مطالعہ سے قبل اس صاحب طرز بونے شاعر اور اس کے کلام فکر کے ابلاغ کے متعلق ہمیں کچھ علم نہیں تھا!

اگلے وقتوں میں دربار کے شعرا بادشاہ سلامت کی خدمت میں مبالغہ آمیز روایتی تحسین سے بھرپور قصیدے لکھ کر شاہی انعام و اکرام سے بہرہ ور ہوتے تھے اور عالم پناہ بھی ازراہ نوازش انعام و اکرام اور خلعت فاخرہ سے ان شعرا کو نوازا کرتے تھے۔ انہیں خطوط پر آج ادب کے خود ساختہ خداوند بونوں کی ادبی خدمات پر وقتاً فوقتاً انہیں اپنے مضامین میں توصیفی کلمات سے یاد کر کے انہیں انعام و اکرام سے سرفراز کرتے ہیں۔ درباری شعرا کے باب میں معاملہ داد و دہش کا تھا مگر آج ادبی دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ داد و ستد کی بات ہے۔

اردو ادب میں قحط الرجال کی کیفیت نہیں مگر غیر جانبدار شستہ لکھنے والوں کے نرم رو آہنگ پر حاشیہ بردار بونوں کا ابلیسی شور و غوغا اس قدر حاوی ہے کہ ایک طوفان بدتمیزی کا سماں قاری کے سامنے آجاتا ہے ادبی دنیا ایک ایسے بازار کے مماثل ہو گئی ہے جہاں معیاری ادب و تنقید کی آراستہ دکانیں تو موجود ہیں مگر خریدار وہاں اس لئے نہیں آتا کہ ان دکانوں کے سامنے سستے قسم کے "فٹ پاتھ کے تاجر" چیخ چیخ کر سستی قسم کی چیزیں سستے داموں پر فروخت کر رہے ہیں۔ کم فہم خریدار تو یہی سمجھ رہے ہیں کہ سڑکوں پر آوازیں لگا کر بیچنے والے وہی چیزیں فروخت کر رہے ہیں جو دکانوں پر انہیں مہنگے داموں پر مل رہی ہیں مگر انہیں کیا پتہ کہ ہانگ کانگ اور جاپان کے تیار شدہ سامان دونوں میں بڑا فرق ہے۔

ادب کی یہ مسخ شدہ صورت حال بہت پریشان کن ہے۔ آج ادب ٹولیوں میں بٹ کر رہ گئے ہیں۔ ہر ادبی گروہ کا تنقیدی مقیاس ان کے ارکان کے لئے ایک طرح کا امتناعی حکم جاری کرتا ہے کہ وہ دوسرے ادبی گروہ یا غیر جانبدار لکھنے والوں کی تخلیقات کو پڑھ کر بھی یہ تحسین پیش کرنا

تو دور کی بات ہے رائے زنی اور تبصرہ آرائی سے بھی گریز کرے اور یوں اپنے غیر وسیع المشرب ہونے کا ثبوت وسیع الظرفی اور ڈنکے کی چوٹ پر فراہم کرے یہ المیہ ہے بائی المیہ سے کم نہیں کہ عصبیت کا زہر ادب کی رگوں میں دور تک سرایت کر چکا ہے۔ افسوس کہ بعض معتبر لکھنے والے بھی مخالف گروہ کے ارکان اور غیر جانبدار لکھنے والوں سے یوں الرجک ہیں جیسے وہ کسی جان لیوا بیماری کے جراثیم ہوں جن لکھنے والوں کی یہ ذہنیت ہو ان کا تنقیدی معیار اور ادبی کردار کیا ہو سکتا ہے۔ اس کا اندازہ کرنے میں ادب کا مطالعہ قاری کبھی غلطی کا ارتکاب نہیں کر سکتا۔ بورخیس (BORGES) نے ایک جگہ کہا ہے کہ اگر لکھنے والا خود اپنی تحریروں پر یقین نہ کرے تو وہ اپنے قاری سے یہ کیسے امید رکھ سکتا ہے کہ وہ انہیں صحیح تسلیم کرے گا۔ عصبیت پر ایمان رکھنے والے ہمارے ادیب خوب جانتے ہیں کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں اس کا بڑا حصہ جھوٹ کا پلندہ ہے مگر اس کے باوجود انہیں اس بات کی قوی امید ہے کہ ان کی بلند آہنگ پروپیگنڈا بازی ان کے ہر جھوٹ کو سچ میں تبدیل کر کے اردو ادب کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر سکتی ہے!

معاصر اردو ادب کا معتد بہ حصہ لکھنے والوں کے تعصبات کا آئینہ ہے۔ اگر اس سازشی رجحان کا جلد خاتمہ بالخیر نہیں ہوا تو اردو ادب کے طفیلی (PARASITES) ان ذہین اور باشعور اور باصلاحیت فنکاروں کو دیمک بن کر چاٹ جائیں گے جو گروہ بندی سے الگ تھلگ، معاصرانہ چشمکوں سے دامن بچاتے ہوئے، ادب کی بے لوث خدمت میں مصروف ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم ادبی اقدار کا نئے سرے سے تعین کریں مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ ادب کے پیش پا افتادہ اور عصبیت سے لبریز پیمانے ہی کو بدل دیا جائے۔ ادب کے نام نہاد سرپرستوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ لکھنے والے سے اس کی مرضی کے خلاف وہ سب کچھ لکھوانے کی کوشش کریں جو وہ لکھنا نہیں چاہتا۔ اہل قلم کا یہ پیدائشی استحقاق ہے کہ وہ از خود موضوعات کا تعین کرے اور بلا استنکاف ان پر طبع آزمائی کرتا جائے۔ ادب پر جب نام نہاد معتبر ناموں کی حکمرانی ہوگی معیاری اور تخلیقی ادب کی تخلیق کوئی آسان بات نہیں۔ آج لکھنے والوں کی اکثریت ان موضوعات پر قلم اٹھا رہی ہے جن کے محرک ادب کے گاڈ فادرز (GOD FATHERS) ہیں۔ جب لکھنے والا مستعار موضوعات پر لکھتا ہے تو فی الحقیقت وہ اپنے اندر کے تین چوتھائی تخلیقی ادیب سے دستبردار ہو کر ایک ایسے وظیفہ خوار کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے جس کا کام وظیفہ دینے والے کی ثنا خوانی کے علاوہ کچھ نہیں۔ جب صورت حال یہ ہو تو لکھنے کا عمل زندگی کی طرح بیکراں دریافت اور انکشاف کا تحیر خیز سفر ثابت نہیں ہوتا۔ یوں بڑی طرح بات کی نفی ہو کر رہ جاتی ہے اور بڑا ادب تو دور کی بات ہے ادب ہی پیدا نہیں ہو پاتا۔

("دریافت" نومبر، دسمبر ۹۳ء)

محمود ایاز

نقشِ اوّل

"سوغات" کا پانچواں شمارہ ——— آپ کے پیش نظر ہے اور اس ڈھائی سال کے عرصے میں محسن خان کے افسانے "زہرا" کے علاوہ کوئی اور افسانہ ایسا نہیں وصول ہوا جسے پڑھ کر خوشی ہو۔ لوگ پوچھتے ہیں "سوغات" میں افسانے کیوں نہیں شائع ہوتے۔ ایک صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ چونکہ "سوغات" افسانے نہیں چھاپتا اس لئے سلام بن رزاق اور انور خان جیسے افسانہ نگار بھی "سوغات" میں مضمون نگار کی حیثیت سے شریک ہوتے ہیں۔ یہ غلط بات ہے۔ "سوغات" میں افسانے اس لئے نہیں آرہے ہیں کہ ایسے افسانے جو "سوغات" شائع کر سکے وصول نہیں ہو رہے ہیں۔ شاعری کا حال بھی زیادہ دل خوش کن نہیں لیکن غزل نے اس حصے کو کسی حد تک سنبھال لیا ہے۔ ناصر کاظمی نے کہا تھا "طاؤس ناچتا ہے تو جنگل ہرا بھی ہو۔" سوال یہ ہے، طاؤس کہاں ہیں؟ جنگل ہرا کیسے ہو؟

تخلیقی کام تو ایک طرف، ہم لوگ تو اب ایسا لگتا ہے، وقتی غم اور غصے کے سیدھے سادے موثر اظہار پر بھی قادر نہیں رہے ہیں۔ ایودھیا پر جو نظمیں آرہی ہیں انہیں کو ایک نظر دیکھ لیجئے۔ اس طرح کے سانحات اور واقعات پر شبلی یا ظفر علی خان کی نظمیں آج بھی اٹھا کر پڑھ لیجئے۔ ان لوگوں نے ان نظموں کو نہ اعلیٰ شاعری کا نمونہ سمجھ کر پیش کیا اور نہ ان کے پڑھنے والوں کو ایسی کوئی غلط فہمی رہی۔ نہ تب نہ اب۔ ایک قومی حادثہ پیش آیا، جذباتی دھچکا پہونچا، لکھنے والوں نے اپنے صدمے اور غم کا اظہار کر دیا۔ جو اظہار پر قدرت تھی، اظہار کے سانچوں سے واقف تھے، الفاظ کا تخلیقی

استعمال نہ سہی خطیبانہ استعمال کرسکتے تھے۔ کچھ جذباتی ضرورتیں تھیں لکھنے والوں کی بھی، پڑھنے والوں کی بھی۔ دونوں کے درمیان ایک مشترک رشتہ تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ جن جذبات اور احساسات کا اظہار ہوتا تھا وہ مصنوعی اور نقلی نہیں ہوتے تھے۔ بات دل سے نکلتی تھی اور دل تک پہونچتی تھی۔ جہاں یہ بنیادی باتیں نہ ہوں وہاں تو جگن ناتھ آزاد صاحب کی نظم بھی وجود میں آسکتی ہے۔ سچ ہے : نگاہِ یار کچھ ایسی پھری حرماں نصیبوں سے۔ کہ اب تو جس کا جی چاہے وہی غم خوار بن جائے۔ لیکن جب کسی معاشرے کے افراد انفعالیت اور خود زخمی کی اس اسفل سطح کو پہونچ جائیں کہ جذباتی رشوت بھی شکریے کے ساتھ قبول ہو تو پھر شکایت کس سے ؟ ایسے موقعوں پر گوپال متل، اللہ ان کے ساتھ عفو و کرم کا معاملہ کرے، بہت یاد آتے ہیں۔

ایودھیا اور اس کے بعد کے سانحات پر نظموں کی بات نکلی ہے تو جی نہیں مانتا کہ عزیز صدیقی کا ذکر کئے بغیر گذر جاؤں۔ اس سانحے کا بڑا موثر اظہار ان کی دو غزلوں میں ہوا ہے جو "سوغات" کے پچھلے شمارے میں شائع ہوئی تھیں ۔

حلق بریدہ کاٹ رہے ہیں شاہ رگیں تلواروں کی ۔ میں جو یہ نقشہ کھینچ رہا ہوں، اگلی رات کا منظر ہے۔

اس شمارے میں تینتیس غزلیں شائع ہو رہی ہیں اور صرف تیرہ شاعروں کی۔ حمید نسیم کی چار تازہ غزلوں کے تیور اتنا تو بتا رہے ہیں کہ ان کا لکھنے والا ان توقعات کو پورا کرے گا جو ان کے درج ذیل اشعار نے قائم کی تھیں :

جاں فروشوں کا وہ انبوہ رہا   پے بہ پے دشنۂ قاتل ٹوٹے
الحذر اے خس و خاشاکِ ہوس   شرر جستہ ہے جو دل ٹوٹے

اب مرا درد نہ تیرا جادو   مرگِ انبوہ میں کیا میں، کیا تو

مند گئیں سارو رات آنکھیں بھی، چاند بھی آج نہیں نکلا ہے   ملکُن کی جوت سے پہلے کیا تھا، آج وہ عالم دیکھا ہے
رنگ ہزاروں گل رُتوں کا، خاک سے مل کر خاک ہوا ہے   دیکھ سکو تو پاؤں کی مٹی گل بکھرے، ماہ لقا ہے

آج اتار دیئے ہیں میں نے دُکھ اور سکھ کے پیراہن   اب میں ازل کی عریانی ہوں، یہ عریانی سدا سُہاگ

نکہت آسودہ کہیں گابوں سے پوچھ   کیسے بے نافہ ہوا دشتِ ختن

وہ پیڑ کیا ہوئے جو بہت سایہ دار تھے   دو دن کی دھوپ شہر کو صحرا بنا گئی

تم کہو تو یہ تماشہ ابھی دم دکھلا دوں   اک پل کی تو بڑی آگ مری خاک میں ہے

ملے مجھے ایک عمر بعد دوست، جشن ہو گیا مہکتی شام، پورا چاند، یہ تو اک بہار تھا

احمد جاوید کی غزلیں پہلی بار "روایت" لاہور میں نظر سے گذری تھیں، کوئی دس برس پہلے۔ دل میں اتر گئیں۔ "سوغات" کی اشاعت کے ساتھ ان کے پتے کی تلاش ہوئی تو معلوم ہوا کہ پاکستان میں ایک سے زیادہ احمد جاوید ہیں۔ بعد از تلاشِ بسیار ملے تو انکساری و خاکساری کا وہ عالم کہ ادیبوں شاعروں میں ڈھونڈیے تو لندن سے دلّی تک کہیں نہ ملے۔ بڑی معذرتوں کے ساتھ چار غزلیں بھیجیں جو پچھلے شمارے میں شائع ہوئیں۔ پھر چھبیس غزلیں، مطبوعہ اور غیر مطبوعہ، جو ان کی لاپرواہی کے ہاتھوں ضائع ہونے سے کسی طرح بچ گئی تھیں حاصل ہوئیں۔ عجیب کیف اور انداز کی غزلیں ہیں، کہیں کہیں تو ایک عالمِ جذب و مستی میں رقص کناں درویشوں کی تصویریں نظر کے سامنے آجاتی ہیں۔ اردو میں جو "تصوّف" اور "عشقِ حقیقی" کی شاعری ملتی ہے اس کا بہترین حصّہ بھی ان غزلوں کے مقابلے میں کہیں نہیں ٹھہرتا اور ان دونوں میں کوئی مناسبت بھی نہیں ملے گی۔ اردو میں اس نوعیت کی شاعری اپنی بہترین صورت میں بھی بہت جلد اُکتا دینے والی یکسانیت اور تکرار کا شکار ہوجاتی ہے۔ اصغر وغیرہ کا تو ذکر کیا آسی غازی پوری کی شاعری کا بھی یہی حال ہے فانی البتّہ اس سلسلے میں کسی حد تک استثنا کی حیثیت رکھتے ہیں (اس پہلو سے قطع نظر عمومی طور پر بھی فانی کی شاعری پر سرور صاحب اور مغنی تبسم کے علاوہ کم نقادوں نے توجہ دی ہے) لیکن آسی جیسے بزرگوں نے دراصل شاعری کو بطور فن اختیار ہی نہیں کیا تھا اور یہ تھی بھی ان کے مرتبے سے بہت نیچے کی چیز۔ احمد جاوید کی غزلیں اس یک رخی اور یکسانیت کا شکار نہیں ہیں۔ ان کے ہاں عشق پوری زندگی بن گیا ہے۔ زندگی کے سارے رویّے اسی سے متعیّن ہوتے ہیں، جینے مرنے کی ہر قدر کا تعیّن اسی سے ہوتا ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ ان غزلوں کا شاعر زندگی کے میلے میں شریک بھی ہے۔ میلے سے وہ واپس بھی لوٹتا ہے لیکن میلے میں شرکت نے اس کے تجربات کو تنوّع بھی دیا ہے اور وسعت بھی، چند اشعار دیکھیے صرف تنوّع کا اندازہ کرنے کے لیے:

سجے ہیں دشت و بیاباں عجب قرینے سے مجھے فقیر، تجھے بادشاہ کرنے کو

جاوید وہاں تک تو مشکل ہے کوئی پہنچے منگوایئے قاصد بھی، جبریلِ امیں کر کے

کیا اس کی لطافت کا احوال بیاں کیجے جو دل پہ ہوا ظاہر، آنکھوں کو نہیں کر کے

بارش کا ہے ایسا کال سوکھے پڑے ہیں دل کے تال

مٹی کو پروا ہی نہیں ہے کس کا چاند ہے، کس کا لال

ان نگاہوں کی گفتگو میں ہے
نیند میں گم ہواؤں کا الجھاؤ

اس بدن کی نزاکتیں مت پوچھ
شیشۂ گل میں چاند کا لہراؤ

ایسی تنہائی کا مداوا کیا
سات دریاؤں میں اکیلی ناؤ

اس گلی، اس دیار کی خوشبو
اے سبک سیر تیز گام ہواؤ

رات کہتی ہے مجھ کو پیار سے دیکھ
مجھ میں ہے چشمِ یار کا گہراؤ

کوئی سورما بدن دریدہ ہیں آفتاب لئے ہوئے
ہے دہانِ زخم سے نعرہ زن، سرِ رزم گاہ مری طرح

یہ غروبِ روزِ مبارزت، کہ شبِ سیاہ شکست ہے
کسی دل کے ساتھ اجڑ گئی ہے یہ خیمہ گاہ مری طرح

کبھی اس گرفتۂ غم پہ بھی نگہِ کرم، کہ کہیں نہیں
کوئی شہ سوار تری طرح نہ غبارِ راہ مری طرح

کوئی آگ ان کو جلا رہی ہے بہارِ تازہ کی اوٹ سے
لبِ جوئبار جھلس گئے ہیں گل و گیاہ مری طرح

یہ دل بھی ہے کشمکش نواز کب سے
نسیمِ رحمۃ للعالمینی

نہ جانے کتنے سجادے جلا کر
ہوئی فرصت مری آتش جبینی

ترے نظارے کو سیکھی ہے میں نے
یہ انفس چشمی و آفاق بینی

تجھے جاوید ہم پہچانتے ہیں
چل اب بس کر یہ شمس العارفینی

کوئی سوار اٹھا ہے پسِ غبارِ فنا
قضا نے ہاتھ کلاہ و نیام پر رکھا

اک پل کو بھی آنکھیں نہ لگیں خانۂ دل میں
ہر لمحہ نگہبانیٔ اسباب میں رہنا

چراغ ہے مری راتوں کا ایک خوابِ وصال
جو کوئی پل تری چشمِ سیاہ میں آیا

ابھی گزر رہی ہے دلِ خود کفیل سے
ٹکڑے روٹی لیتے ہیں پانی سبیل سے

دنیا مرے پڑوس میں آباد ہے، مگر
میری دعا سلام نہیں اس ذلیل سے

کر چکا ہے کوئی افلاک و زمیں کی تکمیل
پھر بھی ہر آن مجھے غزنیٔ ہنر میں رہنا

اک میں ہی رہ گیا ہوں کئے سر کو بارِ دوش
کیا پوچھتے ہو بھائی مرے خاندان کو

جس دن سے اپنے چاکِ گریباں کا شور ہے
تمغے لگا گئے ہیں رفوگر دکان کو

ہمارے تو اک گھر بھی ہے بھائی مجنوں
چلے ہیں اسی کو بیابان کر کے

دیا ہم نے دل اُن پری چہرگاں کو
ز روئے قیاس آدمی جان کر کے

سنو! اب تو ہم جیسے تھک سے گئے ہیں
وہی جینے مرنے کی گردان کر کے

مری کشتِ جاں پر سے گزرا ہے جاوید
سحابِ جنوں زورِ باران کر کے

ان اشعار کا انتخاب بہترین اشعار کے طور پر نہیں کیا گیا ہے۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ کیفیت، تجربات اور اظہار کا کیسا تنوع ان میں پایا جاتا ہے۔ اور یہ انتخاب چھبیس [۲۶] غزلوں سے ہوا ہے اور جس شاعر کی چھبیس [۲۶] غزلوں میں اظہار و بیان کے اتنے پہلو مل جائیں اس کی قدرتِ کلام اور تخلیقی توانائی میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ یہ ایسی شاعری ہے جسے آپ کسی ایک خانے میں بند نہیں کر سکتے ممکن ہے جدید شاعری کے مذاق و مزاج کو یہ غزلیں راس نہ آئیں لیکن بطور تبدیلیٔ ذائقہ کبھی کبھار اچھی شاعری کے بھی کچھ نمونے سامنے آتے رہیں تو "جدید" شاعروں کو [illegible] کرنا چاہیے۔ مبسوط، مدلّل اور سیر حاصل مضامین نقاد لوگ لکھیں گے۔ میں تو بس اپنے پڑھنے والوں کو اس لطف و انبساط میں شریک کرنا چاہتا ہوں جو ان غزلوں سے مجھے حاصل ہوا ہے۔

سوغات (۵) ستمبر ۱۹۹۳ء

حسین الحق

صدر شعبۂ فارسی، مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا (بہار)

نیوکی اینٹ

سلامت اللہ نے آفس جاتے ہوئے دیکھا تھا ٹیجو وفنری کا موری کی بھیڑ بات ذرا کھانے سے نکل گئی

سہ پہر شام کو جب وہ اپنے گھر کے پاس پہنچا تو بھیڑ ویسی کی ویسی ہی نظر آئی، سوچا کہ تو آفس جانے کی جلدی بھی تھی اور ایک خیال یہ بھی آیا تھا ہو کوئی خلش ...... بیچ بچیاں بڑی ہو جاتی ہیں تو ان کے لئے جہیز وغیرہ کا خلش بھی آئی گر جہیز کیا کرتا ہے ...... مگر شام کو بھی بھیڑ ویسی ہی نظر آئی تو اس کو تشویش ہوئی ... کیا کوئی بیمار ہے؟ اب آفس کی جلدی تو تھی نہیں۔ اس نے سائیکل بیٹھک دروازے پر لگائی اور وہ گھر چھوڑ کر تیسرے گھر کی طرف بڑھ گیا۔

"کیا بات ہے بھائی؟ سب خیریت تو ہے؟ یوحن بھائی کہاں ہیں؟" وہ ایک آدمی سے اتنا ہی پوچھ پایا تھا کہ شیو یوحن نظر آ گئے

"آداب شیو یوحن بھائی۔ بڑی بھیڑ ہے؟ کیا بھی دیکھا سب خیریت ہے نا؟"

"ارے آپ نہیں جانتے؟ شیو یوحن جی تو ......"

ایک آدمی بہت بلک بلک کر پھوٹنے کے موڈ میں تھا کہ اچانک شیو یوحن نے اسے ہاتھ سے ہٹاتے ہوئے سلامت اللہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے قدم گھر کی باہر کے منڈیر سے آگے بڑھنے شروع کر دیے ...... سلامت اللہ بھی شیو یوحن کے ساتھ آگے بڑھنے پر مجبور تھا ...... اس آدمی کے رونے شیو یوحن کے اس آدمی کو ہاتھ سے ایک طرف کرنے، سلامت اللہ کے کندھے پر ہاتھ رکھنے اور منڈیر سے آگے کی طرف قدم بڑھانے میں شاید دو سیکنڈ کا وقت گزرا ہوگا، اس بیچ شیو یوحن جب دبے پھر بولے ...... "نہیں کوئی خاص بات نہیں ... تھکے ہم باہر گئے تھے ......"

شیو یوحن کی اس گفتگو کے درمیان ہی ایک اور آواز سنائی دی جو آدمی سلامت اللہ کو شیو یوحن کے بارے میں کچھ بتانے جا رہا تھا ...... اسی سے کوئی اور دوسرا آدمی شاید اطلاع کر رہا تھا ...... سارا خشتی ہے!"

یہ جملہ سلامت اللہ نے بھی سنا اور شیو یوحن نے بھی ...... دونوں کے بیچ یہ جملہ پہنچتے ہی شیو یوحن زور سے بولے ...... "ارے ساتھیے کیا حال چال ہے؟ سب خیر خیریت ہے نا؟"

سلامت اللہ کو اچانک محسوس ہوا کہ وہ تو اکیلا ہے ...... حالانکہ ان کے ساتھ ...... وہ اور شیو یوحن دونوں گیٹ تک آ چکے تھے

"اچھا شیو یوحن جی ...... آداب!" وہ سمجھ نہ پایا کہ اس کے اندر شیو یوحن کے جواب اور کون سا لفظ باقی رہا تھا!

"نمستے!" شیو یوحن نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے ...... سلامت اللہ تیزی سے اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا۔

رات ...... وہ بھی دیر سے گئی ...... چاروں طرف اندھیرا چھا گیا تھا ...... بجلی بند تھی۔ جلدی جلدی ہر گھر میں لیمپ لالٹین جل گئی تھیں۔ اچانک بجلی آ گئی ...... شاید ہوتے ہی دونوں ہی ہر گھر میں ٹی وی، ریڈیو اور مشین میں لگی تھیں، ریڈیو اور ٹی وی کے جانے ہیں، گھر کی بیٹھک میں سب جمع ہوتے رہے ...... بیٹے صاحبوں ...... شیو جی چاچا ...... کا!

وہ اپنے گھر کے روزانہ کے کھانے سے فارغ ہو کر ایک نظر شیو یوحن کے گھر پر ڈالی اور اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔

گھر میں داخل ہوا تھا تو گلی میں بچوں کے کھیلنے کی آواز سنائی دی ...... پہنچا ہی تھی ......

بچے ماں کے کمرے میں لوڈو کھیل رہے تھے۔ بڑا لڑکا اپنے
ٹیبل پر پڑھ رہا تھا۔ بیوی کچن میں تھی۔ دیکھتے ہی عجب انداز میں بولی
"آپ آگئے ؟"
"کیوں کیا بات ہے ؟" اسے کچھ حیرت سی ہوئی۔ وہ روز ہی
آتا ہے اور بیوی کا بنا کچھ کہے بس ہلکے سے مسکرا کر استقبال کرتی
ہے.... پھر یہ ؟
"نہیں اندھیرا بڑھ رہا تھا سایے بھی لمبے ہو رہے تھے"
"کیا اُلٹی پلٹی سی باتیں کر رہی ہو ؟ اندھیرا کیا آج ہی ہوا
ہے۔ ؟"
"اچھا اچھا منہ ہاتھ دھو لیجئے چائے تیار ہے" اسے
لگا وہ بات کا رخ بدل رہی ہے۔
"ارے ابو ! شیوپوجن چاچا کے یہاں اینٹ آئی ہے۔" اس
کی بچی اس کی آواز سنتے ہی دوڑی آئی۔
وہ شاید عادت کے مطابق دن بھر کی اہم خبریں سنانے کے موڈ
میں تھی
"چلو جاکے پڑھو۔ ناشتہ آگیا ہے" بیوی نے جھپٹ کر اس
کا بازو پکڑا اور اپنے کمرے کی طرف دھکیل دیا۔
"پاگل ہوگئی ہو ؟ اس طرح کیوں ڈانٹتی ہو ؟ اور یہ شیوپوجن
کے یہاں اینٹ کیسی ؟"
"چپ رہیے۔" اس نے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور آہستہ
سے بولی۔ "آواز دوسرے گھروں میں بھی جاتی ہے۔ پہلے منہ ہاتھ
دھو کر کچھ کھا پی لیجئے"
سلامت اللہ کچھ نہ بولا۔ وہ تھکن محسوس کر رہا تھا اور بھوک
بھی لگی تھی۔ ٹفن کے وقت کا کھایا کتنی دیر تک پیٹ میں رہتا ؟ آج
تو کوئی ایسا بھی نہیں پھنسا کہ ناشتہ پانی کرا دیتا..... مگر شیوپوجن،
اسے پھر باہر کی بھیڑ یاد آئی.....
پھر بچی کا جملہ...." اینٹ آئی ہے" اور اچانک شیوپوجن کا جملہ
بازگشت کی طرح گونجا" تک باہر چلے گئے تھے۔
"سنو !" اچانک اس کی چھٹی حس جاگ اٹھی اور آہستہ سے
بیوی کو پکارا
"کیا ہے ؟"
"یہ شیوپوجن..... اجودھیا گیا تھا کیا ؟"

"جی باہر اسی کی بھیڑ ہے۔" بیوی آہستہ سے بولی اور تھکے
قدموں پھر کچن میں چلی گئی۔
بلب پھر گل ہوگئی تھی اور پورے گھر میں ایک عجیب سا سناٹا
رینگ رہا تھا۔ آس پاس کے گھروں سے ٹیلیویژن کی گڑگڑاہٹ تو آرہی
اور شاید اس کی کھڑکیوں اور دروازوں سے گھر کے اندر رینگ رہی
تھی کہ اسے لگا سانپ کی کینچلی چمک رہی ہے۔ اندھیرا گہرا اور گہرا ہوگیا
تھا..... گلی میں بچے کھیل رہے تھے..... "جے شری رام کی !"

"سنو" اس نے پھر بیوی کو پکارا
"جی !"
"تمہارے ابا کے وقت میں خط آئے تھے ہی نا ؟ اب تو چھٹی کے دن
کی چھٹی بھی ہونے والی ہے۔ اپنے میکے ہو کر آؤ۔"
"اچھا چلی جاؤں گی۔ پہلے کچھ کھا لیجئے" وہ آہستہ سے
بولی۔ اس کا انداز ٹالنے والا تھا۔
اس نے تھوڑا سا کھایا..... وہ گھر پر پکے کھانے کا دیوانہ تھا
مگر اب بھوک ہی نہیں لگ رہی تھی..... چائے پی کر اس نے سگریٹ
سلگائی اور صوفے پر نیم دراز ہو کر ایک کش لیا اور ایک طرح
بے خیالی کے عالم میں خیال آیا۔ مکان منتقل کرنا ہے۔
مسلم محلوں میں تو کرایہ آسمان چھو رہا ہے۔ مالک مکان سمجھتا ہے
وہ خدا ہے۔ مکان نہیں دے رہا ہے کرایہ داری کا شرف بخش رہا
ہے..... مگر کرایہ دار بھی تو مجبور..... بچوں کے سر پر سایہ
لیکن یہاں تو آمدنی محدود ہے، رشوت کے نام پر چائے
پانی..... یا کبھی قسمت نے یاوری کی تو دس بیس روپئے.....
آمدنی والا قبیل اسے آج تک ملا ہی نہیں ہے۔
ایسے میں وہ سرکاری کوارٹر چھوڑ کر کہاں جاتا ؟ اور کوارٹر بھی کیا ؟
ایل آئی جی فلیٹ..... مگر ایک طرح وہاں آگئی تھی۔ نہیں تو
تو اور کب تک۔
"جے شری رام۔" اچانک ایک زوردار نعرہ گونجا اور وہ
اچھل کر کھڑا ہوگیا۔
"بیٹھئے بیٹھئے۔" بیوی جلدی سے پاس آئی اور آہستہ
سے بولی "گھبرانے کی بات نہیں۔ صبح سے ہی چل رہا ہے۔ دیکھنے
والوں کا پھر کوئی نیا غول آیا ہوگا۔"
اسے لگا دل کی دھڑکن تو بڑھ ہی گئی تھی..... اس نے محسوس
کیا اس سردی میں بھی ماتھے پر پسینہ آگیا تھا۔
کئی رات تک گلی میں بھیڑ کا احساس ہوتا رہا۔ وہ رہ رہ کر نعرے
سنائی دیتے رہے اور تنہائی کا اگیا بیتال سلامت کے کندھوں
پر چڑھا چیخ چیخ کر اس کی کھوپڑی کھاتا رہا۔
"میکے جانے کی بات آپ نے کیوں کی ؟" رات میں جب بچے
سوگئے تو بیوی نے آہستہ سے پوچھا
"کیوں ؟ نفرت سے ہی بچی رہو۔ نفرت تو عقیدت کے خول
پر چڑھائے جا رہے ہیں۔"
"عقیدت کو نفرت بننے کتنی دیر لگتی ہے ؟"
بیوی چپ ہوگئی۔ رات آہستہ آہستہ گہری ہو رہی تھی اور تاریکی بڑھتی
جا رہی تھی۔ وہ بہت دیر تک جاگتا رہا۔ خلاف معمول جاگتا رہا۔
ورنہ وہ تو دن بھر کا تھکا ماندہ بستر پر اس طرح گرتا تھا کہ اسے اس
کا پتہ نہ چلتا کہ بیوی کس وقت اس کے بغل میں آکر لیٹی۔ مگر آج
وہ جاگ رہا تھا۔ آخر وہ کیوں جاگ رہا تھا ؟ شیوپوجن ؟ مٹی ہی
کے پیچھے بھی تو کوئی خاص بات نہیں تھی..... اینٹ ؟ نہیں۔ جب

۱۰ دسمبر گزر گیا تو ..... تو پھر؟ اچانک عجیب سا لگا ..... سلامت اللہ کو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے کانوں میں انگارے ڈال دیئے ..... ہاں ۱۰ دسمبر گیا وہ لفظ ہے جو سات گھنٹوں سے اس کے کانوں میں گونج رہا ہے ..... پچاس برس کی کوار زندگی میں پہلی مرتبہ ..... کل تک وہ صرف سلامت بھائی تھا ۔!

اچانک اسے اپنے کچھ رشتہ دار یاد آ گئے ..... اپنا بھائی برکت اللہ، بہن عزت النساء، ماموں عبدالستار ..... یہ سب لوگ اب کراچی میں تھے۔ ایک مرتبہ ایک شادی میں وہ بھی کراچی گیا تھا۔ ملا وہ گیا اور چلا آیا۔ اس وقت اسے کوئی خاص بات محسوس نہیں ہوئی۔

ہاں ..... اُسے یاد آیا ..... اس کے ماموں نے جب کہا، سلامت تم بھی یہیں آ جاؤ ..... تو وہ جھنجھلا کر بولا تھا کیوں؟ کیا میں وہاں بھوکا مر رہا ہوں؟"

"نہیں، یہ بات نہیں۔ ماموں نے اُسے سمجھانا چاہا۔" وہاں اس قدر فسادات ہوتے ہیں کہ برابر تشویش ہوتی رہتی ہے"

"ماموں اسٹیشن کے بعد آپ لوگ تو کم از کم فسادات کا حوالہ نہ دیا کیجئے۔" شاید اُس کے لہجے میں تلخی کچھ زیادہ ہو آ گئی تھی۔

ماموں تو ایک دم چپ ہو گئے اور باقی لوگوں نے بھی جب تک وہ وہاں رہا پھر اس حوالے سے کوئی بات نہیں کی۔

"کیا ماموں صحیح کہہ رہے تھے؟" اچانک اس کے من میں ایک زہریلا ناگ پھن کاڑھ کر کھڑا ہو گیا۔

ایک منٹ کے لئے وہ کشمکش کا شکار رہا۔ پھر سر جھٹک دیا۔ "نہیں سب جو کچھ میرے ارد گرد ہے وہی میرا ہے۔"

"میرے رام، میرے کرشنا ....." اس کے خیال کی رو اچانک ٹوٹ گئی۔ شیو پوجن کے یہاں بھجن شروع ہو چکا تھا۔

"یہ؟" اس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا

"یہ تو ایک جماعتی ہے مشترکہ کاٹ ہوتی ہے۔" اسے شہر کی دیوار پر لکھا ایک نعرہ یاد آ گیا۔

دور سے ایک گاڑی کی آواز فضاؤں کا سینہ چیرتی اس تک پہنچی ..... ٹھنڈ کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ باہر یخ بستہ ہواؤں کا زور اپنے شباب پر تھا بیوی بچے لحاف میں گردن دبائے سو رہے تھے۔ اس نے لحاف سے ذرا سا سر نکال کر دیوار گیر گھڑی دیکھی ..... دو بج رہے تھے ..... پھر نگاہ خود بخود کیلنڈر کی طرف چلی گئی۔

۱۰ دسمبر! ..... اچانک ایک عجیب اٹ پٹی سی بات اس کے ذہن میں آئی۔ "کیا ۱۰ دسمبر گزر گیا؟" ..... پھر اس سے جڑا ایک اور مبہم سوال ..... "۱۰ دسمبر کیوں آتا ہے؟" ..... پھر ایک اور خوف ..... "کیا ۱۰ دسمبر پھر آئے گا؟" ..... ایسے ہی شبہے میں رات کے درمیان وہ سو گیا۔

صبح سویرے بچوں کی آوازوں سے اس کی نیند ٹوٹی تو

اسکول کالج کی تیاری میں مصروف تھے۔ اس نے کھڑکی کھول کر دیکھا۔ شیو پوجن کے یہاں بڑی چہل پہل تھی۔ شاید بہت سارے لوگ رات یہیں رک گئے تھے۔ ان کے بچے منہ دھونے اور نہانے کا سلسلہ جاری تھا، نوکر پورے گھر میں جھاڑو لگا رہا تھا۔ غالباً نئے مہمانوں کے استقبال کی تیاری تھی۔

"آج بچوں کو نہ جانے دو، اور تم بھی تیار ہو جاؤ میں تم لوگوں کو حیات بھائی کے یہاں چھوڑتا ہوا آفس جاؤں گا" سلامت نے بیوی سے کہا

"کیوں؟"

"تم لوگوں کو اکیلا چھوڑ کر آفس میں جی نہیں لگے گا۔"

بیوی نے ایک منٹ سوچا پھر بولی۔ "کالونی میں عزیز بھائی، انعام صاحب اور فضل احمد بھی تو ہیں۔ ذرا ان لوگوں سے بھی مشورہ کر لیجئے۔"

سلامت اللہ کو یہ بات پسند آئی، وہ گھر سے نکلا اور کسی سے نظر بچائے ان تینوں سے ملنے چلا گیا، وہ تینوں بھی اسی صورت حال سے دوچار ہو رہے تھے مگر چونکہ شیو پوجن کا گھر ان کی لائن میں نہیں تھا اس لئے اتنا زیادہ متاثر نہیں تھے، ویسے فضل احمد کی بات اس کے جی کو لگی کہ "آج دن بھر دیکھ لیا جائے"۔ پھر انعام الحق کہنے لگے "میری چھٹیاں باقی ہیں۔ تم لوگ اطمینان سے جاؤ۔ میں آج چھٹی لے لیتا ہوں"

مگر آفس میں بھی اطمینان کہاں! شیو پوجن بھی اسی آفس میں تھے جس میں سلامت اللہ تھا اور شیو پوجن کے لوٹ آنے کی خبر سب کو مل چکی تھی بلکہ ایسا محسوس ہوا جیسے آفس والوں میں کل کئی لوگ وہاں ہو بھی آئے کیونکہ گفتگو گھوم پھر کر شیو پوجن تک پہنچ رہی تھی ..... اور یاد ہو یہ کہ سلامت اپنے ٹیبل پر تھا مگر دوسری میزوں پر ہونے والی سرگوشیوں کی طرف سے اپنے کان کیسے بند کر لیتا!

"منظر بھائی! بہنے والے بھی بڑے لگی تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ کہیں سے ٹوٹی نہیں ہے۔"

"ارے تو ہے کبھی (پانچ چھ سو برس پرانی ..... تب مٹر لائی بھی تو ملاوٹ نہیں ہوتی تھی۔"

"شیو پوجن کی تو پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں ہے۔"

"کیوں نہ ہو؟ اس کو شکر ہے کہ سنگھرش تو ابھی ہی ہوئی ——— تو کل کو شیو پوجن سو تنترتا سینانی کی پنشن بھی لے گا جو ورلڈ کرتا ہے وہ دکشنا بھی دیتا ہے اور پھر دھرم سنگھرش کا ایک انگ بن کر شیو پوجن راتوں رات دھارمک بھی بن جائیں گے!"

"سلامت اللہ کا گھر تو شیخو پورہ کے گھر کے پاس ہی ہے اس کا کیا حال ہے؟" ایک بہت مدھم سرگوشی ابھری

"وہی ہوگا، جو ان لوگوں کا سارے ذہنوں میں ہے۔"

سلامت اللہ اچانک چونک اٹھا۔ تو اس ہر گروہ کے مخالف میں وہ بانٹ رہا تھا ایک پارٹی ہے!..... اچانک ہی جیسے پورا منظر نامہ بدل گیا اب تک وہ صرف اپنے بچوں، اپنے گھر اور اپنی کالونی کے حوالے سے سوچ رہا تھا مگر اسے اچانک احساس ہوا کہ ہاری ہوئی فوج کا ایک سپاہی وہ بھی ہے..... وہ ایک ایسی جنگ ہار رہا ہے جس میں اس نے حصہ نہیں لیا..... اسے اپنے آپ پر ہنسی بھی آئی اور ترس بھی آیا..... مگر ان کا کیا کروں؟ اسے اپنے ہم پیشہ یاد آگئے..... ان میں ایک تو شیخو پورہ ہی کا ہے جو ایک ایسی جنگ کا فاتح ہے جس میں اس کا مقابلہ کرنے والا کوئی تھا ہی نہیں..... اور پھر باقی بچے یہ میرے دوست جو ایک ایسی جیت پر خوش ہیں جس میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ مگر تب اسے مولانا عبدالجبار کی ایک تقریر یاد آگئی.....

"اسی طرح ہم نے بھی مادرِ وطن کو خوب صورت بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی..... گرینڈ ٹرنک روڈ، تاج محل، لال قلعہ ہم نے بنوایا....."

سلامت اللہ نے اچانک ہی اپنے آپ کو ایک شدید قسم کی نفرت اور درد کے گھیرے میں گھرتا محسوس کیا..... اب تو حالات سے بھی نفرت کرے؟ ہم پیشہ دوستوں سے یا مولانا عبدالجبار سے؟ اسے اس سوال کا کوئی صحیح جواب نہ مل سکا۔ بے خیالی میں اس نے میز کی دراز کھولی اور اس میں پڑا ہفت روزہ نکالا جو اس نے چند دنوں قبل خریدا تھا..... اسی بے خیالی میں وہ اس کے صفحات الٹنے لگا..... الٹتے پلٹتے وہ ایک صفحے پر رک گیا..... پورے صفحے پر ایک رنگین تصویر تھی..... ڈھیر سارے لوگ گنبد پر چڑھ کر اس کو توڑتے ہوئے....."

درد کی ایک تیز لہر اٹھی اور مجبوراً پھوڑے کی طرح اس کے اندر اندر سر سے پیر تک دوڑتی رہی..... اس نے محسوس کیا اس درد میں دکھ کے ساتھ شرمندگی بھی شامل ہے..... اس کو آج [illegible] [illegible]..... شیخو پورہ کے بیانات آ رہے ہیں..... ایک پیش [illegible] خوش [illegible] سورت میں [illegible] عورتوں کا عکس..... [illegible] لاشیں..... اسے گجرات یاد آگئے..... یہ زندہ جلتے [illegible] نہیں ملے گی..... پھر خسرو کا جیسے چیخ سی سنائی دی..... [illegible] ہفت روزہ سے نکل کر وہ تصویر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور پھیلنے لگی..... [illegible]"

"سلامت!" اسے کہیں بہت دور سے کسی کی ایک آواز سنائی دی اور وہ چونک پڑا۔

اس کا چیف عبدل احمد اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے اسے پکار رہا تھا..... اس نے چونک کر اپنے آپ کو دیکھا۔ ہفت روزہ کھلا پڑا تھا اس کی آنکھیں تر تھیں اور آفس کے سبھی لوگ اسے دیکھ رہے تھے..... وہ ہڑبڑا کر باتھ روم کی طرف دوڑا، باتھ روم سے ہاتھ دھو کر نکلا تو اس کی طبیعت بالکل اچاٹ ہو چکی تھی۔ اسی عالم میں وہ باس کے کمرے میں چلا گیا۔

"سر میں گھر جانا چاہتا ہوں"

"گھر؟" باس نے گھڑی دیکھی۔ صرف دو بجے تھے

"جی سر۔ میں بہت تھکاوٹ محسوس کر رہا ہوں"

"اچھا جاؤ!" باس نے نہ جانے کیا سوچ کر اجازت دے دی۔

"سلامت!" جب وہ چیمبر سے نکلنے کے لیے مڑا تو باس نے پکارا

"جی سر؟"

"کبھی کبھی کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے ہونے یا نہ ہونے پر اپنا کوئی اختیار نہیں رہتا، ایسے میں آدمی کو تھوڑا دھیرج سے کام لینا چاہیے.....

Everything is temporary ہوتا ہے"

باس جو کچھ کہنا چاہ رہے تھے۔ شاید سلامت نے وہ سن لیا اور آہستہ روی آفس سے باہر آ گیا۔

مگر وہ تصویر اسے بار بار یاد آتی رہی، اس کے اندر پھر ایک چل چل سی مچی، کاش وہ وہاں ہوتا تو کم از کم اپنی جان تو دے ہی دیتا..... دلی میں بیٹھے کی لوگوں کے لئے بڑی بھدی گالیاں اسے یاد آئیں..... ان لوگوں کو تو گولی مار دینا چاہیے حفاظت کا نعرہ بلند کر رہے تھے..... دھوکے باز کمینے۔ کم از کم وہ وہاں ہوتا.....

پھر اس نے اپنے کو میدانِ جنگ میں بڑے زوروں کی جنگ ہوتے دیکھا، اس کے چاروں طرف دشمنوں کا ایک جمِ غفیر، ڈھالوں تلواروں نیزوں بھالوں سے لیس اور وہ تنہا، بغیر زرہ کے [illegible] ایک ٹوٹی تلوار لیے ہوئے..... اس نے دیکھا کہ وہ ٹوٹی تلوار کے سہارے لڑ رہا ہے، دائیں بائیں اور آگے پیچھے سے اس پر حملے ہو رہے ہیں، وہ سب کا سامنا کرتا ہوا اسی گنبد پر چڑھ جاتا ہے، اور ان سے ایک دھواں دھار جنگ لڑنے لگتا ہے جو گنبد گرانے کی کوشش کر رہے تھے۔

اسی عالم میں گھر آ گیا

گھر میں داخل ہوتے ہی جیسے بیوی نے ہم [illegible] "[illegible] شیخو پورہ میں آپ کو تلاش کرتے ہوئے آئے"

"شیخو پورہ؟ مجھے ڈھونڈ رہے تھے؟"

"جی ہاں!"

"کیوں؟ مجھے کیوں؟"

"پتہ نہیں۔ لیکن کئی مرتبہ آپ جیسے ہیں جب کے مل چکے"

"میں کیا کروں گا جاکر؟ پھر کوئی پاگل مجھے کچھ کہہ دے گا...... اچانک اسے جملہ یاد آ گیا...... سالا سنکی!"

"کیوں کسی نے کچھ کہا کیا؟"

"نہیں...... مطلب نعرہ وارہ......" اب وہ بیوی کو اتنی تفصیل کہاں بتاتا!

"نعرہ...... کوئی ضروری ہے کہ آپ ہی کو سنانے کے لیے ہو...... ویسے بہت دیر سے کوئی نعرہ بھی سنائی نہیں دیا، اور پھر ایک دو دن کا معاملہ نہیں، نہیں بھی تو ہمیں رہنا ہے، جا کے مل لیجئے...... ورنہ کیا رہے گا......"

وہ ایک تذبذب کے عالم میں گھر سے نکلا اور شیو پوجن کے گھر کی طرف بڑھ گیا۔

"ارے!" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل کی پھیلی رہ گئیں، آفس سے واپسی پر وہ اپنے ہی خیالوں میں ایسا گم تھا کہ شیو پوجن کے گھر کی طرف دھیان ہی نہیں گیا...... وہاں تو منظر ہی دوسرا تھا، منڈپ ہٹ چکا تھا، بھیڑ تقریباً ختم ہو چکی تھی، گلی بھی بند ہو چکی تھی۔ اس کے پکارتے ہی شیو پوجن ہڑبڑا کر باہر نکلے...... "ارے سلامت بھائی، آپ! میں آپ کو کئی بار کھوج چکا"

"کیا بات ہے؟"

"آیئے آیئے!" وہ اسے لے کر بیٹھک میں چلے گئے

"بڑھا...... چائے لے آئیے۔" انہوں نے نوکر کو آواز دی

"دیکھئے، ایسا ہے کہ......" تھوڑی دیر ادھر ادھر کی بات کرکے وہ اصل بات پر آ گئے...... "میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں باہر گیا تھا، پھر آفس میں بھی آپ کو معلوم ہو ہی گیا ہوگا یہ تو سنسکار کا معاملہ تھا سلامت بھائی...... آپ کچھ خیال مت کیجئے، آپ دیکھ ہی رہے تھے، کتنی بھیڑ تھی...... سو آج سوچا کہ......" شیو پوجن تھوڑا ٹھہر کر بولے...... "اصل میں رتی اور یہاں دونوں جلا تو ہم لوگوں کی دو دو پارٹیاں ہیں...... تو اب اس کو بیمار دھو بڑا ہو رہا ہے تقاضے سے دو دو لوٹی گھر گھر سے ہیں کہ اوپر کا دور ہے...... پاس کرنا ہی ہوگا، آج کسی وقت چھاپہ پڑ سکتا ہے...... اب اسے کہاں لے جاؤں؟"

اس نے بڑی حیرت سے شیو پوجن کو دیکھا...... سو شتر ہیلی دھرم سنسکرتی کا رنگ ادھارک؟ وہ شیو پوجن کو ایک ٹک تکتا رہ گیا اور وہ بولتے رہے۔ "ویسے تو یہ ہر طرح پر سلامت گروال صاحب سب نے انکار کر دیا...... اور بات بھی ٹھیک ہے جیسے جیسے ہم لوگوں کے گھروں کی بھی تلاشی ہو سکتی ہے...... یہی ایک سے دو سے کے آپ ہی کے یہاں جہاں تلاشی کا چانس نہیں...... کرپا کر کے اس کو آپ اپنے یہاں رکھ لیجئے۔" میں نے سوچا سو ادھر ادھر بھٹکنے کی بجائے

جیسا ہوتی، مشری مار اتی تیار ہے سامنے کرسی پر آتی ٹوپی والے گھوم رہے ہیں۔ اور پھر...... اتنا کہہ کر وہ رکے۔ سلامت اللہ کو دیکھا اور آہستہ سے بولے...... یہ تو آپ کے لیے بھی اتنی ہی مہتو پورن ضرور ہے!

سلامت اللہ کو ہنسی آ گئی...... اس ماں سنسار میں اب کیا ہنسی تلاش کیا جا سکے؟

سو پھر اچانک گھر یاد آ گئے...... یہ زندہ ہونے کی بیمار جہیز مانگتی...... اسے بٹیا جہیز دینے کا وقت آ گیا...... ایک مرتبہ بچپن سے ہے وہ تصویر نکل کر ان کے سامنے آن کھڑی ہوئی...... پورا سر آگ میں جھلس رہا تھا اور شعلے سانپ کی زبان کی طرح لپلپا رہے تھے...... آنکھوں میں ایک بے کسی اور نیلگوں سی تھی وہ پکار رہی ہے...... سلامت اللہ...... سلامت اللہ!

"اچھا یہ تو بتائیے...... یہ کس مٹی کی ہے؟" اچانک سلامت اللہ نے ایک بہت ہی غیر متعلق سوال کر ڈالا

"یہ؟ یہ...... تیوری ہے...... اوپر کو تو زیادہ حصہ ہرا دیکھ ہو چکا۔" شیو پوجن نے چونکا اور بڑی صفائی سے جواب دیا۔

سو جب وہ اسے لے کر اپنے گھر پہنچا تو بیوی بے حال الگ ہو گئی اور پھری بتری کی طرح بیٹھے "ارے جھٹ پڑھی، آپ کی عقل ماری گئی ہے کیا؟ کل سے اسی کے سبب اتنا پریشان تھے اور آج اسی کو اٹھا لائے؟"

"یہ بہرحال ایک چیز ہے!" سلامت اللہ نے سمجھایا۔

"کیا چیز ہے؟" وہ غصے میں اپنا پیچ کھا گئی۔ "کسی کو سوریا کچھ ہو جائے تو وہ بھی تو اس کی اپنی ہی چیز ہوتا ہے۔ تو کیا وہ اسے بیٹ بیٹ کر اپنے پاس رکھے رہتا ہے؟"

"گائے نہیں وہ تو گؤ!" سلامت اللہ ٹھہر ٹھہر کر بولے...... "کہاں لا سور؟ کہاں یہ!...... اس کی حفاظت کرنا اور عزت کرنا ہمارا فرض ہے۔"

"اچھا تو...... ایک بات بتائیے۔" اچانک کوٹھڑی میں پڑے بالا پٹیا بول پڑا۔ "آپ جیسے بتا رہے تھے کہ وہ جوڑی والے وقت سے یہ ہمارے لیے مسئلہ ہی ہوئی ہے، تو پھر ایک ایسی چیز جو ہر دو بیماروں کے لیے مسئلہ ہی بنی رہے کہ اب شیو پوجن چاہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہی اسے اپنے سر پر لیے پھریں، کہاں کی عقل مندی ہے؟"

سلامت نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا...... وہاں اس کا بیٹا ہی تھا سو دھندلی سی تھی، اس لیے شناخت مشکل ہو رہی تھی۔

پھر بیوی کی آواز سنائی دی وہ کوٹ کھونٹی پر ٹانگ رہے تھے...... اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں، یہ شیو پوجن کے گھر دھند بہار کی طرف ہو گئے تو؟ پانی پانی...... یا پھر تنہائی ہی بھلی...... بیوی کا سلوک ان کے سامنے ہی تھا۔

"دیکھو تم ٹوک مجھے کچھ کوشش کرو۔" سلامت اللہ کو محسوس ہوا کہ اب وہ اپنے گھر میں بھی ایک ہاری ہوئی جنگ لڑ رہا ہے۔

"ارے جائیے جائیے۔" بیوی ٹھٹے میں ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی۔ "کسی اندر کو جا کے کچھ بتا دو۔ میرے بیٹے خود کھنے کی کوشش کیجیے۔ ریڈیو پر بیٹھے شور مچا تو ہی آگ سے گھر سے بھاگ کھڑے ہوئے ہم کم از کم وقت بندے کس قدر روشن ہیں؟"

یہ بات سماعت کے جی کو لگ گئی...... وہ تھی جب آگ لگی تو دہلی میں بیٹھے

سور ماں بھی تو صرف دور دور رہ کے "آگ آگ" کا شور مچاتے رہے۔ مگر قسمت کا لکھا کون ٹال سکتا ہے؟ جب وہ باہر آیا تو دیکھا کہ شیو پوجن کے گھر والے کہیں روانہ ہو رہے ہیں۔

"کہاں جا رہے ہو بھائی؟" اس نے شیو پوجن کے لڑکے سے پوچھا جو گھر میں تالا لگا رہا تھا۔

"جی، ہم لوگ ماما کے یہاں کاشی جا رہے ہیں۔"

"اور شیو پوجن جی؟"

"وہ پہلے ہی اسٹیشن جا چکے۔" اتنا کہتے ہوئے لڑکا چھکڑے پر بیٹھ گیا۔

شاید باپ کی ہدایت کے مطابق وہ بھی زیادہ بات نہیں کرنا چاہ رہا تھا...... شیو پوجن کی اس حرکت سے سماعت اللہ کی سمجھ میں آگئی...... ہاں بھوتوں والا آدمی ڈر کے بھاگے نہیں تو کیا کرے؟

مگر اصل مسئلہ یہ نہیں ہے۔ شیو پوجن تو لیا جی سے نکلتا ہے اور کاشی چلا جاتا ہے اور چاہے تو کاشی سے اپنے ماما کے یہاں متھرا چلا جائے لیکن سماعت اللہ کیا کرے جس کو شیو پوجن نے زبردستی نوکری اپنی سونپ دی ہے!؟

[ساغر ۶۴ (۱۱) ۹۳ء]

رشید احمد جالندھری

دارا شکوہ

دارا شکوہ شاہ جہاں کا سب سے بڑا بیٹا تھا، جو اپنے دوسرے بھائیوں کی بہ نسبت شاہ جہاں کو زیادہ عزیز تھا۔ شاید یہی بات دارا کی سیاسی زندگی کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی۔ وہ یوں کہ دارا اسی پیار کی وجہ سے زندگی کے نشیب و فراز اور تمام حقائق سے ایک مدت تک نا آشنا رہا اور سیاسی بصیرت، آہنی ارادے اور قوت فیصلہ سے ایک حد تک محروم۔ جنگی محاذ پر پہلے وہ ۱۶۵۳ء میں شاہ عباس ثانی کے خلاف قندھار کی مہم سر کرنے میں ناکام رہا۔ اس کی وجہ جنگ کی ناقص منصوبہ بندی تھی۔ اس نے اس مہم کو جیتنے کے لیے عملیات اور جادو کا سہارا لیا۔ جس سے اس کی کمزور سپاہیانہ اور قائدانہ اہلیت کا راز کھل گیا۔ تخت نشینی کی جنگ میں بھی اس سے غلطی ہوئی جس کے کفارہ میں اسے بالآخر اپنا سر دینا پڑا۔ پچاس ہزار فوج لے کر اورنگ زیب اور مراد سے مقابلہ کے لیے نکلا اور اپنے دشمنوں کی نقل و حرکت دیکھنے لگا۔ شام ہوتے ہی دونوں طرف کی فوجیں واپس ہو گئیں۔ اگر دارا اسی وقت حملہ کر دیتا، تو جنگ جیت سکتا تھا، کیوں کہ اتحادی فوجیں (اورنگ زیب اور مراد) ایک لمبی مسافت طے کرنے کی وجہ سے تھک چکی تھیں۔ رات بھر آرام کرنے کے بعد یہ فوجیں تازہ دم ہو کر ۱۶۵۸ء میں آگرہ سے آٹھ میل کے فاصلہ پر سامو گڑھ کے میدان میں اتریں اور جنگ جیت لی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دارا اپنے خاندان کی جنگی اور سپاہیانہ روایات کو آگے بڑھانے میں ناکام رہا، لیکن فلسفہ، مذہب اور تصوف میں اس کے قلم نے جو جوہر دکھائے،

اہل ذوق نے انھیں سراہا۔ کیوں کہ ان میں قال کے ساتھ حال بھی شامل تھا۔یہی وجہ ہے کہ انسانی روح نے ان سے تازگی بالیدگی اور معنویت پائی۔

دارا شکوہ اپنی مذہبی اور روحانی روایات کے ساتھ ساتھ اپنے ملک کی دوسری مذہبی جماعتوں فلسفیانہ روایات سے بھی آگاہ تھا۔ وہ دونوں مذاہب (اسلام اور ہندو دھرم) کی روحانی شخصیات سے بھی برابر ملتا رہا۔ مزید یہ کہ وہ عرفان و حقیقت کا ذوق رکھتا تھا اور وحدۃ الوجود کی شراب سے سرشار۔ دارا نے جہاں ممتاز صوفیائے کرام کے سوانح لکھے، وہاں اس نے مجمع البحرین، کے نام سے کتاب لکھی، جس میں اس نے بتایا کہ دونوں قوموں (ہندو اور مسلم) کے حقیقت شناس ایک ہی راہ کے سالک ہیں اور توحید و وحدت کے نغمہ سرا۔ دونوں قوموں کی عارفانہ روایات کی چھان بین کرنے کے بعد دارا نے ان میں ایک ہی حقیقت کو جلوہ گر پایا۔ لیکن دونوں کا باہمی اختلاف لفظی اختلاف ہے۔ شہد کو شہد کہیں یا عسل اس سے شہد کی حقیقت تو نہیں بدلتی۔ ۱۱۸۵ھ میں مصر میں شیخ احمد نے اور ۱۹۲۹ء میں مولوی محفوظ الحق نے کلکتہ سے اس کا عربی اور انگریزی ترجمہ بہ ترتیب شائع کیا۔

دارا نے ۱۶۵۷ء میں ہندو فلسفے کی معروف کتاب اوپنشد کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ اوپنشد کا فلسفہ وید کے فلسفہ کی ایک ارتقائی شکل ہے اور برہمن ازم کی ظاہر پرستی اور رسوم و عادات کے خلاف احتجاج۔ اپنشد فلسفہ ہندوستانی فکر میں ایک نیا انقلاب تھا، جس میں انسانی فکر نے ان فضاؤں میں پرواز کی ہے، جن سے وہ اب تک نا آشنا تھا۔ اس پرواز کا مقصد مذہب کے حقیقی معنی، انسان، کائنات اور خدا کی حقیقت کا سراغ لگانا تھا۔ ان مقاصد کا سراغ لگانے کے لیے قدیم ہند کے اہل نظر سب سے پہلے اپنی تلاش میں نکلے اور اپنے من میں ڈوبنے کے عمل کو حقیقت کبری تک پہنچنے کا زینہ قرار دیا۔

دارا نے پچاس اپنشدوں کو علمائے بنارس کے تعاون سے فارسی زبان میں منتقل کیا۔ دارا نے "سر اکبر" کے مقدمہ میں لکھا کہ توریت، انجیل، زبور اور دوسرے آسمانی صحیفوں

نے دھمال سے توحید کی تعلیم دی ہے۔ موجودہ وقت میں جبکہ اہل ہوس، خدا شناس لوگوں کے در پے آزار ہیں، اس نے (دارا) اپنشدوں کا جو توحید کا سرچشمہ ہیں، بغیر کسی حذف و اضافہ کے فارسی میں ترجمہ کر دیا ہے۔

دارا نے اپنی اس رائے کی تائید میں کہ اپنشد آسمانی صحائف ہیں، قرآن مجید کی ان آیات سے استدلال کیا ہے، جن میں کہا گیا ہے کہ خدا نے دنیا کی ہر قوم میں اپنے پیغمبروں کو بھیجا ہے۔ البتہ اس نے سورۃ "واقعہ" کی آیت کریمہ "انه لقرآن کریم فی کتٰب مکنون" (۵۶: ۷۸) میں "کتاب مکنون" کی جو تفسیر و تشریح کی ہے۔ وہ محل نظر ہے۔ اس کی رائے میں "کتاب مکنون" سے مراد اپنشد ہیں۔ یہ تفسیر روایت اور درایت دونوں کے خلاف ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سر اکبر جسے ڈاکٹر تاراچند اور سید محمد رضا جلالی نے طہران سے شائع کیا ہے اور تفصیل سے دارا کے آثار و احوال پر بحث کی ہے۔)

دوسرے مذاہب کی تعلیمات اور روایات پر لکھنا اہل علم کی قدیم سنت ہے۔ دارا شکوہ سے بہت پہلے البیرونی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "الہند" میں ہندو مذہب کی روایات پر لکھتے ہوئے بتایا کہ ہندو مذہب بنیادی طور پر ذات مطلق پر یقین رکھتا ہے۔ اللہ تعالی کے بارے میں اہل ہند کے عقائد کا ذکر کرتے ہوئے بیرونی لکھتے ہیں:۔ اللہ سبحانہ کے بارے میں (اہل) ہند کا عقیدہ ہے کہ اللہ کی ذات واحد ہے، جو ازلی ہے۔ اس کی کوئی ابتدا نہیں انتہا نہیں۔ وہ اپنے فعل میں مختار ہے، حکیم ہے۔ اس کی بادشاہی میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ اللہ کی ذات پاک و بے مثل کے بارے میں یہی نقطہ نظر ڈاکٹر رادھا کرشنن نے "زندگی کے متعلق ہندوؤں کا نقطہ نظر" میں پیش کیا ہے۔ البیرونی شاید پہلا مسلم محقق ہے، جسے ہندو روایات اُن کے بنیادی ماخذ پر عبور و رسوخ حاصل تھا اور وہ پنڈتوں سے دوستی رکھتا تھا۔

دارا نے البیرونی کی روایت کو آگے بڑھایا۔ دارا کو علمی روایات کے ساتھ ساتھ حکمرانی کی روایات بھی ورثے میں ملی تھیں، وہ جانتا تھا کہ ملک کی اکثریت کا تعاون حاصل کیے

کئے بغیر حکومت مضبوط بنیادوں پر مستحکم نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ دارا کی سیاسی اور علمی سر گرمیوں کا ایک مقصد ہندو، مسلم تعلقات کو خوش گوار بنانا بھی تھا۔ یہاں پر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ دارا کا تعلق برصغیر کے معروف صوفی شیخ محب اللہ الہ آبادی سے بھی تھا جن کا کہنا تھا کہ "انصاف کا تقاضا ہے کہ حکمرانوں کی بنیادی فکر کا محور انسانوں کی فلاح و بہبود ہونی چاہیے۔ تا کہ لوگ سر کاری اہل کاروں کے استبداد سے محفوظ رہیں۔ عدل و انصاف کو اس امر سے کوئی تعلق نہیں کہ لوگ مسلمان ہیں یا غیر مسلم، تمام انسان در حقیقت خدائی کنبہ ہیں۔ اگر ایک آدمی ایسے تصورات (تمام انسان خدائی کنبہ ہیں) رکھتا ہے، تو پھر وہ مسلم اور غیر مسلم کا لحاظ کئے بغیر سب کے ساتھ ہمدردی رکھتا ہے۔ قرآن مجید اور (شیخ ابن عربی کی) فتوحات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) تمام بنی نوع انسان کے لیے رحمت بنا کر مبعوث کیے گئے ہیں۔"

دارا شکوہ کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ:

۱۔ خدا، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور یوم آخرت پر صدق دل سے یقین رکھتا تھا، وہ نہ صرف تلاش حق میں زندگی بھر سر گرم عمل رہا بلکہ حق کے سانچے میں ڈھلنے کے لیے ریاضت بھی کرتا رہا۔

۲۔ ویدانت اور تصوف ایک ہی منزل کے رہرو ہیں۔

۳۔ اس پر الحاد و زندقہ کی تہمت ایک "سیاسی تہمت" ہے۔ جس سے ہر مذہب کے حق پرستوں کو واسطہ پڑا۔ شیخ ابن عربی، ابن سبعین اور اس پایہ کے علمائے ربانی تک اس "تہمت" سے نہیں بچ سکے۔

۴۔ صوفیا کرام کی تحریروں کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی ان کی اشاریت، شاعرانہ اسلوب اور صوفیانہ زبان کو ملحوظ خاطر رکھے۔ چنانچہ دارا شکوہ کے بارے میں مولانا سید ابوالخیر مرحوم کا یہ کہنا کہ خود اس نے اپنے "کفر" کا اقرار کرتے ہوئے کہا ہے کہ

جب سے اس کا دل "کفر حقیقی" کی لذت سے آشنا ہوا ہے "اسلام" رخصت ہو گیا ہے۔ دارا کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔ مولانا مرحوم (سید ابوالخیر مودودی) نے اپنے مقالہ میں دارا کے "کفر" پر علامہ شبلی کا حوالہ بھی دیا ہے۔ شبلی "سر اکبر" کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ اس کتاب کے دیباچہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دارا شکوہ بالکل ہندو بن گیا تھا۔ دارا شکوہ نے اسی کتاب میں بسم اللہ کی بجائے گنیش جی کی تصویر دی ہے۔" (مقالات، ۷/۱۰۲) افسوس علامہ موصوف نے دارا کو "ہندو" قرار دینے میں کسی دلیل یا منطق کا سہارا نہیں لیا۔ "سر اکبر" کے دو قلمی نسخے رائل ایشیاٹک بنگال، اور کلکتہ یونیورسٹی لائبریری میں بھی پائے جاتے ہیں جن میں "سر اکبر" کی ابتدا "بسم اللہ الرحمن الرحیم" سے کی گئی ہے۔ البتہ آصفیہ ... آباد دکن میں موجودہ نسخے میں "اوم سری گنیش ایہ نمہ" ضرور ہے۔ جس کے بارے م... ہے کہ یہ جملہ ایک ہندو کاتب کے قلم سے ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے۔ دارا شکوہ از بکرما (Bikaram.) دہلی ۱۹۸۲، دوسرا ایڈیشن، ناشر منشی رام)

شبلی کے علاوہ سید صباح الدین عبدالرحمان مرحوم نے بھی اپنی کتاب "بزم تیموریہ" میں دارا کو "ہندو" ثابت کرنے کے لیے اسی قسم کی دلیلیں دی ہیں۔ جو تمامتر سطحی ہیں۔

مولانا سید ابوالخیر شاید اس امر سے آگاہ نہیں کہ خود شبلی نے اس امر پر "افسوس" کا اظہار کیا ہے کہ ان کے "کفر" سے ابھی تک بوئے "ایمان" آرہی ہے۔ شبلی فرماتے ہیں۔

دو دل بودن دریں رہ سخت تر عیبے ست سالک را
خجل ہستم ز کفر خود کہ دارد بوئے ایماں ہم

کیا مولانا مرحوم یا کوئی اور اس شعر کی بنا پر شبلی پر الحاد و زندقہ کی تہمت ... کر سکتا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ تصوف کی ڈکشنری میں "کفر" کا معنی انکار حق نہیں "دارا ک... حقیقت ہے، جسے اصحاب ظواہر کفر قرار دیتے تھے۔ اہل حق نے علمائے دنیا کی نفس

پرستیوں کا نہیں وہ دین و مذہب قرار دیتے تھے۔ انکار کیا اور زبان حال سے برابر یہ صدا اٹھتی رہی کہ "اگر یہی ہے عاشقی تو پھر ترک عاشقی اولی" ۔یہی وجہ ہے جب حالی جیسے صاحب ذوق نے شبلی کے اس شعر کو سنا تو ان پر گھنٹوں خود فراموشی (طاری) رہی۔" (کاروان خیال از ابوالکلام آزاد)

یہی بات یہ ہے کہ اورنگ زیب کی غیر معمولی انتظامی اور سپاہیانہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے ضروری نہیں کہ دارا کو "ملحد و زندیق" ثابت کیا جائے۔ اور ان سرکاری مورخوں پر اعتماد کر کے۔ مثلاً منشی محمد کاظم، محمد ساقی خاں وغیرہ) داراشکوہ کے محاسن کا انکار کر دیا جائے۔ مولانا ابوالخیر مرحوم نے داراشکوہ کو "خود سر" "خود رائے اور ستائش پسند" قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ وہ اختلاف رائے کی بناء پر لوگوں کو سر دربار ذلیل و رسوا کرتا تھا، دارا کے صبر و تحمل اور وقار و تمکنت کا ذکر کرتے ہوئے محمد افضل سرخوش جیسے درویش منش دانش مند اپنے تذکرہ الشعراء میں لکھتے ہیں کہ ایک دن شاہزادے کی محفل میں تمکین نامی ایک آدمی نے رکیک اور مہمل جملے کہے، جس پر شاہزادہ خاموش ہو گیا اور اہل محفل جو خوف زدہ تھے، تمکین کا سر قلم ہونے کے منتظر، لیکن دارا نے محفل کو برخاست کر دیا اور محل کے اندر جاتے ہوئے کہا کہ آئندہ اس مسخرے کو دربار میں آنے کی اجازت نہیں ہے۔ اسی طرح نتائج الافکار کے مولف نے بتایا ہے (جس کا ذکر سید صاحب مرحوم نے اپنے مقالہ میں بھی کیا ہے) کہ دارا نے اپنی موت سے قبل جلاد سے نماز کے لیے چند گھڑیوں کی مہلت مانگی اور نماز پڑھنے کے بعد گیارہ قدم سوئے بغداد چلا اور حضرت شیخ عبدالقادر کی روح سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میرا سر قلم کر کے آپ نے مجھے حیات جاوداں عطا کی ہے کیا کوئی دنیا دار بہ ایں وقار و تمکنت موت کا مقابلہ کر سکتا ہے؟

(المعارف، اکتوبر ۹۳ء)

سید ضمیر حسن دہلوی
"دھنیز" A 158 سیکٹر 26، نوئیڈا (یو۔پی)

جدّوجہدِ آزادی اور منٹو کا افسانہ

نیا قانون

منگو کوچوان انگریزوں سے نفرت کرتا ہے۔ اس لئے کہ وہ ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں، طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں اور منگو کوچوان کو ستاتے ہیں۔ شرابی گوروں سے اس کا جھگڑا ہوتا ہے، وہ اسے ایسا سبق دیا کرتے تھے جیسے وہ ایک ذلیل کتا ہو۔ ایک روز منگو کوچوان کو اپنی سواریوں کی زبانی خبر ملی کہ نیا قانون بننے والا ہے جس سے ہندوستان کو آزادی مل جائے گی۔ منگو جسکو سب نہایت عقلمند آدمی سمجھتے ہیں، اس ہونے والی تبدیلی کو سمجھتا نہیں۔ اس کو فریب کھاتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ پہلی اپریل کو جو نیا قانون نافذ ہونے والا ہے وہ زندگی کے انداز کو بدل دے گا۔ وہ خوش تھا کہ نیا قانون اسے انگریزوں کی غلامی سے نجات دلائے گا۔ انگریزوں کا منحوس چہرہ دیکھتے ہی اس کا خون کھولنے لگتا تھا۔ نئے قانون کے ساتھ استاد منگو کے دل میں صرف غلامی سے چھٹکارے ہی کا خیال نہیں آیا بلکہ یہ بھی آتی کہ مارواڑی اور ان کا سود بھی اس کو اثر نہ کرے گا۔ اس کے بعد وہ غریبوں کا خون نہیں چوس سکیں گے۔ یہ بات بھی اس کے ذہن میں آئی کہ اس کے بعد روس کا بادشاہ بھی کچھ نہ کچھ کر کے رہے گا۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ کسی سے سنتا کہ فلاں شہر میں اتنے بم ساز پکڑے گئے یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا ہے تو وہ ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا تھا اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا تھا۔ نئے قانون کی اہمیت اس کے دل میں اور بڑھ گئی جب اس نے دو گریجویٹ طالب علموں کو یہ کہتے سنا کہ جو بیکار گریجویٹ مارے مارے پھرتے ہیں ان میں کچھ کمی ہوگی۔

پہلی اپریل کو ہوا یہ کہ قانون تو نافذ ہو گیا لیکن زندگی نہ بدل سکی، نظام تبدیل نہ ہو سکا اور استاد منگو کو اس حقیقت کا احساس اس وقت ہوا جب چھاؤنی میں ایک گورے کو پیٹنے کے سلسلے میں اسے جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ وہ سمجھتا تھا کہ نئے قانون کے تحت حوالات والے پیٹنے میں اس کے دل کی بھڑاس نکالی جا سکتی ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ پولیس آئی تو وہ نیا قانون چلاتا رہا لیکن انھوں نے ایک نہ سنی اور اسے حوالات میں بند کر دیا۔ منٹو کی اس مختصر سی کہانی میں کئی حقیقتوں کا اظہار ہوا ہے۔ ہندوستانی عوام کی انگریزوں سے نفرت، تبدیلی کی خواہش، آزاد ہونے کا خیال، سیٹھوں کی دست درازی، اشتراکی نظام کی استواری، تعلیم یافتہ لوگوں کی بیکاری سب اپنی اپنی جگہ اس دور کی حقیقتیں ہیں۔ منٹو نے ان کی ترجمانی بڑی خوبی سے کی ہے۔ ہر چند کہ ان حقیقتوں کو پیش کرنے میں کوئی واضح سیاسی نقطۂ نظر نہیں ہے لیکن جو حالات ہیں ان کی عکاسی ہی نے اس کہانی کو حقیقت نگاری کی سرحدوں میں داخل کر دیا ہے۔

جہاں تک ایک واضح نقطۂ نظر کا معاملہ ہے تو یہ اس زمانے کے سیاسی منظرنامے میں کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ گاندھی جی کی جس حکمت عملی نے مختلف سیاسی اور سماجی جماعتوں میں مفاہمت پیدا کی تھی اس سے پیش نظر صرف ایک ہی بات تھی اور وہ تھی انگریزوں کے لئے ہندوستان چھوڑو کا نعرہ۔ اس سے آگے کیا ہو اور اس کے لئے کیا کیا جائے یہ [illegible] الگ تھے۔ جماعتوں کے منشور میں الگ الگ بیان کی گئی تھی۔ آزادی بھی اس دیش کی سب سے بڑی حقیقت کثرت میں وحدت کے جادو سے حاصل کی ہے۔

نیا قانون ــــ تجزیہ

منٹو کے ایسے افسانے جن میں باقاعدہ زمانے کے سیاسی شعور اور ترقی پسند نظریات کا کھل کر اظہار ہوا

ہے۔ "نیا قانون" "نعرہ" اور "شغل" ہیں۔ منٹو کرشن چندر کی طرح کسی سیاسی یا ادبی تحریک سے وابستہ نہیں تھے چنانچہ وہ کہانی کو تبلیغی مقاصد کے لئے استعمال نہیں کرتے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں خود کو فنی تقاضوں تک ہی محدود رکھا ہے۔ خطیبانہ انداز اور اشتراکیت کے حق میں ان کی بلند آہنگی ان کے ابتدائی دور کے بعد آہستہ آہستہ معدوم ہو گئی تھی مگر ان کے پر خلوص اور درد مند دل میں انسان دوستی کی آنچ آخری دم تک قائم و دائم رہی۔ مذکورہ بالا تینوں افسانوں کی ہر سطر سے انسان دوستی آشکار ہوتی ہے۔ اس جذبے میں پاکیزگی تھی، خلوص تھا، نرم نرم حدت تھی۔ اسی جذبے نے ان کے سیاسی مسلک کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔

منٹو مشکل سے اکیس بائیس سال کے تھے جب ان کے دل و دماغ نے بدیسی حکومت کی ستم رسیدہ اور عوام کی ناگفتہ بہ حالت کے خلاف شعلہ سے جوار شروع کر دیا تھا۔ عوام کی بے بسی اور بے چارگی ان کی روح کو آزردہ کرتی تھی اور امیر و غریب کا تضاد ان کے دل پہ ہتھوڑے کی طرح ضربیں لگاتا تھا۔ منٹو کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "آتش پارے" اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اشتراکی نظریات کی طرف مائل تھے۔ ان کے خیالات باغیانہ تھے۔ مشہور انقلابی شہید بھگت سنگھ کے لئے ان کے دل میں خاص عزت اور عقیدت تھی۔ جلیانوالہ باغ کے سانحے سے بھی وہ بہت متاثر ہوئے تھے۔ جن شہدا نے تحریک آزادی میں وطن عزیز کے لئے جانیں قربان کر دی تھیں ان کی یاد میں منٹو کا سر تعظیم و عقیدت سے خم ہو جاتا تھا۔ منٹو کے اس دور کے افسانے "خونی تھوک" "انقلاب پسند" "طاقت کا امتحان" "سوراج" "شاعر" وغیرہ سب منٹو کے سیاسی موقف کے مظاہر ہیں۔

"نیا قانون" منٹو کے نمائندہ افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی عظمت فن اور فکر دونوں کے اعتبار سے مسلم ہے۔ یہ ہماری سیاسی جدوجہد کے دور کا آئینہ دار ہے۔ جس میں ہماری آرزوئیں، امنگیں، تمنائیں اور ناکامیاں جھلکتی ہیں۔ اچھے مختصر افسانے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں واقعات کا تانا بانا زیادہ بکھرا ہوا نہ ہو مرکزی خیال ایک ہو۔ کردار، واقعات اور مکالمات اسی ایک خیال کو اجاگر کرنے اور تاثر میں شدت پیدا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوں۔ یہ بات بھی یہاں پوری طرح حاصل ہو گئی ہے۔ کردار صرف ایک ہے استاد منگو۔ واقعات اور مکالمات، مناظر اور پس منظر کا محور بھی ایک ہے یعنی نئے قانون کے نفاذ کا انتظار، ایک نئے نظام کی تمنا۔ لیکن ان سب باتوں کی تان ایک احساس شکست پر جا کر ٹوٹتی ہے۔

"استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر وہ نیا قانون نیا قانون چلاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ سنی۔ نیا قانون، نیا قانون کیا بک رہے ہو۔ قانون وہی پرانا ہے۔

اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔"

ایک عام ہندوستانی کی طرح منگو کوچوان کا سیاسی شعور بہت خام ہے۔ وہ اپنی سواریوں کی سنی سنائی باتوں سے اپنی محدود ذہنی استعداد کے مطابق غلط سلط معانی اخذ کر لیتا ہے لیکن بنیادی طور پہ اس کے خیالات میں حقیقت کی جھلک موجود ہے۔ اس کے خیال میں کسی پیر فقیر نے بددعا دی تھی کہ ملک میں فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہیں گے اور غیر ملکی لوگ اس پر راج کریں گے۔ ان پڑھ ہونے کے باوجود اسے یہ احساس ہے کہ فسادات سے ملک کمزور ہوتا ہے اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی صلاحیت کھو دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس پر بدیسی حکمران تسلط جما لیتے ہیں۔ منگو کوچوان کو انگریزوں سے دلی نفرت ہے۔ وہ آگ لینے آئے تھے اور گھر کے مالک بن بیٹھے جو اب سارے ملک میں اپنا سکہ چلا رہے ہیں۔ ہندوستانیوں کے لئے انگریزوں سے نفرت کا احساس کوئی نئی بات نہیں ہے۔ غدر سے بہت پہلے اردو کے ایک شاعر مصحفی نے اس کا سبب اپنے ایک شعر میں پیش کیا تھا۔

ہندوستاں کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

معاشی استحصال کے علاوہ غدر میں انگریزوں کے ہاتھوں ڈھائے گئے مظالم، ان کی شاطرانہ حکمت عملی، سفاک دستیاں اور مقامی لوگوں سے نفرت و کدورت کا احساس۔ ان سب کے ساتھ مل کر ان کی حاکمانہ رعونت، عجب و نخوت اور ہندوستانیوں سے ذلت کا برتاؤ ایسے اسباب نہیں تھے جن کی شناخت کرنا عام ہندوستانی کے لئے مشکل ہو۔ منگو کے انگریزوں سے بغض کا ذاتی جواز بھی ہے۔ چھاؤنی کے گورے اس پر بلاجواز رعب گانٹھتے تھے اور اس سے تحقیر آمیز سلوک کرتے تھے جیسے وہ ان کا زر خرید غلام ہو۔ اپنے خام سیاسی شعور کے باوجود منگو کے جذبات و احساسات وطن پرستی سے لبریز ہیں اور یوں وہ ایک طرح سے ہندوستانی قوم کے جذبات کا سمبل یا علامت بن کر ابھرتا ہے جو غلامی کے جوئے کو اتار پھینکنا چاہتی ہے۔ منگو کو جب ایک دن اپنی سواریوں کی باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یکم اپریل کو نیا قانون نافذ ہوگا جس سے ملک کے نظام میں ہمہ گیر تبدیلیاں واقع ہوں گی تو وہ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ یکم اپریل کو انڈیا ایکٹ کے نافذ ہونے پر انگریزی حکومت ہندوستان سے اپنا بوریا بستر گول کر جائے گی۔ نیا قانون نافذ ہونے پر غریبوں کو سود خوروں سے نجات ملے گی اور پڑھے لکھے بیکار نوجوانوں کو ملازمت کے مواقع میسر ہوں گے۔ گویا ہر چیز نئی نئی ہوگی۔ اجلی اجلی ہوگی، مسرت انگیز ہوگی اور یہ سوچ کر وہ بے صبری سے انتظار

بلکہ کمرا پریل پر آنکھیں جمائے دیکھا جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان میں آزادی کے لئے جدوجہد بھی بڑی افراتفری کا شکار رہی۔ مختلف سیاسی گروہ اپنے اپنے منشور پر نظر رکھتے ہوئے انگریزی حکومت کے خلاف متحد ہوگئے تھے۔ کانگریس جو ان سب کی رہنمائی کررہی تھی اس کے سامنے بھی آزادی کا واضح مفہوم اور کوئی منظم فکر و فلسفہ نہیں تھا۔ کرپس مشن، ہوم رول، مکمل آزادی، اکھنڈ بھارت سے ہوتا ہوا ہمارا قافلہ شعور سے تک کیسے پہنچا یہ ایک طویل داستان ہے۔ آزادی کی کہانی میں اس کی تفصیلات کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آزاد ہونے کے بعد شب کے کونے کونے سے یہ آواز بلند ہوئی۔ کوئی آزاد ہوا کس کے ماتھے سے سیاہی چھوٹی۔

پھر بھی تنگ تیرگی میں آ گئے۔ ہم گھر بیٹھے سے دھوکا کھا گئے
اے دوست ابھی آرام نہ کر ہے خام شعور آزادی
چلے تھے جس کے لئے ہم یہ وہ سحر تو نہیں

ہم ہندوستانی اپنی آزادی کی لڑائی پر کتنے ہی نغمیں و دوہا کی کتھائیں کہیں لیکن اس حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ ہماری آزادی کچھ بین الاقوامی حالات کا نتیجہ تھی۔ اس کے لئے مناسب قربانیاں دینے کا موقع ہی نہیں آیا۔ اسی لئے ہمیں اس کی قدر و قیمت اور اہمیت کا احساس نہ جدوجہد آزادی کے دوران ہوا اور نہ آزادی کے حاصل کرنے کے بعد۔ چند حریت پسند انقلابی نوجوانوں کے سہارے چلنے والی یہ تحریک منزل مقصود پر یوں پہنچ گئی جیسے رات خود صبح کے پہر تک پہنچ جاتی ہے۔ آزادی کا باقاعدہ شعور نہ ہمیں آزادی سے پہلے حاصل ہوا تھا اور نہ آج تک ہو سکا ہے چونکہ اس کی تشکیل میں ایک آنچ کی کمی رہ گئی۔ منٹو نے اپنی کہانی میں اس حقیقت کی طرف بڑی خوبصورتی سے اشارہ کیا ہے ملاحظہ فرمایئے۔

• منگو نے ٹھنڈی سانس بھری اور کچھ عرصے کا دم لگا کر اپنی بات شروع کی۔ یہ کانگریسی ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اگر یہ لوگ ہزار سال بھی سر پٹکتے رہیں تو کچھ نہ ہوگا۔ بڑی سے بڑی بات یہ ہوگی کہ انگریز چلا جائے گا اور کوئی اٹلی والا آجائے گا یا وہ روس والا جس کی بابت میں نے سنا ہے کہ بہت تگڑا آدمی ہے۔ لیکن ہندوستان سدا غلام رہے گا۔ ہاں میں یہ کہنا بھول گیا کہ پیر نے یہ بددعا بھی دی تھی کہ ہندوستان پر ہمیشہ باہر کے آدمی راج کرتے رہیں گے۔

نیا قانون میں منٹو نے اپنے مطالب کے اظہار کے لئے جو تشبیہات استعمال کی ہیں وہ خوب ہیں ان سے کہانی کی معنویت میں اضافہ ہوتا ہے اور بات زیادہ پر معنی اور پر گو ہو جاتی ہے۔ تشبیہات میں کوئی ندرت نہیں، چند از تخیل نہیں، شعریت نہیں۔ وہ بالکل سیدھی سادی اور معمولی نوعیت کی ہیں لیکن ان کی موزونیت میں کوئی شبہ نہیں۔ منٹو کے ہاتھوں میں معمولی تشبیہات غیر معمولی اہمیت کی حامل ہو جاتی ہیں۔ مثالیں دیکھئے۔

"جب بھی وہ گورے کے سرخ و سپید چہرے کو دیکھتا تو اسے متلی سی آجاتی، نہ معلوم کیوں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ان کے لال جھریوں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی ہے جس کے جسم پر سے اوپر کی جھلی گل گل کر جھڑ رہی ہو۔ اقتباس ختم..... دوسرا اقتباس "جب گورے نے جو بجلی کے کھمبے کی اوٹ میں ہوا کا رخ بچا کر سگریٹ سلگا رہا تھا، مڑ کر تانگے کے پائیدان کی طرف قدم بڑھایا تو اچانک استاد منگو اور اس کی نگاہیں چار ہوئیں اور ایسا معلوم ہوا کہ بیک وقت آمنے سامنے کی بندوقوں سے گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشی بگولا بن کر اوپر کو اڑ گئیں۔"

منگو کا یہ غصہ ہندوستانیوں کے بدیسی حکومت کے خلاف جذبات کی بھرپور عکاسی کرتا ہے اور منگو اس طرح پوری قوم کی نمائندگی کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اپنے خام اور ناپختہ انداز میں، اپنی محدود ذہنی صلاحیتوں کے مطابق لیکن اس جذبے کی عظمت اور پاکیزگی سے بھلا کون منکر ہونے کی جرأت کرسکتا ہے۔ دراصل یہ جذبہ ہماری آزادی کی لڑائی میں بنیادی اہمیت رکھتا تھا۔ اس کی ارتقائی منازل سے نہ خواص نے کچھ سروکار رکھا اور نہ عوام ہی ہو کر گزر سکے جس کا نتیجہ وہ ہوا جو منٹو نے "موتری" کی دیوار پر بیچوں بیچ کوئلے کی سیاہی سے لکھا ہوا دیکھا تھا اور جس کی وجہ سے اسے بغیر رفع حاجت کئے الٹے قدموں باہر آنا پڑا تھا۔

• دونوں کی ماں کا ہندوستان، تارا را

منگو نے ہندوستان کی آزادی کو معاشی سہولتوں سے بھی جوڑا تھا۔ وہ اشتراکیت کے بارے میں اتنا ضرور جانتا تھا کہ ملک روس میں اس نے کچھ چمتکار ضرور دکھایا ہے۔ معاشی استحصال اور دولت مندوں کی دراز دستیوں پر بھی اس کی نظر تھی۔ اشتراکیوں کی طرح وہ ایک غیرت مند و شکار کھیلنے کو منحنی لکانہ چاہتا تھا کہ آزادی کے ساتھ ایک سنہرا دن بھی آئے۔ چنانچہ مارواڑیوں کو ٹھکانے لگانا چاہا کہ اس نے بارہا بھی ان میں وہ منحوسوں کی کان پہ آدھ سیر دودھ کی لسی پی تھی اور ایک بڑی سی چاقو سے شیشم کی ساتویں لکڑی میں دھار ڈال دی ہے۔ اس کا سارا چہرہ جھلس رہا تھا اور اس نے ان گوروں کو ہنسی کی آگ میں جلا کر بھسم کر ڈالا تھا۔

اس صورت میں منگو ایک شکست خوردہ قوت کا مظہر بن جاتا ہے جو نیا قانون کے نافذ ہونے کا بے تابی سے منتظر ہے اور جو اپنی تحقیر و تذلیل کا بدلہ چھوٹی گوروں سے لینے کے لئے بے تاب بھی ہے۔ اس کے اندر لاوا ابل رہا ہے اور وہ موقع کی تلاش میں ہے کہ اپنے دل کی بھڑاس نکالے اور اسے اطمینان قلب حاصل ہو۔

منٹو نے مناسب و موزوں جذبات سے نیا قانون

کو ربط اور نظم عطا کیا ہے اور ساری کہانی ایک ٹھوس اکائی لگنے لگتی ہے جس میں کوئی جوڑ بے جوڑ نہیں ہے کڑی سے کڑی ملتی جاتی ہے۔ تمام تفصیلات مرکزی تھیم سے جڑی ہوئی ہیں۔ موزوں تشبیہات اور کردار نگاری نے استاد منگو کے کردار کو اس خوبی سے نمایاں کیا ہے کہ پڑھنے والا اُسے آسانی سے بھلا نہیں سکتا۔ یہی چیز کہانی کے بقا کی ضامن ہے۔ منگو کوچوان بیاکی لیڈروں کی طرح بہت عقل مند آدمی سمجھا جاتا تھا گو اس ڈکارے کر مونچھوں کو جوستے ہوتے بلند آواز میں کہا تھا "بہت تیری ایسی کی تیسی" کئی بار اپنی گھنی مونچھوں کے اندر ہنس کر اس نے مارواڑیوں کو گالی دی۔ عزیزوں کی کھٹیا میں لگے ہوئے کھٹمل۔ نیا قانون ان کے لئے کھولتا ہوا پانی ہوگا۔

منگو کوچوان کے دل میں انگریزوں کے خلاف جو غم و غصہ بھرا ہوا تھا اس کا اظہار کہانی میں جگہ جگہ اور بھرپور طریقے سے ہوا ہے۔ یہ غم و غصہ ہندوستانی عوام کی پوری پوری نمائندگی کرتا ہے جو انگریزوں کے خلاف بھرے بیٹھے تھے۔ وہ انھیں ملک سے نکالنے کے لئے بیقرار تھے۔ منگو کی یہ تصویر اسی جذبے کی عکاسی کرتی ہے۔

(اقتباس)

• گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے تانگہ ٹھہرا دیا اور پچھلی نشست پر بیٹھے گورے سے پوچھا۔

صاحب بہادر کہاں جانا مانگتا ہے؟"

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا صاحب کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھنچ گیا اور پاس ہی گال کے اس طرف جو مدھم سی لکیر ناک کے نتھنے سے تھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی گویا کسی نے نوکیلے کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی۔ اڈے کے تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش تھی کہ دنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے، استاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔ تانگوں کا یہ اڈا شہر میں دیہاتی چوپال کا درجہ رکھتا ہے جہاں بیٹھ کر ہم لوگ اپنی ناقص معلومات کے ذریعہ ہی دنیا بھر کے مسائل سلجھا لیتے ہیں یا یوں کہیے کہ سلجھانے کے وہم میں مبتلا ہو کر ریشم کے لچھے کی طرح اور زیادہ الجھتے جاتے ہیں۔

شہر کی اس چوپال میں کبھی ہر طبقے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس میں کوچوان بھی ہیں جو اپنی سواریوں کی سنی سنائی باتوں کو دہراتے ہیں۔ منگو جیسے استاد بھی ہیں جو سب کی سنتے ہیں اور پھر اپنے خیال کے گھوڑے دوڑا کر اس کا من چاہا نتیجہ نکال لیتے ہیں۔ طالب علم بھی ہیں جو کسی اسمبلی ممبر کی سفارش پر اپنے لئے آسانی ڈھونڈنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ مارواڑی بھی ہیں جو نئے قانون کے پس منظر میں اپنے مفادات کا جائزہ لیتے ہیں اور بیرسٹر بھی ہیں جنھیں نئے قانون کو وہ حصہ جو لیڈر کی سے متعلق ہے یہ بتا معلوم ہوتا ہے۔ غرض اس ماحول میں پوری سیاسی فضا کا نچوڑ سمٹ آتا ہے۔ منٹو نے اسی کی عکاسی کی ہے آگے قدم نہیں بڑھایا کیونکہ منٹو کہانی لکھتا ہے سیاست داں نہیں ہے کہانی کار کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ سیاسی پالیسی بھی وضع کرے۔ یہ غلطی کرشن چندر سے سرزد ہوئی جنھوں نے اچھی خاصی کہانیوں کو سُرخ انقلاب کا پیش خیمہ بنا دیا۔ البتہ منٹو کے کردار باصلاحیت ہیں وہ اپنے اپنے مقام اور حیثیت کے مطابق دانشمندانہ گفتگو کرتے ہیں۔ انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ اکبر بادشاہ کے زمانے میں فرقہ وارانہ فسادات نہیں ہوتے تھے۔ فرقہ واریت برطانوی حکومت کے اہتمام سے کچھ ہی دن پہلے انگریزوں کی سازش کے نتیجہ میں پیدا ہوئی۔ یہ الگ بات ہے کہ اکبر کے بعد بادشاہ نو کے عہد تک کا زمانہ منگو کوچوان ایک ہی جست میں طے کر گئے۔ بہر حال یہ افسانے کی بات ہے اور افسانے تاریخی جائزے نہ ہو کر بھی تاریخی حقائق کے سب سے بڑے عکاس ہوتے ہیں۔ منٹو کا نیا قانون ایک اچھا افسانہ بھی ہے اور تاریخی بازیافت کا ایک موثر ذریعہ بھی۔ یہی اس کے بقا کی ضمانت ہے۔ ●

سید حامد

مسلمانوں کی تعلیمی زبوں حالی

یہ خطبہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ کے سالانہ اجلاس کے موقع پر
۲۴ر اکتوبر ۱۹۹۳ء کو غالب اکیڈمی دہلی میں پیش کیا گیا

اگر سیمیناروں، کانفرنسوں اور ورکشاپوں سے پسماندگی دور ہو جایا کرتی تو ہم ہندوستانی مسلمان سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہوتے۔ لیکن چشم فلک آج یہ عجیب منظر دیکھ رہی ہے کہ باوجود ان اجتماعات کے اژدہام کے مسلمان پسپائی سے چھٹکارا نہیں پا سکے۔ اس کی وجوہات کئی ہیں۔ یہاں اس تفصیل میں جانے کا وقت نہیں ہے۔ میں شروعات میں ان اسباب پر انگلی رکھوں گا جن کی طرف عام طور پر دھیان نہیں گیا ہے۔ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں کہ آپ کو سرسید کی طرف لے جاؤں۔ ہمارے فیصلے اور منصوبے مٹی میں اس لیے مل جاتے ہیں کہ ان میں ہمارا خونِ جگر شامل نہیں ہوتا۔ ہم قوم کی خدمت کا ارادہ اور اعلان یا تو اس وجہ سے کرتے ہیں کہ ہمیں نیک نامی حاصل ہو، یا اس لیے کہ ہماری بدنامی ڈھک جائے، یا اس واسطے کہ ہمیں لوگ اس قسم کی محفلوں میں کھینچ لاتے ہیں یا اس لیے کہ خدمت خلق کی شہرت ہماری اپنی ترقی کے لیے زینہ بن جائے، حکومت اور سیاسی پارٹیاں ہماری طرف ملتفت ہو جائیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کا سب سے بڑا نبض شناس اور معالج لکھتا ہے:

"سب سے بڑا عیب ہم میں خود غرضی کا ہے اور یہی مقدم سبب قومی ذلت اور نامہذب ہونے کا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو ضرور ہے کہ رفاہِ عام کا جوش دل میں پیدا کریں اور یقین جانیں کہ خود غرضی سے تمام قوم کی اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی بھی بربادی ہوگی۔

جناب سید حامد سابق وائس چانسلر علی گڈھ مسلم یونیورسٹی، تعلیم آباد، تغلق آباد، نئی دہلی

اس مقام پر ہم کو ایک کہانی یاد آئی۔ انسان کے اعضا میں تکرار ہوئی اور ہر ایک عضو نے خودغرضی اختیار کی۔ تھوڑی دیر بعد معدہ بھوک کے مارے بے چین ہوا۔ پاؤں نے کہا کہ میں کیوں چل کر غذا بہم پہنچاؤں۔ ناک نے کہا کہ غذا کا سڑا بسا بساندا ہونا میں کیوں سونگھوں۔ منہ نے کہا کہ میں کیوں چبا کر حلق میں نگلوں۔ سب اپنے آپ چپکے ہو رہے۔ دو ایک دن تو جوں توں گزر گئے۔ پھر تو پاؤں لڑکھڑانے لگے، ہاتھ کانپنے لگے، منہ ہلانے کی طاقت نہ رہی۔ آنکھوں میں اندھیرا آنے لگا۔ تب تو گھبرائے کہ یہ کیا ہوا۔ اس تت عقل کے پاس گئے۔ اس نے کہا کہ خودغرضی نے تمھارا یہ حال کیا ہے۔ تم نے جانا کہ دوسرے کے کام سے ہم کو کب مطلب ہے، حالانکہ حقیقت میں وہ تمھارا ہی کام تھا اور اس کا نقصان تمھارا ہی تھا۔ بس جس قوم کے لوگوں میں خودغرضی ہوتی ہے، جیسا کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں ہے تو وہ آپ اپنے تئیں برباد کرتی ہے۔"

اس دور میں خودغرضی کے اوزار سے خود کو برباد کرنے کا کام ہم نے بہت تیز کر دیا ہے۔ سرسید کے وقت میں بہت سے اہل اخلاص تھے۔ کچھ تھے، کچھ نے سید والا گہر کی آگ سے شعلہ کرلیا۔ اب تو کوئی شخص جو ملت کو اپنے ذاتی مفاد پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو مشکل سے ہی نظر آتا ہے۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر　　کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

منصوبے نہ بھی بنایئے تو بھی کام ہوتے چلے جائیں گے۔ شرط یہ ہے کہ دل کو لگی ہوئی ہو جو بات نکلے دل سے نکلے۔ وہ بات کیا جس کی شناسا صرف زبان ہو، جو دل اور جگر دونوں سے ٹکرا کے نکل جائے۔

اقبال کی نظم 'شمع و شاعر' یاد آتی ہے۔

میں تو جلتی ہوں کہ ہے مضمر مری فطرت میں سوز

تو فروزاں ہے کہ پروانوں کو ہو سودا ترا

قیس پیدا ہوں تری محفل میں یہ ممکن نہیں

تنگ ہے صحرا ترا محمل ہے بے لیلا ترا

اور ہے تیرا شعار آئینِ ملت اور ہے

زشت روئی سے تری آئینہ ہے رسوا ترا

کعبہ پہلو میں ہے اور سودائی بت خانہ ہے

کس قدر شوریدہ سر ہے شوق بے پروا ترا

یوں تو روشن ہے مگر سوزِ دروں رکھتا نہیں

شعلہ ہے مثلِ چراغِ لالۂ صحرا ترا

جب تک ہم خود غرضی، شہرت طلبی اور ریاکاری سے اوپر نہیں اٹھیں گے، ہماری آواز میں کوئی اثر پیدا نہیں ہوگا۔ ہم اپنے درخشاں ماضی کے راگ لاکھ الاپتے رہیں، ہم اپنے حال کو سنوار نہیں پائیں گے، نہ ایک روشن مستقبل کی بنا ڈال سکیں گے۔

تجھے آباء سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی

کہ تو گفتار وہ کردار، تو ثابت وہ سیارا

دوسری بڑی کمزوری جس نے ہمیں پیچھے کی طرف ڈھکیل دیا ہے، اداروں کو چلانے کے لیے ہماری ناصلاحیتی ہے۔ ہمارے بیشتر ادارے خانہ جنگی کے اکھاڑے ہیں۔ یہی نہیں، ان میں داخلے اور تقرر شاذ ہی صلاحیت کی بنا پر ہوتے ہوں۔ سفارش، مروّت، اثر، دباؤ طلبہ اور اساتذہ دونوں کے معیار پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور اب تو ہمارے بڑے بڑے اداروں میں بھی رشوت راہ پاگئی ہے۔ ہمارے لیے نااہلوں کی ماموری اور داخلے، ادارے کے معیار، اس کی فضیلت اور شہرت سے زیادہ اہم ہیں۔

اب جو کچھ میں کہنے جارہا ہوں اسے چاہے تیسری بات کہیے چاہے دوسری بات کا شاخسانہ سمجھیے۔ ہمارے اداروں میں جب کبھی مقدار اور معیار میں جنگ ہوئی ہے، معیار نے مات کھائی ہے۔ ہم نے کسبِ فضیلت کے تصور کو اپنے لائحۂ عمل اور قلمروِ خیال سے نکال باہر کیا ہے۔ اداروں کے سربراہ بالعموم محاصرہ میں رہتے ہیں۔ ان میں سے اکثر عافیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ دباؤ اور سفارش قبول کرتے رہیں اور قبولِ عام کی مسند پر بیٹھے رہیں۔ سخت اور دشوار فیصلوں سے وہ کتراتے رہیں کہ ان میں سکون اور جان کا جوکھوں ہے۔ کسی کو کیا ضرورت کہ ادارے کے مفاد میں ایسے محکم، عادلانہ اور دور اندیشانہ فیصلے کرے۔ جو اہلِ غرض اور اہلِ قیادت کو اس کے درپے آزار کردیں، دن کا چین اور راتوں کی نیند اس پر حرام ہوجائے۔ بااثر اور بے اصول افراد سے ٹکرانے کی کیا ضرورت ہے۔ ان کی باتیں مانتے چلے جاؤ، پھر ہر طرف تمھاری تعریف ہوگی اور زندگی آرام سے بسر ہوجائے گی۔ ایسے معاشرے میں جو قدروں سے ناآشنا ہے، غلط فیصلوں کی تعریف ہوتی ہے اور صحیح فیصلوں پر کہرام برپا ہوجاتا ہے۔ ادارے ہمارے ایسے ہی ہوں گے جیسے ہمارا سماج خود ہے۔ ہم یہ کہہ کر مطمئن بھی ہوجاتے ہیں، یہ نہیں سوچتے کہ سماج اوپر

اُٹھتا ہی اچھے اداروں کے ذریعے ہے۔ جن اداروں کا کردار پسماندگی کو دور کرنے کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا ہے انھیں ہم نظر انداز کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان پر ہم نا اہلوں' بد اندیشوں' ہوس پیشوں اور اسلحہ برداروں کو قابض ہونے دیتے ہیں۔ ہمارا نقطۂ نظر اس قدر مسخ ہوگیا ہے' ہمارے طرزِ فکر میں اتنی رذالت آگئی ہے کہ ہماری انفرادی اور اجتماعی تائید بسا اوقات شر کے حصّے میں آتی ہے۔ خیر کی بندشوں سے ہم اکثر بیزار نظر آتے ہیں۔ صارفیت کی باڑھ ہر طرف آئی ہوئی ہے۔ ہم اس میں اس طرح ڈوب گئے ہیں کہ جانبر ہونا دُشوار نظر آتا ہے۔ ہم اس طرح جی رہے ہیں جیسے یہ فانی زندگی ہی سب کچھ ہو اس کے ساتھ ہمارا وجود ختم ہو جائے گا۔ ہم سے نہ مواخذہ ہوگا نہ بازپُرس۔ ہم سے حساب لیا ہی نہیں جائے گا۔ منوں مٹّی کے نیچے جب ہماری ہڈّیاں گل جائیں گی تو ہمیں قیامت کے روز کون اُٹھائے گا۔ اور قیامت ہوگی بھی کیوں۔ زر کی ننگی ہوس میں مسلمان غیر مسلموں سے بازی لے گئے ہیں۔ روزِ حشر کے مواخذہ کا تصوّر ان کے لیے بہت بعید اور نہایت مبہم ہوگیا ہے۔

وہ رائے عامہ جو افراد کو سیدھے راستے پر رکھتی ہے؛ ظلم کے خلاف مؤثر احتجاج کرتی ہے' وہ ہماری دسترس سے باہر ہوگئی ہے۔ اسی لیے ہمارے خوش حال اور صاحبِ اقتدار افراد بے جگری کے ساتھ اپنی من مانی کرتے ہیں۔ انھیں احتساب کا کوئی ڈر ہی نہیں؛ اسی لیے کارہائے خیر اور کارہائے فلاح میں مسلمانوں کو وہ امداد نہیں ملتی' وہ اعتراف ہاتھ نہیں آتا جو دل اور مقصد کو بڑھانے کے لیے ضروری ہے' اسی لیے لوگ قواعد ضوابط کو اپنی اغراض کے مطابق توڑتے مروڑتے رہتے ہیں اور معاشرہ چیں بہ جبیں بھی نہیں ہوتا۔ ہم دولت کی پرستش کرتے ہیں' یا کامیابی کی؛ ان کے حصول کے لیے ہر اصول کو توڑ ڈالنے میں ہمیں کوئی باک نہیں۔ چالاکیوں سے ہم قدروں کو تاراج کرتے ہیں اور اس عمل کو اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھتے ہیں۔ ہم اس گت کو کئی دہائیوں کے انحطاط کے بعد پہنچے ہیں لیکن گزشتہ دس سال میں کاروانِ زوال اور رفتارِ ادبار بہت تیز رو ہوگیا ہے۔ اتنا تیز رو کہ ہم رُک کر دم لینے نہیں پاتے۔ ویسے تو یہ رفتارِ زمانہ ہے۔ ہندوستان کی سیاست ان ایّام میں جیسی بے ضمیر اور بے مہار اور جرائم آلود ہوگئی ہے' مسلمان اس کے اثرات سے محفوظ کیونکر رہتے۔ چونکہ اخلاقاً وہ عضوِ ضعیف بن گئے تھے لہٰذا نزلہ ان پر سب سے زیادہ گرا۔ ہمارے اہلِ سیاست اہلِ صحافت اور اربابِ خطابت نے ان کو غور و فکر سے بیگانہ اور سستی جذباتیت کا دیوانہ بنا دیا۔ اب آپ ہی سوچیے کہ جس جماعت میں اتحاد نہ ہو' سنجیدگی نہ ہو' جفاکشی نہ ہو' جو راست روی سے دامن

بچائے اور نئے نئے حربے کم کوشی کے آزمائے وہ ترقی کیسے کرے گی، زندہ اور باآبرو کیسے رہے گی، جابر کیوں کر ہوگی۔

اس تاریک تصویر میں جو موٹے قلم نے کھینچی ہے روشنی کی لکیریں بھی ہیں۔ جنوبی ہندوستان اور ایک حد تک جنوبی مغربی ہندوستان کا نقشہ اس سے مختلف ہے۔ وہاں مسلمان سنجیدہ ہیں، محنت بھی کرتے ہیں اور قدروں سے اس قدر بے گانہ بھی نہیں ہیں اور خود شمالی ہندوستان میں اوپر کی تہ یا کرسٹ کو جو پڑھے لکھوں اور دانشوروں پر مشتمل ہے، اگر کھرچ کر نکال دیجیے تو جاہل یا نیم خواندہ عوام کے جمِ غفیر کو آپ بہت بہتر پایئے گا۔ امکانات کے حامل یہی سادہ لوگ ہیں۔ ہم امیدیں انھیں سے باندھ سکتے ہیں۔ مسجدوں، مدرسوں، کوٹھریوں اور کوچہ و بازار کو آباد رکھنے والے یہ لوگ تہذیب کی شناعت سے بچے ہوئے ہیں، انھوں نے مکر و فریب نہیں سیکھا، نہ انھیں ملی مفاد کو اپنی اغراض پر قربان کرنے کا ہنر آتا ہے۔ دانشوروں اور بے دانشوں کے درمیان اس فرق پر آپ حیران کیوں ہوتے ہیں۔ یہ تو قدرت کا قانون ہے کہ جہاں موقع ملا دولتمند غریبوں کا، پڑھے لکھے جاہلوں کا، طاقت ور کمزوروں کا استحصال کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں چونکہ ان پڑھ بہت زیادہ ہیں اور پڑھے لکھے بہت کم۔ اس لیے پڑھے لکھے ان پڑھوں کی جہالت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں، اپنے مقاصد کے لیے انھیں بہکاتے اور بھڑکاتے ہیں۔ ان کے ترجمان بن کر نام اور زر کماتے ہیں۔ یاد رکھیے مسلمانوں کی امیدوں کا محور کونسلوں کے لیڈر نہیں مسجدوں کے مجتہد ہی بن سکتے ہیں۔

مسلمانوں کی عام حالت کا نقشہ اس قدر تفصیل کے ساتھ میں نے اس لیے کھینچا کہ ان کی تعلیمی زبوں حالی کا تعلق اس سے براہ راست ہے اور اس لیے بھی کہ اگر ان میں تعلیم عام ہو جائے تو وہ پسماندگی کے دلدل سے نکل آئیں اور نہ اپنے انھیں بھڑکا سکیں نہ بیگانے بیوقوف بنا سکیں۔ ہماری سرکار نے شاید اس خیال سے کہ اگر مسلمانوں کو اپنی تعلیمی بے چارگی کی خبر مل گئی تو ان کا دل بیٹھ جائے گا۔ گزشتہ پانچ مردم شماریوں میں اکٹھا کیے ہوئے فرقہ وار تعلیمی اعداد و شمار کو طاقِ نسیاں میں رکھ دیا جس پر خفا کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ وہ ان اعداد و شمار کو شائع کرنے پر کسی طرح راضی نہیں ہو رہی ہے۔ حکومت کی طرف سے مایوس ہو کر ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نے بے ترتیب یا رَین ڈم ڈھنگ سے ایک ملک گیر تعلیمی سروے کرایا ہے، جس کے نتائج منظرِ عام پر آنے لگے ہیں۔ سروے کے انکشافات نے ہمارے بدترین اندیشوں کو صحیح ثابت کر دکھایا ہے۔ مسلمان ہر جگہ اپنے اہلِ وطن سے تعلیم میں بہت پیچھے ہیں۔ ایک مثال

سے، جو نمایندہ نہیں بلکہ انتہائی ہے، یہ بات ذہن نشین ہو جائے گی۔ ہریانہ کے ضلع گوڑ گاؤں کی فیروز پور جھرکہ تحصیل میں مسلمانوں میں تعلیم نسواں کا تناسب ۰۴ء فی صد ہے۔

آپ کے پاس وقت نہیں اس لیے میں صرف اشارے کرتا چلا جاؤں گا۔ مسلمانوں کی تعلیمی پیش رفت کے لیے مندرجہ ذیل قدم اٹھانے چاہئیں بغیر تاخیر کے:

(۱) ہر ریاست میں ان گنتی کے لوگوں پر مشتمل ایک بورڈ بنایا جائے جو ریاست بھر میں مسلمانوں کی نگاہوں میں معتبر ہوں۔ مسلم اسکولوں اور کالجوں کی یک گونہ نگرانی کے لیے یا تو حکومت اس بورڈ کو تسلیم کرے یا پھر مسلم اکابرین ریاست اپنے اخلاقی اثرات کو کام میں لاکر ان اداروں کے منتظمین کو مجبور کریں کہ اداروں کو سنواریں، سدھاریں، ان کے معیار کو اونچا کریں۔

(۲) خواندگی کی ملک گیر تحریک میں مسلمان آگے بڑھ کر حصہ لیں۔

(۳) لڑکیوں کی تعلیم پر لڑکوں کی تعلیم سے بھی زیادہ، کہیں زیادہ زور دیا جائے۔ ان کے لیے اسکول اور ہوسٹل کھولے جائیں۔

(۴) اپنے اسکولوں کو بہتر بنانے اور نئے اسکول کھولنے کے علاوہ دوسرے سرکاری اور غیر سرکاری اسکولوں کا پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ مقامی روابط کے ذریعے شہر کے اچھے اسکولوں میں داخلے حاصل کرنے چاہئیں۔ کیوں کہ ہم اتنے اسکول نہیں کھول سکتے اور نہ کھولنے چاہئیں، جو ہمارے بچوں کے لیے کافی ہوں۔

(۵) ہمارے گھروں میں بالعموم بچوں کو نہ تعلیمی ماحول ملتا ہے نہ تعلیمی امداد۔ اس کی وجہ سے وہ کلاس میں پیچھے رہ جاتے ہیں اور ان کا اعتماد جو زندگی میں کامیابی کی کنجی ہے اکھائل ہو جاتا ہے۔ ہمارے گھر بچوں کو جو کچھ نہیں دے پا رہے، وہ ہمارے معاشرے کو دینا چاہیے۔ ہر چھوٹے شہر میں کسی ایک اسکول میں اور بڑے شہروں میں کئی جگہ اصلاحی یا ریمیڈیل کلاسیز کھولنے چاہئیں۔ ایسے اسکولوں کا ایک کامیاب نمونہ وہ اصلاحی کلاسیز ہیں جو ہمدرد کا بزنس اینڈ ایمپلائمنٹ بیورو رابعہ گرلس پبلک اسکول میں کئی سال سے چلا رہا ہے۔ اس کے علاوہ محلے محلے پڑھے لکھے پڑوسی اپنے جوار کے بچوں کو تعلیمی امداد دے سکتے ہیں۔ یہ ان کا فرض ہے اور یہی قوم کا ان پر قرض ہے۔

(۶) مسلمان بچوں کے گھر میں بیٹھ جانے یا ڈراپ آؤٹ کی شرح تشویشناک حد تک اونچی ہے۔ بڑی وجہ اس کی یہ ہے کہ ان کے باپ یا تو خوانچہ گیری یا چھوٹی دوکان داری کرتے ہیں یا گھریلو دھندا یا

حرفہ۔ وہ چاہتے ہیں کہ جتنی جلد ممکن ہو ان کا بیٹا دوکان پر یا گھریلو دھندے میں ان کا ہاتھ بٹانے لگے۔ حکومت کا فرض ہے کہ ایسے بچوں کے لیے معاوضہ (opportunity cost) کا انتظام کرے۔ ورنہ ایک بڑا طبقہ تعلیم سے محروم رہ جائے گا۔ خود ہمارا فرض ہے کہ والدین کو بتائیں کہ بچوں کو اسکول سے اُٹھا لینا یا سرے سے انھیں اسکول نہ بھیجنا ان کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے۔

(۷) یہ بات کئی زاویوں سے ثابت ہو چکی ہے کہ مسلمان بادشاہوں کے دورِ حکومت میں غریب مسلمانوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ صوفیائے کرام کے اثر سے بہت سے غریب اور مظلوم ہندوؤں خصوصاً ہریجنوں نے اسلام کے دامن میں پناہ لی۔ وہ جاہل تھے اور جاہل رہ گئے۔ اور اب ان کو وہ مراعات بھی حاصل نہیں جو درج فہرست والوں کو حاصل ہیں۔ ان کی طرف دھیان دینے کی خصوصی ضرورت ہے۔ صدیوں تک ان کے ساتھ جو غفلت برتی گئی اس کی تلافی کرنا ہمارا فرض ہے۔

جن اقدامات کا میں نے ذکر کیا ہے اُن کو عمل میں لانے کے لیے دو تحریکیں درکار ہوں گی۔ ایک تو مسلمانوں میں بڑے اور ملک گیر پیمانے پر جوش وخروش اور تدبیر و تنظیم کی سابقہ تعلیمی تحریک، دوسرے حکومت سے متواتر مطالبہ کہ مسلمانوں کی تعلیمی پیش رفت کی طرف دھیان دے۔ اپنے ایم۔ پی اور ایم۔ ایل۔ اے صاحبان کو مجبور کیجیے کہ اس مطالبے کو اپنی مشترکہ تائید کا وزن دیں۔ مرکزی حکومت کے ایما پر میں نے ایک کمیٹی کے ان سابقہ پروگراموں کی تعمیل کا جائزہ لیا تھا جو نئی تعلیمی پالیسی میں اقلیتوں کی بہتری کے لیے شامل کیے گئے تھے۔ ہماری دریافت عبرت ناک تھی۔ حکومت کو دلائل، احتجاج اور التماس کے ساتھ اس پر آمادہ کرنا چاہیے کہ وہ ہماری آبادیوں میں اسکول کھولے، ہماری لڑکیوں اور ہمارے اہلِ حرفہ کے بچوں کی تعلیم کے لیے خاص انتظامات کرے اور اقلیتی اداروں کو اس حیثیت سے تسلیم کرنے میں لیت و لعل نہ کرے اور اُردو میں ابتدائی تعلیم کا محکم اہتمام کرے۔

غفلت کے ایک لمحے میں حکومت نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ (۱۹۸۱ء) کے ذریعہ یونیورسٹی کے مقاصد یا اختیارات میں یہ مقصد یا اختیار بھی شامل کر دیا تھا کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی اور ثقافتی پیش رفت کا سروسامان کرے۔ یونیورسٹی کی مجلس منتظمہ نے اس پراویژن [5(2) C] سے پورا فائدہ اٹھانے کے لیے ایک کمیٹی بنائی جس کے اراکین پروفیسر خلیق احمد نظامی، پروفیسر قمرالدین احمد، پروفیسر آفتاب زیدی اور یہ نامہ سیاہ تھے۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ پروفیسر خلیق احمد نظامی اپنے دوسرے

امتیازات کے علاوہ علی گڑھ تحریک کے مورخ اور اس پر سند ہیں۔ سید والا گہر کے خادموں اور عقیدت مندوں میں میں بھی اپنے آپ کو شمار کرتا ہوں اور میرا تعلق مسلمانوں کی تعلیم سے' اپنی بساط کے مطابق گہرا رہا ہے۔ ہم سب نے بڑی کاوش کے بعد ایک رپورٹ تیار کی۔ ہم یہ سمجھے کہ ترمیمی ایکٹ کی مذکورہ دفعہ علی گڑھ تحریک کے احیاء' جو ڈوڈو کی طرح مردہ ہو چکی تھی' امکانات رکھتی ہے اور بشارت دیتی ہے۔ لیکن بے عملی اور بے حسی کے اس دور میں ہوا کیا۔ ان لوگوں نے جنھیں علی گڑھ تحریک کے رموز و کردار کا کوئی شعور نہیں۔ رپورٹ کو اس طرح سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا کہ اب وہ پہچانی بھی نہیں جاتی حکومت اور یو جی سی کو ہماری سفارشات کا وہ روپ ملا جو بگڑ چکا تھا اور جس کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ شاید کوئی رقم منظور بھی ہوئی لیکن اس حالت میں کہ رقم ناکافی اور مقاصد مُبہم اور بکھرے ہوئے ہیں۔ لوگ یہ بھول گئے کہ رپورٹ کے دو حصے تھے۔ پہلا حصہ یونیورسٹی کو داخلی طور پر خود کیا کرنا ہے۔ دوسرا حصہ ملک میں تعلیم کی اشاعت سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک حصہ پر بھی دھیان نہیں دیا گیا۔ مقصد کو مجوب قرار دیجیے تو :

اس سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد

تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

غرضیکہ علی گڑھ تحریک کو زندہ کرنے کا ایک موقع جو حسنِ اتفاق سے میسّر آ گیا تھا ہاتھوں سے جاتا رہا۔ع

گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

آپ بخوبی واقف ہیں کہ علی گڑھ تحریک کے اہم ترین ستون ایم اے او کالج اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس تھے۔ ایم اے او کالج خدا کے فضل سے اپنے بانی کی منشاء کے مطابق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بن گیا۔ آزادی کے بعد اس کی بڑی توسیعات ہوئیں۔ افسوس ہے کہ بہ وجوہ اسے تنگ معیاری نے گھیر لیا۔ پھر بھی اُمید ہے کہ کبھی اس کے اچھے دن بھی آئیں گے اور توسیع کی جگہ ترفیع' پھیلاؤ کی جگہ بلندی لے لے گی اور معیار مقدار کو ہٹا کر اپنی جگہ بنا لے گا۔ ایک وصف ہے جسے انگریزی میں optimum کہتے ہیں جس کا ترجمہ موزوں ترین کیا جا سکتا ہے۔ یونیورسٹی کا بھی ایک موزوں ترین سائز ہوتا ہے۔ اُسے گھٹا دیجیے تو اُس کی منفعت محدود ہو جاتی ہے اور اس پر صرفہ برداشت اور امکانِ دوام سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ اگر بڑھا دیجیے تو نظم و ضبط' معیار' اور اقدار سب یک قلم مجروح ہو جاتی ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سربراہ کو ہمیشہ مقدار اور معیار' وقتی مقبولیت اور ادارہ کے دور رس مفاد کے درمیان فیصلہ کرنا پڑتا ہے

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا جہاں تک تعلق ہے اس کا مقصد علی گڑھ تحریک کو ملک بھر میں پھیلانا تھا، اس کے پیغام کو گھر گھر پہنچانا تھا۔ اوائل ایام میں اس نے زبردست کارہائے نمایاں انجام دیے۔ آگے چل کر اُس نے مسلمانوں کے تمام اہم مسائل کا احاطہ کرنا شروع کر دیا۔ کانفرنس نے سیاست سے بھی لو لگائی۔ اس ہمہ دانی کی نظر میں اس نئی دلچسپی نے اسے اپنے بنیادی مقصد یعنی تعلیم کی اشاعت سے ہٹا دیا۔ ۱۹۲۰ء تک کانفرنس بہر حال سرگرم کار رہی۔ یونیورسٹی کیا بنی کہ کانفرنس نے پسپائی اختیار کی، گویا اس کا دیرینہ مقصد پورا ہو گیا۔ یہ پسپائی ارادی تھی یا بے ارادہ، اس کا فیصلہ کرنے میں نہیں کھڑا ہوا ہوں، مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اب کوئی ساٹھ سال سے کانفرنس بے عملی اور ہزیمت کا شکار ہے۔ اور گزشتہ نصف صدی سے تو یہ اس حیثیت کو پہنچ گئی ہے جیسے انسانی جسم میں اپینڈکس کی ہوتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے کہ ایک پل کی غفلت ایک صدی پیچھے دھکیل دیتی ہے۔

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل ماندم صد سالہ راہم دور شد

ایک لمحہ کا ذکر کیا۔ یہاں پوری نصف صدی ضائع کر دی گئی۔ یہاں یہ بات بھی آپ کی توجہ کے قابل ہے کہ آزادی کے بعد ایک عرصے تک جنوبی ہند کے مسلمان سید والا گہر کی وضع کی ہوئی کانفرنس کی طرف دیکھتے رہے کہ وہ تعلیمی مہم میں ان کی رہنمائی کرے گی۔ کوئی تیس سال ہوئے علی گڑھ اور کانفرنس کی طرف سے مایوس ہو کر انھوں نے اپنی تحریک الگ شروع کر دی۔ کیرالا میں مسلم ایجوکیشن سوسائٹی قائم ہوئی۔ (آپ کو معلوم ہے کہ علی گڑھ کے ابنائے قدیم ہی اس کے محرک تھے) اور پھر کرناٹک میں الامین سوسائٹی، تامل ناڈو میں ایس آئی ای ٹی نے گرانقدر کام کیا اور آندھرا پردیش خصوصاً حیدرآباد میں تو کارگزار انجمنوں اور اچھے اداروں کی بھیڑ لگ گئی۔ لہٰذا اب یہ سوچنا کہ علی گڑھ تحریک کا احیاء علی گڑھ میں ہوگا، خام خیالی ہے۔ اب مرکز ثقل جنوب منتقل ہو گیا ہے۔ علی گڑھ تحریک اگر کبھی زندہ ہوئی تو وہ زیادہ سے زیادہ شمالی ہندوستان کا احاطہ کر سکے گی۔

آج کا جلسہ جس ڈھنگ سے شروع ہوا ہے اور اس کے پیچھے جو نسبتاً نوخیز اور حوصلہ مند ابنائے قدیم ہیں ان سے امید کی جا سکتی ہے کہ مسلم ایجوکیشن کانفرنس کہف سے نکل کر سرگرم عمل ہو جائے گی۔ نظریاتی جھگڑوں میں وقت نہ گنوائیے، اختلافات کو ہوا نہ دیجیے، اچھے اسکول کھولیے، ان کی حالت کو

شدھاریئے، ساکھ قائم کیجیے اور اس کا فائدہ ارتفاع تعلیم اور اصلاح معاشرہ کے لیے اُٹھایئے۔ بہار میں فضا محنت اور مقابلے کے لیے سازگار ہے۔ یوپی خواب غفلت میں گرفتار ہے۔ یہاں صرف دو شہر ایسے ہیں جہاں تعلیم نے تحریک کی شکل اختیار کی ہے۔ ایک تو کانپور جہاں Movement for Education کے ڈاکٹر (محمود رحمانی اور جمیل احمد) جنوب کے ڈاکٹروں کی طرح ملت کی مسیحائی کر رہے ہیں، دوسرے بنارس جہاں سرسید سوسائٹی نے اہل تجارت کی نگاہ تعلیم کی طرف موڑدی ہے۔ تھوڑی بہت جنبش اور شہروں میں بھی نظر آرہی ہے۔ یوپی رابطہ کمیٹی نے انھیں بہت جھنجھوڑا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ ریاض الرحمن خاں صاحب شیروانی جن کا دل صحیح جگہ پر ہے اور جن کا ذہن پیش رفت کی طرف آمادہ ہے، اور جو گفتار کو کردار کا بدل نہیں سمجھتے اپنے نسبتاً نوعمر رفقائے کار کے ساتھ مل کر بلند پروازی کی جگہ ارض پردازی کے باب کا آغاز کردیں گے۔ انشاء اللہ۔

دینی تعلیم کا تو ابھی تک ذکر بھی نہیں آیا۔ اس کی حالت عصری تعلیم سے بہتر نہیں ہے۔ نصاب میں توسیع (اہم جدید مضامین کے شمول کے ذریعے) اور طریق تدریس میں ترمیم کو اب زیادہ دیر تک اُٹھا نہیں رکھا جاسکتا۔ عصری تعلیم پانے والوں کو دین کی واقفیت بہم پہنچانا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ کانفرنس اس طرف دھیان دے سکتی ہے اور اُن دانوں کو جو شمالی ہندوستان میں بکھرے ہوئے ہیں ایک لڑی میں پرو سکتی ہے۔

وآخر دعوانا عن الحمد للہ رب العالمین

اور ہم اپنے بیان کو اپنے رب کی حمد پر ختم کرتے ہیں جو سارے جہان کا رکھوالا اور پالنے والا ہے۔

(جامعہ دسمبر ۹۳ء)

مطلع اتنا ابر آلود بھی نہیں ہے

سید حامد، سابق وائس چانسلر اے ایم یو علی گڑھ

انسان پریشانیوں میں گھر جائے اور کملانے لگے تو امید کی ذراسی کرن بھی آب حیات کا کام کر جاتی ہے۔ جس کسی کو جینے کا حوصلہ ہوتا ہے وہ بڑی مصیبتوں کا مقابلہ خم ٹھونک کر کرتا ہے اور چھوٹی چھوٹی کامیابیوں کو ڈھال بنالیتا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں پر برا وقت پڑا ہے۔ بابری مسجد کے انہدام کے بعد ہر طرف سے حوصلہ فرسا خبریں آتی رہیں مظلوم پر الزاموں کی یورش بھی ہو تو وہ بیچارہ کیا کرے اس کے پاس کوئی چارہ اس کے سوائے نہیں رہتا کہ کمر ہمت کس لے اور دانت پیس کر میدان کارزار میں اتر آئے ــــــ میدان کارزار یعنی بے درد مقابلہ کی دنیا۔ مسلمانوں نے ہنوز ایسا کیا تو نہیں ہے، لیکن کوشش کی آہٹیں مل رہی ہیں۔ قارئین مجھے معاف کردیں۔ اگر میں ان آہٹوں کی صدا کو اونچا کر کے دکھاؤں، یا سنواؤں۔

یہ دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ مسلمان ہندوستان کی آبادی کا تقریباً ۱۲ فیصد ہیں۔ آٹھ دس سال تک سول سروسیز کے مقابلہ میں ہر سال تقریباً ۹۰۰ سو کامیاب امیدواروں میں بارہ کے قریب مسلمان ہوتے تھے۔ گزشتہ دو تین سالوں میں یہ تعداد ۱۸ سے ۲۲ تک پہنچ گئی اس سال کل ۷۹۱ امیدوار چنے گئے جن میں مسلمانوں کی آبادی کے تناسب سے ۹۵ ہونا چاہیئے تھی۔ کل ۲۴ مسلمان کامیاب ہوئے۔ یعنی ابھی منزل دور ہے لیکن یہ بات کیا کم ہے کہ چند سال ہوئے جہاں ہمارا تناسب ۱ر۳ اور ۱ر۵ ہوتا تھا وہ اب ۳٪ ہوگیا ہے۔ ہم پروردگار کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ایک محاذ پر تو ہمیں رجعت قہقری سے چھٹکارا ملا اور ہم نے آگے کی طرف بڑھنا شروع کردیا خواہ وہ رینگنے کی ہی شکل میں کیوں نہ ہو۔

یہاں یہ بات بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ حکیم عبدالحمید صاحب کے ایما پر اور ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کی اعانت سے ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نے تعلیم آباد، سنگم وہار (جنوبی دہلی) میں جو مرکز سول سروسیز کے مقابلہ کے لئے کھولا ہے وہ سال بھر کی مختصر مدت میں حوصلہ افزا نتائج سامنے لایا ہے۔ پچھلے سال اس نے آٹھ لڑکوں کو امتحان کی آخری منزل یعنی پرسنیلٹی ٹسٹ کے لئے تیار کیا۔ چار لڑکے کامیاب ہوئے امسال جس جماعت کو وہ شروع سے تیار کر کے لایا تھا۔ اس میں سے ۹ لڑکے دوسری منزل یعنی خاص تحریری امتحان میں کامیاب ہوئے۔ اور ۱۲ لڑکے آخری منزل کی تیاری کے لئے ان کے ساتھ شامل ہو گئے ان ۲۱ امیدواروں میں سے اس نتیجہ کے مطابق جو آج ۳ رجون ۱۹۹۰ء کو اخباروں میں شائع ہوا ہے، ۱۲ بفضلہ کامیاب ہو گئے ہیں۔ انہیں دس مسلمان ہیں اور تین درج فہرست ذاتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

فہرست حسب ذیل ہے۔

ذکی احمد، انجم پرویز، اصغر سمول، منظفر حسین، نورالدین انصاری، اظہر شمس، اشتیاق حسین شکیبہ وارثی، آر ڈی نظیم، نظام، تامیز دکندن، کے ایل مینا، منجے بارا۔

یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ ہمدرد اسکنڈری سرکل سے جتنے مسلمان طالب علم امسال کامیاب ہوئے ہیں اتنے ہندوستان کے کسی دوسرے تربیتی مرکز سے نہیں ہوئے۔

یہاں یہ تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ راقم سطور کی متواتر کوششوں کے بعد مرکزی سرکار نے مقابلہ کے امتحانوں کے لئے تربیت کی اسکیم منظور کی تھی۔ یہ ۱۹۸۴ء میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے زیر اہتمام یونیورسٹیوں اور کالجوں میں روبہ عمل آئی۔ ہندوستان بھر میں ۵۲ کوچنگ سنٹر کھولے گئے۔ جہاں تک سول سروسیز کا تعلق ہے ان مراکز کے نتائج حوصلہ افزا نہیں رہے لیکن ان کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمان طلبہ کو یہ اطلاع مل گئی کہ قوت بازو سے اچھی ملازمتیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ چھوٹی ملازمتیں، سرکاری اور نجی سیکٹر میں ان مراکز کے تربیت یافتہ طالبعلموں نے معقول تعداد میں حاصل بھی کیں۔ مقابلہ کی ایک فضا تیار ہو گئی۔ اس سے بہت بہتر نتائج حاصل ہو سکتے تھے۔ اگر ان تربیت گاہوں کے سربراہ خلوص، محنت، لگن اور بصیرت سے

کام لیتے اور مسلم عوام اس پروگرام کا پورا فائدہ اٹھاتے ۔ ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نے ہمدرد اسٹڈی سرکل کو قائم کرتے وقت ان کمیوں کو دور کر دیا ۔ یہ اسکیم بغیر کسی بیرونی اعانت کے شروع کی گئی تھی لیکن بعد میں وزارتِ فلاح نے اپنی تربیتی اسکیم کے تحت اسے جزئی امداد دینا منظور کر لیا ۔ ہمدرد اسکیم کے تحت خوبی یہ ہے کہ اس میں طلبہ کے قیام و طعام کا انتظام بھی ہے ۔ بہت بڑا کیمپس ہے ۔ اس پروگرام کے تحت ۔ لائبریری لکچر روم، ڈائننگ ہال، ایڈمنسٹریٹیو بلاک اور پچاس کمرے فرنیچر اور ضروریات کے ساتھ ہر امیدوار کو ایک کمرہ الاٹ کیا جاتا ہے ۔ اور صبح سے رات تک ڈائرکٹر کے زیر نگرانی طلبہ کو تیاری میں مصروف رکھا جاتا ہے ۔ مختلف مضامین کے متخصصین لکچر اور مذاکرات کے لیے بلائے جاتے ہیں ۔ یہ تاثرات عام ہو گیا ہے کہ پرسنیلٹی ٹسٹ کی جتنی اچھی تربیت ہمدرد اسٹڈی سرکل میں ملتی ہے اتنی ہندوستان میں کہیں نہیں ملتی ۔ ان انٹرویو بورڈوں میں جو مشق کے لیے تشکیل دیے جاتے ہیں ۔ ہمیں مرکزی سروسیز کے نوجوان افسروں کا تعاون حاصل ہوتا ہے ۔ یہ بات انوکھی سی لگتی ہے مگر ہے امر واقعہ کے مطابق کہ جہاں تک سول سروسیز کا تعلق ہے، یو جی سی کے ۵۳ اور وزارت فلاح کے ۲۱ مراکز نے مل کر بھی کامیابی کی وہ منزل طے نہیں کی جو ہمدرد اسٹڈی سرکل اپنی شیر خواری کے دوران طے کر پایا ہے ۔

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ محنت باقاعدہ محنت اور لگن شرط ہے، کوئی کام ایسا نہیں جو انجام نہ دیا جا سکے ۔ افسوس اس بات کا ضرور ہے کہ مسلمانوں کی قیادت نے انہیں تعمیری کاموں سے سدا دور رکھا اور حکومت انہیں کھلونے دے کر بہلاتی رہی ۔ کسی کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ مسلمانوں کو تعلیم و تربیت اور مقابلہ کے میدان میں اتار دیتی ۔

خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے ۔ آج کی سادہ سی کامیابی کل کی شاندار فتوح کا پیش خیمہ ثابت ہوگی ۔

(حیات نو، اگست ستمبر ۹۳ء)

قوّت بندوق سے نہیں قلم سے آتی ھے

مولانا کلب صادق

مسلم پرسنل لاء بورڈ کے گیارہویں اجلاس منعقدہ جے پور کے اجلاس عام میں جو رام لیلا میدان جے پور (اردو نواس باغ کے سامنے) منعقد ہوا حضرت مولانا کلب صادق' نائب صدر مسلم پرسنل لاء بورڈ نے ایک دل پذیر تقریر فرمائی۔ وقت' حالات' مزاج' ضروریات اور ضرورت کے مطابق ایسی جامع' مختصر تقریر تھی جو دل کو چھو رہی تھی اور اپنے منفرد انداز میں پیش کر رہے تھے کہ لوگوں کو بالکل اپنی بات لگ رہی تھی ان کو اپنا مشاہدہ محسوس ہو رہا تھا۔ خاص طور سے بھارتیہ جنتا پارٹی کو اشاروں و کنایوں میں صرف ۲۵ سال پہلے کا ایک اپنا چشم دید واقعہ سنایا جس نے اس زمانہ میں اخباروں میں زبردست ہلچل مچایا تھا پیش کیا کہ انسان کا بچہ جو بھیڑیوں سے پلا تھا وہ بھیڑیا ہو گیا اور اسے صرف انسان کے خون سے دلچسپی رہ گئی اسی طرح سے آج بھارتیہ جنتا پارٹی کو مسلمانوں کے خون سے دلچسپی ہے۔ ان کی تقریر کو ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے شمس الحق ندوی ترتیب دے کر پیش کر رہے ہیں۔ (ایڈیٹر)

حمد و ثنا کے بعد

اما بعد

معزز حاضرین! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

برادران وطن

اللہ کی طرف سے انسان کو جو سب سے زیادہ حسین اور سب سے زیادہ قیمتی اور سب سے زیادہ خوبصورت تحفہ دیا گیا اسی کو ہم دین اور اسی کو ہم مذہب اور اسی کو ہم دھرم کہتے ہیں۔ لیکن وہ دین اور وہ مذہب اور وہ دھرم جو پھول کی شکل میں ہمارے لئے آیا تھا' جو ایک امرت کی شکل میں ہمارے سامنے آیا تھا' جو ایک پیغام حیات کی شکل میں ہمارے سامنے آیا تھا۔ حیرت ہوتی ہے کہ آج یہ پھول کانٹا بن چکا ہے اور یہی امرت زہر بن چکا ہے اور یہی پیغام حیات' پیغام موت و پیغام فنا میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اور آج اسی دھرم اور مذہب کے سہارے نہ معلوم کتنے بے خطا انسانوں کی جان لی جاتی ہے' کتنی عورتیں بیوہ ہو جاتی ہیں' کتنے بچے یتیم ہو جاتے ہیں اور عورتوں کا برہنہ جلوس سڑکوں پر نکالا جاتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ایسے کیوں ہوا؟

تقریباً ۲۵ سال پہلے کی کی بات ہے جب لکھنؤ میں' مجھے اچھی طرح سے یاد ہے اخباروں میں یہ خبر آئی تھی کہ شکاریوں کی ایک پارٹی لکھنؤ کے قرب و جوار میں شکار کھیلنے کے لئے گئی تھی تو انہوں نے شکار کے دوران ایک عجیب و غریب منظر دیکھا اور انہوں نے منظر یہ دیکھا کہ ایک انسانی بچہ جو صورت میں انسان اور شکل میں انسان مگر وہ ایک بھیڑیے کے بھٹ سے برآمد ہوا معلوم یہ ہوا کہ کسی دیہات کا کوئی بچہ تھا جسے بھیڑیا اٹھا لے گیا تھا مگر اس بھیڑیے میں شرافت تھی کہ اس بچہ کو کھایا نہیں بلکہ بھیڑیے کی جو مادہ تھی اس نے اسے دودھ پلا پلا کر پالا اور اس کو بڑا کیا۔ اس بچے کو میں نے اسپتال میں دیکھا تھا وہ بچہ انسان کا بچہ تھا' لیکن جب بھیڑیا اسے اٹھا لے گیا اور بھیڑیے نے اسے پالا پوسا تو میرے عزیزو نتیجہ یہ ہوا کہ انسان کے بچے کے

سامنے دودھ لے جائیں تو وہ خوش ہوتا ہے' انسان کے بچے کے سامنے آپ چاکلیٹ لے جائیں تو وہ خوش ہوتا ہے۔ انسان کے بچے کے سامنے آپ مٹھائی لے جائیں تو وہ خوش ہوتا ہے۔ انسان کے بچے کے سامنے آپ پھل لے کر جائیں تو وہ خوش ہوتا ہے مگر وہ انسان کا بچہ جو انسان کا بچہ تھا مگر جب بھیڑیوں کے بھٹ میں بھیڑیوں کے ساتھ پل پوس کر اور بڑا ہو کر دوبارہ انسانوں کے درمیان آیا تو میں نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اگر آپ اس کے سامنے دودھ لے جائیں تو وہ غراتا ہے۔ اس کے سامنے پھل لے جائیں تو وہ لال آنکھیں نکالتا ہے۔ اس کے سامنے چاکلیٹ یا کوئی شے لے جائیں تو وہ اس کو کاٹنے کے لئے دوڑتا ہے۔ یہ منظر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا' ان ساری تفصیلات کو اس زمانہ میں اس زمانہ کے اخبارات میں چھپے ممکن ہے یہاں بھی چھپا ہو۔ لیکن جب اسی انسان کے سامنے جو بچہ تھا انسان کا مگر اسے بھیڑیوں نے پالا اور بھیڑیوں نے پرورش کیا اس کے سامنے آپ کچا گوشت لے جائیں کہ جس سے خون کی بوندیں ٹپک رہی ہوں تو اس کے منہ سے رال ٹپکنے لگتی تھی۔ وہ للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیتا تھا اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کا بچہ بڑا پیارا ہوتا ہے۔ بڑا بھولا ہوتا ہے وہ خود ہنستا ہے' دوسروں کو ہنستے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے۔ یہی انسان کا بچہ جب بھیڑیے اسے اٹھا کر لے جاتے ہیں تو بڑا خونخوار ہو جاتا ہے' بڑا خطرناک ہو جاتا ہے اس کو پھر انسان کے گوشت کے علاوہ کسی اور شی سے دلچسپی باقی نہیں رہتی ہے وہ مذہب تو بہت بھولا بھالا تھا' مذہب تو بہت سیدھا سادھا سا تھا' مذہب تو انسانوں کو ہنستے مسکراتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن جب سیاسی بھیڑیے اسے اٹھا کر لے گئے تو پھر یہ مذہب بڑا خونخوار ہو گیا' پھر یہ مذہب بڑا جفا کار ہو گیا' اب اس کو صرف انسان کے خون سے دلچسپی ہے۔ اب اس کو جلتے ہوئے گھروں سے دلچسپی ہے۔ اب اس کو گری ہوئی مسجدوں سے اور اللہ کے گھروں کی بے حرمتی سے دلچسپی

ہے۔ تو اس میں مذہب کا کوئی دوش نہیں ہے۔ آپ یہ دیکھئے کہ مذہب کن ہاتھوں میں ہے' میں اپنے ہندو بھائیوں کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں اور ان کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے ہندو دھرم کا ادھین کیا ہے اچھی طرح سے "گیتا جی میرے سرہانے رکھی رہتی ہے۔ میں اس کتاب کو پڑھتا رہتا ہوں اور جب جب پڑھتا ہوں میری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ جب پڑھتا ہوں اس سے بہت متاثر ہوتا ہوں۔ میں نے گیتا جی جو پڑھا ہے تو مجھے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ہندو دھرم تو محبت کا پیغام ہے۔ میں نے ہندو دھرم کا ادھین کیا تو میں یہ دیکھتا ہوں کہ ہندو دھرم تو قوت برداشت اور شمتا کا نام ہے لیکن آج جن لوگوں کے ہاتھوں یہ ہندو دھرم آگیا ہے وہ اس ہندو دھرم کے سہارے بے خطا انسانوں کا خون بہا رہے ہیں۔ ہندو دھرم شمتا کو لے کر چلتا ہے۔ رحم کو لے کر چلتا ہے اور میں صاف صاف آپ کے سامنے کہنا چاہتا ہوں کہ اسلام انصاف کو لے کر چلتا ہے اور نیائے کو لے کر چلتا ہے۔ صاحب آپ یہ نہ دیکھئے کہ کس کے ہاتھ میں ہندو دھرم ہے اور آپ یہ نہ دیکھئے کہ کس کے ہاتھ میں اسلام ہے آپ یہ دیکھیں کہ کون ہندو دھرم کو اپنے پاس رکھنے کے بعد ایسے کام کر رہا ہے جسے ہندو دھرم کی ٹیک نامی ہو' کون ایسا انسان ہے جو ہندو دھرم جس کی فلاسفی میں تیاگ شامل ہے۔ رام چندر جی نے راج پاٹھ کو چھوڑ دیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جہاں دھرم ہوتا ہے وہاں تیاگ چھوڑا جاتا ہے۔ دہلی کے پارلیمنٹ پر للچائی ہوئی نظریں نہیں لگائی جاتی ہیں۔ لیکن جب دھرم کے ذریعہ ستہ کی بات کی جاری ہو' جب دھرم کے ذریعہ حکومت کی بات کی جاری ہو تو آپ سمجھ لیں کہ یہ دھرم کی خدمت کے لئے نہیں ہے بلکہ دھرم سے اپنی خدمت لینے کے لئے ہے۔

میں اپنے ہندو بھائیوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہندو دھرم میں شمتا ہے ہندو دھرم میں محبت ہے' ہندو دھرم میں پریم ہے لیکن آج جو لوگ ہندو دھرم کا نام لے رہے ہیں اور اسی کے سہارے اپنی سیاست کو چلا رہے ہیں کیا کسی بیوہ کو روتے ہوئے دیکھ کر آپ نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھا ہے' کبھی یتیم کو دیکھ کر آپ نے اس کے دل میں تڑپ محسوس کی ہے' عورتوں کی بے حرمتی ہوتی ہے انہوں نے کبھی ایک لفظ بھی کسی کے مذمت میں یا مسلمانوں کی تسلی کے لئے کہا ہے۔ نہیں کہا ہے۔

مذہب تو انسانوں کو ہنستے مسکراتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن جب سیاسی بھیڑیے اسے اٹھا کر لے گئے تو پھر یہ مذہب بڑا خونخوار ہو گیا' پھر یہ مذہب بڑا جفا کار ہو گیا' اب اس کو صرف انسان کے خون سے دلچسپی ہے۔ اب اس کو جلتے ہوئے گھروں سے دلچسپی ہے۔ اب اس کو گری ہوئی مسجدوں سے اور اللہ کے گھروں کی بے حرمتی سے دلچسپی ہے۔ تو اس میں مذہب کا کوئی دوش نہیں ہے۔ آپ یہ دیکھئے کہ مذہب کن ہاتھوں میں ہے

اب میں آپ کے سامنے اسلام کی باتیں کرنا چاہتا ہوں میں صاف بات کرنے کا عادی ہوں میں نے عرض کیا کہ جس طرح سے ہندو دھرم محبت کا پیغام ہے اسی طرح سے اسلام نیائے' انصاف اور شانتی کا پیغام ہے۔ اسلام دوسری شئے ہے اور مسلمان دوسری شئے۔ جیسے ہندو دھرم دوسری شی ہے اور ہندو الگ ہے۔ جو ہندو دھرم پر چلے وہ ہندو ہے

جو ہندو دھرم کا استحصال کرے وہ ہندو نہیں ہے وہ ہندو دھرم کا دشمن ہے تو اب ملاحظہ فرمائیں پاکستان میں کیا ہوا میں برابر پاکستان جاتا رہتا ہوں۔ میرا اسلام پر یقین ہے اور میں جانتا ہوں کہ اگر اس دنیا میں صحیح اسلام کو نافذ کردیا جائے تو نہ صرف مسلمان مطمئن ہوجائیں بلکہ غیر مسلم بھی خوش اور پر سکون زندگی گذاریں گے۔ اس کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن میں بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پاکستان میں صورت حال یہ ہوئی کہ وہ کچھ ملا لوگ کہ جن کے پاس علم نہیں تھا وہ اسلام کو نہیں سمجھتے تھے وہ مذہب کے ذریعہ اقتدار حاصل کرنا چاہتے تھے انہوں نے وہاں پر بپا فتنہ و فساد کیا۔ آپ یقین کریں' بڑے بڑے علماء و سمجھدار لوگوں کی بات میں نہیں کر رہا ہوں لیکن پبلک کو موبلائز کردینے والے کچھ ملا ہوتے تھے انہوں نے وہاں پہ ایک فرقہ کو دوسرے فرقہ سے لڑانا شروع کردیا اور دوسرے فرقہ کو پہلے فرقہ سے۔ اور جس طرح سے یہاں پر بہت سے سمجھدار ہندو فسادی نہیں ہونے کے باوجود مجبور ہوگئے اور بے بس ہوگئے ان فسادی ہندوؤں کے سامنے' اسی طرح وہاں کے مسلمان بہت سے جو فساد نہیں چاہتے تھے مگر وہ بے بس نظر آنے لگے ایسے فسادی مسلمانوں کے سامنے۔ مگر اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ میں ہندو بھائیوں سے کہتا ہوں کہ پاکستان کے الیکشن سے سبق حاصل کریں۔ پاکستان کے مسلمانوں نے جب یہ دیکھا کہ یہ لوگ جو اسلام کا نام لیتے ہیں یہ چالیس سال سے ہم کو لڑا رہے ہیں۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا خون بہا رہا ہے۔ عبادت گاہوں کی بے حرمتی ہورہی ہے تو آپ دیکھ لیجئے کہ ان مسلمانوں نے اس ساری نام نہاد قیادت کو یکسر Reject کردیا اور نامنظور کردیا۔ یہاں سے آپ کو سبق لینا چاہئے' میں کہتا ہوں کہ جو سلوک پاکستان کے مسلمانوں نے اپنی نام نہاد کہ اصلی دینی قیادت کے ساتھ کیا ہے وہی سلوک یہاں کے ہندوؤں کو بی جے پی' آر ایس ایس اور شو سینا کے ساتھ کرنا چاہئے اگر وہ اس ملک کی خیریت چاہتے ہیں ان کو مسلمانوں سے سبق لینا چاہئے' اور میں مبارکباد دینا چاہوں گا پاکستان کے مسلمانوں کو انہوں نے بھی کوئی عقل کا کام نہیں کیا اور یہ پہلی مرتبہ عقل کا کام کیا ہے۔

جہاں تک اسلامی قوانین کا تعلق ہے میں دو باتیں کہنا چاہتا ہوں' ایک بات میں کہنا چاہتا ہوں اپنی گورنمنٹ سے' اپنی سرکار سے' اپنی حکومت سے۔ وہ ابھی جیسا کہ ہمارے بات والا صاحب فرما رہے تھے کہ گورنمنٹ چاہتی ہے کہ یونیفارم سول کوڈ نافذ کردے۔ بہت سے لوگ پڑھے لکھے ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ ایک انگریزی دوا ہوتی ہے جس کا نام ہے کلوروفوم— کلوروفوم کا کام کیا ہوتا ہے آپ کو معلوم ہے؟ کلوروفوم سے پہلے کام لیا جاتا تھا تعمیر کا۔ اور اب کام لیا جاتا ہے اس سے تخریب کا۔ پہلے آپریشن کیا جاتا تھا تو اس کو سونگھا دیتے تھے مریض بے چارہ بے ہوش ہوجاتا تھا اور اطمینان سے آپریشن کردیتے تھے۔ اب ڈاکو اپنے ساتھ کلوروفوم لئے گھومتے رہتے ہیں' سڑکوں پر' ریلوں میں' بسوں میں اور جہاں ان کو موقع ملا دیکھا کہ جیب میں پیسے ہیں انہوں نے کلوروفوم سنگھائی اور دولت لے کر چپت ہوگئے تو میرے عزیز آپ یہ سمجھ لیں کہ یہ جو حکومت جو آپ کے سامنے یونیفارم کی بات کر رہی ہے یہ یونیفارم نہیں ہے۔ آپکی قیمتی دولت کو چھیننے کیلئے کلوروفوم کا استعمال کیا

میں اپنے ہندو بھائیوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہندو دھرم میں محبت ہے ہندو دھرم میں محبت ہے' ہندو دھرم میں پریم ہے۔ لیکن آج جو لوگ ہندو دھرم کا نام لے رہے ہیں اور اسی کے سہارے اپنی سیاست کو چلا رہے ہیں کیا کسی بیوہ کو روتے ہوئے دیکھ کر آپ نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھا ہے' کبھی یتیم کو دیکھ کر آپ نے اس کے دل میں تڑپ محسوس کی ہے' عورتوں کی بے حرمتی ہوتی ہے انہوں نے کبھی ایک لفظ بھی کسی کے مذمت میں یا مسلمانوں کی تسلی کے لئے کہا ہے۔ نہیں کہا ہے۔

جارہا ہے کہ آپ کے ہوش و حواس کو سلب کردیا جائے اور آپ کے متاع دین کو چھین لیا جائے۔ ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ پارلیمنٹ بہت مقدس ہے۔ پارلیمنٹ بہت سیکریٹ ہے یہ جو بات طے کرے تو آپ کو ماننا پڑے گا تو ٹھیک ہے بھائی جب ہم اس دیش میں رہتے ہیں تو بھارتی ہیں ہم پارلیمنٹ کے Sensitive سے تھوڑے انکار کرتے ہیں اس کی عظمت سے انکار تو نہیں کرسکتے۔ میں بالکل حکومت کو بتا دینا چاہتا ہوں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وہ کان کھول کر سن لے۔ ٹھیک ہے ہم پارلیمنٹ' کی لوک سبھا' راجیہ سبھا کی عظمت کے قائل ہیں لیکن ہم سے کتنی عظمت کا مطالبہ ہے۔ ہم اپنے مجتہدوں کے برابر بھی نہیں پارلیمنٹ کو' سمجھ لیتے ہیں' ذرا تھوڑی دیر کے لئے مجھے معاف کریں گے مسلمان بھائی' میں جسارت کر رہا ہوں لیکن ایک نتیجہ تک چونکہ پہنچنا ہے ہم مجتہدوں کے برابر بھی نہیں مان لیتے ہیں' قاضیوں کے برابر بھی ہم نہیں مان لیتے ہیں' ارے حضور دو منٹ کے لئے معاف کریں ذرا سماعت فرمائیں۔ ہم حضرت امام ابو حنیفہ' امام شافعی' امام مالک' امام احمد بن حنبل کے برابر مقدس مانیں۔ مانے لیتے ہیں۔ ہم امام باقر' امام جعفر صادق کے برابر مقدس مانیں۔ مانے لیتے ہیں۔ ہم خلفاء راشدین کے برابر مقدس مانیں' مانے لیتے ہیں۔ معاذ اللہ استغفراللہ حضرت محمد

رسول اللہؐ کے برابر مقدس مانیں مانے لیتے ہیں۔ لیکن میرے عزیز! اس پارلیمنٹ کو بفرض محال ہم حضور گرامیؐ کے برابر بھی مقدس مان لیں تو قرآن میں تو حضورؐ یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ "ان اتبع الا ما یوحی الیّ۔۔۔۔" میں تو اللہ کے حکم کی پابندی کرتا ہوں' قانون شریعت بدلنے کا تو مجھ کو بھی اختیار نہیں ہے۔ تو جب دنیائے اسلام کی سب سے عظیم ذات "اس سے عظیم ذات کوئی ہو ہی نہیں سکتی اس کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ قانون شریعت میں کوئی تبدیلی کرسکے تو دنیا کی وہ کون سی قوت و طاقت ہو سکتی ہے کہ جس کو ہم یہ پاور Power دے دیں کہ وہ شریعت اسلامی میں تبدیلی کرے۔ آخری بات آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔

میرے عزیزو!۔۔۔۔۔

سامان دو طرح سے جاتا ہے یا تو چوری ہوتی ہے یا چھن جاتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ سائیکل چوری ہو جاتی ہے' اگر آپ یہاں بھی سائیکل پر سوار ہو کر آئے ہوں گے تو ممکن ہے یہاں سے بھی سائیکل چوری ہو جائے۔ سائیکل جب چوری ہوتی ہے کہ جب سائیکل کو آپ چھوڑ دیں۔ دوسری صورت کیا ہوتی ہے کسی نے آپ کے ہاتھ سے کوئی شی چھین لی۔ چوری اس وقت ہوتی ہے جب آپ کسی شی کو چھوڑ دیا کرتے ہیں اور چھینی جاتی ہے کوئی شی اس وقت جب آپ میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے تو اگر شریعت اسلامی حکومت آپ سے چھیننا چاہتی ہے تو آپ سمجھ لیجئے دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں کہ جب آپ سے شریعت چھین لی جاسکتی ہے اس وقت جب شریعت کو آپ نے چھوڑ دیا ہو یا اس وقت جب آپ اتنے کمزور و ناتواں ہو جائیں کہ اپنی شریعت کی حفاظت کی آپ کے اندر طاقت نہ رہ جائے۔

میں کہتا ہوں کہ جو سلوک پاکستان کے مسلمانوں نے اپنی نام نہاد کہ اصلی دینی قیادت کے ساتھ کیا ہے وہی سلوک یہاں کے ہندوؤں کو بی جے پی' آر ایس ایس' اور شیو سینا کے ساتھ کرنا چاہئے اگر وہ اس ملک کی خیریت چاہتے ہیں ان کو مسلمانوں سے سبق لینا چاہئے' اور میں مبارکباد دیتا ہوں کہ پاکستان کے مسلمانوں کو انہوں نے کبھی کوئی عقل کا کام نہیں کیا اور یہ پہلی مرتبہ عقل کا کام کیا ہے۔

میرے عزیزو!

جیسا کہ علمائے کرام نے فرمایا ہے کہ آپ شریعت کو چھوڑیں نہیں اگر آپ نے شریعت کو لاوارث بنا دیا تو حکومت کے چور اسے اڑا کر لے جائیں گے اور اگر آپ کمزور ہو گئے تو حکومت کے ڈاکو اسے چھین کر لے جائیں گے۔ حضور کریمؐ نے کیا اور ارشاد فرمایا۔ تمام شیعہ و سنی بتاتے ہیں کہ مسلمان کو کیا ہونا چاہئے۔ ارشاد ہوتا ہے "تخلقوا باخلاق اللہ" ایک صحیح مسلمان وہ ہے کہ اللہ سے جتنے جتنے صفات بقدر طاقت بشری اپنے اندر پیدا کرنا چاہئے۔ وہ مسلمان میں صفات الٰہی بقدر بشری اپنے اندر پیدا کرنا چاہئے۔ میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں اللہ کیا ہے؟ آپ پہلے یہ بتائیں کہ اللہ عالم ہے یا جاہل؟ اللہ عالم ہے تو مسلمان اگر جاہل ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سے دور ہو گیا۔ میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اللہ فقیر ہے یا غنی اگر فقیر ہے تو آپ کو اختیار ہے اور اگر وہ غنی ہے تو مسلمان کو زیب نہیں دیتا کہ وہ فقیر ہو۔ آپ مجھے بتائیں کہ اللہ قوی ہے کہ کمزور؟ اگر اللہ قوی ہے تو مسلمان کے شایان شان نہیں ہے کہ وہ کمزور ہو۔ اللہ کے صفات کو دیکھنا چاہئے اور اس کے صفات کے آئینے میں اپنے کردار کو ڈھالتے چلے جائیے۔ آپ صحیح مسلمان ہوتے چلے جائیں۔

قوت کیسے آتی ہے میں یہاں کھڑے نہیں ہوں کہ میں آپ سے کہہ دوں کہ آپ ملی ٹینٹ ہو جائیں۔ اگر یہاں کھڑے ہندو قوم کو ملی ٹینٹ بنانا چاہتے ہیں تو اتنا جانتا ہوں کہ ہندو اتنے سمجھدار ہیں کہ وہ اس کے بہکاوے میں نہیں آئیں گے لیکن میں اس کے ساتھ ساتھ اتنی وارننگ دے جاتا ہوں کہ ملی ٹینسی سے ملی ٹینسی پیدا ہوگی یہ بات اچھی طرح سے آپ سمجھ لیجئے۔ ملی ٹینسی سے آپ محبت نہیں کر سکتے ہیں ملی ٹینسی سے صرف ملی ٹینسی ہوتی ہے۔ میں ایک پوری ذمہ داری کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ اسلام بے خطا لوگوں کے قتل کی کبھی بھی 'کبھی بھی' کسی بھی صورت میں اجازت نہیں دیتا ہے' لیکن اس کا ہم کیا کریں کہ اب کچھ لوگوں کو وہ ترکیب آگئی ہے کہ جس کے ذریعہ سے فسادات میں فقط اقلیت کا ہی نقصان نہیں ہوتا ہے بلکہ اکثریت کا بھی کیسے نقصان کیا جا سکتا ہے۔ یہ خطرناک طریقہ بھی اب اقلیت کو آگیا ہے۔ اور یہ وارننگ ہے ان کھڑے کے لئے' اور ان کے اپنے افراد کے لئے کہ وہ ہوشیار ہو جائیں اس لئے کہ جب کبھی جھگڑی چھوتی ہے اور کہیں پاپند ہوتا ہے تو ہم اس کو روکنا بھی چاہیں تو پھر ہمارے بس کے باہر ہے (میں لکھنؤ کے جلسہ میں یہ بات کہہ چکا ہوں) کہ اس حد تک مسلمانوں کو دبائیں کہ ہم اسے روک سکیں اور ایسا نہ ہو کہ آپ مسلمانوں کو اتنا دبائیں اتنا دبائیں' اتنا دبائیں کہ وہ بیٹھے تشدد کا شکار نہیں کو بنا دیں۔ کہ پہلے آپ صرف ہم ان کو کچھ لیتے ہیں تو وہ نوبت بھی آسکتی ہے۔ تو ملی ٹینسی کے بارے میں تو میں کہہ ہی نہیں سکتا ہوں اس لئے کہ ملی ٹینسی سے ہمیشہ ملی ٹینسی پیدا ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں یہ ضرور آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ آپ قوی ہوں' قوت ہاتھ میں بندوق لینے سے نہیں آتی ہے' قوت ہاتھ میں بم لینے سے نہیں آتی ہے' قوت ہاتھ میں قلم لینے سے آتی ہے۔ اصلی قوت وہ ہے جو علم سے پیدا ہوتی ہے' اصلی قوت وہ ہے جو عقل سے پیدا ہوتی ہے۔ میرا وقت بھی ختم ہو رہا ہوگا میں اس لئے اپنی بات ختم کر رہا ہوں۔

اسلام بے خطا لوگوں کے قتل کی کسی بھی، کبھی بھی، کسی بھی صورت میں اجازت نہیں دیتا ہے، لیکن اس کا ہم کیا کریں کہ اب کچھ لوگوں کو وہ ترکیب آگئی ہے کہ جس کے ذریعہ سے فسادات میں فقط اقلیت کا ہی نقصان نہیں ہوتا ہے بلکہ اکثریت کا بھی کیسے نقصان پہنچایا جاسکتا ہے۔ یہ خطرناک طریقہ بھی اب اقلیت کو آگیا ہے۔ اور یہ وارننگ ہے بال ٹھاکرے کے لئے، اور ان کے ایسے افراد کے لئے کہ وہ ہوشیار ہو جائیں

آج میں بہت عرصہ کے بعد جے پور آیا تو جب ادھر جا رہا تھا (سدایہ سے آ رہا تھا تو میں نے دیکھا کر ہاتھی پہ ہاتھی، ہاتھی پہ ہاتھی چلے جا رہے ہیں تو میں نے پوچھا یہ کیسے ہاتھی جا رہے ہیں تو معلوم ہوا کہ آمر کے قلعے جا رہے ہیں۔ ہاتھی تو میں نے بارہ پندرہ دیکھے مگر مجھے اس میں سے ایک بھی ایسا ہاتھی دکھائی نہیں دیا جو ہاتھی آدمی پر سوار ہو۔ بڑے بڑے ہاتھی تھے، بڑے خطرناک ہاتھی، بڑے قوی ہیکل ہاتھی مگر میں نے ہمیشہ دیکھا کہ اتنا سا آدمی اتنے بڑے ہاتھی پر بیٹھا ہے۔ تو یہ کیا بات ہے وہ تو بڑا ہے، وہ تو قوی ہے۔ تو آپ کہیے قوت ہاتھی کے پاس، طاقت اس کے پاس ہے وہ اتنا لمبا چوڑا، یہ انسان اتنا سا، مگر ہاتھی آدمی پر سوار نہیں ہوتا۔ آدمی ہاتھی پر سوار ہوتا ہے اس لئے کہ ہاتھی کے پاس جسمانی قوت زیادہ ہوتی ہے مگر اصلی قوت جسم کی نہیں ہوتی ہے اصلی قوت عقل کی ہوتی ہے۔

مسلمانو!

اگر تم دنیا پہ غلبہ چاہتے ہو تو عقل اور علم کو حاصل کرو اللہ تم کو ساری دنیا میں غلبہ اور طاقت اور سرفرازی عطا کردے گا۔ وآخر دعوانا۔ ☆ ☆ ☆

ہدایت دسمبر ۱۹۹۳، فروری ۱۹۹۴ء

انوار علی خان سوز

مسلم اساسیت
(Muslim Fundamentalism)

فنڈامنٹلزم کی اصطلاح امریکہ سے مستعار لی گئی ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ فنڈامنٹلزم یعنی اساسیت کی تحریک جنگِ عظیم اوّل کے بعد شروع ہوئی ہے۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ بائبل کو لفظ بہ لفظ صحیح سمجھا جائے اور بائبل کی کوئی نئی تعبیر نہ کی جائے۔ بائبل میں جن معجزات کا ذکر ہے انھیں حرف بحرف صحیح مانا جائے۔ مسیح کے بغیر باپ کی پیدائش اور ان کا آسمان پر جانا بھی بالکل صحیح تسلیم کیا جائے۔ اس تحریک کا ایک خاص مقصد یہ بھی تھا کہ نظریہ ارتقاء کو غلط ثابت کیا جائے۔

مگر "اساسیت" کی تحریک کی ابتداء در حقیقت ۱۸۳۰ء سے شروع ہوئی تھی۔ یہ تحریک ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ایک کاشتکار ولیم ملر (WILLIAM MILLER) نے شروع کی تھی۔ اس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ ۱۸۴۳ء میں مسیح دوبارہ تشریف لائیں گے اور "الفِ مبارک" شروع ہو جائے گا۔ اس کے پیروؤں کی تعداد ۵۰ ہزار سے ایک لاکھ تک ہو گئی تھی، لیکن جب ۱۸۴۳ء ختم ہو گیا اور مسیح دوبارہ تشریف نہ لائے تو لوگوں کے دماغ میں شبہات پیدا ہونے لگے۔ "الفِ مبارک" کے ماننے والوں کو "الفیین" (MILLENARIANS) کہنے لگے۔ مسیح کی آمد کے مخالفوں نے اس بات کو لے کر بائبل کی لفظی تشریح کے بجائے معنوی تشریح شروع کر دی۔

۱۸۳۵ء میں انگلینڈ میں بھی اس تحریک کا آغاز ہو گیا تھا۔ ایونجلیکل چرچ نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس تحریک کی وجہ سے امریکہ میں ولیم ملر کی اچھی خاصی شہرت ہو گئی، مگر جب مسیح دوبارہ تشریف نہ لائے تو ساری تحریک بے جان ہو کر رہ گئی اور انگلستان میں بھی لوگوں نے "الفِ مبارک" کی دوسری تشریح کرنی شروع کر دی۔

اس کے بعد ۱۸۷۰ء تک یہ تحریک بے جان ہی پڑی رہی، لیکن جب چرچ کو جدید خیالات سے خطرہ لاحق ہوا تو پادریوں نے ان خیالات کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ الفیین کی تحریک ابھی تک پوری طرح ختم نہیں ہوئی تھی، اس کے ماننے والوں نے مسیح کی دوبارہ آمد کے تعیّن کو تو چھوڑ دیا تھا مگر وہ "الفِ مبارک" کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسیح ایک خاص وقت پر تشریف لائیں گے، اس لیے ہمیں مسیح کی آمد کی تیاری کرنی چاہیے اور عیسائیت کو جدید خیالات سے بچانا چاہیے۔ امریکہ میں

ایپس کوپلین (EPISCOPALIAN) اور پرس بی ٹیرین (PRESBYTERIAN) چرچ نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس تحریک میں مختلف فرقوں کے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ اس تحریک کی طرف سے ایک رسالہ "سچائی" (TRUTH) کے نام سے نکلتا تھا۔ اس رسالہ کا ایڈیٹر جیمس ۔ ایچ۔ برکس (JAMES H. BROOKS) (۱۸۳۰ء - ۱۸۹۷ء) "الف مبارک" کے ماننے والے امریکہ کے بڑے شہروں میں کانفرنسیں کرتے تھے۔ نیاگرا میں ۱۸۹۹ء تک ان لوگوں کی کانفرنسیں ہوتی رہیں۔ نیویارک میں بھی ان لوگوں نے ایک کانفرنس کی۔

"الف مبارک" کے ماننے والے یہ کہتے تھے کہ عیسائی معاشرہ مسیح کے آنے کے بعد ہی ٹھیک ہو گا، لیکن یہ کسی تاریخ کا تعین نہیں کرتے تھے۔ ان لوگوں کو "ماقبل الفیین" کہا جاتا تھا۔ کچھ لوگ ایسے تھے جنہیں "مابعد الفیین" کہا جاتا تھا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ امریکہ میں ہر طرح کی معاشی، معاشرتی اور اخلاقی ترقی ہو رہی ہے، اور مسیح علیہ السلام اس وقت تشریف لائیں گے جب دنیا ان کی آمد کے لیے تیار ہو چکی ہو گی، لیکن ہلر کے حامی جنہیں "ماقبل الفیین" کہا جاتا ہے وہ اس سلسلے میں زیادہ پرامید نہیں تھے۔ وہ کہتے تھے کہ عیسائی سماج مسیح کے آنے کے بعد ہی سدھرے گا۔ ان کا خیال تھا کہ مسیح علیہ السلام انیسویں صدی کے آخر تک ضرور آجائیں گے۔ ہلر کے حامی سمجھتے تھے کہ مسیح انہی کے زمانے میں تشریف لے آئیں گے۔ ۱۸۷۰ء میں جو تحریک پیدا ہوئی، اس کے حامی بائبل کی نئی ترجمانی کرتے تھے۔ مگر ۱۸۳۰ء میں جو تحریک پیدا ہوئی تھی، اس کے حامی بائبل کی نئی تعبیر کو ماننے سے انکار کرتے تھے۔

بائبل پر سخت تنقید کی وجہ سے بہت سے عیسائی تقریباً کفر کی حد تک پہنچ گئے تھے مگر ہلر کی تحریک اب ابھر کر اوپر آنے لگی اور اسی کا نام "الف مبارک" کے ماننے والا ہو گیا۔ اسی کو الفیین کی تحریک کہا جانے لگا۔ اسی زمانے میں "الف مبارک" کے ماننے والوں کو ایک عظیم شخصیت مل گئی جس کا نام "ڈوائٹ۔ ایل۔ موڈی" (DWIGHT L. MOODY) تھا۔ یہ شخص ۱۸۹۹ء تک زندہ رہا۔ "الف مبارک" کے ماننے والے عیسائی مبلغوں کو جو دوسرے ممالک میں کام کرتے تھے امداد بھی دیتے تھے، ان لوگوں نے پرنسٹن میں ایک دارالعلوم بھی کھولا جس میں بائبل کی لفظی تشریح پر پورا زور دیا جاتا تھا۔ ان لوگوں نے یونیورسٹی کے پروفیسروں کو تبادلۂ خیالات کے لیے بلایا۔

"الف مبارک" کے ماننے والوں نے قدامت پسندوں اور ایونجلیکل پروٹسٹنٹس (EVANGELICAL PROTESTANTS) کے ساتھ مل کر کام کیا۔ ان لوگوں نے ۱۹۰۹ء میں بارہ کتابچے چھپوائے۔ ان کتابچوں کا نام "اساسیات" (FUNDAMENTALS) تھا۔ ان بارہ رسالوں میں بائبل پر تنقید کی سخت مخالفت کی گئی تھی۔ ان رسائل میں بائبل کی جدید ترجمانی کو غلط ثابت کیا گیا تھا۔ جو دلائل بائبل کی لفظی تشریح کے حق میں پرنسٹن کے دارالعلوم میں

جمع کیے گئے تھے۔ ان کی رو سے نئی تعبیر کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ بارہ رسالے ڈھائی لاکھ کی تعداد میں مفت تقسیم کیے گئے تھے۔ یہ سلسلہ ۱۹۱۵ء تک چلتا رہا۔

جیمس ایچ۔ بروکس اس تحریک کو کافی عرصہ تک سنبھالے رہا، مگر ۱۸۹۷ء میں اس کا بھی انتقال ہو گیا۔ ۱۹۱۲ء تک نیاگرا کانفرنس کے سارے حامی مر گئے۔ ان سارے رہنماؤں کے بعد "الف مبارک" کے ماننے والوں میں اختلافات رونما ہونے لگے۔ الفیین دو حصوں میں بٹ گئے۔ دونوں کی طرف سے دو رسالے نکلنے لگے۔ ایک کا نام "واچ ورڈ اینڈ ٹرتھ" (WATCHWORD & TRUTH) تھا اور دوسرے کا نام "ہماری امید" (OUR HOPE) تھا۔ ان دونوں رسالوں میں ایک دوسرے کے عقائد پر تنقید کی جاتی تھی اور اپنے عقائد کو صحیح ثابت کیا جاتا تھا۔

جنگ عظیم اوّل کے بعد امریکہ میں سخت اخلاقی انحطاط رونما ہونے لگا۔ "الف مبارک" کے ماننے والے اس اخلاقی زوال سے سخت پریشان تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح اس اخلاقی زوال کو روکا جائے۔ انہوں نے امریکہ کے مختلف شہروں مثلاً نیویارک، فلاڈلفیا وغیرہ میں بہت سی کانفرنسیں کیں۔ ان کانفرنسوں میں بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ چنانچہ الفیین (MILLENARIANS) نے اپنا نام بدل کر "عالمی عیسائی اساسیات تنظیم" (WORLD'S CHRISTIAN FUNDAMENTAL ASSOCIATION) رکھ لیا۔ الفیین (MILLENARIANS) کو اساسیین (FUNDAMENTALISTS) کہا جانے لگا۔

اساسیین نظریۂ ارتقاء کے سخت مخالف تھے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ نظریۂ ارتقاء کو پبلک اسکولوں میں نہیں پڑھانا چاہیے۔ ٹینیسی نے ایک قانون اس سلسلے میں پاس کر دیا مگر اس قانون کو عدالت میں چیلنج کیا گیا۔ امریکہ کے مختلف شہروں میں اس قسم کے جلسے کیے گئے مگر ان جلسوں میں زیادہ لوگ شریک نہ ہوئے۔ یہ سلسلہ ۱۹۲۸ء تک چلتا رہا

جنگ عظیم اوّل کے بعد اخلاقی زوال کے ساتھ کمیونزم کا خطرہ بھی بڑھ رہا تھا۔ لوگ بائبل کی نئی تعبیر کو اختیار کر رہے تھے۔ اساسیین ایک طرح سے محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ ایپس کوپل، پریس بی ٹیرین، بیپٹسٹ اور میتھوڈسٹ چرچ کے لوگ ان نئی تعبیروں کو ماننے لگے۔ ہنری ایمرسن فوس ڈک (HENRY EMERSON FOSDUK) جدید تعبیر کا نمائندہ سمجھا جانے لگا۔ فوس ڈک نے ایک بار یہ کہہ دیا تھا کہ "کیا اساسیین کی فتح ہو گی؟" ہنری ایمرسن فوس ڈک بیپٹسٹ چرچ سے تعلق رکھتا تھا۔ "الف مبارک" کے ماننے والوں نے اسے چرچ سے نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا گیا جس میں پندرہ ممبر شامل تھے۔ کمیشن اس نتیجے پر پہنچا کہ بیپٹسٹ چرچ میں اختلاف آراء کو برداشت کیا جانا چاہیے۔ بہر حال ہنری ایمرسن فوس ڈک کو چرچ سے باہر نہیں نکالا گیا۔ اس کا

نتیجہ یہ نکلا کہ اساسیین (FUNDAMENTALISTS) کو فتح حاصل نہ ہو سکی۔

اساسیین کے چند اصول یہ تھے۔ اوّل بائبل کو صرف کلام الٰہی سمجھا جائے۔ ثانیاً یہ مانا جائے کہ مسیح کنواری مریم کے بطن سے پیدا ہوئے۔ ثالثاً کفارہ مسیح کا عقیدہ حرف بحرف تسلیم کیا جائے۔ رابعاً از سر نو پیدائش اور معجزاتِ مسیح کو مکمل طور پر تسلیم کیا جائے۔

اساسیین کے اختلافات تقریباً ۱۹۲۰ء تک ختم ہو چکے تھے مگر ان کا استدلال ختم نہیں ہوا تھا۔ ۱۹۲۰ء کے اواخر میں اساسیین کے نظریات نے پھر زور پکڑنا شروع کر دیا۔

۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۰ء تک اساسیین عوام میں زیادہ مشہور نہیں رہے۔ اس دوران میں اکثر اساسیت پسندوں نے ایک نیا فرقہ بنالیا۔ یہ فرقہ بہت چھوٹا تھا۔ اس فرقہ میں ہر فرقہ کے لوگ جمع ہو رہے تھے۔ اساسیت پسندوں کا یہ طبقہ اپنے پرانے عقیدوں پر جارہا۔

جنگِ عظیم ثانی کے بعد اساسیین میں خوشحالی پھیل گئی۔ ان لوگوں نے صنعتی ترقی اور سائنس اور ٹیکنالوجی کو قبول کر لیا۔ انھوں نے اپنے عقائد کو پھیلانے کے لیے ریڈیو اور ٹیلی وژن کا استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اسی دور میں بلی گراہم (BILLY GRAHAM) اساسیین کا سب سے بڑا نمائندہ تھا۔ بلی گراہم نے سائنس کی مخالفت بند کر دی۔ اس نے کہا کہ اگر امریکہ نے اپنے اخلاقی زوال کو نہ روکا اور دولت کو غلط طریقے پر استعمال کیا تو امریکہ کو طرح طرح کی مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ دولت کی فراوانی کے ساتھ امریکہ میں جرائم کی رفتار بھی بڑھنے لگی۔ گھریلو زندگی میں طرح طرح کے مسائل پیدا ہونے لگے۔ اب اساسیین کا مقصد ان جرائم کو روکنا اور خاندانی روایات کو برقرار رکھنا قرار پایا۔

جس طرح جنگِ عظیم اوّل سے پہلے نظریۂ ارتقاء کی مخالفت کی گئی تھی، اسی طرح جنگِ عظیم ثانی کے بعد کمیونزم کی مخالفت شروع ہوئی۔ اساسیین یہ سمجھتے تھے کہ اب عیسائیت کو کمیونزم سے خطرہ ہے، لہٰذا اس کی شدید مخالفت کی گئی۔ اس وقت اساسیین کا نمائندہ رسالہ "آج کا عیسائی" (CHRISTIAN TODAY) تھا۔

اساسیین نہ شراب پیتے ہیں، نہ سگریٹ نوشی کرتے ہیں اور نہ رقص میں حصہ لیتے ہیں۔ بعض لوگ ان میں سے فلمیں بھی نہیں دیکھتے۔ اکثر اساسیین ۱۸۱۷ء میں جو کانفرنس نیاگرا میں ہوئی تھی، اسی کے اصولوں پر عمل کرتے ہیں اور انھیں عقائد کو مانتے ہیں۔ مثلاً بائبل وحی الٰہی ہے۔ بائبل کے الفاظ میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ تثلیث کا عقیدہ، انسانی کمزوری اور نجات کے لیے دوسری پیدائش، کفارۂ مسیح، مسیح پر ایمان لانے والوں کے لیے نجات کی بشارت اور مسیح کی دوبارہ آمد۔

اس حد تک میں نے مسیحی اساسیین کے نظریہ کی تشریح کی ہے اور ان کی پوری تاریخ بھی

بیان کر دی ہے۔ ۱۸۳۰ء کے آس پاس مسلمانوں میں کچھ لوگ ایسے پیدا ہوئے جو مہدی اور مسیح کی آمد کے منتظر تھے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی اصلاح مہدی کے بغیر ناممکن ہے، اور مہدی کے بعد مسیح کا آنا بھی ضروری ہے۔

سوڈان میں محمد احمد (۱۸۴۴ء تا ۱۸۸۵ء) نے مہدویت کا دعویٰ کیا۔ مہدی سوڈانی نے بہت سی فتوحات حاصل کیں مگر ۱۸۸۵ء میں مہدی سوڈانی کا انتقال ہو گیا۔

برصغیر میں مرزا غلام احمد قادیانی نے ۱۸۳۹ء تا ۱۹۰۸ء میں مہدی و مسیح ہونے کا دعویٰ کیا۔ مرزا صاحب کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی اصلاح مہدی کے بغیر ممکن نہیں ہے، مگر جب انھوں نے یہ دیکھا کہ مہدی کے بعد مسیح کا آنا بھی ضروری ہے تو انھوں نے مسیح ہونے کا بھی دعویٰ کیا، چونکہ مسیح علیہ السلام نبی تھے اس لیے انھوں نے نبوت کا بھی دعویٰ کیا۔ مسلمانوں نے انھیں ماننے سے انکار کر دیا۔ اس لیے وہ ایک فرقہ بن کر رہ گئے۔ جس طرح ۱۹۱۴ء میں اساسیین دو فرقوں میں بٹ گئے تھے۔ اسی طرح غلام احمد قادیانی کے انتقال کے بعد تقریباً ۱۹۱۴ء کے لگ بھگ احمدی بھی دو فرقوں میں بٹ گئے۔ ایک فرقہ قادیانی تھا دوسرا لاہوری۔

مرزا غلام احمد قادیانی گو خود کو نبی قرار دیتے تھے جو سراسر کفر تھا لیکن وہ بنیادی طور پر قرآن میں کسی رد و بدل کے قائل نہیں تھے۔ قرآن کو وحی الٰہی مانتے تھے اور معجزات کو بھی تسلیم کرتے تھے۔

ایران میں ۱۸۴۴ء میں مرزا علی محمد باب (۱۸۱۹ء تا ۱۸۵۰ء) نے امام مہدی ہونے کا دعویٰ کیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ عیسائی اور مسلمان سب ایک عہد مبارک کا انتظار کر رہے تھے اس لیے مہدویت کے دعویٰ داروں کو بہت سے پیروکار مل گئے۔ باب کا انتقال ۱۸۵۰ء میں ہوا اور اس کے بعد ۱۸۶۳ء میں بابی تحریک دو حصوں میں بٹ گئی اور مرزا حسین علی نے یہ دعویٰ کیا کہ جس موعود شخصیت کا باب نے دعویٰ کیا تھا، وہ میں ہوں۔ وہ خود کو اللہ کا مظہر کہتا تھا۔ لوگوں نے سمجھا کہ شاید بہاء اللہ کے بعد کوئی مبارک دور شروع ہو جائے گا، لہٰذا بہاء اللہ کو بھی بہت سے پیروکار مل گئے۔ لیکن نہ تو مہدی سوڈانی کے بعد، نہ مرزا غلام احمد قادیانی کے بعد، نہ باب اور بہاء اللہ کے بعد کوئی مبارک دور شروع ہوا۔ مسلمانوں میں جن لوگوں پر اساسیین کا اطلاق ہو سکتا ہے تو وہ یہی چند فرقے ہیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ سارے شیعہ اور سنی راسخ العقیدہ مسلمان ہمیشہ ان فرقوں کے مخالف رہے ہیں۔

لفظ اساسیین کا اطلاق آج کل بعض مسلمان جماعتوں پر کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جماعتِ اسلامی، اخوان المسلمون، ایرانی انقلاب کے حامی وغیرہ۔ اگر اس لفظ کو اساسیاتِ دین کے معنی میں لیا جائے تو میرا خیال ہے کہ کوئی لبرل سے لبرل مسلمان بھی اپنے آپ کو اساسیاتِ دین کا منکر نہ قرار دے گا اور اگر کوئی مسلمان اساسیاتِ دین ہی سے انکار کر بیٹھے تو غالباً انتہائی آزاد خیال مسلمان بھی اسے مسلم

قوم کا فرد ماننے کے باوجود اس کی تحریروں کو کوئی وزن نہ دے گا۔

مسیحیوں نے "اساسیات" (FUNDAMENTALS) کے نام سے کچھ رسالے شائع کیے تھے جن کی وجہ سے انھیں اساسیین (FUNDAMENTALISTS) کہا جانے لگا۔ ان رسالوں میں مسیحیت کے بنیادی عقائد بیان کیے گئے تھے اور ان کی تعبیر کو غلط ثابت کیا گیا تھا۔ اس لحاظ سے ہر مسیحی جو ان رسالوں سے متفق تھا اسے FUNDAMENTALIST کہا جاسکتا ہے، مگر اسلم دُنیا میں اُن لوگوں کو اساسیت پسند کہا جاسکتا ہے جو انیسویں صدی میں مہدی اور مسیح کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دین میں جن چیزوں کا اضافہ کیا گیا ہے، انھیں دین سے خارج کر دیا جائے اور اسلام کو اس کی اصل بنیادوں پر قائم کیا جائے، مگر اس سلسلے میں بھی مختلف لوگوں کے مختلف خیالات ہیں۔ بعض ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو دین میں اضافے کو صحیح سمجھتے ہیں، حالانکہ ان لوگوں کو راسخ العقیدہ شمار کیا جاتا ہے۔ اہل قرآن کے نام سے ایک گروہ مسلمانوں میں پایا جاتا ہے۔ اس گروہ کا خیال ہے کہ جو باتیں صرف قرآن میں پائی جاتی ہیں، انھیں پر دین کی عمارت استوار ہونی چاہیے، مگر س گروہ کو دین سے منحرف قرار دیا جاتا ہے۔

آج بھی جتنے متجدد مسلمان اصلاح کے مدعی ہیں وہ محض قرآنی بنیادوں پر دین کی تشریح کرنا چاہتے ہیں۔ بعد میں جو احادیث جمع کی گئی ہیں، ائمہ فقہ وحدیث نے ان کی جو تشریحات کی ہیں، ان کی طرف وہ زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ وہ محض ابتدائی اسلام کی طرف مراجعت کرنا چاہتے ہیں مگر یہ لوگ، آزاد خیال سمجھے جاتے ہیں لہٰذا آزاد خیال لوگوں کو فنڈامنٹلسٹ قرار دیا جانا چاہیے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دین کی لفظی تشریح کرنے والوں کو اساسیت پسند کہا جانا چاہیے مگر اس گروہ میں نہ جماعت اسلامی آتی ہے اور نہ اخوان المسلمون اور نہ ایرانی انقلاب کے حامی۔

امام خمینی نے امام مہدی کے عدم ظہور کے باوجود اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس موضوع پر انھوں نے "حکومتِ اسلامی" نام کی ایک کتاب لکھی ہے۔ انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ پرانا شیعی نقطۂ نظر صحیح نہیں ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اسلامی نظام اور دور میں بھی قائم کیا جا سکتا ہے، لہٰذا امام خمینی کے حامیوں کو فنڈامنٹلسٹ نہیں کہا جاسکتا۔

جماعت اسلامی کی بنیاد مولانا مودودی رحمہ اللہ علیہ نے ڈالی تھی۔ جو لوگ راسخ العقیدہ سمجھے جاتے ہیں انھوں نے مولانا مودودی کی بعض تشریحات پر اعتراضات کیے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ ان اعتراضات میں کوئی وزن ہے یا نہیں، ان اعتراضات کے پیش نظر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جماعتِ

اسلامی کو فنڈامنٹلسٹ کس طرح قرار دیا جاتا ہے۔ مولانا مودودی نے سبع سموت کی نئی تعبیر کی ہے، حالانکہ پرانے علماء سات آسمانوں کو ٹھوس مادہ سے بنے ہوئے تعبیر کرتے تھے۔ عرش کی تعبیر مولانا مودودی رحمہ اللہ علیہ نے اقتدار سے کی ہے حالانکہ پرانے علماء اس کی یہ تعبیر نہ کرتے تھے۔

الاخوان المسلمون کی بنیاد حسن البنا نے ڈالی تھی۔ مگر اس زمانے میں حسن البنا صرف دینی اصلاح کے کام کر رہے تھے اور الاخوان المسلمون بھی صرف مسلمانوں کی اصلاح کے کام میں معروف رہی۔ ایک وقت آیا کہ کرنل ناصر الاخوان المسلمون کے ساتھ مل کر انقلاب لانے میں کامیاب ہوئے۔ اس دور میں کرنل ناصر اور الاخوان المسلمون ایک ہی نقطۂ نظر کے حامی تھے۔ لہذا کرنل ناصر کو بھی فنڈامنٹلسٹ کہا جانا چاہیے۔ انقلاب کے بعد الاخوان المسلمون کے سب سے بڑے مفکر سید قطب تھے اور سید قطب مولانا مودودی کی فکر سے بے حد متاثر تھے۔ انھوں نے قدیم علماء کی روش سے ہٹ کر اسلام کی ایک نئی تعبیر کی۔ اپنی کتاب "العدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام" میں انھوں نے کہا ہے کہ ابو بکرؓ نے لوگوں میں مالِ غنیمت کو مساوی طور پر تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا تھا لہٰذا ان کے زمانے تک معاشی مساوات باقی رہی مگر حضرت عمرؓ نے پہلے اسلام لانے والوں کو زیادہ حصہ دیا اور بعد میں اسلام لانے والوں کو کم حصہ دیا، اس کی وجہ سے معاشی عدم مساوات پیدا ہو گئی۔ سید قطب نے لفظی تشریح پر اکتفاء نہ کیا، اس لیے الاخوان المسلمون کو بھی فنڈامنٹلسٹ قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جو لوگ مذہب پر نہایت سختی کے ساتھ جمے ہوئے ہیں، انھیں فنڈامنٹلسٹ کہا جانا چاہیے۔ دین پر سختی کے ساتھ جمے رہنے کا مطلب یہ ہے کہ پرانی روایات پر سختی کے ساتھ جما رہنا چاہیے۔ حالانکہ اس دور کی جن جماعتوں کو فنڈامنٹلسٹ کہا جاتا ہے وہ سب علامہ اقبال، محمد عبدہ، ڈاکٹر علی شریعتی اور جمال الدین افغانی کے نظریات پر پرمی شدت کے ساتھ جمی ہوئی ہیں۔ کیا ان سب کو فنڈامنٹلسٹ کہا جائے گا۔ علامہ اقبال، علی شریعتی، محمد عبدہ نے دین کی نئی تعبیر پیش کی ہے۔ سید قطب پرانے لباس کو چھوڑ کر جدید لباس پہنتے تھے۔ ڈاکٹر علی شریعتی بھی جدید لباس پہنتے تھے۔ جماعتِ اسلامی کے جدید تعلیم یافتہ اصحاب بھی جدید لباس پہنتے ہیں۔ ان میں جماعت کی مجلسِ شوریٰ کے ارکان بھی ہیں۔ سید قطب اور امام خمینی عورت کے چہرے کو چھپانا ضروری نہیں سمجھتے اور جماعتِ اسلامی میں بعض ارکان کا بھی یہی خیال ہے۔ الاخوان المسلمون کے نزدیک داڑھی رکھنا ضروری نہیں ہے۔ سید قطب داڑھی نہیں رکھتے تھے۔ مولانا مودودی رحمہ اللہ علیہ نے ایک بار یہ کہہ دیا تھا کہ داڑھی کی کوئی مقدار نہیں ہے۔ یہ غالباً ۱۹۳۳ء کی بات ہے۔ اس پر راسخ العقیدہ علماء نے سخت اعتراضات کیے تھے۔ امام خمینی نے علی رجائی کو وزیرِ اعظم بنایا تھا اور وہ بھی جدید لباس پہنتے تھے۔

اگر روایت پرست مسلمانوں کو فنڈامنٹلسٹ کہا جائے تو یہ مسلمان اس دور میں انقلاب کے علمبردار نہیں ہیں۔ برصغیر کے مسلمانوں میں روایت کے ماننے والے دو گروپ پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک گروپ دیوبندی ہے اور دوسرا بریلوی مگر دونوں گروپ اپنے عقائد میں اختلاف کے باوجود جماعت اسلامی اور الاخوان المسلمون دونوں کی مخالفت میں متحد ہیں اور ایرانی انقلاب کے بھی عام طور پر حامی نہیں ہیں۔ خود وہابی مسلمان جن کی حکومت سعودی عرب میں ہے، وہ بھی ایرانی انقلاب کے ہم نوا نہیں ہیں۔ جماعتِ اسلامی ملوکیت کو غلط سمجھتی ہے اس لیے وہ سعودی حکومت کو اسلامی حکومت نہیں بتاتی۔ روایت پرست شیعہ عام طور پر امام خمینی کے مخالف ہیں۔ عام طور پر روایت کے ماننے والے علماء اپنی حکومتوں کے وفادار ہیں۔

آج جو لوگ مسلم فنڈامنٹلزم کی اصطلاح سے نہایت خوف زدہ ہیں، ان کے خوف کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آتی۔ جن تحریکوں کو اسلامی فنڈامنٹلسٹ تحریک کہا جاتا ہے۔ ان تحریکوں میں مسلم قوم کے دانشور پائے جاتے ہیں جو اسلام کے اوپر مکمل اعتماد رکھتے ہیں۔ وہ خلافت راشدہ کو سامنے رکھتے ہوئے اسلام کو اس دور میں نافذ کرنا چاہتے ہیں، مگر خلافت راشدہ کے طریقۂ انتخاب کو اس دور میں نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ امام خمینی نے ایران میں باقاعدہ جمہوریت قائم کی ہے جس میں ممبران پارلیمنٹ کا باقاعدہ انتخاب ہوتا ہے۔ آیت اللہ روح اللہ خمینی ایک نیا سماجی، سیاسی اور معاشی نظام قائم کرنا چاہتے تھے، مگر یہ نظام اس دور کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے روبہ عمل لایا جائے گا۔

مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا تھا کہ اسلامی نظام کس طرح وجود میں آسکتا ہے تو مولانا نے جواب دیا تھا کہ صرف جمہوری ذرائع سے۔۔۔

الاخوان المسلمون شام میں جمہوریت کی بحالی کے لیے کوشش کر رہی ہے، حالانکہ حافظ الاسد خود کو جمہوریت کا حامی بتاتے ہیں۔ مصر میں الاخوان المسلمون جمہوریت کی بحالی کے لیے پریشان ہے کیونکہ مصری حکمران خود کو جمہوریت کا حامی بتاتے ہیں۔ سعودی عرب میں کیونکہ ملوکیت ہے اور الاخوان کی تعداد بہت کم ہے اس لیے وہ کھل کر سامنے نہیں آتے ہیں۔ مصر اور شام ہی میں الاخوان کی طاقت بہت زیادہ ہے۔ اگر یہ پارٹیاں برسر اقتدار آگئیں تو ان دونوں ممالک میں جمہوریت قائم ہو جائے گی مگر چونکہ عوام الناس اسلام پر مکمل اعتماد رکھتے ہیں اس لیے جمہوریت کی اسلامی شکل قائم کی جائے گی۔

ان جماعتوں میں مسلم دانشوروں کی بڑی تعداد پائی جاتی ہے۔ لہٰذا لبرل مسلمانوں کو ان جماعتوں کی تائید کرنی چاہیے۔ کیونکہ ان جماعتوں کو عوام اچھا سمجھتے ہیں یا کم از کم انھیں برا نہیں خیال کرتے۔ انھی جماعتوں کی وجہ سے اسلام کی ایک نئی تعبیر وجود میں آسکتی ہے۔ ان میں سے بیشتر جماعتوں کے سربراہ اور دانشور اپنا شجرۂ نسب علامہ اقبال، محمد عبدہ، ڈاکٹر شریعتی اور جمال الدین افغانی سے جوڑتے

ہیں۔

مسیحی اساسیین نظریۂ ارتقاء کو غلط سمجھتے تھے انھوں نے ٹینیسی میں اس کے خلاف ایک قانون بھی بنوادیا تھا۔ مولانا مودودی رحمہ اللہ علیہ نے بھی نظریۂ ارتقاء کو غلط ثابت کیا ہے، مگر علامہ اقبال نظریۂ ارتقاء کو صحیح سمجھتے ہیں۔ اس کے ساتھ مولانا مودودی رحمہ اللہ علیہ اقبال کو نہایت عظیم اسلامی مفکر بھی مانتے ہیں۔ جماعتِ اسلامی میں بعض لوگ نظریۂ ارتقاء کو صحیح سمجھتے ہیں اور بعض لوگ اسے غلط سمجھتے ہیں۔ اگر سعودی عرب یا کسی دوسرے ملک میں نظریۂ ارتقاء نہیں پڑھایا جاتا تو ان ممالک میں الاخوان یا جماعتِ اسلامی کی حکومت نہیں ہے۔

یہ ساری جماعتیں کمیونزم کی مخالف ہیں، مگر یہ کمیونزم کے لادینی فلسفہ کی مخالف ہیں جس میں مادہ ہی اصل شئے ہے اور خدا کا کوئی وجود نہیں پایا جاتا۔ مگر قومی ملکیت کو ماننے والے ان جماعتوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ علامہ اقبال زمین کو اللہ کی ملکیت قرار دیتے ہیں نہ کہ انسان کی۔ ان جماعتوں نے کبھی نظریۂ ارتقاء کو اپنا موضوعِ بحث نہیں بنایا۔ جس طرح مسیحی اساسیین کے لیے نظریۂ ارتقاء کی مخالفت ہی ایک نکتۂ اتحاد بن گئی تھی، اسی طرح کمیونزم کے معاشی نظام کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کمیونزم کے خلاف جو نکتۂ اتحاد ہے وہ کارل مارکس کی خدا بیزاری ہے۔

اس لیے میرا خیال یہ ہے کہ الاخوان المسلمون، جماعتِ اسلامی اور ایرانی انقلاب کے حامیوں کو کسی معنی میں بھی فنڈامنٹلسٹ قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔

(بہ شکریہ سہ ماہی "تحقیقاتِ اسلامی" علی گڑھ)

(عالم اسلام اور عیسائیت اگست ۱۹۹۳ء)

احمد ظفر

○

ایسا ہونا تھا، ایسا ہوتا ہے
محفل میں بھی دل تنہا ہوتا ہے

اپنے آپ میں جو کھویا ہوتا ہے
شہر میں اس کا ہی چرچا ہوتا ہے

اتنا دنیا سے پیچھے رہتا ہوں
جتنا دنیا کو سوچا ہوتا ہے

منظر دُھلتا ہے اتنا بارش سے
جتنا پت جھڑ میں میلا ہوتا ہے

اس سے آگے بھی ہے اک دنیا سی
جتنا انساں نے سمجھا ہوتا ہے

پھول کی پتی پر شبنم جمتا ہے
رات کو تارا جو ٹوٹا ہوتا ہے

صبح حسینہ باغ میں جب آتی ہے
چہرہ شبنم سے دھویا ہوتا ہے

ذہن نہ سوتے تو پھر آنکھ نہیں لگتی
جس کو سونا ہے سویا ہوتا ہے

(فنون جولائی ۔ دسمبر ۹۳ء)

احمد ندیم قاسمی

○

دستک یہ کمال کر گئی تھی
اک پل میں صدی گزر گئی تھی

پھر نور کا اک وفور سا تھا
اس تک تو مری نظر گئی تھی

کس دل سے اُسے وداع کرتا
آنکھوں میں تو ریت بھر گئی تھی

میں بڑھ نہ سکا اُفق سے آگے
ہاں، گردِ سفر نکھر گئی تھی

دن کی بھی پکار، پر نہ نکلی
وہ رات جو میرے گھر گئی تھی

سینے پہ پہاڑ بن کے اُتری
فریاد، جو بے اثر گئی تھی!

○

ہوا نے گھر کا دروازہ بجایا
میں حیراں تھا، مرے ہاں کون آیا

مجھے اپنا بنایا صرف اُس نے
جو تھا دنیا کی نظروں میں پرایا

جب اپنا عشق پہنچا انتہا تک
تو ہر انساں کو سینے سے لگایا

میں سرگرداں ہوں اپنی جستجو میں
مجھے کوئی اشارہ دے، خدایا!

صدائے روشنی منزل ہے میری
سدا پیچھے رہا ہے میرا سایا

ندیم اس عہد کا یہ المیہ ہے
موحّد نے خدا کو بت بنایا

(فنون، جولائی۔دسمبر ۹۳ء)

فنون، لاہور

افتخار عارف

○

انہیں میں جیتے، انہی بستیوں میں مر رہتے
یہ چاہتے تھے مگر کس کے نام پر رہتے

پیمبروں سے زمینیں وفا نہیں کرتیں
ہم ایسے کون خدا تھے کہ اپنے گھر رہتے

پرندے جاتے نہ جاتے پلٹ کے گھر اپنے
پرانے اپنے شجروں سے تو باخبر رہتے

بس ایک خاک کا احسان ہے کہ خیر سے ہیں
وگرنہ صورتِ خاشاک در بدر رہتے

مرے کریم! جو تیری رضا، مگر اس بار
برس گزر گئے شاخوں کو بے ثمر رہتے

○

قلم جب درہم و دینار میں تولے گئے تھے
کہاں تک دل کی چنگاری! ترے شعلے گئے تھے

فصیلِ شہرِ لب بستہ! گواہی دے کہ ہم لوگ
دیارِ حلقۂ زنجیر سے بولے گئے تھے

تمام آزاد آوازوں کے چہرے زرد ہو جائیں
فضاؤں میں کچھ ایسے زہر بھی گھولے گئے تھے

فسادِ خون سے سارا بدن تھا زخم ہی زخم
سو نشتر سے نہیں، شمشیر سے کھولے گئے تھے

وہ خاکِ پاک ہم اہلِ محبت کو ہے اکسیر
سرِ مقتل جہاں نیزوں پہ سر تولے گئے تھے

(فنون، جولائی ـ دسمبر ۱۹۹۳ء)

بیدل حیدری

○

ہر چند کہ زخمی ہوں مگر ڈر نہیں لگتا
پتھر بھی اب اُس ہاتھ میں پتھر نہیں لگتا

اب میرا مکاں اونچے مکانوں میں گھرا ہے
اب دھوپ کا بازار مرے گھر نہیں لگتا

دریا میں اُترنے سے مجھے روکنے والو!
پیاسے کو سمندر بھی سمندر نہیں لگتا

فٹ پاتھ پہ سونے کی نہیں جب سے اجازت
شہروں میں کوئی شخص بھی بے گھر نہیں لگتا

بیدلؔ مجھے جس شخص نے برباد کیا ہے
وہ سادہ ہے ایسا کہ ستمگر نہیں لگتا

(فنون، جولائی۔ دسمبر ۹۳ء)

تنویر سپرا کے "لفظ کھردرے"

اُردو کے نامور شاعر تنویر سپرا کا یہ مجموعہ کلام پہلی بار ۱۹۷۵ء میں چھپا، اب اس کا تیسرا ایڈیشن ۱۹۹۲ء میں نکلا ہے۔

مضمون خشک، تلخ زبان، لفظ کھردرے
نازک سماعتوں پہ مرے شعر بار ہیں

مسافت میں نہیں حاجت اسے چھتنار پیڑوں کی
بیاباں کی دہکتی گود میں جو شخص پلتا ہے

اس بار جنوں مصلحت آثار نہیں ہے
یا سر نہیں یا جبر کی دیوار نہیں ہے

اے تنویر سپرا کاٹ پھینکو اپنے شانوں سے
جو ہر چوکھٹ پہ جھک جائے وہ سر اچھا نہیں ہوتا

لہو کی وردیاں تنویر سپرا پہننی ہوں گی
اگر شہرِ شرافت کو بچانا ہے رذیلوں سے

یہ لفظ ہیں لفظوں سے کہیں بھوک مٹی ہے
منشور کی سوغات نہیں چاہیے مجھ کو
مخلص ہو تو تقسیم کرو زر کو ابھی سے
وعدوں کی یہ رات نہیں چاہیے مجھ کو
جو صرف چھلکتے ہوئے دریاؤں پہ برسے
تنویر وہ برسات نہیں چاہیے مجھ کو

آج بھی سپرا اس کی خوشبو مِل مالک لے جاتا ہے
میں لوہے کی ناف سے پیدا جو کستوری کرتا ہوں

سپر بلیک میں ملیں تو خرید لا
دو چار قہقہے لبِ رنجور کے لیے

(فنون جولائی۔ دسمبر ۱۹۹۳ء)

●●

عبداللہ جاوید

دُعا

داتا
جو دینا ہے
وہ دے دیتا
تو میں یہ کرتا نہ ہی وہ کرتا

مرے ہاتھ
سدا کے سوالی تھے
ترے دستِ عطا کب خالی تھے؟

مجھے بھیک کی پل پل جلدی تھی
تری جانب سے پابندی تھی
مری پستی، تیری بلندی تھی
یا تیری سب نیرنگی تھی — داتا

جو اوامر تھے
میں ان سے بچا
میں نواہی سے ہر دم لپٹا
اِس حکم عدولی سے آتا

مرا تن من سارا داغ ہُوا

تو نے پھر بھی اتنا کرم کیا
مرے سامنے آئینہ رکھا
جب عکس نے منہ پر تھوک دیا
تب مجھ پر میرا حال کھُلا — داتا

یہ بھی تیری عطا ہے، تیری عطا
مرے چہرے کا اک اک دھبا
ابھی خلق کی آنکھوں سے ہے چھپا

مرے شملے آج بھی سیدھے ہیں
اور سر اونچا کا اونچا ہے
مری ٹوپی آج بھی ٹیڑھی ہے
اور پھُنّا بھی لہراتا ہے

یہ جو خلقت مجھ پہ نہیں ہنستی
کوئی مجھ پر طعنہ نہیں کستی

نہیں کھُلتی ان پہ مری پستی
یہ بھی تیری عطا ہے تیری عطا — داتا

لے میں اندر سے شرماتا ہوں
پھر تیرے در پر آتا ہوں
مجھ بھیک کی جلدی والے پر
اس اندر سے منہ کالے پر
رحمت کر دے

نہ ہی دنیا اور نہ ہی عقبیٰ
تری خوشنودی اور تیری رضا
یہی میری طلب ہے، میری دُعا — داتا

(فنون، جولائی ـ دسمبر ۹۳ء)

خالد احمد

تعارف: محمد حنیف

خالد احمد کا ندیم صاحب اور "فنون" سے تعلق لازم و ملزوم ہے۔ لاہور سے تبادلے کی وجہ سے دفتر "فنون" میں حاضری اور بعد "فنون" میں شرکت پہلے کی طرح نہیں رہی۔ تاہم اس عرصہ میں کچھ غزلیں اور دو یادگار نظمیں "فنون" میں چھپیں۔ "والدہ مرحومہ کی یاد میں" اور "رحمان بابا کے لئے"۔ یہ نظمیں پڑھ کر فکر کے دریچے وا ہوتے ہیں۔ "ہتھیلیوں پہ چراغ" "تشبیب" اور نئی کتاب "پہلی صدا پرندے کی" کی غزلوں اور نظموں میں خالد احمد اپنے عہد کے بڑے فن کاروں میں سے ایک نظر آتا ہے۔ خالد احمد تنقید نگار بھی ہے جو فنون میں اہم موضوعات پر [illegible] کے نام سے شذرے تحریر کرتا رہا ہے لیکن خالد احمد مشہور بطور شاعر ہوا۔ "تشبیب" کے بعد "ہتھیلیوں پہ چراغ" شاعری کی دوسری کتاب ہے جس میں حمد، نعت، قصیدہ، غزل، نظم سب کچھ ہے اور ہر صنف اپنی جگہ اعلیٰ معیار کا درجہ رکھتی ہے۔ خالد احمد نے کتاب کے فلیپ پر لکھا ہے —— "میری شاعری لہو میں اپنا جانے کے لئے ہے۔ میرا قاری میرا احساس ہے، میرا قاری میرا دل ہے، میں دلوں پر لکھتا ہوں" —— "ہتھیلیوں پہ چراغ" سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بے جہت فکر کے ہاتھوں میں کماں کیوں دی تھی
اب ہدف ٹوٹ ہے تو کیا، تیر تو چل جانا تھا

ہر شخص حقائق کی کڑی دھوپ کے ڈر سے
تانے ہوئے اوہام کی چادر نظر آیا

چُپ کا زہر پی لینا، غم کے ہونٹ سی لینا
مصلحت نہیں یارو، بات بے حسی کی ہے

پھولوں میں رنگ اور نشوں میں نشہ نہ تھا
جب تک ترا جمال لہو میں رچا نہ تھا

پلکوں کی ہتھیلیوں پہ خالد
یادوں کے چراغ جل رہے ہیں

ہر قدم جاری تھی نادیدہ سہاروں کی تلاش
ہر قدم منت کشِ اغیار ہونا تھا، ہوئے

بے حس کسی خنکی سے بجھتے نہیں خالد
اے ماں ترے بیٹے ترے اشکوں پہ کھڑے ہیں

"تشبیب" خالد احمد کی پہلی کتاب ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور عقیدت کا اظہار ہے۔ انتہائی چھوٹی بحر میں احساسات کا اظہار اس قادر الکلامی سے ہوا ہے کہ پڑھنے والا بھی جذب و مستی کی کیفیت سے سرشار ہو جاتا ہے۔ اسی قصیدے میں اپنے اہل خانہ کے ساتھ ساتھ وہ اپنے دوستوں کے لئے بھی دعا گو ہے۔ مختصر بحر میں کیا خوبصورت انداز بیان ہے:

آپ ہی گرفتہ آں
رحل ہے آپ کی آل

آپ کا ورثہ ہیں
فاطمہ کے دو لال
آپ کا ترکہ ہے
ترکِ مال و منال
ستر دو ہیں اثاث
نیمہ ہو جس پہ کھال
آدھی نانِ جویں
پانی ایک پیال
فاقے تھے یوں کاٹے
فاقے تھے دیے اُجال

جامعہ عثمانیہ دکن کے سابق پرنسپل حافظ سید محمد نعمان صاحب لکھتے ہیں:

"مجھے اس کی "تشبیب" میں حضرت کعب بن زہیرؓ، امام بوصیریؒ، نظامیؒ، جامیؒ اور محسن کی قصیدہ گوئی کی تمام تر لطافتیں بھی نظر آتی ہیں اور اس روایت کے نئے امکان بھی۔ عمر کے حسنِ طبیعت نے عرب کے سوز دروں سے ہم آہنگ ہو کر وہ رنگ دکھائے ہیں کہ دل سے بے اختیار ماشاء اللہ کی صدا نکلتی ہے۔ عربی اور ہندی روایاتِ شعر کے دل نشیں امتزاج، امام مشرقی زبانوں سے فراخدلانہ استفادے، حدود کی [illegible] اظہار کی شدت، نظر کی وسعت اور عقیدت و محبت کی رنگا رنگی کی بدولت اردو قصیدہ اپنے نقطۂ کمال تک پہنچ گیا ہے۔"

"لمحہ تیار ہے" ایک اعلیٰ درجہ کی نظم ہے جس میں شاعر احمد کا ذاتی دکھ، ماں کی رحلت کا دکھ، آفاقی دکھ بن گیا ہے۔

مری بہنو!

مرے سینے میں تو دل کی جگہ پتھر دھڑکتا ہے
مرے تھمے کے آنسو بھی، تمہارے نام لکھے ہیں

مری بہنو!

اسی انداز سے روؤ، مگر کچھ زور سے روؤ
کہ اس ماتم کی آوازیں، مرے پتھرائے کانوں کو
نہ جانے کیوں ابھی معصوم لگتی ہیں
کوئی بتلائے، اس [illegible]، اس [illegible] سے
مجھے کس بات کی تسکین ملتی ہے
مرے سینے میں تو دل کی جگہ پتھر دھڑکتا ہے

لمحہ تیار ہے لیکن، ابھی کچھ دیر میرے گھر ہی
بوڑھی برکتوں کا ابر رہنے دو
لمحہ تیار ہے، بیٹوں کی آنکھیں خشک ہیں، لوگوں کو جلدی ہے
کہ میرے غمگسار اپنے بہت سے کام دھندے چھوڑ آئے ہیں
تمہی سوچو! جنازے کون تمہارے کے قبرستان پہنچائے

مری بہنو!

تم اپنے سر اور سینے سے ٹکراؤ
کہ اس سینے میں بھی دل کی جگہ پتھر دھڑکتا ہے
مرے آقاؐ!

مری ماں نے اذانوں کے جلو میں مجھ کو چھوڑا ہے
مرے آقاؐ!

مری ماں منزلوں کے پالنے والے کا شفقت ریز سایہ تھی
مرے آقاؐ!

یہ بوڑھی ہڈیاں اولاد کی چاہت کی چکّی میں بڑی محنت سے پس کر بھربھری ٹھہریں
مرے آقاؐ!

یہ بوڑھی انگلیاں راتوں کو سپنے کاڑھتی تھیں
تاکہ دن نکلے تو ان کے رنگ میرے روپ میں تعبیر ہو پائیں
مرے آقاؐ!

یہ آنکھیں صرف میری راہ تکتی تھیں
سبھی گلیاں مرے گھر کی طرف آتی تھیں لیکن میں نہ آتا تھا
مرے آقاؐ!

بھرے گھر میں، فقط یہ بوڑھی آنکھیں میری آنکھیں تھیں
کھٹی کی سرسراہٹ تک بوڑھے کھول دیتی ہے
یہ آنکھیں بار بار اس طرح کھلتی ہیں کہ گویا ان میں
اب تک نور باقی ہے، یہ مجھ کو دیکھ سکتی ہیں
مرے آقاؐ!

یہ لب وہ پھول سے لب ہیں کہ جو اپنی دعاؤں کی مہک کو
روز اک بالکل نئی، لیکن بسی فرما کہانی کے بدن میں یوں
لپیٹ دیتے کہ یہ خوشبو مرے کانوں کے رستے جان و تن کے
آخری تاریک گوشے تک پہنچ جاتی، مرا ہر موئے تن یکسر
معطر کر کے سو جاتی کہ میں جب صبح دم اٹھوں تو یہ
خوشبو مرے دل کی مہک بن کر مجھے مہکائے رکھے اور دن
رنگ بھری کے دریاں باریک سے خط پر بہت ہموار
قدموں سے گزر جائے
مرے آقاؐ!

یہ پھولوں سے بھی نازک ہاتھ میری ڈھال تھے
ان میں دعا کے رنگ کھلتے تھے، یہ رنگ ان بوڑھے ہاتھوں سے
دعا بن بن کے اڑتے تھے
مرے آقاؐ!

یہ فانی ہاتھ اک اللہ پر کامل توکل کی توانائی سے اُٹھتے تھے
مرے آقاؐ!

میں جو کچھ ہوں، مرے مولا کی رحمت، آپؐ کی اُلفت
اور اس کے بعد میری ماں کی محنت اور شفقت کا نتیجہ ہے
مرے آقاؐ!

مجھے ربِ دو عالم پر توکل، آپؐ کے کردار کے سائے میں، جینے کی تمنا
اور انسانوں کی عزت اور دنیا میں فقط محنت کے رستے
آگے بڑھنے کے سبق، مجھ تک مری ماں کے وسیلے سے ہی پہنچے ہیں
مرے آقاؐ!

میں اپنے پالنے والے سے پہلے، آپؐ کے بابِ شفاعت پر
یہ بوڑھی ہڈیاں لے کر کھڑا ہوں تاکہ میں اپنے وسیلے کے لئے
اُس شفاعت کی ضمانت مانگ لوں، اور آپ کی
اُس شفاعت کے بھروسے پر میں اپنے پالنے والے
سے اپنی ماں کی خاطر جنت الفردوس کا طالب بنوں
اپنے وسیلے کے لئے ربِ محبت سے بخشش مغفرت چاہوں
مرے آقاؐ!

اجازت دیں، لحد تیار ہے، لوگوں کو جلدی ہے
کہ میرے غمگسار، اپنے بہت سے کام ادھورے چھوڑ آئے ہیں
مرے آقاؐ!

اجازت دیں، میں اپنی ماں کو مٹی میں سلا دوں
آپ کو اپنے بہت پیارے چچا کا واسطہ ہے
حضرت حمزہؓ کی بے پایاں وفا کا واسطہ ہے
میرے آقاؐ! مجھ کو مت دیکھیں کہ میں نے
اپنی بوڑھی ماں کی بوڑھی چھاتیوں سے خون نچوڑا ہے
مگر مجھ کو اذانوں کے جلو میں اس نے چھوڑا ہے

دوسری نظم "جہانِ بابا کیسے" میں خالد احمد ایک فلسفی شاعر نظر آتا ہے۔ اس میں فلسفۂ زمان و مکان جاری و ساری ہے۔ قوموں کے عروج و زوال اور سانحات عمل کو تاریخی تناظر میں بیان کیا گیا ہے۔ خالد احمد کی شاعری اور تنقید پر سیر حاصل بات تو کوئی پڑھا لکھا نقاد ہی کر سکتا ہے۔ یہاں تو ایک دوست کی حیثیت سے، ادب کے ایک عام قاری کے نقطۂ نظر سے بات کی ہے اور

دنیا فقط گماں ہے، سب کچھ درونِ جاں ہے
جاگو ضرور خالد، آنکھیں مگر نہ کھولو

(فنون، جولائی - دسمبر ۹۳ء)

خورشید رضوی

مناجات

کبریائی کی ردا عرشِ بریں پر رکھ کر
بے نیازی کی ادا صرفِ کرم کرتے ہوئے
زینہ زینہ کبھی لاہوت کی رفعت سے اتر

وسعتِ عرصۂ کونین سے کتراتے ہوئے
یوں مرے دل کی جراحت میں سمٹ آ جیسے
جیسے خوشبو کسی غنچے میں سمٹ آتی ہے

ہے مرے ظرف سے باہر تری عظمت کا تضاد
چھوڑ دے میرے لیے اپنے تنوع کا جلال
ایک ہی رنگ میں کچھ دیر مرے پاس ٹھہر

بے زبانوں کے لیے دل میں چھپے پیار کا رنگ
سنگ میں محوِ نمو سبزۂ کہسار کا رنگ
دل پہ مرہم کی طرح پرسشِ غمخوار کا رنگ

یوں تو تو کون سے منظر میں نہیں ہے لیکن
میری درماندگی، محدودی، مجبوری کی آنکھ
بس اسی ایک دریچے میں تجھے مانگتی ہے

انور شعور

○

سب کچھ تھا مگر کوئی نہیں تھا
سایہ تھا وہ آدمی نہیں تھا

تھی جس سے امیدِ معذرت کی
اس شخص کو یاد بھی نہیں تھا

آدم کے بغیر زندگی تھی
ہنگامۂ زندگی نہیں تھا

چپکے سے گزر گئی جوانی
اعلان تو لازمی نہیں تھا

جس روگ نے میری جان لے لی
وہ روگ مجھے کبھی نہیں تھا

ناقابلِ اعتبار تھا وہ
ناقابلِ دوستی نہیں تھا

اس شے کے خیال میں رہے ہم
جس شے کا وجود ہی نہیں تھا

تھی بات عجب شعور لیکن
اظہار کا وقت ابھی نہیں تھا

(فنون، جولائی۔ دسمبر ۹۳ء)

شوکت ہاشمی

○

گھر سے باہر قدم میں نے رکھا نہیں تھا کہ گھر بجھ گیا
گھر بجھا کر سفر پر روانہ ہوا تو سفر بجھ گیا

ہجر کی شام سے اس تعلق سے خوش تو بہت ہوں مگر
دل میں غم بھی بڑا اس اداسی کا ہے، یہ اگر بجھ گیا

یوں ہوا پھر اسے بھی پرندوں کی ہجرت کے دکھ کھا گئے
صبح اور شہر کے درمیاں زندگی کا شجر بجھ گیا

اے مری روشنی سے بھری زندگی! تیرا ماتم کروں
کیا کہوں، اس چکاچوند میں میرا کیا کیا ہنر بجھ گیا

وہ سفر میں مرا آخری موڑ تھا اور ہوا چل پڑی
آخری موڑ پر کیوں چراغِ سرِ رہگزر بجھ گیا

اُس محبت کے دُکھ کی کہانی مجھے آج بھی یاد ہے
اور کہانی یہی ہے، شگفتہ رہا عمر بھر، بجھ گیا

میں نے سب کو چراغِ نظر دے دیا تھا کہ موسم کھلے
اور موسم کھلا تو مرا ہی چراغِ نظر بجھ گیا

دیر سے گھر پلٹنے کے انجام سے کون واقف نہیں
اے ستاروں کے ہمجو! تجھے کیا خبر، تیرا گھر بجھ گیا

واقعہ یہ ہوا بجھ گیا میں ادھورا سفر چھوڑ کر
سانحہ یہ ہوا، دل مرا بس کسی بات پر بجھ گیا

نیند ڈر کے اس اندھیرے میں شوکت نہیں بجھ رہا
اک دیا جو محبت نے روشن کیا تھا مگر بجھ گیا

○

وہ جو کنجِ شجر چھوڑ کر آ گئے تھے کہاں آ گئے
بدگماں لوگ تھے، دھوپ کے شہر میں بدگماں آ گئے

ہائے کن ساعتوں میں دعا چھاؤں کی مانگتے تھے تم
لوگ سے کر رہے ہیں دھوپ کے سائباں آ گئے

اے زمیں! تیرے ناخلف بیٹے ہیں تیرے بیٹے تو ہیں
دیکھ تو ماں! ترے سامنے ہم بھی گریہ کناں آ گئے

اے اداسی کے موسم کی دشمن ہوا! مت کوئی وار کر
تیرے زنداں میں میرے قبیلے کے سب نوجواں آ گئے

وہ بھی دکھ کو چھپانے کی کوشش میں تھا، روئے ہم بھی نہیں
یہ الگ بات ہے، اشک آنکھوں میں پھر ناگہاں آ گئے

اس بھرے گاؤں کو چھوڑتے وقت تو ہم بھی خوش تھے بہت
آج اس شہر کو دیکھ کر سوچتے ہیں، کہاں آ گئے

ہم نے ان کو مٹانے میں عمریں گنوا دیں مگر ہاشمی
سانحہ یہ ہوا پھر وہی فاصلے درمیاں آ گئے

(فنون، جولائی ۔ دسمبر ۱۹۹۳ء)

سید ضمیر جعفری

○

گردن کٹ گئی کالر سے — ٹینک ڈھلے ہیں ڈالر سے
کتنا سرد اور زرد ہُوا — انساں، انساں کے ڈر سے
اس کا نسخہ اور کوئی؟ — جنگ رُکی کب لشکر سے
مال برآمد کون کرے — نقب لگی ہے اندر سے
دفتر— ہتی کھتی کی — حاکم ہیں سوداگر سے
مشرق مغرب کے مابین — کنوئیں کی جنگ سمندر سے
سورج مانگے ہے کرنیں — چھت لٹکی چمگادڑ سے
دھوپ بھی نکلی نَم نَم سی — بادل بھی کم کم برسے
جانے کب چھوٹے گی جان — دارا اور سکندر سے
گھر کو آگ نہ لگ جائے — ایٹم کے بجلی گھر سے
ماں کہے اس دھوپ میں مانگ — چھاؤں ماں کی چادر سے

میرے شعر کی رُسہ مٹی
جہلم اور گوادر سے

(فنون، جولائی ـ دسمبر ۹۳ء)

ظفر اقبال

○

عداوت سب سے رکھتا ہوں کہ یہ منشور ہے میرا
نشانِ منزلِ مقصود کتنی دور ہے میرا

میں اپنی بات پر خود بھی کبھی رہتا نہیں قائم
سو' جیسا بھی ہے' یہ انداز تو مشہور ہے میرا

بہت ممکن ہے پھر سے آندھیوں کی زد میں آجائے
وگرنہ اس برس بھی ٹہنیوں پر بور ہے میرا

میں اپنے معجزے کی خود وضاحت کیا کروں آخر
کہ یہ میری روایت ہے نہ یہ دستور ہے میرا

مسافت پر نکلنے کا ابھی سوچا ہی تھا میں نے
جو دیکھا تو بدن سارا تھکن سے چور ہے میرا

سبھی کے سامنے ہے صورتِ حالات جو بھی ہے
لب خاموش ہیں اس کے' دل رنجور ہے میرا

مسائل اپنے اپنے تھے' ضرورت اپنی اپنی تھی
نہ میں ممنوں ہوں اس کا' نہ وہ مشکور ہے میرا

کہیں پر بھی کوئی اب میری گنجائش نہیں باقی
زمیں مشکل میں ہے' اور' آسماں مجبور ہے میرا

ظفر' تعبیر ایسی کررہا ہوں خوابِ ہستی کی
کہ جس میں بادشاہِ وقت خود مزدور ہے میرا

○

کہیں جانے سے ہوا' اور' نہ آنے سے ہوا
کچھ ہوا بھی تو کسی اور بہانے سے ہوا

فائدہ رازِ دلِ زار کسی صورت بھی
نہ بتانے سے ہوا ہے نہ چھپانے سے ہوا

کچھ سمجھ آپ بھی آتی گئی اس کو آخر
اور' قائل بھی وہ کچھ پاس بٹھانے سے ہو

راہ سے دل کو ہٹایا تو کہیں بات بنی
ربطِ خاص اک یہی دیوار گرانے سے ہوا

تھا اندھیرا بھی کسی اور طرح کا اب کے
گھر یہ روشن بھی فقط آگ لگانے سے ہوا

جو کہیں بھی نہیں موجود یہ ہنگامہ تمام
اس کی تصویر ہی دنیا کو دکھانے سے ہوا

سب سمجھتے ہیں کہ اس بار تو برپا یہ فساد
رنگ پر اور کوئی رنگ جمانے سے ہوا

جمع پونجی تو بہا لے گیا میری بھی وہ ساتھ
یعنی نقصان بھی طوفان اٹھانے سے ہوا

منکشف اس پہ مرا شوقِ ملاقات، ظفر
دور رہنے سے ہوا، آنکھ چرانے سے ہوا

○

برا سمجھوں اسے اب یا کہ اچھا کرچکا ہوں
وہی کافی ہے جیسا اور جتنا کرچکا ہوں

کیا ہے جو بھی کچھ، یہ دردِ سر میرا نہیں ہے
کہ ایسا کرچکا ہوں کہ یا ویسا کرچکا ہوں

مری دانست میں تو کارنامہ یہ ہے میرا
کہ میں کچھ کر گزرنے کا ارادہ کرچکا ہوں

بھلا اب اور کیا کرنے کی ہو مجھ سے توقع
اسے دیکھا ہے اور اس کی تمنا کرچکا ہوں

مجھے وہ کام کرنے کے لئے اب کہہ رہے ہیں
جسے میں اپنی جانب سے دوبارہ کرچکا ہوں

کسی صورت مجھے کچھ بھی نہ کرنے دے یہ دنیا
اگر معلوم ہوجائے میں کیا کیا کرچکا ہوں

مجھے توفیق ہی سب سے الگ بخشی گئی تھی
جو یہ سب کررہے ہیں، میں وہ تنہا کرچکا ہوں

بظاہر تو روانی ہی فقط ڈالی ہے میں نے
جو دریا ہی نہیں تھا اس کو دریا کرچکا ہوں

ظفر، اب اور یاران غزل کیا چاہتے ہیں
کہ میں اک بار تو مردے کو زندہ کرچکا ہوں

○

دربدر کوبکو ہوگئی ہے
جو یہاں گفتگو ہوگئی ہے

کچھ نہ کچھ مختلف تھی جو خواہش
اب وہی ہوبہو ہوگئی ہے

صرف دل میں تھی پہلے محبت
اب مرے چار سو ہوگئی ہے

کوئی شوق آشیاں بن گیا تھا
کوئی شے آرزو ہوگئی ہے

ٹھیک تھی سات پردوں میں وحشت
کس لیے روبرو ہوگئی ہے

کچھ نتیجہ تو نکلے گا آخر
جنگ اب دوبدو ہوگئی ہے

چلتی رہتی وہ موجِ ملامت
اب رگوں میں لہو ہوگئی ہے

پہلے میں ہوگیا ہوں کوئی اور
پھر مرے بعد تو ہوگئی ہے

ڈھونڈنے کیا چلے تھے، ظفر ہم
کیا سے کیا جستجو ہوگئی ہے

فنون، لاہور

سید منیر

○

ایک ہی بات ہے، جس رُخ سے حقیقت دیکھو
مجھے دیکھو کہ مرے شہر کی حالت دیکھو

پا بجولاں کی وفا حلقۂ زنجیر میں ہے
مجھے آزاد کرو، پھر مری اُلفت دیکھو

پھر ہوا حکم تو نکلا ہے مرے شہر پہ چاند
شب کے ماتھے پہ لگائی ہوئی تہمت دیکھو

تم جو کرتے ہو ہر اک بات میں مثبت کی تلاش
آؤ دیکھو، مرے انکار کی شدت دیکھو

جسے خود اپنی جفاؤں کی بھی پہچان نہ تھی
اُسے برداشت کیا ہے، مری ہمت دیکھو

وقت بہتا ہے مگر وقت میں گہرائی بھی ہے
رات کے پچھلے پہر درد کی ساعت دیکھو

کوئی دیوار کے اُس پار بھی رہتا ہے منیر
آدمیت کی نظر سے وطنیت دیکھو

(فنون، جولائی۔دسمبر ۹۳ء)

حرفِ اوّل

مندیم

آمریت کی ہوا خواہی کیوں

ہماری ذہنیت کا یہ کتنا المناک رخ ہے کہ جو ملک قائداعظم کی ولولہ انگیز رہنمائی میں جمہوریت کے زور پر اور کروڑوں جمہوری تاریخ ساز تحریک کے نتیجہ میں وجود میں آیا تھا اس میں آمریت کے مرثیہ خوانوں اور نوحہ گروں کا آج بھی بہت زور شور ہے۔ وہ لوگ جو جمہوریت کی بات کرتے نہیں تھکتے تھے اور وہ ادارے جنہوں نے جمہوریت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا آج کل آمروں کا ماتم یوں شدت اور رقت سے کرتے ہیں جیسے پاکستان آمریت ہی کے لیے وجود میں آیا تھا۔ ہمارے معیاروں کا یہ تضاد کتنا دل شکن ہے کہ ہم قائداعظم کی جمہوریت پسندی کا پرچم بھی بلند کرتے ہیں اور ساتھ ہی پاکستان کی تاریخ کے سینے میں خنجروں کی طرح گڑی ہوئی آمریتوں کے جھنڈوں کو بھی پھر لہرا دیتے ہیں۔ صاف مطلب یہ ہے کہ اب ہم قائداعظم کا ذکر محض رسماً یعنی ضرورتاً محض برائے بیعت کرتے ہیں ورنہ دراصل ہم آمریت کی گرفت میں رہنے پر راضی ہیں۔ وہ عناصر جنہوں نے تحریکِ پاکستان اور قیامِ پاکستان کی علی الاعلان مخالفت کی اگر آج آمریت کے سب سے بڑے حامی ہیں تو بات سمجھ میں آتی ہے مگر وہ عناصر جنہیں دعویٰ ہے کہ وہ جمہوریت کو خود آمریتوں کے ادوار میں بھی سر کرتے رہے اور جو اپنے مرحوم سربراہوں کو جمہوریت کے محسن قرار دیتے ہیں، اگر آج محض کسی پارٹی کی مخالفت کے جوش و خروش میں آمروں کو پاکستان کا ہیرو بنا کر پیش کرتے ہیں تو انہیں ایک بار آئینہ ضرور دیکھ لینا چاہیے۔

جمہوریت کا ذائقہ

میرا اندازہ ہے کہ پے در پے مارشل لاؤں کی زد میں آتے رہنے کی وجہ سے ہم آمرانہ طرزِ حکومت کے عادی سے ہو گئے ہیں۔ ہم نے بالکل بے خبری میں تھکی ہوئے غیر محسوس طور پر اسے قبول کر لیا ہے۔ اور نتیجہ یہ بھگتنا پڑا ہے۔ ہم نے اپنی بیتالیس سالہ آزادی میں جمہوریت کا ذائقہ صرف تین بار چکھا ہے۔ قیامِ پاکستان سے اکتوبر ۱۹۵۸ء تک کے جمہوری دور کو ہم نے دستور سازی کے جھگڑوں کی نذر کر دیا۔ اس مختصر مدت میں عام انتخابات کے بغیر ہم نے سات عدد وزرائے اعظم بھگتے ایک وزیرِاعظم کو قتل کیا اور باقی وزرائے اعظم کی چھٹی چھٹی کرتے رہے۔ روایت ہے کہ جب ایک گورنر جنرل نے اس وقت کے ایک وزیرِاعظم کو ہٹانے کا ارادہ کیا تو نئے قائد گورنر جنرل نے وزیرِاعظم کو ڈسمس کر سکتا ہے اور وزیرِاعظم نے جواب دیا کہ جی ہاں کر سکتا ہے۔ اس پر گورنر جنرل نے ارشاد فرمایا تو جاؤ میں تمہیں ڈسمس کرتا ہوں۔ یعنی ہماری اس دور کی جمہوریت کے چہرے پر بھی آمریت کے داغ تھے۔ خدا خدا کر کے ایک بڑا دستور بنا اور اس کے تحت عام انتخابات کی تیاریوں کے سلسلے میں جلوس نکلنے لگے اور جلسے ہونے لگے تو ایوب خان سے تو اس وقت جنرل تھے اور بعد میں فیلڈ مارشل کہلائے، بڑھے اور پاکستان پر قبضہ کر لیا۔

جمہوریت کے ساتھ زیادتی

جمہوریت کا دوسرا دور پاکستان کے پہلے عام انتخابات کے انعقاد کے بعد آیا۔ اسی دور میں ۱۹۷۳ء کا وہ آئین متفقہ طور پر منظور ہوا جس کے بارے میں اس کے مخالفین بھی کہتے تھے کہ ان حالات میں اس سے بہتر آئین مرتب ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ آئین منظوری کے بعد صرف چار برس زیرِ عمل رہا جب یک طرفہ تاریخ ساز تحریک نے جس میں نہ نہ ... بزعم خویش جمہوریت نواز بھی شامل تھے ضیائی آمریت کا راستہ بالکل صاف اور ہموار کر دیا اور وہ مارشل لاء دوبارہ آیا جس نے گیارہ برس تک پاکستان کی غیرت و حمیت کے ساتھ بیت نوازی کا کھیل کھیلا۔ یہ ملک محض آمرانہ اقتدار کی

وجہ سے پوری دنیا میں بدنام ہوا۔ اس دور میں عوام کے ایک نہایت محبوب رہنما کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ پھر اس آمریت نے ریفرنڈم کا ڈھونگ بھی رچایا اور غیر جماعتی انتخابات کا بھی انعقاد کر کے جمہوریت کی روح کے پرخچے اڑا دئے گئے۔ پھر اسی غیر جماعتی اسمبلی میں جماعت بھی بنا دی گئی اور بعد میں اسی اسمبلی پر بعض الزامات عائد کر کے اسے برطرف بھی کر دیا۔

آج کا جمہوری دور

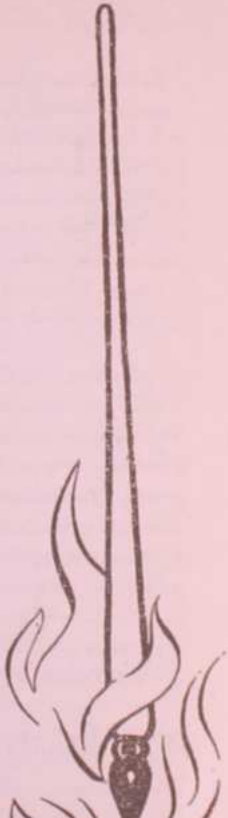
تیسرا جمہوری دور وہ ہے جو ابھی جاری ہے۔ اس جمہوری دور کو تین مارشل لاؤں کے ملبے پر پاکستان کی تعمیر نو کا مرحلہ کہنا چاہئے۔ اور یاد رہے کہ یہ تین مارشل لاء پاکستان کی تاریخ کی نصف مدت پر پھیلے ہیں۔ چنانچہ اس ملبے کو ہٹانے اور منظر کو صاف کرنے اور تعمیر نو کی بنیادیں رکھنے اور ایک آزاد اور جمہوری، اسلامی عوامی مملکت کی فلک بوس عمارت کھڑی کرنے میں کچھ وقت تو لگے گا مگر سب کی یہ دعا ہونی چاہئے کہ یہ وقت زیادہ طویل نہ ہو اور ترسے ہوئے عوام، تنگ آئے ہوئے عوام، گرانی اور بدعنوانی اور رشوت ستانی کی چٹانوں تلے کچلے ہوئے عوام اپنی آزاد مملکت میں ایک بار تو آزادی سے سکون کا سانس لے سکیں۔

آمریت نے بھی عوام کے طرز فکر کو بدل ڈالا ہے۔ ابھی تو نہیں مگر ان کا ایک حصہ کہتا ہے کہ مارشل لاء کا دور اس سے بہتر تو نہیں لگایا جاتا۔ اور اگر انتخابات میں ایسے لوگ بھی منتخب ہو کر آ جاتے ہیں جو محض اپنی زمینوں کے بل پر، اپنی صنعتوں کے بل پر، اپنے مال و دولت کے زور پر، اپنے پیروں کی مریدی کے بل پر کامیاب ہونے میں تو ہمارا کیا ہے، ہمیں تو دو وقت کی روٹی چاہئے۔ وہ فلاں یا فلاں ہو تو ٹھیک ہے — سب ٹھیک ہے۔ ہم سے نمائندوں کو خدمات کی کسوٹی پر رکھنے کے ٹیسٹ نہیں پائے جاتے — اس طرح کی ذہنیت سراسر آمریتوں کی پیدا کردہ ہے اور یہ بہت خطرناک ذہنیت ہے۔

افہام و تفہیم کی ضرورت

یہ منفی ذہنیت اگر کسی قوم کے ذہن و ضمیر پر قابض ہو جائے تو یہ قوم بے حس ہو کر رہ جاتی ہیں اور تاریخ میں کوئی ایک بھی ایسی مثال موجود نہیں ہے کہ کسی بے حس قوم کی آزادی زیادہ دیر تک محفوظ رہی ہو۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ذہنیت کو ختم کیسے کیا جائے۔ تو یہ کام تو صرف سیاسی جماعتیں ہی کر سکتی ہیں بشرطیکہ وہ کسی بے حسی اور عناد کا شکار نہ ہو گئی ہوں۔ یہ بے حسی محض اخلاقی نعروں یا کسی فوج یا ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے سے ختم نہیں ہو سکتی۔ اس بے حسی کا واحد علاج افہام و تفہیم کی وہ فضا ہے جو پاکستان کی وزیر اعظم نے جگہ جگہ کی تقریروں میں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے پاکستان بھر کی سیاسی جماعتوں کے ساتھ جس فراخ دلانہ سلوک کا مظاہرہ کیا ہے اس کی وجہ سے خدا کرے چڑھی ہوئی تیوریاں اتر جائیں، بھینچے ہوئے جبڑے کھل جائیں اور تنے ہوئے اعصاب پرسکون ہونے لگیں۔ اگر ہم سبھی یہ طرز فکر اختیار کریں — اگر صوبائی خود مختاری اور علاقائی مسائل اور زبانوں کے سلسلے میں ہم اتنے ہی فراخ دل ہو جائیں، اگر ہر صوبے کے باشندوں کے حقوق کے تحفظ کو ہر حکومت اپنا ایمان بنا لے، تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ملک جو ایک زبردست جمہوری تحریک کی برکت سے وجود میں آیا ہو، ایک متوازن جمہوریت کا خوبصورت نمونہ نہ بن جائے۔ اگر ہم مذہبی، علاقائی، لسانی اور گروہی تعصبات کو جھاڑ دیں، ذات کو مملکت پر فوقیت دینا ترک کر دیں اور پاکستان کی آزادی کی غیر مشروط دوستی کی قسم کھائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم وہ منزل نہ پا لیں جس کی قائد اعظم نے واضح طور پر نشان دہی فرما دی تھی۔

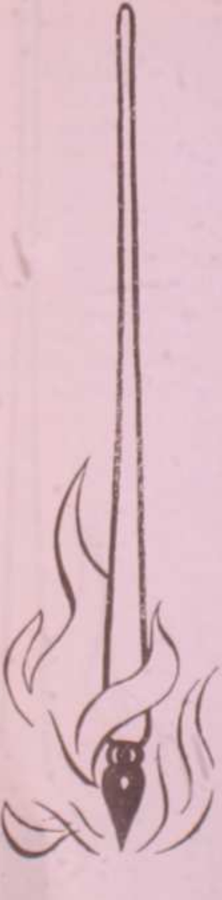
(فنون، جولائی - دسمبر ۹۳ء)



ایک ایک پائی وصول کرلی جائے

معین قریشی صاحب کی نگراں حکومت نے بحالت مجبوری مارچ 85 سے جون 93 تک کے ساٹھ ہزار سے زیادہ نادہندگان کی ستو سو صفحات پر مشتمل فہرست شائع کردی ہے ان پر اسی ارب روپے واجب الادا ہیں اس فہرست میں باربار اپنے قرضے معاف کروالینے اور پھر مزید قرضے لے لینے والے ہی گرامی افراد بھی شامل ہیں مگر یہ سب کے سب بالائی استحصالی طبقوں سے تعلق رکھنے والے ہی ہیں۔ نچلے اور درمیانے درجے اور طبقوں کے ضرورت مند کاروباری لوگوں میں سے کوئی نہیں ہے۔ کہا جارہا تھا کہ ان نادہندگان کے نام فاش اور ظاہر کرنا بینکوں کے اس قانون رازداری کی خلاف ورزی ہوگی جو بین الاقوامی سطح پر نافذ و مروج ہے مگر پھر نہ معلوم مصلحتوں کے تحت یہ کہنا سننا ختم کرکے وہ کارنامہ سرانجام دے ہی دیا گیا جو پاکستان کے اب تک منتخب حکمران نہیں دے سکے تھے بلکہ ہم تو ان حکمرانوں کے یہ بیانات بھی پڑھتے اور سنتے کے گناہ گار و سزاوار ہیں کہ سارے مخالف حکمران ایک دوسرے کو یہ دھمکیاں دیا کرتے تھے کہ "باز آجاؤ" حد سے آگے نہ بڑھو ورنہ ہم قرضہ جات معاف کرانے والوں کے نام شائع کردیں گے۔ خیر ہم نے تو بزرگوں سے یہی سنا ہے کہ "نصف سچائی" مکمل جھوٹ سے بدتر ہوتی ہے۔" لہٰذا نگراں حکومت سے ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ قیام پاکستان سے لے کر مذکورہ تاریخ تک کی مدت پر کس مصلحت کے تحت توجہ نہیں کی گئی؟ ساتھ ہی ساتھ یہ حکومت اس کھلے راز سے بھی پردہ اٹھائے کہ ان قرضہ جات کی رقم دس لاکھ اور اس سے اوپر کیوں مقرر کی گئی؟ اور اس بنیادی سوال کا جواب بھی دینا اسی حکومت پر واجب ہے کہ یہ قرضے کس نے دلائے اور کس نے معاف کرائے تھے؟؟؟ جب پینڈورا بکس کھل گیا تو ڈر یا احتیاط کیا معنی؟

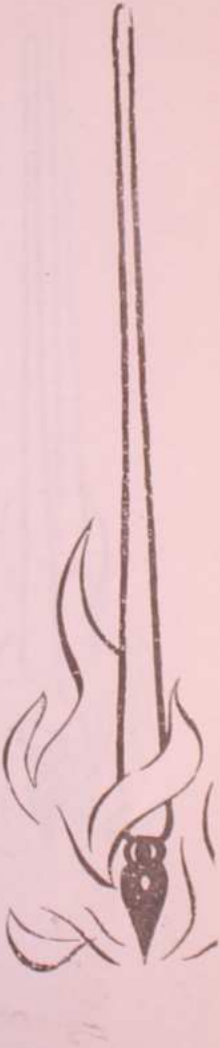
ہمیں فخر ہے کہ ماضی میں ہم نے ہر خلیفۂ وقت کو للکارا' برملا کہا کہ اقتدار کے حمام میں سب ننگے ہیں' بروقت لکھا کہ چور کو چور کہنے اور یہ کہہ کر پکڑنے والے منتظر خود بھی چور ہیں مگر کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی آج اس مظلوم قوم کے جسم سے جب خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لیا گیا ہے' اس کی ہڈیاں تک چچوڑ لی گئی ہیں اور حرام کھانے والے حکمران گروہوں اور بے حس' بے وقعت و رذیل انسانوں کی جب ان کی اپنی لوٹ کھسوٹ کی معیشت بھی چرا چرا کر رہ گئی ہے تو نگراں حکومت کا نسخہ استعمال کیا جارہا ہے' غیر جانبدار بننے کا دعویٰ کیا جارہا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ قاتلوں' ٹھگوں' ڈاکوؤں' لٹیروں' چوروں' ذخیرہ اندوزوں' کھلے وطن دشمنوں اور عوام کے غداروں کے ساتھ غیر جانبداری کیا مطلب' مفہوم اور معنی رکھتی ہے؟ "غائب خزانہ" بھرنے کے لئے ٹیکس پر ٹیکس لگانے' بنیادی ضروریات زندگی کی اشیاء کی قیمتیں مسلسل بڑھانے' علم و ادب و ثقافت کے لئے ترسنے والوں کو مزید ترسانے' علاج معالجے' پڑھنے پڑھانے' روزگار کی خاطر آنے جانے کے وسائل' ذرائع اور مواقع کو محدود سے محدود تر کرنے کو غیر جانبداری نہیں کہتے' جن کے پاس ملک و قوم اور عوام کی اربوں کھربوں کی رقومات چھپی ہوئی ہوں' ان کو انتخابات میں محض منتخب ہونے سے روکنے کو غیر جانبداری قرار نہیں دیا جاسکتا' وہ خود نہیں آسکیں گے تو اپنے بھائی بند یا پیارے کو آگے بڑھادیں گے یہ بھی نہیں کرپائیں گے تو منتخب ہوکر آنے والوں کو خرید لیں گے اور تو اور خود منتخب پارٹیوں کی بولی لگادیں گے۔ انہیں کیا فرق پڑے گا' الہ دین کا چراغ تو ان ہی کے ہاتھ میں ہے۔ قوت خرید تو ان سے نکلی ہی نہیں گی۔ ایک دم روشنی پھیلا کر اور انہیں چندھیانے سے بات نہیں بنے گی۔ ڈگڈگی بجانے سے کام نہیں چلے گا۔ حرام مال کی تھیر مثلاً پڑے گی' دھالی پڑے گی' غضب خدا کا' کس کے یہ بھاری قرضے ڈکار لیئے عوام کا پورا کا پورا سارا کا سارا مال کھائے بیٹھے ہیں اور پھر بھی دندناتے پھر



دب سار۔ کوئی پکڑ دھکڑ نہیں، کوئی وارنٹ نہیں، وصولیابی کے لئے کوئی مہم اور تیز تر نہیں۔ بیشتر حضرات معمولی قرض کی ادائیگی نہیں کرپاتے تو ان کے بال بچے بلکہ گھر بار اور نسلوں کی نسلیں، یرغمال اور غلام بنائی جاتی ہیں۔ اسمبلی میں حالانکہ ان کی آزادی اور بازیابی کا قانون بھی پاس ہو چکا ہے مگر عملاً لاگو نہیں ہوا۔ وہ جب بھی بیگار کرتے تھے اب بھی زندہ درگور ہیں مگر جتنے بڑے نامور بادشاہ سے اب بھی اس سلطنت خداداد کے محل اور حقیقی رکھوالے بنے ہوئے ہیں۔ ہم اور آپ سب کے سب اور ساری دنیا کہہ رہی ہے کہ نگران حکومت نے ان کے نام شائع کرکے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے مگر جن معصوم عوام کا ان بے حسیوں نے مال ہڑپ کیا ہے ان کو تو صحیح معنوں میں پتہ ہی نہیں ہے کہ کالے چور آخر کون ہیں۔ ناخواندگی کی شرح تو خیر کوئی ڈھکی چھپی نہیں، خود خواندہ لوگوں میں سے کتنے لوگ اخبارات اور رسالے خرید اور پڑھ پاتے ہیں پھر کس کو کس کا نام معلوم ہے، ضرورت تو اس بات کی ہے کہ ان تمام قومی مجرموں کا اشتہار کرنے کے لئے قومی سطح پر اخبارات، رسائل اور ٹی وی پر بھی صاف ستھری تصاویر مسلسل اور لگاتار چھاپی جائیں، بچوں کو بتایا جائے، اسکولوں میں نصاب کیا جائے، سرعام ان کی شناخت پیدا کروائی جائے تاکہ وہ جاگرتی، وہ شعور پیدا ہو جو کسی بیدار قوم کی لازمی خصوصیت ہوا کرتی ہے اور ہر ایک کو معلوم ہو جائے کہ انسانوں کو صرف ذلیل کتے، گدھے اور سور ہی چرند پرند ہی نہیں ان کی اپنے جیسے ہاتھ پاؤں رکھنے والے انسان نما حیوان بھی کھا جاتے ہیں، کیا عجیب ہے، انسانی معاشرے کو طبقاتی طور پر تقسیم کرتے ہیں، کیا اونچ نیچ کے قائل ہیں، کیسی جور ستم اور ظلم و تشدد مسلط کرتے اور روا رکھتے ہیں۔ ان کے ساتھ کوئی رعایت، رحم و عافیت خود جرم ہے، بدوں کے ساتھ نیکی بھی نیکوں کے ساتھ بدی ہے۔ موجودہ نگران حکومت کی ذرا کاوشات اور نیچ ہائے، جل حل اور ایک ارب میں ناموں کی عام اشاعت سے صاف انکار اپنی جگہ خود سی چیز ہے۔ انتقالی قواعد کی پیچیدگی اور محکموں کے دباؤ کی وجہ سے یہ کام اب ہو ہی گیا ہے تو اپنے منطقی نتیجے تک اسے پہنچنا ہی چاہئے۔ خالی خولی فہرستیں چھپ دینا کوئی معنی نہیں رکھتا اس سے پہلے بھی قرضوں کی فہرستیں چھاپ دی گئی تھیں، جتنے بڑے نادہندوں کی نگرانی میں کہیں کام کے گھپلے تھے اور تو اور عدالتوں نے بھی وقت گزرنے کے بعد ریکارڈ UP TO DATE کر لئے تھے، سو بات اس طرح نہیں بنے گی قوم کا مال آج اگر سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے تو ٹیڑھی انگلیوں سے نکالا جانا چاہئے

بے نظیر اور نواز شریف نے عمرو عیار کی زنبیل کی طرح اس طول طویل زنجیر نما فہرست کی اشاعت پر خیر مقدم کا فرض تو ادا کر دیا مگر سوال یہ ابھرتا ہے کہ انہوں نے اپنے اپنے دور اقتدار میں یہ کارنامہ انجام دے کر خود شاباشی کیوں نہیں لی؟ اب بے نظیر معترض ہیں اور پوچھ رہی ہیں کہ سامنے سے عوام صادق کے زمانے میں 20 کروڑ روپے کے قرضے لینے والوں کے نام کیوں نہیں دیئے گئے مگر پہلے وہ خود بتائیں کہ سہولت کے لئے حاصل کیا جانے والا دس لاکھ روپے کا قرضہ انہوں نے کیوں معاف کروایا؟ زرداری کو وہی پہلا پتھر مار سکتا ہے جس نے خود کوئی زنا نہ کیا ہو۔ میاں صاحب الٹی کے ہمراہ معظم کے خلاف جہاد کیا خود ایک اتفاق تو مگر اس طرح قرضے معاف کرا کوئی شان نہیں، یہ تو بہت چونکانے والی بات ہو گی۔ پھر معاملہ قرضوں تک ہی محدود نہیں، پلاٹوں کے الاٹمنٹ کا دھندہ بھی درمیان میں ہے، سیاسی کارکنوں اور رہنماؤں کو قربانی کے صلے میں دار و رسن اور جرأت و وفائی کے انعام پر قتل و غارت گری کے دادا گیر اور اختلافات انتہائی فلاح و بہبود اور عوامی سیاست سے تعلق نہیں رکھتے، یہ ذاتی وفاداری کی تعلیمات عام کرنے اور

سیاسی مخالفوں کی پرورش کے طور طریقے ہیں یہ پورے کے پورے معاشرے کو CORRUPT کرنے کے روایتی اور جدید ترین سہل و مجرب ہیں، دوسرے ملکوں میں کوئی ایک فرد یا کچھ لوگوں کا کوئی GANG تو رسوائے زمانہ اسکینڈلز میں ملوث ہوتے دیکھا اور سنا ہے مگر اپنے



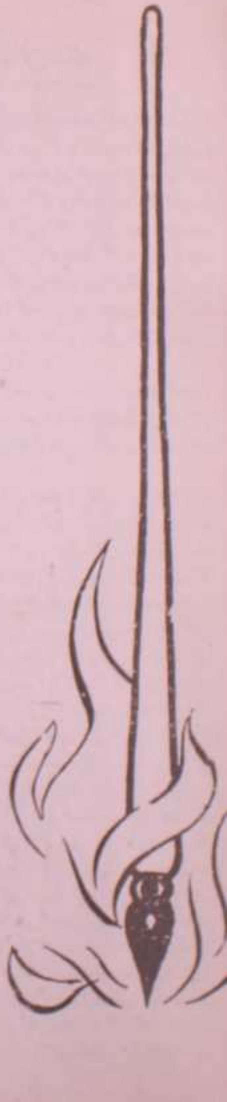
پاکستان میں اس طرح اونچی اونچی دستار والوں، کلف لگی ہوئی خاکی اور سفید وردی پوشوں، معیشت کے کلیدی حکمرانوں، صحافت کے مرکزی اجارہ داروں، سیاست، سماجی خدمت اور مذہب کے روشن میناروں، انتظامیہ، عدلیہ اور مقننہ کے صاف شفاف ستونوں کے اس طرح اس گندگی میں لت پت ہونے اور منہ مارنے کے متعلق سوچا بھی نہیں تھا کہ ان میں سے بھی وہ محو کرتے جا رہے ہیں اور کبھی یہ مزارات پر چادریں چڑھاتے دکھائی دے رہے ہیں مگر خدائے بزرگ و برتر کو اچھی طرح علم و خبر ہے کہ حقوق العباد غصب کرنے والے قابل معافی ہیں یا گردن زدنی؟!

بچپن میں ایک کھیل کھیلا کرتے تھے چھپن چھپی کتنا پانی؟ یہاں تو نہ کوئی پوچھنے والا ہے نہ بتانے والا، سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ڈراما اور یہ کھیل کھیلنے والوں نے کس بل گردے کے ساتھ اتنے دنوں تک کیونکر یہ کھیل کھیلا؟ اب جب کہ یہ کھیل کھلا ہی جا چکا ہے تو پہلی فرصت میں پوری سخت گیری کیساتھ اسے ختم کیا جانا چاہئے۔ ان سارے پلاٹوں کو اصل مارکیٹ قیمت کے حساب سے از سرنو فروخت ہونا چاہئے اور ہر طرح کے شعبہ میں اتنے بڑے بڑے ہر بدعہد کے ساتھ کوئی ہمدردی یا ترجیحی سلوک کئے بغیر تمام اثاثے ضبط کئے جانے چاہئیں سب سے پہلے بینکوں کا پورا نظام درست کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ مالیاتی ادارے آج کے دور میں ہر قوم کی شہ رگ کی حیثیت رکھتے ہیں اگر یہی مفلوج کر دیئے جائیں، اگر انہیں کو کاٹ ڈالا جائے تو کوئی کیونکر زندہ رہے گا؟ ڈاکو تو چوکیداروں اور پولیس والوں کو مارنے اور خود مرنے کی ہمت کر کے بنکوں پر ڈاکہ مارنے آتے ہیں، اگر پکڑ لیئے جائیں تو ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑ کر سلاخوں کے پیچھے رکھ کر پھانسی کے پھندے پر چڑھا دیئے جاتے ہیں اور اس دوران انہیں عدالتوں میں بھی گھسیٹا جاتا ہے اور ابلاغ عامہ میں بھی مشتہر کر کے ذلیل و رسوا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جاتی مگر ہمارے یہ مہذب اور یہ شرفاء، یہ نادہندہ اور یہ قومی مجرمیں کس شان سے گلچھرے اڑانے اور داد عیش و عشرت دینے میں ہمہ تن مصروف و مشغول ہیں پھر بنکوں میں اندر بیٹھ کر اور جنجوری لے کر ڈاکہ مارنے والوں کو کیا ڈاکو نہیں کہا جائیگا؟

عموماً کہا جاتا ہے کہ قوم بچت ہی نہیں کرتی، کفایت شعاری کی عادی نہیں ہے، درآمد برآمد سے زیادہ ہے، بتانے والے بتائیں کہ جب بینکوں کی کارکردگی مشتبہ ہو، قرضہ دینے اور معاف کرنے میں کمیشن کے جلوے صاف نظر آرہے ہوں، لوگ علی الاعلان کہتے ہوں کہ بینکوں کے چھوٹے یا بڑے قرضے ادا کرنے کے لئے تھوڑی لئے جاتے ہیں تو بچت کیوں کر ہو؟ کون کرے؟؟ اور بچت کنندگان کو کیا ملے گا؟؟؟ پھر کوآپریٹو اداروں، تاج کمپنی جیسی مالیاتی کمپنیوں، ڈرگ مافیا کی فہرست اور رقومات الگ ہیں۔ مہران بینکوں کے معاملات جدا ہیں۔ ان سب میں بدعنوانی، بدانتظامی اور جعلسازی کے ذمہ داروں نے معیشت، سیاست اور معاشرت کے کیا کیا گل نہ کھلائے ہونگے۔

قوم کے ان کپوتوں کے سارے کرتوت سامنے ہیں، گندگی اور نجاست سطح آب پر تیر رہی ہے۔ ضرورت بہت مردانہ وار کی ہے، جھاڑو دینے اور صفائی کرنے کی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ نگران حکومت کو انتخابات کروانے کا مینڈیٹ دیا گیا مگر ہمیں معلوم ہے کہ انتخابات کے بعد بننے والی حکومتیں یہ کام نہیں کریں گی اور نہ کرنے دیں گی اس لئے انتخابات کے ساتھ ہی ساتھ، انتخابات سے زیادہ ضروری کام بہرحال اور بہرصورت کر لینے چاہئیں۔

شیر شاہ سوری سے جان بچا لینے پر مغل بادشاہ ہمایوں نے نظام سقہ کو اپنے دوبارہ تخت نشین ہونے پر ایک دن کی بادشاہت کا موقع عنایت کیا تھا تو اس نے چام کے دام چلا کر تاریخ میں اپنا نام محفوظ کر لیا پاکستان کی فوج، حزب اقتدار، حزب اختلاف اور ان سب کے اندرونی و بیرونی اتحادیوں نے معین قریشی صاحب کو خود اپنے تمام تنازعات سے بچنے بچانے کے لئے، منصفانہ، غیر جانبدارانہ، آزادانہ اور صاف و شفاف انتخابات کرانے کی ذمہ داری متفقہ طور پر سوچتے ہوئے تین ماہ کی عبوری حکومت کا موقع دیا ہے، انہیں چاہئے کہ وہ تمام الجھی گتھیوں اور سارے



معترضین کی لن ترانیوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیں اور صرف اپنے اس ضمیر کی آواز سنیں جس نے انہیں سٹیٹ بینک کو آزاد و خود مختار ادارہ بنانے' بغیر زر مبادلہ کے دھڑا دھڑ نوٹ چھاپنے کی ممانعت کرنے' زرعی ٹیکس لگانے' نادہندگان کی فہرست چھاپنے' ملت اور اونے پونے سرکاری اراضی اور پلاٹ الاٹ کرنے کرانے والوں کو بے نقاب کرنے اور تین مہینوں کے اندر اندر انتخابات کروا کر واپس چلے جانے کی تلقین کی ہے۔ جب وہ یہ آواز ذرا اور غور سے سنیں گے تو انہیں یہ بھی سنائی دے گا کہ قومی دولت میں خیانت کرنے والوں سے مطلوبہ وصولیابی کئے یا انہیں کیفر کردار تک پہنچائے بغیر مذکورہ سارے کام بیکار اور لاحاصل ہیں اور بین الاقوامی سطح کا ان جیسا ماہر معیشت بحسن و خوبی سمجھتا ہے کہ اصل منافع کے بغیر یہ سارے بیکار اور لاحاصل کام ان کی ذات' صحت' ساکھ اور تجارت کے لئے کتنے نقصان دہ ہوں گے؟

نگران کابینہ کے علاوہ موجودہ فوجی سربراہوں سے بھی ہمارا یہ کہنا ہے کہ بلاشبہ آج کل تو وہ سرحدوں کے تحفظ کی اصل' بنیادی اور مرکزی ذمہ داری ہی نبھا رہے ہیں مگر نگران کابینہ کا وجود اور بھرم بھی دراصل انہیں کے دم سے ہے' ملک کے اندرونی مسائل کی ذمہ داری براہ راست تو وہ نہیں سنبھال رہے مگر در پردہ وہ یقیناً ایک ایک بات سے باخبر بلکہ ہر بات کے ذمہ دار ہیں۔ سو انہیں بھی تاریخ برصغیر کے وہ اسباق ضرور ذہن میں رکھنے چاہئیں جو یہ بتاتے ہیں کہ ٹیپو سلطان اور سراج الدولہ جیسے محب وطن اور باصلاحیت حکمران' جعفر و صادق جیسے اندرونی غداروں کی وجہ سے بیرونی سامراجیوں سے مات کھا گئے تھے!

(منشور، اگست ۹۳ء)

اداریہ

یہ تو ہاتھ کی صفائی ہے

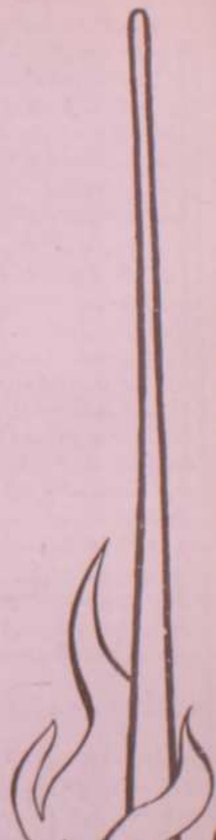


پہلے تو شیر مزاری نہیں تو معین قریشی صاحب کی نگران حکومت سے متنازعہ انتخابات کروا کر مطلوبہ نتائج حاصل کر لئے گئے ہیں۔ غلام اسحاق' اجلال حیدر زیدی اور روئیداد خاں وغیرہ کی خواہش پوری ہو گئی ہے لانگ مارچ اور ٹرین مارچ کامیاب ہو گئے ہیں' این۔ ڈی اے اور اے۔ پی۔ سی کو ان کی تشکیل کا مقصد پورا کر کے توڑا اور غیر موثر کیا جا چکا ہے اور کمانڈر انچیف کی بھاگ دوڑ ٹھکانے لگ گئی ہے دامین کے قاتلوں کی تلاش بدستور سرگرمی سے جاری ہے۔ بلدیاتی ادارے توڑنے کی ترکیب کارگر ثابت ہو گئی ہے' اب احمد صادق محض سندھ کے چیف سیکریٹری نہیں رہے' وفاق کے پرنسپل سیکریٹری بنا دیئے گئے ہیں سندھ میں' آپریشن کلین اپ کا تسلسل قائم ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ۱۹۹۰ء کے انتخابات کی بینئہ دھاندلی "ثابت" ہو گئی ہے۔ یہ سب صدفی صد درست تسلیم کر لینے کے باوجود بنیادی طور پر یہ سوال ابھر کر سامنے آتا ہے کہ کیا مدت سے زیر بحث بحران ختم ہو گیا یا اب شروع ہوا ہے؟

وفاقی اور صوبائی منتخب ایوانوں کے مقتدر اور غیر مقتدر نئے رہنمایان کرام نے تعاون و اشتراک کے رسمی اور روایتی اعلانات ضرور کئے ہیں مگر یہ سب منافقت اور ڈھکوسلے ہی کے مظہر تھے۔ جو کچھ بھی ہوا' ہماری توقعات اور تجزیئے کے عین مطابق ہوا ہے۔ ہم ان صفحات پر بہت پہلے ہی عرض کر چکے تھے کہ:

"تاریخ وطن نے یہ کوئی نئی کروٹ نہیں لی جو کھیل ۱۹۵۳ء میں غلام محمد نے ناظم الدین کے ساتھ کھیلا تھا' وہی اب ۱۹۹۳ء میں غلام اسحاق نے نواز شریف کے ساتھ کھیلا ہے اور یہ گھٹیا کھیل پاکستان کے تقریباً تمام ہی حکمرانوں کا بڑا محبوب و مرغوب کھیل ہے' چالیس سالہ تاریخ میں اسکندر مرزا' ایوب خان' ذوالفقار علی بھٹو' ضیاء الحق' محمد خان جونیجو' بے نظیر بھٹو' نواز شریف اور غلام اسحاق خان دراصل غلام محمد کے ہی اولتے بدلتے سائے بنے رہے ہیں۔ آپ پاکستان کے بڑے بڑے جاگیرداروں' گماشتہ سرمایہ داروں' اعلیٰ فوجی کمانداروں' گنھور بیورو کریٹوں' عیار و شاطر ٹیکنو کریٹوں' پیشہ ور قانون دانوں' بازاری سیاستدانوں اور مثالی ضمیر فروشوں کی ایک فہرست بنانے کی کوشش کریں گے تو پاکستان کے حکمرانوں کے اگلے پچھلے تمام ٹولے آپ کے سامنے آ جائیں گے' ان میں سے بیشتر ایک دوسرے کے قریبی رشتہ دار بھی ہوں گے کچھ بعض اوقات بظاہر اصولی اور نظریاتی اختلاف کرتے نظر آئیں گے۔ مگر عملاً یہ سب ایک خاندان ——— استحصالی طبقہ ——— کے فرد ہوں گے۔ ان میں کس وقت کون کس کو مغلوب کرے۔ ان میں یہ لڑائی محض بالادستی کے حصول کی خاطر ہی ہے۔ یہ سب کے سب اہل وطن کو معاشی' سیاسی' اور معاشرتی طور پر لوٹنے کھسوٹنے پر متحد و متفق رہے ہیں اور ان سب کے سارے تانے بانے عالمی سطح پر بیرونی سامراجیوں اور ان کے سرغنہ امریکہ سے جڑے ہوئے ہیں مختصراً یہ کہنا چاہئے کہ اقتدار کے بدنام زمانہ حمام میں یہ سارے حکمران مادر زاد ننگے ہیں!" ——— "ہاں اس دفعہ ایک خاص پہلو زیادہ نمایاں اور واضح ہو کر سامنے آیا ہے جس کا اعتراف' میکہ اور سسرال دونوں طرف سے بڑے جاگیردار خاندانوں سے تعلق رکھنے والی سیاستدان بے نظیر بھٹو نے بھی کیا ہے' وہ یہ کہ ۱۸ اپریل کو ایک تاجر سیاستدان بن گیا' قبل ازیں یہ فرد اسٹیبلشمنٹ کا ہی لے پالک تھا' جنرل جیلانی' جنرل ضیاء الحق اور غلام اسحاق کا لاڈلا تھا مگر اب اس نے تاجروں اور صنعتکاروں کے سیاستدان کا روپ دھار لیا" ——— "حالانکہ بے نظیر کا یہ کہنا تھا کہ صدر اور وزیر اعظم کی یہ چپقلش تو محض نورا کشتی ہے!" ——— "اسی لئے ایک موثر سوچ یہ بھی

ہے کہ آثار و قرائن سے (نگران شیر مزاری کی نگراں حکومت کے تحت) انتخابات ہوتے نظر نہیں آتے اور کابینہ کی یہ ہیئت ترکیبی' روز افزوں بڑھتی ہوئی یہ جسامت اور مختلف ثالث پر اس کے اراکین کا یہ اختلاف رائے یا متنازعہ رویہ جلد یا بدیر اسے لے ڈوبے گا اور صدر اسحاق اپنے چیدہ کمانڈر انچیف کو صدر ایوب کی طرح اقتدار اعلیٰ سونپ کر خیر و عافیت سے ایک طرف ہو جائیں گے۔ یا وسیم سجاد کو آگے لاکر خود پیچھے چلے جائیں گے؟ ——— "اگر نواز شریف وقت کی آواز سنتے 'ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نہ اڑا دیتے' مزدوروں اور کسانوں کے لئے بھی ڈھنگ سے کوئی ٹھوس کام کر جاتے تو وہ بھی اب آگے بڑھ کر انہیں لبیک کہتے' انہوں نے تاجر اور صنعتکار طبقے کے لئے تھوڑا بہت کیا تو وہ آج ان کی پذیرائی کے لئے باہر نکلا۔ انہوں نے پیر پگارا کے کہنے کے مطابق ابھی سندھ میں وڈیروں کی پگڑی اچھالنے کے لئے صرف کچے کی زمین ہی ہاریوں کو دی تھی تو وڈیرہ شاہی نے پلٹ کر ان پر وار کر ڈالا۔ اب بھی کچھ نہیں گیا وہ موجودہ عوامی اجتماعات میں برملا اعلان تو کریں کہ جاگیرداری کا خاتمہ کیا جائیگا زرعی آمدنی پر بھی ٹیکس لگایا جائیگا پھر دیکھیں وہ اوم مست قلندر کیا ہوتا ہے!" ——— "یہ سوچنا کہ اکتوبر انتخابات میں دو تہائی اکثریت سے جیت کر آٹھویں ترمیم کا خاتمہ کردیا جائیگا خیال خام ہے کیونکہ نہ تو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی' پاکستان کی موجودہ ناخواندگی میں لسانی' صوبائی' فرقہ وارانہ اور طبقاتی تضادات کے ہوتے ہوئے کوئی بھی فریق نہ تو دو تہائی اکثریت لے پائیگا اور نہ ہی مرکز اور تمام صوبوں میں اپنی اور صرف اپنی حکومتیں بنا پائے گا!" ——— "نواز شریف نے بعد کے اس پورے عرصہ میں ۱۸ اپریل والی پوزیشن سے پسپائی ضرور اختیار کی ہے!" ——— "ہوا یہ کہ چاروں صوبوں میں وزراء اعلیٰ کے عدم تعاون' پنجاب اسمبلی کے دوبارہ توڑے جانے کے بعد' پنجاب میں خاص الخاص اپنے گورنر' چیف سیکریٹری اور آئی جی کی تقرری میں رینجرز کے عدم اشتراک یا غیر موثر کردار' پنجاب اسمبلی کے تمام حامی اراکین کی بے عملی اور اسلام آباد کے ہوٹل میں عیاشانہ قیام (نظر بندی؟) کے دوران میں پنجاب سے صدفی صد عدم رابطہ' پارلیمنٹ میں دفعہ ۲۳۴ کی رو سے منظور کردہ قرارداد کے عملی شکل اختیار نہ کرسکنے کی وجہ سے وہ پے در پے غیر موثر ہوتے چلے گئے اور پھر آخر میں افواج کی واضح' ٹھوس' اور عملی مداخلت کے باوجود ان کا یہ کہنا کہ میں رضاکارانہ طور پر مستعفی ہو رہا ہوں' صاف صاف بتارہا ہے کہ ہوا کا رخ کس طرف تھا' ہے اور ہوگا!" ——— "نواز شریف عملاً بازی جیت چکے تھے مگر منظور وٹو ان کی جڑوں میں بیٹھ گئے اور پھر سرحد' سندھ و بلوچستان کے وزراء اعلیٰ نے بھی گرگٹوں کی طرح رنگ بدل لیا' بنیادی طور پر پنجاب کی حکومت ہی ان کی طاقت تھی' عملاً وہ ان کے ہاتھ سے نکل گئی تو سب کچھ نکل گیا اور وہ اسلام آباد میں بعد اراکین پنجاب اسمبلی محصور ہو کر رہ گئے' اس انداز میں (ظاہر ہے) وہ نومبر تک آخر کیونکر ٹکتے؟" ——— "اب جب دیوالیہ قومی معیشت کے تھنوں سے دودھ کی بجائے خون بہنے لگا تو فوجی اور انتظامی بجٹ اور دولتی سامراجی قرضوں اور ان پر سود کی ادائیگی کے بھی لالے پڑ گئے اور نہ صرف امریکہ' اس کے بین الاقوامی مالیاتی اداروں بلکہ خود افواج پاکستان سے حاصل کردہ ہمت و توانائی اور ذہانت و دانائی کے بل بوتے پر کرنے والے نے صرف ایک مہینے میں ہی اس ٹاسک کو نکمن ملا اللہ اور مجبوراً جاگیرداروں پر چوٹ ماردی لیکن ان کے آنسو بھی پونچھ دیئے گئے ہیں' معین قریشی صاحب نے دودھ بھی دیا ہے تو مینگنیوں بھرا دیا ہے' جس تاریخی مہنگائی کی دلدل میں انہوں نے عوام الناس کو جھونکا ہے وہ ناقابل معافی ہے!" ——— "موجودہ صورتحال میں عوام کی بہت بڑی اور بھاری اکثریت جیتے جی موت کے منہ میں دھکیل دی گئی ہے' پاکستان



اور پاکستانی عوام کی موجودہ ناگفتہ بہ درگت بنانے والے اگلے پچھلے سارے چور اچکے' ڈکیت' فیرے' جمہوری حقوق اور بالغ رائے دہندگی کے تحت منتخب ہونے اور منتخب کرنے کرانے کے مزے لوٹتے رہیں تو کیا فرق پڑے گا؟" ——— "دراصل موجودہ صوبائی اور قومی اسمبلیوں کے اراکین کی واضح ترین اکثریت جاگیرداروں ' نوکرشاہی کے کارندوں' گماشتہ سرمایہ داروں اور ڈرگ مافیا کے ہرکاروں پر مشتمل ہے' زمانہ حال کے استحصالی ' ریاستی ڈھانچے' غیر منصفانہ سیاسی ماحول ' جاگیردارانہ قبائلی اور سرمایہ دارانہ چوکھٹے نیز پسماندہ ' ناخواندہ اور منتشر معاشرتی گورکھ دھندے میں آپ موجودہ انتخابی قواعد و قوانین کے تحت جب بھی کوئی الیکشن کروائیں گے اور کتنے ہی مثالی ایماندار لوگ کتنی ہی ایمانداری سے کرائیں گے (حالانکہ یہ ابھی تحقیق و تصفیہ طلب ہے) لامحالہ انہی ضمیر فروشوں کی اکثریت منتخب ہو کر آتی رہے گی۔ اس طرح کے انتخابات میں قیدی اپنے جیلر منتخب کیا کرتے ہیں' یہ ہمارا مطالعہ' مشاہدہ' تجربہ' تجزیہ' دعویٰ' اور چیلنج ہے۔ ماضی گواہ ہے یہی نتیجہ نکلے گا' آزمائش شرط ہے!" ——— "جن کے پاس ملک و قوم اور عوام کی اربوں کھربوں کی رقومات چڑھی ہوئی ہوں' ان کو انتخابات میں محض منتخب ہونے سے روکنے کو غیر جانبداری قرار نہیں دیا جاسکتا' وہ خود نہیں آسکیں گے تو اپنے بھائی بند یا پیادے کو آگے بڑھاویں گے' یہ بھی نہیں کہائیں گے تو منتخب ہو کر آنے والوں کو خرید لیں گے اور تو اور خود منتخب پارٹیوں کی بولی لگادیں گے۔ انہیں کیا فرق پڑے گا' الہ دین کا چراغ تو ان ہی کے ہاتھ میں ہے' قوت خرید تو ان سے چھنی ہی نہیں گئی ایک دم روشنی پھیلا کر اور آنکھیں چندھیانے سے بات نہیں بنے گی۔ ڈگڈگی بجانے سے کام نہیں چلے گا' حرام مال کی قیمر مٹانا پڑے گی' ڈھانا پڑے گی!" ——— "بڑے بڑے نامور بدھندے اب بھی اس سلطنت خداداد کے عملی اور حقیقی رکھوالے بنے ہوئے ہیں!" ——— "قومی دولت میں خیانت کرنے والوں سے مطلوبہ وصولیابی کئے یا انہیں کیفر کردار تک پہنچائے بغیر مذکورہ سارے کام بیکار اور لاحاصل ہیں ———!"

یہ معروضات تھیں جو ہم ابھی ماضی قریب میں آپ کے گوش گزار کر چکے ہیں اس سے قبل ماضی بعید میں بھی ہم نے جو کہا تھا صداقت و حقانیت نے ان پر اپنی مہر ثبت کردی ہے (اس اداریہ کو ہم اقتباسات کے پے درپے حوالوں سے مزید طویل اور بوجھل نہیں بنانا چاہتے دوسرے صفحات پر "ریکارڈ آن فائل" کے عنوان کے تحت متعلقہ تین دستاویزات الگ سے پیش خدمت ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے)

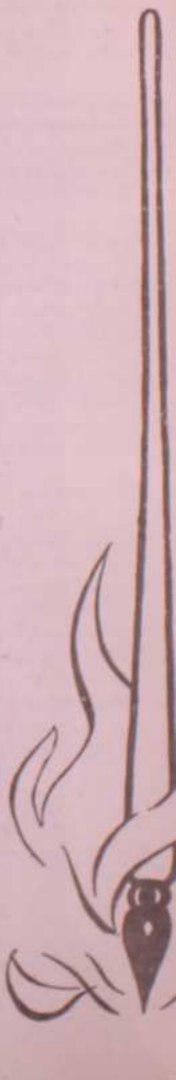
آیئے اب انتخابی نتائج کی روشنی میں تشکیل ہونے والی ملکی سیاست کا مزید جائزہ بھی لے لیتے ہیں۔

دونوں بڑی منتخب سیاسی پارٹیوں کی ماہیت قلب ہوتی نظر آرہی ہے ادھر ادھر ہر طرف سیٹوں کی مجموعی تعداد' پیپلز پارٹی اور اس کے حواریوں کی زیادہ ہے مگر مجموعی پاپولر ووٹ مسلم لیگ "ن" کو زیادہ ملے ہیں' مزید تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ جونیجو اور مختلف لیگوں کی توڑ پھوڑ کے باوجود مسلم لیگ' قیام پاکستان کے بعد پہلی مرتبہ اس انداز میں سنگل پارٹی کے طور پر ابھر کر آئی ہے۔ اور اب تک قائم سارے ریاستی' فوجی ' انتظامی' امدادی سہاروں اور تانے بانوں کو توڑ کر' کاٹ کر آئی ہے' خود پیپلز پارٹی کے مضبوط ترین ووٹ بینک چھین کر آئی ہے' بلکہ سب سے بڑی بات یہ کہ جنوبی پنجاب کے محفوظ ترین جاگیردارانہ علاقوں کے ریتی دونوں کے بغیر آئی ہے اور تو اور جماعت اسلامی کے قائم کردہ پاکستان اسلامی محاذ کے ہاتھوں کم از کم بارہ سیٹیں پیپلز پارٹی کی طرف لڑھکانے کے بعد آئی ہے اس کے برعکس پیپلز پارٹی کو جہاں تقویت اور ڈھارس ملی ہے وہاں اس کی پرانی تنظیمی اور سیاسی' شخصی اور اجتماعی آن بان شان میں کمزوری بھی صاف جھلکتی نظر آرہی ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ بے نظیر کا دوبارہ برسراقتدار آجانا ان کے لئے فخر و اعزاز کی بات نہیں



بلاشبہ پاکستان جیسے دقیانوسی معاشرے میں ایک عورت ہوتے ہوئے 'نجی' خاندانی' جماعتی' معاشرتی اور سیاسی پھندوں کے باوجود جس انداز میں انہوں نے پتے بازی کی ہے اور دوبارہ پالا مارا ہے اس کا سارا کریڈٹ ان کو جاتا ہے اور جانا چاہئے مگر یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ جو قیمت وہ اب تک دے چکی ہیں اور وہ دام جو انہیں ابھی مزید چکانے ہیں ان کے مدِ نظر یہ کامیابی اور سرخروئی کہیں انہیں مہنگی نہ پڑ جائے' وہ بالکل دیوار سے نہ جا لگیں ساری اسمبلیاں معلق ہیں' لٹکی ہوئی ہیں لیلی اور بیوا' دونوں ہی اپنی سیاسی پارٹیوں کی بہتری کے لئے ضروری اچھل کود نہیں کر سکتے کہ ان کی اپنی ڈوریاں محدود ہیں اور ان دونوں کے بابا جان' اسلام آباد میں بیٹھ کر کٹھ پتلیوں کی ڈوریاں ہلانے میں سدا کے اور بلا کے ماہر و مشاق ہیں' انتخابات کے بعد حکومت سازی کے دوران موصوف اسلام آباد میں ہی تھے' انہوں نے پنجاب کا ٹکڑا کر جس طرح مچھلی کے حلق میں کانٹا اٹکایا تھا وہ عالم آشکارہ ہے یہ جملے ہمیں پھر اس لئے لکھنے پڑ رہے ہیں کہ پنجاب میں انہوں نے پاکستان کی موجودہ سیاست کے سب سے بڑے لوٹے اور بدترین صوبہ کو ترپ کا پتہ بنا ڈالا' حالانکہ سب کو ہی علم و تجربہ ہے کہ اس قماش کے لوگوں کے متعلق رائے عامہ کیا ہوا کرتی ہے۔ کیا میاں منظور وٹو' پنجاب کے جام صادق نہیں ہیں؟ بے نظیر بھٹو نے اب پھر جس طرح بالمشافہ ملاقاتوں یا ٹیلیفون پر رابطوں کے ذریعے مولانا سمیع الحق' چوہدری سالک' قاضی حسین احمد' نصر اللہ' اکبر بگٹی' جتوئی وغیرہ کو پذیرائی بخشی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہی ہیں آئندہ بھی اسی طرح انہیں محتاط' ہوشیار اور چوکنا رہنا چاہئے کہ اس سے بھی زیادہ پیچیدہ اشخاص مثلاً امین فہیم' ممتاز بھٹو' بیگم نسیم ولی' جی ایم سید ابھی اور ان کے بھائی' شوہر اور والدہ بھی' بہرحال ایک مسئلے ہی ہیں' پھر ایم کیو ایم کا کٹھن مرحلہ تو ابھی باقی ہے عالمی سیاست میں بھی عراق و فلسطین کیساتھ ساتھ صومالیہ سے آنے والی' ہموطن فوجیوں کی لاشیں اور خود وہیں پر گھسیٹی جانے والی امریکی فوجی کی لاش کا سارا پس منظر بھی ایک سوالیہ نشان ہے اس کا ممکنہ تسلسل بھی ان کے خلاف ہی جائیگا۔ کشمیر کے سلسلے میں بھی امریکہ نے بھارت کو اسرائیل اور پاکستان کو یاسر عرفات بنانا ہی بنانا ہے۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ انفرادی طور پر افراد کی ہینڈلنگ HANDLING اور غیر معمولی بھاگ دوڑ الگ مسئلہ ہے اور قومی و بین الاقوامی سطح پر ماضی' حال اور مستقبل کے سنگین ترین معاشی' سیاسی اور معاشرتی تضادات کو سائنسی اور عوامی انداز میں حل کرنا قطعی دوسرا مسئلہ ہے یوں اقتدار کسے اچھا نہیں لگتا' سب اس کے دیوانے ہیں مگر حصول اقتدار کے لئے FOUL GAME کھیلنا اچھا نہیں لگتا' غیر موثر بلکہ بے ثمر اقتدار حاصل کر لینا زیب نہیں دیتا! محض اقتدار برائے اقتدار کو غور کا مستحق بھی سمجھنا چاہیے' کب؟ یہ تو وہی بتا سکیں گی!

پاکستان اسلامی فرنٹ اور دیگر مذہبی محاذوں کا تجربہ بھی تھیوکریسی کو ملائیت اور پاپائیت کی علمبردار جماعتوں کی طرف سے کیا گیا تھا جو کم از کم ایک جماعت کو بہت مہنگا پڑا ہے اس کے ۸۰ فیصد کارکنوں نے تو گھر بیٹھ کر ان انتخابات کی تنظیمی سرگرمیوں میں حصہ لیا نتیجہ یہ نکلا کہ ۲۰۷ سیٹوں پر جو ۱۳۴ امیدوار کھڑے کئے گئے تھے ان میں سے صرف ۳ کامیاب ہوسکے جب کہ پہلے جس حلقہ انتخاب میں ۳۷۰۰۰ ووٹ ملا کرتے تھے وہاں سے اب صرف ۵۰۰۰ ہزار ہی ملے' ماضی میں ریکارڈ اس سے تو بہتر تھا کہ ۱۹۷۰ میں ۴' پھر ۱۹۸۸ میں ۵ اور ۱۹۹۰ میں ۸ امیدوار کسی نہ کسی طرح بہرحال منتخب تو ہو ہی گئے تھے' تنظیمی طور پر تو شاید یہ بتایا گیا ہے کہ جماعت نے انتخابی مہم پر ۲۰۰ ملین روپے خرچ کئے جبکہ اندازہ لگانے والوں نے غیر سرکاری طور پر ۳۰۰ ملین روپے کے اخراجات بتائے ہیں' PIF کے پلیٹ فارم سے جو پروگرام دیا گیا اور جو نعرے پھینکے گئے' ان سے تو عوام کے دکھ درد کا احساس جھلکتا تھا' امریکہ دشمنی بھی حرج تھی لیکن الیکشن میں حاصل ہونے والے ووٹ اتنے کم ہیں کہ اب پوچھنے والے یہ پوچھتے پھر رہے ہیں کہ جب عوام سے نہ ووٹ دیئے نہ دام دیئے تو اتنے خطیر اخراجات کیونکر ہوئے اور کہاں سے آئے؟



ایک اور بات جو سامنے آئی ہے وہ یہ کہ قاضی حسین احمد صاحب کی ذاتی آمدنی ۳۰ر ۴۰ ہزار روپے ماہانہ ہے' ان کے صاحبزادے کی بوسٹن امریکہ میں پڑھائی وغیرہ کے جملہ اخراجات ہی بارہ لاکھ روپے سالانہ تھی اس طرز بود و باش کے ساتھ اعلیٰ عوامی قدروں سے وابستگی کے یہ بلند و بانگ نعرے اور دعوے کیا ایک ایسا کھوکھلا تاج نہیں تھا جو قطعی طور پر ناکام رہا اور عوام کی نظروں میں EXPOSE ہو کر رہ گیا۔

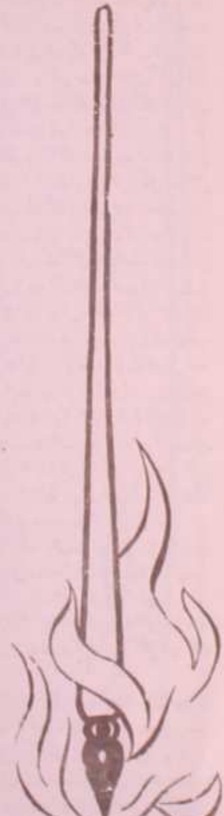
آخر میں علامہ اقبال' مفکر پاکستان کے حوالے سے یہ بات کہی جائے کہ جمہوریت میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے۔ کل رجسٹرڈ ووٹوں میں سے تقریباً چالیس فیصد ووٹروں نے ووٹ ڈالے تھے ان میں سے جیتنے والی بڑی پارٹیوں کو بیس بیس فیصد ووٹ بھی نہیں پڑے ہیں اور جیتنے والی ہی "چھوٹی پارٹیوں" "اقلیتی و آزاد امیدواروں کے ہاتھوں میں اقتدار کا توازن آگیا ہے۔ ذرا نظام جمہوریت کا اندازہ و احساس کیجئے کہ پاکستان جیسی نظریاتی مملکت اور بارہ کروڑ مسلمانوں کی قسمت کا دارومدار ان لوگوں پر ہے؟!

ووٹ کے اہل جن لوگوں کے نام لسٹ رائے دہندگان میں شامل نہیں ہیں اگر ان لوگوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ساٹھ فیصد سے بھی زیادہ لوگوں نے ان انتخابات میں کسی قسم کا کوئی حصہ ہی نہیں لیا۔ یہ وڈیرا شاہی جاگیردارانہ اور قبائلی سیاست کے اصل خدوخال اور اعداد و شمار ہیں۔ اس پہلو پر نہ مبصرین نے کوئی تبصرہ کیا' نہ ماہرین نے ان حالات کا کوئی جائزہ لیا' حالانکہ اصل دکھتی رگ ہی یہ ہے۔ اس پر کسی معالج نے ہاتھ نہیں رکھا' مرض کی تشخیص کرنے کے لئے نبض تو دیکھنا چاہئے تھا؟ رائے دہندگان کی ٹرن آؤٹ ووٹنگ' برادری سسٹم' تعصبات' خرید و فروخت' جلسہ بازی' پروپیگنڈہ' ذہنی مزاجوں کی مجبوریاں اور نہ جانے کیا کیا کچھ خارج از بحث کر بھی دیں تو ووٹنگ میں حصہ نہ لینے والوں کی اتنی کثیر اور واضح تعداد کو نظرانداز نہیں کیا جانا چاہئے یہ عدم شرکت' یہ عدم دلچسپی ایک طرح سے اس طرز جہانبانی پر عدم اعتماد ہے۔ یہ ایک طرح کا غیر اعلان شدہ بائیکاٹ ہے۔ روایتی اظہار بیزاری ہے۔ جو فی الحال بے عملی کی شکل میں ہے' PASSIVE ہے۔ مگر اندازہ لگایئے کہ:

ابھی تو تیرے سلامت ہیں ایک دو دامن
چمن کو رسم جنوں بھا گئی تو کیا ہو گا

پھر عوام دشمن سارے ہی حکمراں بھی اسے ختم کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے اتنی بڑی تعداد میں عوام الناس کو لاتعلق رکھنے والا نظام زرگری' جھوٹ و مکاری' جہالت و غلاظت' محرومی و غربت' پسماندگی و بیماری مسلط کر کے کیسے کیسے مظالم توڑتا ہے' یہ ہمارے ادیبوں اور شاعروں سے پوچھئے' خود اپنی آنکھوں سے دیکھئے' اپنے دلوں کو ٹٹولئے اور پھر یہ اندازہ لگایئے کہ ہمارے گرد کتنے جالے ہیں' ایک کو توڑیں تو دوسرا موجود' دوسرے کو توڑیں تو تیسرا موجود' ایک لامتناہی سلسلہ ہے ان کا' اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے نہ تو مابعد الطبیعاتی سوچ سے کام چلے گا اور نہ ہی مابعد الحقیقاتی عمل سے بات بنے گی۔ ذرا غور سے تو دیکھئے کہ یہ سارا کھیل کود' یہ سارا انتخابی عمل جس کے متعلق دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ آزادانہ' غیر جانبدارانہ اور منصفانہ ہے' صاف و شفاف ہے' دراصل صدیوں سے قائم شدہ استحصالی نظام کو قائم رکھنے کا دلچسپ کرتب اور سوچا سمجھا ڈھونگ ہے' آنکھوں سے کاجل چرانے اور گھی سے بال نکال لینے والے ہاتھ کی صفائی ہے اور صاحب ماننا پڑے گا کہ کمال کی صفائی ہے۔

(منشور، ستمبر ۹۳ء)



رشید احمد جالندھری

اکتوبر ۱۹۹۳ء کے انتخابات اور ہمارے مسائل

پاکستان کو اپنی مختصر سی تاریخ میں کئی بار سیاسی بحرانوں کا شکار بننا پڑا۔ ان میں سے ۱۹۷۱ء کا بحران ایک خوف ناک المیہ پر منتج ہوا اور نصف ملک وفاق سے الگ ہو کر بنگلہ دیش کے نام سے وجود میں آگیا۔ خیال تھا کہ ہمارے ارباب اقتدار اس المیہ سے سبق لے کر اپنے سیاسی اور اجتماعی نظام کا جائزہ لیں گے اور گہری نظر سے اپنی ناکامیوں کا کھوج لگا کر پاکستان کو صحیح معنی میں ایک اخلاقی، جمہوری اور فلاحی ریاست بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن صد افسوس۔ ایسا نہ ہو سکا۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ سیاست اور اقتدار پر ان لوگوں کا قبضہ رہا جو جمہوریت کی اخلاقی اقدار پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ یا وہ اس قابل ہی نہ تھے کہ روح عصر یا فطرت کے تازیانہ عبرت کو سمجھنے کی کوشش کریں، یا ایک نئے اخلاقی اور جمہوری انسان کے روپ میں دوسرا جنم لے سکیں۔ چنانچہ ہم نے دیکھا کہ سیاست میں وہی آمرانہ مزاج، معیشت میں وہی ظالمانہ روش کام کر رہی ہے، جس کے ہاتھوں اخلاق، عدل و انصاف اور قانون کی برابر بے حرمتی ہوتی رہی اور ہماری اجتماعی زندگی: رشوت، سفارش اور لوٹ مار کی علامت بن کر رہ گئی۔ غرضیکہ اس المیے کے بعد بھی ہماری سیاسی زندگی اسی ڈگر پر چلتی رہی، جس پر ۱۹۷۱ء سے پہلے چل رہی تھی۔ چنانچہ تاریخ نے پھر اپنے آپ کو دہرایا اور نیا پاکستان ایک بار پھر سیاسی بحرانوں کا شکار ہوا۔ اس سلسلے کی آخری کڑی جولائی ۱۹۹۳ء کا ڈرامہ ہے۔ جس میں مرکز اور صوبے ایک بار پھر سیاسی حریف کی حیثیت سے ایک دوسرے کے سامنے آئے۔ اور کروڑوں عوام اپنے مستقبل کے بارے میں قلق و اضطراب کا شکار ہوئے۔ مقام شکر ہے کہ ایک غیر سیاسی منظم قومی ادارے نے اس بحران پر قابو پانے کی راہ ہموار کی اور نئے انتخابات کے لیے نگران حکومت وجود میں آئی اور لوگوں

نے سکھ کا سانس لیا۔ لیکن اہلِ درد نے اس قلق کا اظہار بھی کیا کہ کیا جدید انتخابات ہمارے مسائل کا مداوا ہیں؟ بے شبہ یہ قلق اور یہ اضطراب جائز اور فطری ہے۔ کیوں کہ انہیں ڈر ہے کہ ان انتخابات کی راہ سے پھر وہی لوگ اقتدار میں آئیں گے، جو ادھر کئی سال سے تختِ سلطانی پر قبضہ جمائے ہوئے پیش دے رہے ہیں اور جنھوں نے اپنے اقتدار کو ذاتی مفاد کا زینہ بنائے رکھا ہے۔ انہیں کبھی بھی یہ وجوہ قوم کے مسائل اور اس کی مشکلات سے کوئی سروکار نہیں رہا۔

قومی مسائل سے اربابِ اقتدار کی غفلت و بے رخی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ قومی دولت پر برابر سالہاسال سے یورش ہوتی رہی۔ لیکن "منتخب حکومت" نے نہ صرف اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا، بلکہ اہلِ ہوس نے انہی کے زیرِ سایہ قومی دولت کو دونو ہاتھوں سے لوٹا۔ اس لوٹ مار میں بنکوں سے لیے گئے بھاری قرضے اور مال دار لوگوں کو دے گئے پلاٹ بھی شامل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۷۲ء تک پاکستانی حکومت نے ترقیاتی منصوبوں کے لیے جو بیرونی امداد وصول کی تھی اس کا چوراسی (۸۴) فی صد حصہ سرکاری رپورٹوں کے مطابق ۲۲ خاندانوں میں چلا گیا۔ چنانچہ یہ برابر کہا گیا، کہ پاکستان میں دو قومیں پہلو بہ پہلو زندگی بسر کر رہی ہیں ایک طرف خانماں برباد کروڑوں عوام ہیں، جن کے دکھ درد نے اقبال اور جناح کی ساری توانائیاں جذب کر کے پاکستان کو جنم دیا تھا۔ دوسری طرف بائیس "خاندان" ہیں جو عوام کے نام پر مسندِ اقتدار پر براجمان ہیں۔ لیکن عوام سے دور، چنانچہ زندگی کے ان تلخ حقائق کی بنا پر بجا طور پر کہا گیا کہ جو لوگ انتخابات کی موجودہ شکل کو اپنے مسائل کا حل تصور کرتے ہیں، وہ تمناؤں میں دھوکا کھائے گئے ہیں۔ کیوں کہ یہ انتخابات ہی ہیں جنھوں نے اب تک ان لوگوں کے سروں پر "تاجِ حکمرانی" کا تاج رکھا ہے۔ جنھیں ہم نے بہیں روش بندہ پروری سیا ہے، عوام اور اہلِ درد اسی کشمکش میں تھے کہ نگران حکومت نے آئندہ آنے والے انتخابات کو مؤثر اور بامقصد بنانے کے لیے اعلان کیا کہ جن

لوگوں کا دامن مندرجہ بالا خرابیوں سے داغ دار ہے وہ انتخابات میں حصہ نہیں لے سکیں گے ایسے ہی حکومت نے بیمار معیشت کو سہارا دینے کے لیے دوسرے جرات مندانہ فیصلے کیے ہیں، جن سے پتا چلتا ہے کہ غیر سیاسی نگران حکومت قومی اسمبلی میں ایسے لوگوں کو لانا چاہتی ہے، جن کا دامن بدعنوانی کے ہر دھبے سے صاف ہو، واقعہ یہ ہے کہ ان اقدامات پر بہت سے لوگوں کو خوش گوار حیرت ہوئی ہے۔ مقام حیرت ہے کہ جو کام بہت پہلے "منتخب حکومت" کو کرنا چاہیے تھا، اسے ایک غیر سیاسی حکومت سرانجام دے رہی ہے۔ عرفی نے سچ کہا ہے۔

سر خدا کہ عارف و زاہد بہ کس نہ گفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

جہاں حکومت اپنے طور پر اصلاح احوال کے لیے بڑی ہمت، پامردی اور اخلاص سے کام کر رہی ہے، وہاں موجودہ نازک حالات نے عوام الناس کے کندھوں پر بھی بھاری ذمہ داریاں ڈال دی ہیں۔ عوام کا اخلاقی، جمہوری اور مذہبی فرض ہے کہ وہ ملک و قوم کو درپیش سنگین مسائل کا شدت سے احساس کریں اور ان لوگوں کو اپنا ووٹ دیں جو صحیح معنی میں نہ صرف قومی و ملی مشکلات سے آگاہ ہیں بلکہ اپنے مذہب، تاریخ اور روایات کا گہرا شعور بھی رکھتے ہیں اور پوری قوم کو حالیہ مادی اور معنوی زبوں حالی سے نکالنے کا درد رکھتے ہیں۔ آج ہم تاریخ کے جس موڑ پر کھڑے ہیں اگر ہم نے ووٹ کا صحیح استعمال نہ کیا، تو پھر ہمیں وقت کے خلاف زبان پر حرف شکایت لانے کا کوئی حق نہ ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ ووٹ ایک مقدس امانت ہے اور اس امانت میں خیانت کرنے کا شرعی طور پر کسی کو حق حاصل نہیں ہے۔ چنانچہ کسی نالائق یا بدعنوان امیدوار کو ووٹ دینے کا معنی یہ ہے کہ ہم نے جان بوجھ کر امانت میں خیانت کی ہے اور ملک و قوم کے مستقبل سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: "(مسلمانو) خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ جو جس کی امانت ہے

وہ اس کے حوالے کردیا کرو۔ (ایسانہ ہو کہ کسی حق دار اور اہل کے حق سے انکار کرو) جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو، تو چاہیے کہ انصاف کے ساتھ کرو۔" (النساء، ۵۸)

یہ آیت کریمہ دین و شرع کے بنیادی احکام سے تعلق رکھتی ہے، جس نے معاشرے کے ہر گروہ کو اس امر کا پابند بنایا ہے کہ امانت کو اس کے اہل تک پہنچادیا جائے۔ چنانچہ جہاں ارباب حکومت کا فرض ہے کہ وہ معاشرے میں عدل و انصاف کے قیام، ظلم و ستم کے خاتمے اور دولت کی منصفانہ تقسیم کے لیے کام کریں، وہاں عام لوگوں کا بھی فرض ہے کہ وہ حقوق الناس کو ادا کریں۔ چنانچہ امانت کو واپس کرنا، یا عدالت میں سچی گواہی دینا یہ سب باتیں حق کو حق دار تک پہنچانے کے حکم میں آتی ہیں، جس طرح لوگوں پر اپنے بھائیوں کے حقوق پورے کرنا فرض ہے، اسی طرح اللہ کا ذکر اور اس کی عبادت کرنا بھی اللہ کی امانت ہے، جس کا ادا کرنا انسان کے ذمہ واجب ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حق پرستی اور انسان دوستی کو اختیار کر کے ہی ہم صحیح معنوں میں ادائے امانت کے فریضہ سے سبکدوش ہوسکتے ہیں۔

(المعارف جولائی ۹۱ء)

محمد اسحاق بھٹی

ایک حدیث

عن المقداد بن معد یکرب قال قال رسول اللہ ﷺ ما اکل احد طعاماً قط خیراً من ان یاکل من عمل یدیہ وان نبی اللہ داؤد علیہ السلام کان یاکل من عمل یدیہ۔ (صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب کسب الرجل و عملہ بیدہ)

حضرت مقداد بن معد یکرب روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی شخص کا بہترین رزق اس کے اپنے ہاتھوں کی محنت سے کمایا ہوا رزق ہے۔ بے شک اللہ کے پیغمبر داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھوں کی محنت سے روزی کماتے تھے۔

اس حدیث کو انسان کے عمل و حرکت، جدوجہد اور سعی و کوشش کے سلسلے میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں ہر شخص کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی تاکید کی گئی ہے اور کسب مال و طلب رزق کے لیے تگ و دو کی تلقین فرمائی گئی ہے۔

اسلام لوگوں کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ بے کار نہ رہو اور کسی پر بوجھ نہ بنو، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنا اور دوسرے سے توقع رکھنا کہ وہ اسے کچھ دے اور اس کی مالی مدد کرے، اسلام کی تعلیم کے سراسر خلاف ہے۔ اس سے انسانی شرف مجروح ہوتا ہے اور خودداریٔ نفس کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ وہ رزق جو انسان خود کما کر نہیں کھاتا اور محنت اور مشقت سے حاصل نہیں کرتا، وہ انسان کو ناکارہ بنا دیتا ہے اور اس کی تگ و تاز فکر و عمل کو ختم کر کے رکھ دیتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے دوسرے کے آگے ہاتھ پھیلانے اور مانگنے سے سخت الفاظ میں منع کیا ہے اور ارشاد فرمایا ہے کہ اگر تم گھوڑے پر سوار ہو اور ہاتھ سے چابک گر جائے، تب بھی کسی سے یہ نہ کہو کہ وہ زمین سے چابک اٹھا کر تمہارے ہاتھ میں تھما دے۔

اس حدیث کا مطلب در حقیقت کسی کے آگے دستِ سوال دراز کرنے اور کسی کا محتاج ہونے سے روکنا ہے۔ احتیاج اور سوال وہ فعل ہے جو انسان میں بُزدلی اور جُھجِک کے جراثیم پیدا کرتا ہے، سخاوت اور علوہمت کو ختم کرنے کا باعث بنتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین مکہ مکرمہ سے ہجرت کرکے مدینہ منورہ پہنچے تو نبی اکرم ﷺ نے ان کو محنت مزدوری سے رزق حاصل کرنے کا حکم دیا، حالاں کہ مدینے کے لوگ نہایت نرم خو اور رحم دل تھے اور مہاجرین کی ہر قسم کی مدد کرنے کو ہمہ وقت تیار رہتے تھے، لیکن نبی ﷺ نے مہاجرین مکہ کو انصار مدینہ کی امداد پر انحصار کرنے کی اجازت نہیں دی، خود مہاجرین نے بھی اس کو پسند نہیں کیا اور انصار مدینہ کی مخلصانہ پیش کش کو قبول کرنا خودداریٔ نفس کے منافی قرار دیا۔ اپنا کام آپ کرنا اور اپنے ہاتھ سے کما کر روزی حاصل کرنا ہی ان کے نزدیک ضروری ٹھہرا۔

جو لوگ دوسروں کے دستِ نگر ہوتے ہیں اور حصولِ رزق کے ایسے ذرائع تلاش کرتے ہیں جن میں محنت و مشقت نہ کرنا پڑے، ان کو معاشرے میں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ ہر شخص ان کی تحقیر کرتا اور ان سے دُور رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ عزت و احترام کا مستحق اسی شخص کو سمجھا جاتا ہے جو حصولِ رزق کے لیے محنت کرتا ہے اور کسبِ حلال سے اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ پالتا ہے۔

اس سلسلے میں ہادیٔ برحق ﷺ کا یہ فرمان کس درجے رفعت و عظمت کا حامل ہے۔

الید العلیا خیر من الید السفلی۔

اُونچا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے کہیں بہتر ہے۔

ہاتھ کی اُونچائی اور بلندی خیر و برکت کا بہترین پیمانہ ہے۔ اُونچے ہاتھ سے صدورِ خیرات کا تسلسل جاری رہتا ہے، لہٰذا وہ ہاتھ اس ہاتھ سے بہر حال بہتر ہے، جس میں خیرات کا مال گرتا ہے اور اسے قبول کرتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کے ان الفاظ میں فلسفہ یہ پنہاں ہے کہ سوال کرنے والا اور محنت سے جی چرانے والا شخص ذہنی اور نفسیاتی اعتبار سے اپنے آپ کو حقیر اور کمزور سمجھنے لگتا ہے۔ اس کے برعکس مشقت سے کمانے اور اپنے ہاتھ سے روزی حاصل کرنے والا شخص معاشرے میں گردن اونچی کر کے چلتا ہے اور اسے ہر حلقے میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

اس حدیث میں حضرت داؤد ؑ کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے محنت کر کے روزی کماتے تھے۔

صحیح بخاری کے نامور شارح شیخ بدر الدین عینی اس حدیث کی شرح بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت داؤد ؑ دعا مانگا کرتے تھے کہ اے اللہ! ایسی صورت پیدا فرما دے کہ میرے لیے اپنے ہاتھ سے کمائی کرنا آسان ہو جائے۔ میں اپنی معاشی ضروریات کا بوجھ بیت المال پر نہیں ڈالنا چاہتا۔ چنانچہ ان کی اس دعا کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح شرف قبول بخشا کہ ان کے ہاتھ میں لوہے اور فولاد کو موم کی مانند نرم کر دیا گیا۔ جب وہ زرہ بناتے تو لوہے کو جس طرح چاہتے کام میں لاتے، وہ ان کے ہاتھ کی گرفت میں آ کر آسانی سے ہر قسم کے سانچے میں ڈھل جاتا تھا۔

حضرت داؤد ؑ دنیا کے پہلے شخص ہیں جنہوں نے ایسی زرہیں ایجاد کیں جو باریک اور نرم زنجیروں کے حلقوں سے بنائی جاتی تھیں اور ہلکی پھلکی ہونے کی وجہ سے میدان جنگ میں سپاہی انہیں پہن کر آسانی سے نقل و حرکت کر سکتے تھے۔ دشمن کے وار سے محفوظ رہنے کا وہ بہترین ذریعہ تھیں۔

صحیح بخاری کے ایک اور ممتاز شارح حافظ ابن حجر فتح الباری میں اس حدیث کی شرح کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں کہ خلیفۃ المسلمین کو اگرچہ بیت المال سے بقدر ضرورت وظیفہ لینا جائز ہے، تاہم افضلیت اس میں ہے کہ وہ بیت المال پر اپنا معاشی بار نہ ڈالے۔ چنانچہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے وفات کے وقت وہ تمام رقم واپس کر دی تھی جو انہوں نے اپنے

زمانۂ خلافت میں بیت المال سے وظیفے کی شکل میں وصول کی تھی۔

ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ جن لوگوں نے قوتِ بازو سے کام لیا اور اپنے ہاتھ سے کما کر رزق حاصل کرنے کی جدوجہد کی انہیں اگرچہ کتنے ہی نامساعد اور ناموافق حالات سے گزرنا پڑا لیکن وہ زندگی میں کامیاب رہے اور مشکلات کی منزلوں کو طے کر کے اپنے مقصود کو پا گئے۔

اس کے برعکس جو لوگ ہمت ہار کر بیٹھ گئے، دوسروں پر غلط طور سے اعتماد کیا اور خود آگے بڑھنے کی کوشش نہ کی، وہ ناکام رہے اور معاشرے میں کوئی مقام حاصل نہ کر پائے۔ لوگوں نے ان کو بے کار اور نکمے قرار دیا اور کسی نے ان کو قابلِ التفات نہ گردانا۔

بہتر اور اچھے لوگ وہ ہیں جو دنیا میں محنت اور جدوجہد کرتے ہیں، ناموافق حالات کا مقابلہ کرتے ہیں اور دوسروں کا سہارا تلاش کرنے کی بجائے خود آگے بڑھنے کے لیے کوشاں ہوتے ہیں۔

(المعارف جولائی ۹۳ء)

فکر و نظر

محمد اسماعیل ذبیح

یتیم پوتوں کی وراثت

قرآنِ کریم کی سورۂ نسار میں اولاد ذکور و اناث کی وراثت کا مسئلہ ان سب کے حصص کے ساتھ "یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ" سے "فَلَھَا النِّصْفُ" تک کمال جامعیت کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے، جس میں کسی قسم کا ابہام یا پیچیدگی نہیں۔ اور خون اور نطفہ کے تسلسل کے ساتھ خطِ مستقیم کی صورت میں یہ سلسلہ جتنا بھی نیچے تک چلا جائے، متفقہ طور پر تمام علما اور فقہا کے نزدیک وہ اولاد ہی کہلاتا ہے۔ اس اعتبار سے یتیم پوتوں کے اولاد ہونے میں بھی کسی کو اختلاف نہیں۔ جو فقہا ان یتیموں کو محجوب الارث قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک بھی یتیم اولاد کی محرومی کی یہ وجہ نہیں کہ وہ انھیں اولاد نہیں سمجھتے، بلکہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک یتیموں کا چچا ان سے اقرب ہے، جس نے یتیم اولاد کو محجوب الارث قرار دے دیا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ کیا فی الواقعہ، چچا اقرب ہے؟ اور وہ یتیم اولاد کو محجوب الارث ٹھہرا سکتا ہے؟

۱۔ اس سلسلہ میں جب ہم قرآنِ حکیم کی طرف رجوع کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اولاد جزء المیت ہے، اقرب نہیں۔ جیسا کہ حق تعالیٰ قرآنِ حکیم میں فرماتے ہیں، وَجَعَلُوْا لَہٗ مِنْ عِبَادِہٖ جُزْءًا (الزخرف ۴۳ : ۱۵)۔ یہ آیت مشرکینِ مکہ، یہود اور نصاریٰ کے اس غلط اور مشرکانہ عقیدہ کی نفی کرتی ہے کہ خدا کا کوئی بندہ اللہ کا بیٹا ہے یا فرشتے اس کی بیٹیاں ہیں۔

اس آیت کی رو سے اولاد کا ہر فرد جزءُ المیت ہے، اقرب نہیں، کیونکہ جزو ذات کے کسی حصے کا نام نہیں ہے۔ اور اقرب تو وہ ہے، جو ذات کا حصہ نہ ہو، بلکہ علیحدہ وجود ہو، البتہ اس میں قرب کا تعلق تفضیل کے ساتھ پایا جاتا ہو۔ اس اعتبار سے یتیموں کا چچا، جو میت کا بیٹا ہے، جزء المیت قرار پاتا ہے، اقرب نہیں۔ اور جب صورت یہ ہے کہ وہ اقرب ہی نہیں تو وہ اقرب کی بنیاد پر یتیم بھتیجوں کا حاجب کیسے کر سکتا ہے؟

۲۔ ایک دوسری آیت جو لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ " (النساء ۴: ۷) کے الفاظ میں ہے۔ اس میں 'الاقربون' کو 'الوالدان' پر عطف کیا گیا ہے۔ اور اصولِ کلام کی رو سے عطف مغایرت کا تقاضا کرتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ والدین اقربون میں شامل نہیں اور جب والدین اقربون میں شامل نہیں، تو والدین کا کوئی جزو یعنی اولاد بھی اقربون میں شامل نہیں۔ اور اقربا وہ ہوئے، جو والدین اور اولاد کے سوا دوسرے رشتہ دار ہوں۔ ان دونوں آیتوں کی رو سے میت کا کوئی بیٹا بیٹی اقرب نہیں، بلکہ جزء المیت ہے۔ اور جب یتیموں کا چچا، جو میت کا بیٹا ہے، خود اقرب نہیں، تو وہ اقربیت کی بنیاد پر یتیموں کا حجب کیسے کر سکتا ہے؟

۳۔ ہمارے علمائے فرائض کے نزدیک بھی اولاد کا جزء المیت ہونا مسلمہ بات ہے۔ علمِ فرائض کی مشہور کتاب "السراجی" جو ہمارے مدارسِ اسلامیہ میں بالعموم داخلِ نصاب رہی ہے، اس کے باب 'العصبات عصبہ بنفسہ' کی بحث میں مصنفِ کتاب علامہ عبدالرشید سجاوندی فرماتے ہیں:

وهو اربعة اصناف جزء الميت واصله وجزء ابيه وجزء جده.	"اس کی چار قسمیں ہیں: جزوِ میت، میت کی اصل، جزوِ ابن اور جزوِ جدّ۔"

اور پھر اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اعني اولٰهم بالميراث جزء الميت اي البنون ثم بنوهم وان سفلوا ثم اصله اي الاب ثم الجد اي اب الاب. (السراجی، باب الوصیات)	"مطلب یہ کہ میراث کا سب سے پہلا حق دار جزوِ میت، یعنی بیٹے ہیں اور اس کے بعد ان کے بیٹے، اور اگر پیچھے جائیں، تو پھر اصل، یعنی باپ، اور پھر دادا، یعنی باپ کا باپ۔"

تعجب ہے کہ جس اولاد کو وہ جزء المیت قرار دیتے ہیں، اسی جزء المیت، یعنی یتیموں کے چچا کو، جو میت کا بیٹا ہے، اسے اقرب بھی قرار دیتے ہیں، اور اسی اقربیت کی بنیاد پر یتیم پوتوں کو اس کی موجودگی میں محجوب الارث ٹھیراتے ہیں، حالانکہ جب یہ جزء المیت ہیں، تو اقرب نہیں۔ اور اگر اقرب ہیں، تو جزء المیت نہیں، چونکہ جزو، ذات کے حصے کا نام ہے اور اقرب اس وجود کا، جو ذات سے الگ ہو اور اس کے ساتھ قرب کا تعلق تفضیلی صورت میں ہو۔ ایسے ورثا جو کسی دوسرے وارث کے ہوتے ہوئے محجوب الارث ہوتے ہیں، اور اس کے نہ ہونے کی

صورت میں وارث، علمائے فرائض نے ان کے لیے جو تفریعی قانون مرتب فرمایا ہے، وہ "حجب حرمان" ہے۔ یہ دو ضابطوں پر مشتمل ہے جنھیں میراث کے شہرۂ آفاق عالم عبد الرشید سجاوندی نے اپنی کتاب "السراجی" میں ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

وھو مبنی علی اصلین۔ احدھما کل یدلی الی المیت بشخص لا یرث مع وجود ذلک الشخص۔ والثانی الاقرب فالاقرب۔

"اور یہ (حجب حرمان) دو ضابطوں پر مشتمل ہے۔ ایک یہ کہ جو شخص میت کے ساتھ کسی دوسرے آدمی کی نسبت سے رشتہ رکھتا ہو وہ اس شخص کی موجودگی میں وارث نہیں ہوگا۔ اور دوسرا ضابطہ ہے 'الاقرب فالاقرب' یعنی پہلے وراثت اقرب کو ملے گی، وہ نہ ہو تو اسے جو اس کے بعد اقرب بنے گا۔"

گویا خون اور نطفہ کے تسلسل میں یکے بعد دیگرے، جو اقرب آتے جائیں گے، وہ وارث ہوں گے۔ اور الاقرب وارث، ثم الاقرب وارث کا سلسلہ جاری رہے گا۔

ان دونوں ضابطوں پر نظر ڈالی جائے، تو ان دونوں کی رو سے یتیم پوتے چچاؤں کے ہوتے وارث قرار پاتے ہیں، کیونکہ پوتے اپنے دادا کے ساتھ اپنے باپ کی نسبت اور واسطہ سے رشتہ رکھتے ہیں، چچاؤں کے واسطہ سے نہیں۔ اور قاعدۂ اول کی رو سے خالی اقربیت محجوب الارث بنانے کے لیے کافی نہیں، بلکہ شخصِ حاجب کا واسطہ ہونا ضروری ہے، اس لیے باپ کی موجودگی میں پوتے محجوب الارث ہیں، لیکن جب باپ موجود نہ رہے، تو وارث قرار پاتے ہیں، کیونکہ باپ، جو حاجب تھا، موجود نہیں رہا۔ جہاں تک ان کے چچاؤں کا تعلق ہے، تو وہ یتیم پوتوں کے لیے حاجب نہیں ہو سکتے، اس لیے کہ اس قانون کی رو سے حجب کے لیے صرف اقربیت کافی نہیں، بلکہ واسطہ اور نسبت بھی ضروری ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یتیم اولاد چچاؤں کے واسطے سے اپنے دادا کے ساتھ رشتہ نہیں رکھتے، بلکہ اپنے باپ کے واسطہ سے رکھتے ہیں۔ اگر چچاؤں کو اقرب مان بھی لیا جائے، تو بھی وہ، چونکہ یتیم اولاد کے لیے واسطہ کی حیثیت نہیں رکھتے، اس وجہ سے ان کا حجب نہیں کر سکتے۔

ہم جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے کہ اولاد جزء المیت ہے، اقرب نہیں، اس لیے اس قاعدہ کا اطلاق ہی اولاد پر نہیں ہو سکتا۔ اس کا دائرۂ کار اولاد اور والدین کے سوا دوسرے رشتہ داروں تک محدود ہوگا۔ تاہم، اگر اس کا اطلاق اولاد اور والدین پر بھی مان لیا جائے تو چونکہ

اصول و فروع کے ان رشتہ داروں میں باہمی نسبت اور واسطہ کا تسلسل ہے۔ اس لیے الاقرب فالاقرب کا مطلب یہ ہوا کہ پہلے باپ، پھر دادا اور پہلے ماں، پھر نانی۔ اور اسی طرح، پہلے بیٹا پھر اس کا بیٹا یعنی پوتا، درجہ بدرجہ وارث قرار پائیں گے۔

۵۔ علامہ السید الشریف علی الجرجانی علم میراث میں امام فن کا درجہ رکھتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب "الشریفیہ، شرح السراجی" میں دونوں قاعدوں پر بحث کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ یہ دونوں قاعدے یتیم اولاد کو چچاؤں کی وجہ سے محروم نہیں کر سکتے۔ اُن کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ مصنف "السراجی" نے قاعدۂ اوّل پر اکتفا نہیں کیا کہ یہ خیال نہ کیا جا سکے کہ یتیم اولاد چچا کے ہوتے وارث ہے، کیونکہ چچا ان کے لیے واسطہ کی حیثیت نہیں رکھتا۔ (جب کہ قاعدۂ اوّل کی رو سے کسی کو محجوب الارث قرار دینے کے لیے ضروری ہے کہ حاجب واسطہ کی حیثیت رکھتا ہو۔)

اور دوسرے قاعدے پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "الاقرب فالاقرب کا یہ قاعدہ مطلق معنوں میں باپ کے ہوتے ہوئے نانی کو محروم الوراثت قرار دیتا ہے (جو صحیح نہیں) اور مطلق نہ مانیں، تو یہ قاعدۂ اوّل بن جاتا ہے۔ اور یتیم اولاد چچاؤں کے ہوتے ہوئے وارث قرار پاتی ہے۔ اور یہ قاعدۂ ثانی بعینہٖ قاعدۂ اوّل بن کر رہ جاتا ہے۔" (الشریفیہ، باب الحجب)

۶۔ ہمارے وہ علما جو اولاد کو اقرب قرار دیتے ہیں، انھوں نے اس بات کی طرف توجہ نہیں فرمائی کہ اقرب اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ اور تفضیل کا اطلاق ہمیشہ ایک ہی ذات پر ہوتا ہے جیسے 'اللہ اکبر' میں لفظ 'اکبر'، 'افضل الرسل' میں لفظ 'افضل'، 'احکم الحاکمین' میں لفظ 'احکم' ایک ہی ذات کے لیے ہے۔ اب غور فرمایا جائے کہ جب کسی وفات یافتہ شخص کے ایک سے زیادہ بیٹے ہوں تو اُن میں اقرب کسے قرار دیا جائے؟ اگر کسی ایک کو اقرب قرار دیں، تو یہ ترجیح بلا مرجح ہے۔ اور اگر سب کو اقرب قرار دیں تو یہ کس اصول و قاعدہ کی بات ہوگی؟ ایسی صورت میں تفضیل، تفضیل نہیں رہے گی، کیونکہ یہ سب بیٹے مساوی الدرجہ ہیں، چنانچہ ان سب کو اقرب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ معلوم نہیں، ہمارے علما اولاد کو اقرب قرار دینے پر کیوں بضد ہیں، اور اس بنیاد پر یتیم پوتوں کو کیوں محروم قرار دے رہے ہیں؟ بہر حال، اس عاجز کی تحقیق اور جتنا کچھ شعور قدرت کی طرف سے ملا ہے، اس کے مطابق یتیم اولاد چچاؤں کی موجودگی میں وارث ہے۔ چچا اُن کا حاجب نہیں کر سکتے۔ اور اس عاجز کو کتاب و سنت اور اصولِ میراث کی کوئی دلیل اب تک نہیں ملی جس کے مطابق سمجھ سکوں کہ یتیم اولاد چچاؤں کی وجہ سے محجوب الارث ہیں۔ اگر کسی کی بالغ نظر میں کتاب و سنت کی کوئی مضبوط اور واضح دلیل موجود ہو تو ضرور رہنمائی فرمائیں۔

(اشراق، اکتوبر ۹۳ء)

فیروز بخت

مولانا آزاد اور ان کے دوست



قومی تہواروں پر فرزندانِ قوم کی بے ساختہ یاد آ جاتی ہے [illegible] بھی جاتی ہے [illegible] لوگوں نے قربانیاں دی ہیں [illegible] قومی یکجہتی کی علمبردار بھی ہیں۔ مگر [illegible] قومی تہواروں پر [illegible] وہ پندرہ اگست ہو یا چھبیس جنوری [illegible] سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کیا انگریزوں سے حاصل کی گئی اس قیمتی آزادی کی ہم قدر کر پائے ہیں؟ کیا گاندھی، نہرو اور آزاد کی باتوں پر ہم نے کبھی دھیان دیا [illegible] سوچا ہے کہ وراثت میں وہ ہمارے لئے کیا چھوڑ گئے ہیں؟

مولانا آزاد کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ دنیا کی تقلید نہیں کرتے تھے مگر دنیا ان کی تقلید کرتی تھی [illegible] میں مولانا نے جو ایک سب سے بڑی خدمت کی وہ یہ ہے کہ [illegible] انہوں نے یہ بتایا کہ مذہب کی [illegible] ایک مذہب کی حیثیت [illegible] پیدا کرتا ہے۔ یعنی مذہب [illegible] لوگوں کو الگ الگ کرتی ہے جو لوگوں میں نفرت پیدا کرتی ہے وہ جھوٹی [illegible] ہے۔ انہوں نے بتایا کہ [illegible] ملانے والی ہے یا ایک دوسرے کو [illegible]

مذہب کی یہ روح انسانیت کی [illegible] ہے۔ مذہب کی روح [illegible] ہے جو تمام مذہبوں [illegible] لوگوں کو سمجھنا چاہیئے [illegible] چھوٹی چھوٹی [illegible] بنایا جاتا ہے [illegible] کسی ذات پات [illegible] مذہب [illegible] لوگ زندگی کو [illegible] چاہیئے کہ مذہب پیار کا [illegible] ہے نفرت کا نہیں [illegible] ہمارے ملک میں اس وقت [illegible] ہے کہ ہمارے [illegible] چھوٹی وفاداریاں [illegible] ہیں [illegible] گروہ [illegible] چاہیئے کہ اپنی چھوٹی وفاداریوں کو [illegible] قائم کریں [illegible] چھوٹی وفاداریاں ختم کر دی جائیں [illegible] مسلمان [illegible]

دشمنی کی صیحتیں یورپ کی طرح سائنس اور ترقی کے پاگلوں نے نہیں پیدا کیں بلکہ مذہب کے پاگلوں نے پیدا کی ہیں۔ اگر ہم اس حالت سے اپنے ملک کو نکالنا چاہتے ہیں تو اس کا علاج نہیں ہو سکتا ہے کہ مذہبی تعلیم کو آج کل کے حالات کے رحم پر چھوڑ دیں۔ اس طرح اس کی روک تھام کر دیں کہ مذہب اپنے غلط روپ میں آ کر بچوں کے دماغ کو بگاڑ دینے کا موقعہ نہ پائے۔"

گاندھی جی، مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو ایسی نادر روزگار ہستیوں کے نام ہیں جن کی زندگی کی تمام تر توانائیاں، فکر و عمل کی بلندیاں اور آرزوؤں اور جستجوؤں کی دلکشیاں ہندوستان کی متحدہ قومیت، سالمیت اور وحدت کے لیے وقف تھیں لیکن اس تثلیث (گاندھی، نہرو، آزاد) میں مولانا آزاد کی اہمیت خود کانگریس کے وجود کو ایک قومی جماعت کی حیثیت سے باقی اور قائم رکھنے کے لیے خاص معنی رکھتی ہے جس سے گاندھی جی اور پنڈت جی دونوں ہی بخوبی واقف تھے اور ان دونوں تاریخ ساز انسانوں کی نظر میں مولانا آزاد کی بصارت اور بصیرت، حب الوطنی اور انسانیت نوازی ان کے علم و عمل کی پائیداری اور ذہنی غلامی سے بیزاری باعث صد افتخار تھیں۔ اس تثلیث کے دو زاویوں اور شعلوں (آزاد، نہرو) کے گہرے تعلقات اور معاملات پر تاریخ کے حوالے سے غور کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہے جس کی چند جھلکیاں اس مضمون میں پیش کی گئی ہیں۔

نئی نسل مولانا کی شخصیت کی گراں مایگی کا اندازہ نہیں کر سکتی لیکن تاریخ ان واقعات کو سینے میں محفوظ کیے ہوئے ہے۔ ایک مرتبہ جواہر لال نہرو کا فون آیا جسے مولانا کے سیکریٹری اجمل خاں نے سنا اور اندر جا کر مولانا کو خبر دی کہ پنڈت جی خود ملنے کے لیے آنا چاہتے ہیں۔ مولانا نے جواب دیا، فون پر کہہ دو

"اس وقت نہیں۔" اجمل خاں پنڈت جی سے یہ نہ کہہ سکے اور کہہ دیا کہ مولانا صاحب کی آنکھ لگ گئی ہے۔ اگر بہت اہم بات ہو تو اٹھا دیا جائے۔ نہرو جی نے جواب دیا: "نہیں، تکلیف نہ دیجیے، صبح سہی۔" ٹھیک اسی طرح مولانا نے ایک دفعہ گاندھی جی کو واپس کر دیا تھا اور پھر وہ دوسرے دن تشریف لائے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ مولانا صاحب اپنی کسی ضروری تصنیف میں مصروف تھے اور مسلسل ذہنی سکون کی خواہش رکھتے تھے۔ بڑا رعب تھا مولانا صاحب کا۔ مگر اس بات کا کوئی دوسرا مطلب نہیں نکالنا چاہیے کیونکہ گاندھی جی کو وہ سیاست میں اپنا رفیق و استاد مان کر چلتے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا آزاد کو جواہر لال نہرو سے دلی وابستگی اور سچی محبت تھی۔ دونوں نے انگریز حکومت کی قید و بند کی صعوبتیں بھی ایک ساتھ اٹھائی تھیں اور ہر موقع پر جواہر لال کی قدر و قیمت و قابلیت کا انہیں صحیح اندازہ تھا۔ اسی طرح نہرو کو بھی مولانا کی قدر و منزلت، قابلیت اور جاذب شخصیت کا کوئی اندازہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر کانگریس کو کوئی بہترین مشورہ دے سکتا ہے تو وہ مولانا

صاحب تھے۔ مذہب اور سیاست دونوں ہی میدانوں میں مولانا کی صحافت نے تہلکہ برپا کر دیا تھا۔ سیاست کی طرف آئے تو مسلمانوں کی سیاست کا رخ ہی بدل دیا اور سرسید کی بے جان پالیسی کو ختم کر کے ایک نئی جاندار تحریک کی بنیاد ڈالی۔ برطانوی سازشوں کا جو جال مشرقِ وسطیٰ اور ہندوستان میں بچھا ہوا تھا اس کے پردے چاک کر کے رکھ دیے۔ مسلمانوں کو عالمی سیاست سے روشناس کرایا اور ہندوستان کی جنگ آزادی میں شریک لا کھڑا کیا۔ جس طرح طوفان کے طوفان اٹھے، انقلابوں کے زلزلے آئے مگر مولانا قطب کی طرح ڈٹے رہے، اٹل رہے۔ مولانا نہ صرف ہندوستان ہند کے معماروں میں ہیں بلکہ تمام عالم اسلامی میں جو آزادی کی تحریکیں اٹھی ہیں اور تمام ایشیا کی سرزمین جس طرح بیرونی تسلط سے آزاد ہوئی ہے اس میں مولانا کے علم و عمل اور تبلیغ کا بڑا دخل ہے۔ وہ صحیح معنوں میں موجودہ ایشیا کے عظیم معماروں میں ہیں۔ دو قومی نظریہ کی تحریک کے زمانے میں مولانا کی دل آزاری کا کوئی طریقہ باقی نہیں رکھا گیا اور ان کے دل و دماغ پر بے رحمیوں کے تیر اور تشنیعوں کے گہرے زخم لگے لیکن مولانا پہاڑوں کا جلال اور سکوت لیے ہوئے اپنی جگہ جمے رہے اور کسی سے نہ الجھے نہ ان پر برسے۔ البتہ اس بات سے بالکل نہیں بچے جو بعد میں اختیار کر لیا تھا۔ اب ان قدروں کے مالک کہاں ملتے ہیں؟

جہاں تک گاندھی جی اور مولانا آزاد کا تعلق ہے دونوں حضرات ایک دوسرے کی رائے سے سیاسی امور انجام دیا کرتے تھے۔ گاندھی جی نے ہندو مسلم یکجہتی کے لیے اور لوگوں کو ہندو مسلم فسادات سے باز رکھنے کے لیے مرن برت رکھ لیا تھا جو ۱۲ جنوری ۱۹۴۸ء سے مولانا ہی کی ذات کو شروع کیا گیا تھا۔ گاندھی جی کے پاس نامور شخصیتیں آئیں اور ان سے کہا کہ فسادات رک گئے ہیں۔ یہاں کے مقیم ہندو مسلم جان کی بازی لگانے کے لیے تیار ہیں اور یہ کہ گاندھی جی اپنا مرن برت ترک کر دیں۔ مگر گاندھی جی کی شرط یہ تھی کہ وہ اپنا مرن برت بھی توڑیں گے جب لوگ فسادات سے باز آئیں گے۔ تب مولانا نے گاندھی جی کو یقین دلایا کہ لوگوں کی ذہنیت میں تبدیلی آئی ہے اور یہ کہ وہ برت توڑ دیں۔ گاندھی جی نے بنگال اور مسلمانوں کی بحالی کے لیے خاص شہر دہلی سے گو شانتی تھی اور دلی کے مسلمانوں کی جان و مال بچانے کے لیے انھوں نے جو مرن برت رکھا تھا اس سے سکھوں اور راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے لوگ بدظن ہو گئے تھے مگر گاندھی جی نے ان کی پروا نہ کی۔ یہ ہندو مسلم یکجہتی کی بہترین مثال تھی۔

مولانا آزاد گاندھی جی کی بے حد عزت کرتے تھے مگر گاندھی وادی نہ تھے۔ کانگریس کے کچھ معاملات میں ان کا گاندھی جی سے اکثر اختلاف ہو جایا کرتا تھا۔ ان کی تصنیف "ہماری آزادی" میں اس کی تفصیل موجود ہے کہ مولانا نے بالخصوص سے لے کر تقسیم ہندوستان تک (۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۷ء) مولانا نے بعض بڑے مسائل میں گاندھی جی سے اختلاف کیا اور یہ



بات صاف تھی کہ کانگریس میں رہ کر گاندھی جی سے اختلاف
کوئی معمولی بات نہ تھی۔ مگر یہ اختلافات کبھی بدمزگی میں تبدیل
نہ ہوتے تھے بلکہ کوئی نہ کوئی حل [illegible] دونوں رہنما اتفاق
کرتے تھے خاص طور سے جب محمد علی جناح [illegible]
تحریک کی بات کیا کرتے تھے۔ مولانا کے خلاف مسلم لیگ تو
خیر آگ بگولا تھی وہ مسلمان بھی مولانا کے بارے میں [illegible]
کرتے تھے جو [illegible] مختلف معاملات میں [illegible]
نیشنلسٹ مسلمان جو ضرورت سے زیادہ نیشنلسٹ ہو کر صرف
ہندوستانی کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے سوشلسٹ یا
کمیونسٹ مسلمان جنہیں مذہب سے دلچسپی نہیں تھی۔

مولانا تقسیم کو ہولناک خیال کرتے تھے۔ ان کے نزدیک
تقسیم ہندوستان کا زوال تھا اور مسلمانوں کے مسئلے کا حل بھی
نہ تھا کیونکہ پاکستان بن جانے سے ہندوستان کے مسلمانوں کا غم
نہیں ہو سکتا تھا۔ مسلم لیگ کے [illegible] جارحانہ سیاست کی بات
[illegible] علاوہ ازیں پاکستان و ہندوستان
تقسیم کے بعد آپس میں دوست نہیں ہو سکتے تھے۔ مولانا
کے نزدیک اصل مسئلہ فرقہ وارانہ نہیں معاشی تھا اور [illegible]
[illegible] کے درمیان نہیں طبقوں کے درمیان تھے۔ مولانا
[illegible] اس کا آخری نتیجہ [illegible]
ہوگا۔ [illegible] جنگ کا آغاز ہوگا [illegible]
[illegible] کے متعلق کوئی [illegible]
[illegible] نہیں [illegible] دونوں کے
[illegible] مولانا لکھتے ہیں [illegible] تقسیم
کے [illegible] خیال میں مسلمانوں کے لیے
[illegible]
[illegible] تقسیم کے [illegible]
[illegible] تقسیم کے قریب جب مولانا نے گاندھی
[illegible] تو انھوں نے مولانا کو یقین دلایا "تقسیم
[illegible] کانگریس [illegible] تقسیم کر
سکتی ہے" [illegible] گاندھی جی [illegible] مولانا [illegible]

[illegible] سے ملے مگر وہ متفق نہ تھا۔ لیگ کا مطالبہ تقسیم تھا
مولانا [illegible] جب [illegible] نے مولانا سے
تقسیم کے بارے میں دریافت کیا تو مولانا نے کہا "کیا کبھی
پانی کے دھارے کو تلوار کی دھار تقسیم کر سکتی ہے؟" اپنی
ایک اور [illegible] تقسیم کے سلسلے میں انھوں نے کہا "پانی
[illegible] دو حصوں میں
تقسیم ہو گیا ہے لیکن پانی [illegible]
[illegible] تقسیم [illegible] ہو جاتی ہے" مولانا تقسیم کے
بعد پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کوئی [illegible]
[illegible] لیگ [illegible]
روایت کے مطابق مولانا نے [illegible]
[illegible] دونوں
[illegible] تقسیم سے [illegible] مگر
[illegible] مولانا [illegible] کے لیے
[illegible] اور محمد علی
جناح [illegible]
لیگ [illegible]
[illegible] محمد علی [illegible] پاکستان کی حیثیت سے [illegible]
[illegible] مولانا [illegible] جس میں
ہندوستان کے [illegible]
مختلف [illegible]
[illegible] مولانا [illegible]
[illegible] پاکستان کے [illegible] مولانا
[illegible] پاکستان [illegible]
[illegible] مولانا [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible] مولانا [illegible] ہندوستان [illegible]

وہ کسی قیمت پر دستبردار نہیں ہو سکتے تھے۔ "انڈیا ونس فریڈم" کے آخری اہم تیس صفحات کے چھپنے پر جو غلط فہمی پھیلی یا پھیلائی گئی اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا آزاد کی شخصیت کی بلندی اور ان کے قول و عمل کی یکسانیت آج کی نسل کی نظروں سے اوجھل ہے۔ ان کے اعتراضات کسی کی خدمات کی نفی نہیں کرتے ہیں بلکہ خود ان کے خلوص کے آئینہ دار ہیں۔ جیسے جواہر لال نہرو کے لیے انھوں نے ان مذکورہ صفحات میں یہ بھی لکھا ہے:

"سولہ اگست انیس سو چھیالیس کا دن نہ صرف کلکتہ کے لیے بلکہ پورے ہندوستان کے لیے یوم سیاہ تھا۔ حالات نے جس طرح سے کروٹ لی تھی اس نے حکومت کے لیے کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان مصالحت کرانے کو تقریباً ناممکن بنا دیا تھا۔ یہ ہندوستانی تاریخ کی سب سے بڑی ٹریجڈی تھی اور مجھے بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ اس تبدیلی کی ذمہ داری بڑی حد تک جواہر لال نہرو پر عائد ہوتی ہے۔ ان کے اس بیان نے کہ کیبنٹ مشن پلان میں تبدیلی یا اصلاح کرنے میں آزاد ہوں گے، سیاسی اور فرقہ وارانہ مصالحت کے سوال کو از سر نو کھڑا کر دیا۔ مسٹر جناح نے اس غلطی سے فائدہ اٹھایا تھا اور مسلم لیگ کی جانب سے کیبنٹ مشن پلان کی منظوری کو واپس لے لیا۔" ان تمام باتوں کے باوجود مولانا آزاد کی شفقت نہرو جی کے لیے اور پنڈت جی کا ادب و احترام مولانا آزاد کے لیے اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ قائم رہا۔ جس اختلاف کو تحریری شکل میں مولانا کے ان متنازعہ صفحات میں عام لوگوں نے خطاب جانا، یہ نہرو جی اور مولانا آزاد اپنی زندگی میں ایک دوسرے کو بتا چکے تھے۔ یہ کوئی راز نہ تھا اور نہ ہی اس کی وجہ سے دونوں کی دوستی میں کوئی فرق آیا...

ایک دن پنڈت جواہر لال نہرو اور گاندھی جی مولانا آزاد کی کوٹھی پر ان سے ملنے آئے تو مولانا آزاد اس وقت کھدر کا جو کرتہ پہنے ہوئے تھے وہ مونڈھے کے اوپر سے پھٹا ہوا تھا۔ ان دونوں حضرات کو دیکھ کر مولانا نے مونڈھے کے اوپر چادر ڈال لی۔ ان حضرات نے مولانا سے کہا کہ انھیں معلوم ہوا ہے کہ وہ (مولانا) ان دنوں مالی مشکلات سے دوچار ہیں۔ اس سلسلے میں وہ ان کے ساتھ تعاون کرنا چاہتے ہیں۔ مولانا نے جواب دیا وہ کسی قسم کا تعاون نہیں چاہتے اور نہ باوجود سخت اصرار کے انھوں نے کسی قسم کی امداد قبول نہیں کی۔ الغرض ان کی بے نیازی اور خودداری کا یہ عالم تھا کہ خود تکلیف اٹھاتے تھے لیکن کسی کا احسان کبھی بھی قبول نہ کیا۔ یہی خاصیت ان کے جوہر تھے [illegible] میں علی جوہر کے اخلاق کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی کے متعلق ان کی زبان سے کوئی کلمہ یا شکوہ و شکایات کا لفظ نہ نکلا۔

مولانا آزاد اور پنڈت نہرو کی دوستی کا بہترین دور [illegible] تعلق کے [illegible] میں گزرا۔ بقول مولانا آزاد "اردو جواہر لال کی زبان تھی جسے انھوں نے ہمیشہ اپنی مادری زبان مانا۔ انگریزی تعلیم یافتہ کی زبان تھی جسے انھوں نے اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا تھا۔ وہ مجھے انگریزی میں تعلیم دینے کی کوشش

یہ ہوئی تھی کہ کتاب کے چھپتے ہی اس کا اردو ترجمہ بھی بازار میں آگیا۔ جواہر لال کی چائے پینے کی عادت کے بارے میں مولانا لکھتے ہیں: "جواہر لال بلاشبہ چائے کے عادی ہیں اور چائے پیتے بھی ہیں۔ خوش ہیں یورپ کی ہم مشربی کے ذوق سے بغیر دودھ کی چائے۔" جنگ آزادی کے دوران ایک دفعہ انگریزوں کے بارے میں مولانا نے کہا تھا "مسلمانوں کے لیے آسان ہے کہ وہ ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ صلح کریں۔ پہاڑوں کے غاروں اور جنگلوں میں چلے جائیں۔ وہاں درندوں کے ساتھ صلح کر لیں مگر یہ ممکن نہیں کہ انگریزوں کے سامنے صلح کا ہاتھ بڑھائیں۔" ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں نہرو نے "گلمپسز آف ورلڈ ہسٹری" (GLIMPSES OF WORLD HISTORY) میں لکھا ہے: "مذہب کا مقصد آپس کا نفاق نہیں اتفاق ہے۔ دل میں تمام مذہبوں کا احترام ہونا چاہیے۔"

مولانا آزاد نے ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں لکھا ہے "اگر آج ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں میں سے اتر آئے اور دہلی کے



یہ ہندوستانی تاریخ کی سب سے بڑی ٹریجڈی تھی اور مجھے بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ اس تبدیلی کی ذمہ داری بڑی حد تک جواہر لال نہرو پر عائد ہوتی ہے۔

قطب مینار پر کھڑا ہو کر یہ اعلان کرے کہ سوراج تین گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد سے دستبردار ہو جائے تو میں سوراج سے دستبردار ہو جاؤں گا مگر اس سے دستبردار نہ ہوں گا کیونکہ اگر سوراج میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے۔" شروع سے ہی جب مولانا آزاد کی رہائش کلکتہ میں تھی تحریک آزادی کا جوش و ولولہ ان میں بچپن سے موجود تھا۔ کچھ کٹر [illegible] بنگالی لوگ جنھوں نے تحریک آزادی ہند کی علیحدہ کوشش شروع کر رکھی تھی مولانا ان سے ملے اور ان کو

دعوت دی کہ بنگالی مسلمانوں کے ساتھ مل کر وہ لوگ اس تحریک کو لے کر چلیں۔ اس میں تحریک کے لیڈر شیام سندر چکرورتی پہلے تو تھوڑا مشکوک رہے مگر جب دو علاقائی تین آزاد سے ہو گئیں تو ان کے قدردانوں میں سے ایک ہو گئے اور اس طرح سے ہندو مسلم یکجہتی کا یہ سبق انگریزی سامراج کے خلاف کافی پہلے سے ہی مولانا نے نہ صرف خود پڑھا تھا بلکہ دوسروں کو بھی پڑھاتے تھے اور جن لوگوں کو انھوں نے یہ درس دیا تھا وہ ان کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دیش بندھو چترنجن داس کی زندگی کا کافی اثر مولانا پر پڑا تھا اور ان سے آزاد نے بہت کچھ سیکھا تھا۔

مہاتما گاندھی نے مولانا کی ایک تقریر کو جو فرقہ واریت کے زہر کے خلاف تھی بہت سراہا تھا۔ مولانا نے کہا تھا: جہاں تک فرقہ پرستی کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ فرقہ پرستی ایک دروازے سے نہیں آتی بلکہ کئی دروازوں سے آتی ہے۔ تو یہ سب دروازے بند ہونے چاہئیں۔ میں آپ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان جس کی آزادی کا ہم ستر برس سے خواب دیکھ رہے تھے، برباد نہ ہو اور یہ ہمارے ملک کے کسی دروازے میں نہ گھس جائے تو ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ کس دروازے سے یہ فرقہ پرستی آتی ہے اس دروازے کو بند کر دیں بلکہ ختم ہی کر دیں۔ اس لیے آپ کو فرقہ پرستی کو ختم کرنا ہوگا۔ بقول عبدالرزاق ملیح آبادی ہندوستان میں ہندو مسلم یکجہتی کا ایسا فرشتہ آج تک پیدا نہیں ہوا ہے جیسا کہ مولانا آزاد اور شاید اب پیدا ہوگا۔ یہی تو جواہر لال نہرو نے مولانا کی وفات پر کہا:

"میں یہ نہیں کہتا کہ مولانا آزاد کے بعد ہندوستان میں عظیم انسان پیدا ہی نہ ہوں گے، یقیناً پیدا ہوں گے... لیکن جو عجیب و غریب اور مخصوص عظمت مولانا آزاد کو حاصل تھی وہ اب نہ تو ہندوستان میں کسی کو نصیب ہوگی اور نہ ہندوستان کے باہر کسی کے حصے میں آئے گی۔ وطن کا کارواں اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہے گا لیکن مولانا آزاد جو امیر کارواں تھے ہم سے جدا ہو گئے۔ اچھا ہو ہم ان کی تقلید کریں۔"

کیا ہم مولانا آزاد، گاندھی جی اور پنڈت نہرو کی تقلید کر رہے ہیں یا ان کی روحوں کو اذیت پہنچا رہے ہیں؟ اس سوال پر ہر ہندوستانی کو غور کرنا چاہیے۔ ●

جمشید قمر

رانچی میں مولانا آزاد کی آمد کا قصّہ

(ایک خفیہ فائل کی روشنی میں)

البلاغ کے آخری شمارے (بابت ۷، ۱۴، ۲۴ و ۳۱ مارچ ۱۹۱۶ء) میں مولانا آزاد نے یہ خبر شائع کی:

"۲۸ مارچ کو گورنمنٹ بنگال کا حکم زیر دفعہ ۳، ڈیفنس ایکٹ پہنچا کہ میں چار دن کے اندر کلکتہ کا قیام ترک کر دوں اور حدود بنگال سے باہر چلا جاؤں۔ بعد کو یہ مدت ایک ہفتے تک بڑھا دی گئی۔ اس سے پہلے گورنمنٹ دہلی، پنجاب اور متحدہ اپنے اپنے صوبوں میں آنے سے روک چکی ہیں۔"

یہ خبر کلکتہ کے دوسرے اخبارات میں بھی شائع ہوئی۔ ظاہر ہے کہ یہ صوبجات متحدہ، پنجاب اور دہلی کی صوبائی حکومتوں کے لیے پریشانی کا سبب نہیں بن سکتی تھی کہ وہ پہلے ہی اپنے صوبوں کے حدود میں مولانا آزاد کے داخلے پر پابندی عائد کر چکی تھیں البتہ دیگر صوبائی حکومتوں مثلاً بمبئی، مدراس اور بہار و اڑیسہ کے لیے یہ تشویش اور اندیشے کا سبب ضرور بن سکتی تھی۔

صوبۂ بنگال کے پڑوس میں واقع بہار و اڑیسہ کی صوبائی حکومت کے لیے مولانا آزاد کے اخراج کی خبر فوری طور پر توجہ کا مرکز بن گئی۔ جس اخبار میں یہ شائع ہوئی اس کا تراشہ یکم اپریل ۱۹۱۶ء کو ایک نوٹ شیٹ پر چسپاں کیا گیا اور اس طرح حکومت بہار و اڑیسہ کی جانب سے مولانا آزاد پر ایک فائل کی ابتدا ہوگئی۔

خبر میں دو اطلاعات درج ہیں۔ پہلی اطلاع کے مطابق 'بنگال کو مولانا آزاد پر حکومت بنگال نے ایک حکم جاری کیا ہے۔ دوسری اطلاع کے مطابق 'اسی طرح کے احکامات پہلے ہی پنجاب، صوبجات متحدہ اور دہلی کی حکومتیں جاری کر چکی ہیں۔ ایک طویل پیراگراف جس میں سرکاری حکم کا متن شامل ہے، اسے آخر میں درج کیا گیا، حکم کے مطابق:

"... گورنر بہ اجلاس کی رائے میں (یہ) یقین کرنے کے لیے معقول اسباب (موجود) ہیں کہ لال کنواں (دہلی) کے محی الدین احمد عرف ابوالکلام آزاد نے جو طرز عمل اختیار کیا ہے، وہ عوامی سلامتی کے لیے مضرت رساں ہے اور یہ بہت ممکن ہے کہ (مستقبل قریب میں بھی) وہ ایسا طرز عمل اختیار کریں۔ اب اسی وجہ سے گورنر بہ اجلاس اس اختیار کے استعمال میں، جو انھیں قانون (ضمیمہ) تحفظ ہند ۱۹۱۵ء (حکومت ہند کے اعلان نمبر ۸۶، مورخہ ۹ دسمبر ۱۹۱۵ء میں شائع شدہ) کے دفعہ ۳، اے کے تحت مرحمت کیا گیا ہے (اس کے مطابق) یہ ہدایت دیتے ہیں کہ موصوف محی الدین احمد عرف ابوالکلام آزاد صوبۂ بنگال کے حدود میں کسی مقام پر نہ داخل ہوں گے، نہ رہائش اختیار کریں گے اور نہ موجود ہوں گے۔ انھیں صوبۂ بنگال چھوڑنے کے لیے اس حکم کی وصولیابی سے چار دن کا وقت دیا جاتا ہے۔ موصوف محی الدین احمد عرف ابوالکلام آزاد خبردار کیے جاتے ہیں کہ اگر انھوں نے اس حکم کی کسی ہدایت کی جان بوجھ کر خلاف ورزی کی تو وہ قانون تحفظ ہند ۱۹۱۵ء کے ضابطہ میں تجویز کردہ سزا کے مستحق ہوں گے۔ اس حکم نامے سے ضابطہ کی ایک نقل منسلک کی جاتی ہے۔"

خبر میں جو اطلاعات درج تھیں ان سے اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ مولانا آزاد درحقیقت کس صوبے کے باشندے ہیں گو سرکاری حکم نامے میں انھیں 'لال کنواں (دہلی) کے محی الدین احمد عرف ابوالکلام آزاد' کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا مگر حکم نامے سے ہی، صوبۂ بنگال سے اخراج کی بجائے، اس کے حدود کے کسی مقام پر داخل ہونے، رہائش اختیار کرنے اور موجود ہونے کی ممانعت ظاہر ہوتی تھی۔ خبر میں تین صوبائی حکومتوں کی جانب سے اسی طرح کے احکامات کے اجرا کی بات بھی کہی گئی تھی۔ ان اطلاعات سے یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ

تین صوبائی حکومتوں کی طرح اب بنگال کی حکومت نے بھی اپنے حدود میں ان کے داخلے پر پابندی لگا دی ہے۔ اپنی پیدائش کے اعتبار سے مولانا آزاد مذکورہ چار صوبوں میں سے کس صوبے کے باشندے ہیں' اس کا صحیح اندازہ چیف سکریٹری (حکومت بہار و اڑیسہ) بھی نہیں لگا پاتے ہیں جب ۲۔اپریل کو اخبار کا تراشہ ان کے سامنے لایا جاتا ہے اور وہ اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔

چیف سکریٹری کے بعد ڈپٹی انسپکٹر جنرل آف پولیس کے پاس اخبار کا تراشہ اس توقع کے ساتھ بھیجا جاتا ہے کہ وہ اس کی نسبت کچھ بتانے کے اہل ہوں گے۔ ڈی۔آئی۔جی (پولیس) چونکہ بیمار تھے لہٰذا' ان کی غیر حاضری کے سبب ۴۔اپریل کو ان کے قائم مقام پولیس افسر نے اخبار کے تراشے اور چیف سکریٹری کی تحریر کا مطالعہ کیا۔ مولانا آزاد کے وطن کی نسبت صحیح جانکاری کے لیے' اس نے اسی روز حکومت بنگال کے نام ایک تار ارسال کیا۔

۵۔اپریل کو مولانا آزاد کے متعلق دو اہم اطلاعات موصول ہوتی ہیں' اور اس کے بعد ہی مولانا آزاد کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ضرورت اس اندیشے کے ساتھ ہی تشویش کا لازمی نتیجہ تھی جس کا سامنا ۴۔اپریل کو حکومت بہار و اڑیسہ نے اخراج کی خبر کی وصولیابی کے فوراً بعد کیا۔ مذکورہ پولیس افسر' جس نے مولانا آزاد کے متعلق اطلاعات وصول کی تھیں' اس نے اسی روز چیف سکریٹری کو یہ اطلاع دی کہ وہ بنگال سے مولانا آزاد کی خفیہ سرگزشت کو حاصل کر رہا ہے۔

ڈی۔آئی۔جی (پولیس) کے قائم مقام افسر کو مولانا آزاد کے متعلق جو دو اطلاعات ملی تھیں اور جن کو وصول کرنے کے بعد اس نے بنگال سے رابطہ قائم کیا تھا' ان میں سے ایک اطلاع کلکتہ سے مولانا آزاد کی روانگی سے متعلق تھی۔ اس کے مطابق مولانا آزاد ۳۔اپریل کو کلکتہ سے روانہ ہوتے ہیں اور اگلی صبح یعنی ۴۔اپریل کو پنجاب ٹرین سے بمبئی (کی جانب) جاتے ہوئے' بانکی پور (پٹنہ) سے گزرے ہیں' وہ اس لیے کہ وہ مدراس بھی جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ اطلاع خاص طور پر ۵۔اپریل کو حاصل ہوئی تھی' اس پر توجہ دی گئی۔ سبب یہ تھا کہ یہ مولانا آزاد کی روانگی اور اس صوبے کے حدود میں ان کی آمد سے متعلق تھی۔ دھیان میں رہے کہ ابھی تک حکومت بنگال کی جانب سے اس سلسلے میں کوئی اطلاع نہیں آئی تھی اور صوبائی حکام ایک غیر مصدقہ اطلاع کا سامنا کر رہے تھے۔

مولانا آزاد کی نقل و حرکت اور ان کی سرگرمیوں پر بنگال پولیس کی نظر پہلے ہی سے تھی جبکہ سرکاری حکم کے جاری ہوتے ہی یہ پوری طرح حرکت میں آگئی۔ یہ معلوم ہوتے ہی کہ مولانا آزاد ۳۔اپریل کی رات میں ٹرین سے رانچی کے لیے روانہ ہوتے ہیں' اس نے بذریعہ تار حکومت بہار و اڑیسہ کو مطلع کر دیا۔ تار ۵۔اپریل کو دن میں ۲ بج کر ۴۰ منٹ پر روانہ کیا گیا۔ یہ اسی دن رانچی سکریٹریٹ میں دن کے ۳ بج کر ۳۵ منٹ پر وصول کیا گیا۔ اس سے پہلے صوبائی حکام کے پیش نظر' مولانا آزاد کی کلکتہ سے روانگی' ان کے سفر کی سمت اور ممکنہ جائے قیام کے بارے میں ایک غیر مصدقہ اطلاع تھی۔ تار پر نظر پڑتے ہی' ان کے لیے رانچی کی مقامی پولیس سے رابطہ قائم کرنا ضروری ہو گیا۔ چنانچہ اسی وقت آئی۔جی۔پولیس نے ایس۔پی (رانچی) سے فون پر رابطہ قائم کرکے' انھیں اس امر کی اطلاع دی اور ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کہ وہ مولانا آزاد کو رانچی میں تلاش کریں' ان کا پتہ لگائیں۔ ۶۔اپریل کی شام تک مقامی پولیس کو رانچی میں مولانا آزاد کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ آئی۔جی (پولیس) کی ہدایت پر ایس۔پی نے اس کی اطلاع بذریعہ تار حکومت بنگال کو بھیج دی۔

۸۔اپریل کو کلکتہ سے شائع ہونے والے اخبار' بنگالی' میں ایک خبر شائع ہوئی۔ اس کے مطابق محی الدین احمد (سابق ایڈیٹر' الہلال) جنھیں حالیہ سرکاری حکم کے ذریعے بنگال سے خارج کر دیا گیا ہے' وہ منگل کو کلکتہ سے کہا جاتا ہے کہ بمبئی کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ صوبائی حکام اس خبر کی جانب ۸۔اپریل کو متوجہ ہوتے کہ یہ کلکتہ پولیس کی ارسال کردہ روانگی کی تاریخ (۴۔اپریل مطابق منگل) کی تصدیق کرتی تھی۔ انھیں کلکتہ پولیس کی اطلاع پر یقین تھا کہ مولانا آزاد رانچی کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ اخبار میں بمبئی کے لیے روانگی کی اطلاع دی گئی تھی' اس بارے میں انھیں کوئی خوش گمانی نہیں تھی۔

۷۔اپریل کو بھی رانچی کی مقامی پولیس مولانا آزاد کو دریافت کرنے میں ناکام رہی۔ ناکامی کی خبر محکمۂ پولیس کے اعلیٰ افسران تک پہنچی۔ ڈی۔آئی۔جی کا یہ بیان ملاحظہ ہو جس میں گزشتہ اطلاع کی تصحیح بلکہ تردید کی گئی ہے ساتھ ہی موجودہ صورت حال کے نتیجے میں قیاس آرائی کا یہ انداز اپنایا گیا ہے:

"اب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کو' مسٹر مظہر الحق سے ملاقات کی خاطر بمبئی کے لیے جاتے ہوئے' بانکی پور (پٹنہ) سے گزرنا تھا' لیکن جیسا کہ موخر الذکر بانکی پور سے باہر گئے ہوئے ہیں' لہٰذا یہ ملاقات ملتوی کر دی گئی اور یہ اطلاع کہ وہ (مولانا آزاد) ۴۔اپریل کی صبح میں بانکی پور سے گزر رہے ہیں' درست نہیں ہے۔ کلکتہ کے پولیس کمشنر کے ذریعے ان کے بارے میں اطلاع ملی ہے کہ ۳۔اپریل کی شب میں وہ رانچی کے لیے روانہ ہوتے ہیں لیکن رانچی کے ایس۔پی جنھیں (اس اطلاع کی نسبت) فون کیا گیا ہے' وہ ابھی تک وہاں پر ان کا پتہ لگانے میں کامیاب نہیں ہوتے ہیں۔ یقین کرنے کی وجہ یہ بھی دکھائی دیتی ہے کہ اس شریف آدمی نے اپنی حقیقی منزل کے بارے میں کچھ بھی ظاہر نہیں کیا۔ اگر رانچی میں اس کا پتہ نہیں چل پایا تو یہ بالکل ممکن ہے کہ راہ میں کسی اسٹیشن

پر وہ اُتر گیا ہو گا اس کے بعد کہیں اور چلا گیا ہو گا۔"

صوبائی حکام کو مولانا آزاد کی روانگی کے بارے میں جو اطلاعات مل رہی تھیں ان کے تئیں ان کی کارروائیوں سے ان کی مستعدی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ روانگی کے متعلق محض تین ابتدائی اطلاعات نے انھیں متوحش اور نہایت پریشان کر رکھا تھا' جبکہ رانچی میں ان کی موجودگی کی تصدیق اور ان کے بارے میں تفصیلی معلومات کی فراہمی کے مراحل ابھی باقی تھے۔

یکم اپریل کو بنگال سے مولانا آزاد کے اخراج کی خبر سامنے آئی۔ ۵۔ اپریل کو کلکتہ سے ان کی روانگی کی اطلاع وصول کی گئی۔ ان پانچ دنوں میں صوبائی حکام کو مولانا آزاد کے بارے میں محض یہ معلوم ہوسکا کہ وہ بمبئی کے مولوی ابوالخیر الدین کے اکلوتے صاحبزادے ہیں' جنھوں نے کلکتہ میں رہائش اختیار کرنے سے پہلے دہلی میں قیام کیا۔ ۶۔ اپریل کو انھیں اور دو معلومات فراہم ہوئیں ان کے مطابق:

۱۔ "۱۸۔ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو اس وقت کے الہلال کے مدیر اے۔ کے۔ آزاد' مسٹر مظہر الحق کے ساتھ پٹنہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کی آپسی ملاقات کا مقصد معلوم نہیں ہوسکا۔"

۲۔ "۲۵۔ فروری ۱۹۱۴ء کو انجمن اسلامیہ (پٹنہ) کے ایک جلسے میں مولانا آزاد شریک ہوئے۔ اس میں ترکی پارلیامنٹ کے ایک رکن توجیق پاشا بھی موجود تھے۔ مولانا آزاد نے کوئی تقریر نہیں کی۔"

صوبائی انتظامیہ کے حکام کو یہ معلومات محکمۂ پولیس کی وساطت سے حاصل ہوئیں۔ یہ ناکافی اور ادھوری تھیں۔ ان سے تھوڑا بہت مولانا آزاد کے خاندانی پس منظر اور کسی حد تک اس صوبے کی ایک سیاسی شخصیت سے ان کے تعلق اور یہاں کی ایک سیاسی سرگرمی سے ان کے ربط کو سمجھا جاسکتا تھا۔ حکومت کے اپنے ریکارڈس میں مولانا آزاد سے متعلق' متفرق طور پر کوئی معلومات درج تھیں مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ مربوط نہیں تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حکام' مولانا آزاد کے بارے میں ایسی مربوط معلومات کے طلبگار تھے' جن سے ان کو بخوبی جانا اور سمجھا جاسکتا ہو۔ انھیں معلوم تھا کہ محکمۂ پولیس نے ۵۔ اپریل کو ہی بنگال پولیس کے نام معلومات کی فراہمی کے لیے ایک درخواست بھیج رکھی ہے۔

صوبائی محکمۂ پولیس کی درخواست پر بنگال پولیس نے مولانا آزاد سے متعلق اپنا خفیہ نوٹ ارسال کر دیا۔ اسے یہاں کے ڈی۔ آئی۔ جی (پولیس) نے ۷۔ اپریل کو وصول کیا۔ یہ مہر بند لفافے میں پولیس افسران کو اس تاکید کے ساتھ بھیجا گیا کہ وہ اسے انتہائی خفیہ طریقے پر محفوظ رکھیں۔ اس سے ضروری اقتباسات فائل کے تین صفحات پر نقل کیے گئے۔ یہ ملاحظہ ہوں:

"(مولانا ابوالکلام آزاد) اُردو ہفتہ وار اخبار "الہلال" کے مالک اور مدیر ہیں۔ یہ کلکتہ سے شائع ہوتا تھا۔ انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے والد مولانا خیر الدین (مرحوم) سے حاصل کی۔ ان کے دادا ابوالکلام' درحقیقت دہلی کے باشندے تھے مگر وہ مکہ چلے گئے اور وہیں انھوں نے رہائش اختیار کرلی خیر الدین جوان ہوئے اور وہیں انھیں تعلیم دی گئی وہ پچاس سال پہلے ہندستان آئے اور بمبئی میں رہنے لگے جہاں ان کے بہت سے مرید تھے آخر کار وہ کلکتہ کے لیے روانہ ہوگئے۔ جہاں ۱۸۹۰ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کی پیدائش ہوئی ۱۹۰۱ء میں ان کے والد کی موت ہوئی۔ ابوالکلام نے کلکتہ' لکھنؤ اور دہلی میں تعلیم حاصل کی اپنے والد کے مریدوں کے ذریعے جمع کی گئی رقم سے انھوں نے "الہلال" اخبار جاری کیا۔ وہ عربی کے ایک اچھے عالم اور فارسی و اُردو کے اچھے واقف کار ہیں۔ وہ شائستہ خطیب اور ادیب ہیں اور اپنے کردار میں تقویٰ و استقامت کے سبب اپنے ہم مذہب افراد کے درمیان قابل احترام سمجھے جاتے ہیں۔ ان کا اخبار' مسلمانوں اور بالخصوص ان کے پیروکاروں (مریدوں)' جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی تعداد لاکھوں میں ہے' ان کے درمیان بہ نظر تحسین دیکھا جاتا ہے۔ وہ ان سے مالی عطیات وصول کرتے ہیں۔

وہ انتہا پسند اور شورش پسند ہیں۔ بلقان کی جنگ پر ان کی تقریریں اور الہلال کا عمومی لہجہ یہ دونوں برطانیہ مخالف میلان کو آشکار کرتے ہیں۔ نومبر ۱۹۱۳ء میں جنگ بلقان کے سلسلے میں ایک نشست منعقد ہوئی جس میں انھوں نے کہا کہ عیسائی اقوام ترکی کو مستقل طور پر اکھاڑ پھینکنے کی درپے ہیں۔ اس سے پہلے جولائی ۱۹۱۳ء میں کانپور کی مسجد کے سلسلے میں یو۔ پی کی حکومت کی طرف سے اُٹھائے گئے اقدامات کی یہ کہتے ہوئے انھوں نے سخت مذمت کی کہ یہ (اقدامات) مذہبی آزادی پر براہ راست مداخلت (کی طرح) ہیں۔ ایڈریانوپل کے بارے میں برطانوی وزیر اعظم کی دھمکی پر سات کروڑ مسلمانوں نے ناراضگی ظاہر کی اور انھوں (مولانا آزاد) نے لوگوں کو ترغیب دی کہ وزیر اعظم نے صاف طور پر اسلام پر غلبہ حاصل کرنے کی خواہش کی ہے۔ ۱۹۱۳ء میں انھوں نے حزب اللہ سوسائٹی قائم کی جو چاہتی ہے کہ ہر مسلمان کو جو قرآن کے حرف و معنی سے آشنا ہے' اسے اپنی زندگی اسلام پر قربان کرنے کے لیے تیار رکھنی چاہیے۔ انھوں نے انجمن خدام کعبہ کی حمایت کی ہے اور وہ اتحاد اسلامی کے ایک خطرناک حامی ہیں۔ ان کے خصوصی معاونین کے نام ذیل میں درج ہیں:

(i) مولوی نجم الدین احمد ایک ریٹائرڈ ڈپٹی مجسٹریٹ
(ii) کامریڈ کے۔ محمد علی
(iii) شوکت علی (نمبر ۲ کے بھائی)
(iv) دہلی کے حکیم اجمل خاں
(v) بانکی پور کے مظہر الحق

نمبر ۵ سے گفت و شنید کے لیے بڑی بے باکی سے وہ بانکی پور جا چکے ہیں۔ اور بعد میں وہ دو بار رانچی بھی جا چکے ہیں۔ اپنے اخبار الہلال کے برطانیہ مخالف لہجے کے سبب پریس ایکٹ کے تحت انھیں کلکتہ میں دو ہزار روپے کی رقم بطور ضمانت بھی جمع کرنی پڑی اور یہ رقم قابل اعتراض مضمون کی اشاعت کے سبب حال ہی میں ضبط کر لی گئی ہے۔ اپنے اتحاد اسلامی کے کافی نمایاں خیالات سمیت وہ بے حد قابل اور نہایت خطرناک آدمی سمجھے جاتے ہیں۔"

وہ تمام اہم معلومات، جن سے مولانا آزاد کو بہ خوبی جانا اور سمجھا جا سکتا تھا، ان اقتباسات میں مربوط طور پر موجود تھیں۔ مولانا آزاد کے خاندانی احوال، ان کے خیالات، ان کی سرگرمیوں کے میلانات، نیم سیاسی و نیم مذہبی تنظیموں سے ان کے روابط، حکومت کی نظر میں مشتبہ اور ناپسندیدہ افراد سے ان کے تعلقات، حکومت کی جانب سے ان کے خلاف کی گئی کارروائیاں، یہ سبھی اہم امور ان میں درج تھے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ان سے ان کی مختصر سوانح حیات اور ان کی سابقہ سرگرمیوں کے نمایاں اور اہم احوال ظاہر ہو جاتے تھے۔ ساتھ ہی ان کے مطالعے سے ایک ایسی شخصیت کا تعارف ممکن ہو جاتا تھا، جو نہ صرف اپنے ہم مذہب افراد کے درمیان قابل احترام تھی بلکہ اپنی سرگرمیوں کے سبب حکومت وقت کی نظر میں نہایت خطرناک بھی واقع ہوئی تھی۔

۷، اپریل تک صوبائی حکام کو مولانا آزاد کے بارے میں کافی معلومات فراہم ہو چکی تھیں۔ کلکتہ سے ان کی روانگی کی اطلاع ۵، اپریل کو ہی وصول کی جا چکی تھی۔ اسی کے مطابق ان کو رانچی میں تلاش کرنے کا کام بھی شروع ہو چکا تھا۔ تین دن تلاش و تفتیش کی نذر ہوگئے اور ان کا پتہ کہیں پر نہیں چلا۔ اس مرحلے پر حکومت کی پوری مشنری مستعد اور چاق و چوبند نظر آتی ہے۔ اس درمیان میں انتظامیہ کے حکام نے محکمۂ پولیس کے افسران سے اور افسران نے مقامی پولیس سے برابر رابطہ قائم رکھا۔ مولانا آزاد کے متعلق اب تک کی دستیاب معلومات کے پیش نظر، رانچی میں ان کی موجودگی کا پتہ چلانا ان سب کے لیے بے حد ضروری ہو گیا تھا۔

۸، اپریل کو کئی اطلاعات وقفے وقفے سے صوبائی حکام کو موصول ہوتی ہیں۔ ان میں سے پہلی اطلاع بڑی اہم ہے۔ اہم اس لیے کہ پہلی بار معلوم ہوتا ہے کہ جب کلکتہ سے مولانا آزاد روانہ ہوئے تو وہاں کے ایس پی مسٹر ہربرٹ سیموئیل نے ان کا تعاقب کیا۔ غالباً احتیاط کے طور پر اس خیال سے یہ تعاقب ضروری سمجھا گیا کہ ختم سفر کے بعد ان کی جائے قیام کا پتہ معلوم رہے۔

۵، اپریل کو دن میں دس بجے کے قریب کلکتہ سے آنے والی ٹرین رانچی کے چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن پر رکتی ہے۔ اس کے ایک ڈبے سے دوسرے مسافروں کی طرح مولانا آزاد بھی پلیٹ فارم پر اترتے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے مسٹر سیموئیل بھی اتر پڑے۔ انھوں نے پلیٹ فارم پر ایک بھیڑ کا مشاہدہ کیا، مانو لوگ کسی کے استقبال کے لیے آئے ہوئے ہوں۔ تھوڑی دیر بعد جب ریل پورولیا کے لیے روانہ ہوئی تو بھیڑ چھٹ گئی۔ اور اسی درمیان میں مولانا آزاد مسٹر سیموئیل کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اس موقعے پر ایس پی موصوف کی جو حالت ہوئی ہوگی اس کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بہر حال انھوں نے اپنے طور پر مولانا آزاد کا سراغ پانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر وہ ناکام رہے۔ آخر کار چوتھے دن یعنی ۸، اپریل کو انھوں نے محکمۂ پولیس کے آئی جی سے رابطہ قائم کرنا چاہا۔ آئی جی اس وقت آفس میں موجود نہیں تھے۔ انھوں نے آئی جی کے پرسنل اسسٹنٹ سے ملاقات کی اور اس سے مولانا آزاد کی بابت دریافت کیا۔ ساتھ ہی انھوں نے اپنے واقعے کو بھی بیان کیا۔ پی اے نے آئی جی کی اطلاع کے لیے اس واقعے کو فائل میں درج کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر سیموئیل کے بیان کا یہ اثر تھا کہ پی اے نے ایک بار پھر مقامی پولیس سے فون پر رابطہ قائم کیا۔ ایس پی (رانچی) اس وقت آفس میں نہیں تھے۔ لہٰذا پی اے نے آئی جی کی جانب سے ڈی ایس پی (رانچی) کو ہدایت دی کہ وہ رانچی میں مولانا آزاد کا پتہ لگائیں۔

مولانا آزاد سے متعلق فائل میں مذکورہ واقعہ درج تو ہے مگر تفصیل سے نہیں۔ اسی طرح اس میں یہ بھی درج نہیں کہ مقامی پولیس نے مولانا آزاد کا پتہ لگانے میں کن دشوار گزار مراحل کا سامنا کیا۔ مولانا آزاد کی شکل و شبیہ کی جانکاری پولیس کو مہیا تھی کہ نہیں، اس کا بھی پتہ فائل سے نہیں چلتا۔ ایک اندازے کے مطابق یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ نو واردان شہر پر پولیس نے یقیناً نظر رکھی ہوگی۔ شہر میں نئے چہروں کی تلاش اسے ضرور رہی ہوگی۔ فائل میں اطلاعات کی شکل میں جو تحریر درج ہے، اس سے واقعات کی ایک تصویر ضرور مرتب ہو سکتی ہے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ مقامی پولیس محکمے کو مولانا آزاد کی رانچی میں آمد کی کوئی بھنک نہیں ملی۔ ملتی بھی کیسے؟ صوبائی پولیس افسران کو ان کے بارے میں جس وقت اطلاع ملی اور انھوں نے مقامی پولیس کو انھیں تلاش کرنے پر مامور کیا اس وقت تک مولانا آزاد سفر تمام کر کے مقیم ہو چکے تھے۔ ظاہر ہے اب پولیس کے پاس آنے والے راستوں پر نظر رکھنے کا سوال ہی نہیں تھا بلکہ رانچی میں ان کی موجودگی کا پتہ لگانا ان کے لیے ضروری امر تھا۔ رانچی اس وقت تک کوئی بڑا شہر تو تھا نہیں کہ وہ اس کی بڑی آبادی میں گم ہو جاتے اور ان کا پتہ لگانا بہت ہی دشوار ہوتا۔ اس حقیقت کے باوجود، واقعہ یہ ہے کہ پولیس تین دنوں تک شہر میں ناکام پھرتی رہی۔ ان تمام ممکنہ مقامات پر جہاں پر ان کی موجودگی کا امکان تھا، پولیس وہاں تک

ضرور محسوس ہوئی۔ تلاش و تفتیش کے اسی مرحلے میں ایک اور دلچسپ واقعہ رونما ہوتا ہے۔

پولیس مولانا آزاد کو تلاش کرتے سرکاری ڈاک بنگلے پہنچتی ہے۔ وہاں پر مقیم لوگوں میں مولانا آزاد کے نام سے کوئی شخص ہے، اس بابت اس نے ڈاک بنگلے کے ملازمین سے پوچھ تاچھ کی۔ ملازمین نے یہاں پر اس نام کے کسی شخص کی موجودگی سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ پولیس اس وقت لوٹ آئی۔

۸۔ اپریل کو شام کے وقت مقامی تھانے کے افسر انچارج نے ڈی۔ ایس۔ پی کو یہ اطلاع دی کہ ڈاک بنگلے کے آس پاس ایک مشتبہ شخص کو دیکھا گیا ہے۔ یہ اطلاع ملتے ہی ڈی۔ ایس۔ پی نے شام کے ساڑھے چھ بجے صوبائی پولیس ہیڈ کوارٹر کو اس امر کی اطلاع دی۔ ادھر سے یہ خبر کرنے کی کہ مولانا آزاد کو گرفت میں لے لیا گیا ہے، ہدایت آئی، علاوہ ازیں یہ بھی کہ وہ دریافت کر لیے گئے ہیں۔ اس کی اطلاع ۹۔ بجے رات تک سی۔ آئی۔ ڈی کو دے دی جائے۔ ان ہدایات کے ملتے ہی ڈی۔ ایس۔ پی نے ڈاک بنگلے میں خود ہی جا کر پتہ لگانا مناسب خیال کیا جس شخص کی نشاندہی کی گئی تھی، وہ وہیں پر مقیم تھا۔ لہٰذا اس کے کمرے کے نزدیک جانا انھوں نے ضروری خیال کیا۔ وہاں پر موجود اس شخص کے ملازم نے اپنے مالک کے نام کو افشا کرنے سے انکار کیا۔ اس پر ڈی۔ ایس۔ پی نے کمرے میں جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی۔ غالباً دیکھ لیے جانے سے بچنے کی خاطر اس شخص نے غسل خانے میں پناہ لی۔ ڈی۔ ایس۔ پی کا شبہ یقین میں بدل گیا اور اس طرح اس شخص کی شناخت مولانا آزاد کی حیثیت سے کی گئی۔ ایس۔ پی کی خفیہ ڈائری میں درج رپورٹ تلاش و تفتیش کے درمیان رونما واقعات کی تصویر کو اور بھی واضح کرتی ہے۔ رپورٹ ملاحظہ ہو:

"محی الدین احمد عرف مولوی ابوالکلام آزاد، ضبط شدہ اخبار الہلال کے سابق ایڈیٹر، جو بنگال سے، قانون تحفظ ہند کے تحت خارج کیے گئے ہیں، وہ ۵۔ اپریل ۱۹۱۶ء کو رانچی پہنچ گئے۔ ان کی آمد کی خبر ۷۔ اپریل تک جب وہ ڈاک بنگلہ میں پائے گئے انہیں ہوئی تھی۔ ڈاک بنگلہ کے ملازموں سے یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ یہاں ۲۸۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو (بھی) آئے اور ۳۰۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو کلکتہ واپس روانہ ہوئے۔ ڈاک بنگلہ کی بہی، انھیں تاریخوں میں محی الدین کا اس (ڈاک بنگلہ) میں داخلہ بتاتی ہے۔ یہ نام معلوم نہیں تھا، اسی لیے اس کے لاپتہ ہونے کی خبر ابوالکلام آزاد کی حیثیت سے دی گئی۔ اگرچہ انھوں نے مقامی پولیس انسپکٹر کو بتایا ہے کہ وہ یہاں کچھ دنوں تک قیام کا ارادہ رکھتے ہیں مگر وہ یہاں آنے کے بعد کسی مناسب گھر کو تلاش کر رہے ہیں۔ دو دنوں سے انھوں نے کسی سے ملاقات نہیں کی ہے اور نہ کوئی مقامی شخص ان سے ملنے کے لیے آیا ہے۔ خاموشی سے ان کی نگرانی کی جا رہی ہے۔"

رانچی کی مقامی پولیس کو تلاش و تفتیش کے پہلے مرحلے میں ناکامی کا سامنا اسی سبب سے کرنا پڑا تھا کہ ڈاک بنگلے کے ملازمین مولانا آزاد کو محی الدین کے نام سے جانتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ اس شہر کے لیے نو وارد نہیں تھے۔ ڈاک بنگلے میں ۲۸۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو اپنی پہلی آمد سے ایک ماہ پہلے بھی وہ رانچی آئے تھے۔ اس وقت ان کے ہمراہ قاضی نورالانعام بھی تھے۔ اس بار انھوں نے ۲۷۔ ستمبر سے ۲۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء تک کلکتہ کے اپنے بزرگ رفیق کار مولوی عبدالکریم (ریٹائرڈ انسپکٹر آف اسکول گورنمنٹ آف بنگال) کے مکان میں قیام کیا۔ کہنا چاہیے کہ رانچی میں مولانا آزاد کی یہ آمد تیسری بار ہوئی تھی۔ پہلی بار ۶۔ دن اور دوسری بار تین دن تک کے اپنے قیام میں یہاں پر ان کی سرگرمیاں کیا رہیں ہم ان کا پتہ نہیں چلتا۔

رانچی پولیس نے اب مولانا آزاد کی نقل و حرکت پر نگرانی شروع کر دی۔ ان سے ملاقات کرنے والوں پر بھی نگاہ رکھی جانے لگی۔ رانچی میں ان کی موجودگی کی تصدیق کے بعد تو یہ سب کچھ ہونا ہی تھا۔

حواشی و توضیحات

۱۔ File No. 1255/1/16 Bihar State Archives, Patna

فائل کے بیشتر صفحات ضائع ہو گئے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ اس کے ابتدائی صفحات محفوظ رہ گئے ان میں درج احوال کی روشنی میں مضمون تیار کیا گیا ہے۔

۲۔ دینک بھارت مترا (۳۱۔ مارچ ۱۹۱۶ء)، ادرب (۳۱۔ مارچ ۱۹۱۶ء) اور صداقت (یکم اپریل ۱۹۱۶ء)، بحوالہ:
Bengal News papers Selections Pages 465, 4690

۳۔ صوبجات متحدہ کی حکومت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے متعلق مولانا آزاد کی تحریروں اور اس سلسلے میں اپنے صوبے کے حدود میں ان کی سرگرمیوں سے سخت نالاں اور متوحش تھی۔ سی۔ آئی۔ ڈی کی دو الگ الگ رپورٹوں (موصولہ ۹۔ نومبر ۱۹۱۵ء) میں درج ہے کہ مولانا آزاد اور مولانا حسرت موہانی نے ایک لیفلٹ (بہ عنوان مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن) اور ایک پمفلٹ (بہ عنوان تنقید و تردید) بالترتیب اپنے ناموں سے شائع کیے۔ ان میں مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن کے گزشتہ اجلاس (منعقدہ ۱۵۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء) کی کارروائیوں کی براہ راست تنقید کی گئی تھی۔ مگر یہ تنقید بالواسطہ طور پر مسلم یونیورسٹی کے متعلق صوبجات متحدہ کے موقف اور اس کی حکمت

علی کے خلاف جاری تھی۔ یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ یو۔پی کی حکومت نے مولانا حسرت موہانی کے خلاف اس پمفلٹ کی اشاعت پر کیا کارروائی کی البتہ مذکورہ بالا رپورٹوں کو دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے پمفلٹ کی وصولیابی کے چوتھے دن یعنی ۹ نومبر ۱۹۱۵ء کو اپنے یہاں مولانا آزاد کے داخلے پر پابندی کا حکم جاری کر دیا۔ صوبجات متحدہ کی ایک سی آئی۔ڈی رپورٹ (مورخہ ۹ نومبر ۱۹۱۵ء) کے مطابق:

مقامی حکومت نے قانونِ تحفظ کے دفعہ ۳ کے تحت ایک حکم جاری کیا ہے اس میں ابوالکلام آزاد (ضبط شدہ الہلال کے سابق ایڈیٹر) کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ صوبجات متحدہ (آگرہ اور اودھ) کے حدود میں نہ داخل ہوں گے نہ رہائش اختیار کریں گے اور نہ ہی وہ یہاں پر موجود ہوں گے۔ انھیں وارننگ دی گئی ہے کہ وہ اگر جان بوجھ کر اس حکم کی کسی ہدایت کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو وہ اس کے ضابطہ ۳ میں مجوزہ سزا کے مستحق ہوں گے۔"

(U.P. Intelligence Abstracts 1915, Pages-693-695)

قرینِ قیاس امر یہ ہے کہ مولانا آزاد کے خلاف اس حکم کا فوری سبب پمفلٹ میں درج تحریر ہو سکتی ہے اس کے بعد ہی دہلی اور پنجاب کی صوبائی حکومتوں نے اپنے اپنے صوبوں میں ان کے داخلے پر پابندی کے احکامات جاری کیے صوبجات متحدہ کے حدود میں داخلے پر پابندی کے متعلق مسلم یونیورسٹی کے حوالے سے مولانا آزاد کا یہ بیان ملاحظہ ہو:

"میں سچ ہے کہ صوبجات متحدہ کی گورنمنٹ نے پچھلے اجلاس ایسوسی ایشن کی شرکت کے بعد ہی مجھ کو اپنے صوبے میں داخل ہونے سے روک دیا ہے اور اس لیے میں اس جلسے میں شریک نہیں ہو سکتا۔"

(البلاغ شمارہ ۷ (ص ۴۔۲۔۳) مارچ ۱۹۱۶ء۔ ادبی ایڈیشن ص ۱۱۔۴ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ)

جس پچھلے اجلاس ایسوسی ایشن کی بات کہی گئی ہے وہ ۱۵۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو منعقد ہوا تھا اور جس جلسے میں شریک نہ ہو سکنے کی بات کہی گئی ہے وہ ۱۰۔ اپریل ۱۹۱۶ء کو لکھنؤ میں منعقد ہونے والا تھا اس کا اہتمام مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن نے کیا تھا۔

؎ تراشے سے اخبار کے نام اور اس کی اشاعت کی تاریخ کا پتہ نہیں چلتا۔ اس میں عنوانات دو سطری اس ترتیب میں درج ہیں۔ (پہلی سطر۔ بنگال سے اخراج دوسری سطر۔ گورنمنٹ کا حکم نامہ)

؎ مثال کے طور پر حکم اخراج کے اجرا کے دوسرے دن یعنی ۹ مو

مارچ ۱۹۱۶ء کو حکومت بنگال کے انٹیلی جینس برانچ نے ہفتہ بھر کی روداد پر مشتمل جو رپورٹ تیار کی اس میں حسب ذیل اہم اطلاعات درج ہیں:

(i) ۲۰، مارچ کو پٹنہ سے مولانا آزاد کے ہمراہ مولانا حسرت موہانی آئے تھے وہ ۲۳، مارچ کی شام کے وقت کلکتہ سے روانہ ہو گئے۔

(ii) ۲۷، مارچ کو مولانا آزاد نے دارالارشاد میں ایک تقریر کی جس میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے مسلمانوں سے جہاد کرنے کے لیے کہا۔

(iii) ۲۹، مارچ کو انھوں نے دو پنجابیوں اور پانچ افراد سے جو یوروپین لباس پہنے ہوئے تھے ملاقات کی۔ ان لوگوں کا استقبال انھوں نے اپنے نجی کمرہ واقع نمبر ۴۵ رپن لین میں کیا۔ یہ شک کیا جاتا ہے کہ ان کے مابین چند خفیہ مشورے ہوئے جیسا کہ دارالارشاد کے طلبا تک کو بھی اس موقع پر موجود رہنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔"

(بحوالہ: File No. 428/16 Page 32, Bengal Archives, Calcutta)

؎ حکومت بہار و اڑیسہ کے پاس ریکارڈس کی شکل میں مولانا آزاد پر مختلف عنوانات سے کئی فائلیں رہی ہیں۔ ان میں سے بیشتر فائلیں انٹیلی جنس برانچ کی رپورٹوں کی بنیاد پر تیار کی گئیں۔ ۱۷۔۱۹۱۴ء میں تیار ہونے والی فائلوں کے عنوانات اور نمبر حسب ذیل ہیں:

1. Speech by Maulana Abul Kalam Azad Editor, of Alhilal File No. 196

2. Objectionable articles in Al-hilal read by Mohammedans in Patna and probably elsewhere File No. 201

3. Objectionable articles published in Alhilal of Calcutta on present crisis File No. 210

4. Meeting of the Anjuman Islamia at which Mazharul Haque, 3. Turkish delegates, Kalam Azad and other spoke File No. 295

5. Issue of 2nd September of Alhilal containing special branch report, File No. 302

6. Articles in Alhilal, entitled (Importance of) Har & Islam File No. 315

7. Abul Kalam Azad Editor of Alhilal

according to the rumour in Patna city vide secret Abstract Bihar & Orissa of 25th Sept. 1914, applied to Mr. Mazharul Haque for a portion of money collected Cownpore, Mosque Case File No. 326

8. Hazbullah Association and duties of its member File No. 363

9. Regarding Alhilal, An Urdu weekly paper printed published in Calcutta File No. 815

10. Report of a meeting of Maulana Kalam of Calcutta Abul Subhan of Delhi, M. Hasrat of Lucknow, Muzzam Ali Khan of Aligarh and Dr. Ansar Ali of Delhi, met by Mr. Mazharul Haque at Bankipore, at the house of Mr.Hassan Imam to discuss the Mohammadan University question File No. 1232

افسوس ناک امر یہ ہے کہ مذکورہ بالا تمام فائلیں ضائع ہوگئیں۔ بہار اسٹیٹ آرکائیوز کے انڈکس بک نمبر ۳ (پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ، گورنمنٹ آف بہار و اڑیسہ) میں ان فائلوں کا اندراج موجود ہے۔ آخر الذکر فائل انٹیلی جنس برانچ کی جن دو رپورٹوں کی بنیاد پر تیار کی گئی تھیں ان کا اندراج انٹیلی جنس ایبسٹرکٹس میں موجود ہے۔ ۲۱ مارچ ۱۹۱۴ء کی پہلی رپورٹ کے مطابق:

"کلکتہ کے مولانا ابوالکلام آزاد دہلی کے عبدالسبحان (غالباً کان پور کے مولوی عبدالقادر آزاد سبحانی۔ ج۔ق) لکھنؤ کے ایم۔ حسرت (علی گڑھ کے مولانا حسرت موہانی ہونا چاہیے۔ ج۔ق) ۱۹ مارچ کو بانکی پور (پٹنہ) پہنچے اور اسٹیشن پر ان کی ملاقات جناب مظہر الحق سے ہوئی، جن کے ساتھ وہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اسی شام کو مسلم یونیورسٹی کے سوال پر بحث کرنے کے لیے انھوں نے مسٹر حسن امام کے مکان پر ایک نشست میں شرکت کی۔۔۔"

۲۲ مارچ ۱۹۱۴ء کی دوسری رپورٹ کے مطابق:

"مولانا آزاد کلکتہ کے لیے بانکی پور سے ۲۰ مارچ کو روانہ ہوئے۔"

بہ حوالہ: (Bihar & Orissa Intelligence Abstracts 1914 P.132)

مندرجہ بالا رپورٹس کی تصدیق بنگال آرکائیوز کی ایک فائل (No. 428/14 pages 27 & 32) میں درج دو اطلاعات کرتی ہیں، جن کے مطابق:

(۱) مولانا آزاد ۱۶ مارچ ۱۹۱۴ء کو کلکتہ سے بانکی پور کے لیے روانہ ہوئے اور ۲۱ مارچ کو کلکتہ واپس ہوئے۔

(۲) مولانا آزاد جب پٹنہ سے واپس لوٹے تو ان کے ہمراہ علی گڑھ کے مولانا فضل الرحمٰن (سید فضل الحسن عرف مولانا حسرت موہانی ہونا چاہیے۔ ج۔ق) بھی تھے۔

محولہ رپورٹس میں ایک امر قابل توجہ ہے۔ ۱۶ مارچ کو کلکتہ سے روانہ ہوئے مگر ان کی آمد پٹنہ میں ۱۹ مارچ کو ہوئی۔ ۱۷، ۱۸ مارچ کا دن انھوں نے کس مقام پر بتایا اس بابت میں انٹیلی جنس رپورٹ کچھ نہیں بتاتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک دن کے لیے کسی مقام پر ٹھہر گئے اور انھوں نے مذکورہ نشست کے مدعوئین کا وہاں پر انتظار کیا۔ غالباً یہی سبب ہے کہ تمام افراد بشمول مولانا آزاد ایک ہی وقت پر پٹنہ کے ریلوے اسٹیشن پر وارد ہوئے۔ مسلم یونیورسٹی کے سوال پر مذکورہ نشست کی غرض و غایت اور صوبہ بہار میں ہی اس کے انعقاد کے سبب سے یہاں پر بحث نہیں، البتہ اس حقیقت کی نشاندہی یہاں پر مقصود ہے کہ بہار و اڑیسہ کی حکومت کے پاس مولانا آزاد سے متعلق غیر مربوط اور متفرق معلومات پہلے سے موجود تھیں۔ محولہ رپورٹس سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ بنگال اور بہار و اڑیسہ کی حکومتیں مولانا آزاد کی نقل و حرکت اور سرگرمیوں پر نظر رکھتی تھیں ساتھ ہی ان کے متعلق اطلاعات کی فراہمی میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون بھی کرتی تھیں۔

ے یہ محض اتفاق ہے کہ ٹھیک اسی وقت رانچی کے مسلمانوں کی ایک جماعت اپنے بزرگ مولانا عبدالقادر صاحب مرحوم کو رخصت کرنے کے لیے اسٹیشن پر موجود تھی۔ مولانا آزاد جیسے ٹرین سے پلیٹ فارم پر اترے، اسی سے مولانا موصوف پورولیا جانے والے تھے۔ واقعہ نویسوں نے لکھا ہے کہ موصوف نے مولانا آزاد کو پہچان لیا اور بڑی عزت و تکریم کے ساتھ ان سے ملاقات کی۔ مولانا موصوف کو رخصت کرنے والوں نے کسی نووارد شخص کے ساتھ اپنے بزرگ کا ایسا سلوک دیکھا تو انھوں نے مولانا آزاد کو گھیر لیا اور باری باری ان سے مصافحہ بھی کیا۔ (دیکھیے (۱) مولانا آزاد رانچی میں' ابوالسلام رحمانی' ہفتہ وار 'الکلام' پٹنہ' مارچ ۱۹۵۹ء' ص ۱۱ (۲) سوونیر ایڈیٹر ثمر الحق 'منجانب' ارکین کمیٹی ۸۵ ویں سالگرہ مولانا ابوالکلام آزاد' رانچی' ۱۱ ستمبر ۱۹۷۳ء' ص ۱' ۳ اور ۲۸)۔ غالباً مسٹر سیموئیل رخصت کرنے والوں کو دیکھ کر بھرم کا شکار ہوگئے کہ یہ تو ایک بھیڑ تو کسی آنے والے شخص کے انتظار میں استقبال کے لیے کھڑی ہے۔

ش ۱۹۱۱ء میں رانچی شہر کی کل آبادی ۳۲۹۹۴ شمار کی گئی تھی۔

۱۹۱۱ء سے یہ شہر حکومتِ بہار و اڑیسہ کا عارضی ہیڈ کوارٹر بن گیا اور اس کے ساتھ ہی شہر کی آبادی میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہ اضافہ سکریٹریٹ میں کام کرنے والے عہدے داروں، کلرکوں اور خدمت گاروں نیز دوسرے مقامات سے آکر بسنے والے تاجروں اور سوداگروں کی آمد کے سبب سے ہوا۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۱۸ء میں شہر کی آبادی اپنے اضلاع سمیت لگ بھگ ۳۰ ہزار کے قریب ہوگی۔ ۱۹۱۷ء میں کیے گئے ایک سرکاری اندازے کے مطابق ۱۷۰۰۰ ہندو، ۵۰۰۰ مسلمان ۵۳۰۰ عیسائی اور دیگر مذاہب اور عقائد کے لوگ اس شہر میں بستے تھے۔ بہ حوالہ:

Bihar & Orissa District Gazetteer (Ranchi 1917 By M.C.Hallet P236)

ے Bengal Intelligence Abstracts 1916 P.163

Bihar & Orissa Intelligence Abstracts 1916 P. 36

حکومتِ بنگال کی جانب سے فراہم کردہ مولانا آزاد سے متعلق خفیہ نوٹس میں درج ہے کہ وہ دوبارہ رانچی جا چکے ہیں۔

ماہنامہ ایوانِ اردو دہلی نومبر ۱۹۹۳ء

ان کی خدمت میں حاضری رہی ہے۔ اور آپ سب کی یاد آج بھی تازہ ہے۔

علی گڑھ کی زندگی میں اچھا برا جو کچھ کیا ہے اس کی مختصر داستان نذرِ عرض کر دی گئی۔ اب تو بارگاہِ الٰہی میں یہی دعا ہے کہ:

رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝

---

① الٰہ دین کے نام سے دو دوستوں کی دوستی یاد آئی۔ وہاں والدِ ایت حسین صاحب نے دہرہ دون کے کھاڑی مسعود زیدی کے بزرگ تھے اپنی کوٹھی کا نام انگلستان کے نام پر حبیب اللہ منزل رکھا اور حبیب اللہ صاحب نے اپنی کوٹھی کا نام ولایت منزل رکھا۔ ENGLAND MANZIL ہے جہاں کہا کرتے تھے۔ اسی کے قریب بعد میں PICTURES GALLERY تعمیر ہوئی تھی۔

② حکیم صاحب بعد میں کراچی آگئے تھے اور وہاں برنس روڈ پر مطب کرتے تھے۔

[العلم (کراچی) اکتوبر۔ دسمبر ۹۳ء]

بیگم حمیدہ اختر حسین رائے پوری

ہم سفر

①

بیگم حمیدہ ــــ مشہور جاسوسی ناول "نیلی چھتری" کے مصنف جناب ظفر عمر کی صاحبزادی اور ڈاکٹر اختر حسین صاحب رائے پوری کی اہلیہ ہیں۔ سال گزشتہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی جدائی کے سبب صدمے سے گزری تھیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے انھیں کچھ طور آمادہ کر لیا کہ وہ اپنی تقریباً ساٹھ سالہ رفاقتِ زندگی کی یادیں قلم بند کر کے انھیں اسلام آباد بھیج دیں تاکہ وہ ایک نظر انھیں دیکھ لیں اور پھر "افکار" میں ان کی اشاعت ممکن ہو سکے۔ چنانچہ بیگم حمیدہ اختر حسین صاحبہ رائے پوری نے چار رجسٹر اب تک لکھ ڈالے ہیں اور پہلے رجسٹر کے مندرجات زینتِ افکار کئے جا رہے ہیں۔

واضح رہے کہ بیگم حمیدہ زندگی بھر ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں مصروف رہیں اور کبھی کوئی تحریر نہیں لکھی ــــ افکار ــــ بصد فخر و مسرت بیگم حمیدہ کی یادداشت کو شائع کرتے ہوئے یہ اعلان بھی کرتا ہے کہ بطور ادیب بیگم حمیدہ پہلی بار اردو ادب سے متعارف ہو رہی ہیں۔ ان کی سادہ و پُرکار تحریر ہمیں یقین ہے کہ اہلِ نظر سے داد و تحسین حاصل کرے گی۔

ــــ صہبا لکھنوی

صہبا لکھنوی صاحب نے اختر حسین رائے پوری سے بڑے ہی جتن کر کے "گردِ راہ" اردو ادب کو ایک عظیم ادبی شہ پارہ دلوا کر ایک اہم کارنامہ سرانجام دیا۔

اختر "گردِ راہ" کے حرفِ آغاز میں لکھتے ہیں "مسٹر ڈلی دیکھیے کر نوجوانی میں پیرس کی کہانی لکھنے بیٹھ گیا تھا اور اب

لکھ رہا ہوں ان بیتے دنوں کی داستان مرقوم کر رہا ہوں معلوم نہیں یہ روٹھا ہوا دوست کس حد تک میرا ساتھ دیتا ہے۔ وہ اکتاتا ہے تو ذرا سا دبا دیتا ہوں کہ میرے حافظے کا ساتھ دے۔ البتہ خود فیصلہ کر کہ کیا گفتنی ہے اور کیا ناگفتنی ہے۔

ہمارے جمیل جالبی صاحب نے بارہ عدد قلم اور چار رجسٹر بھیج کر مجھ بہتر سالہ بڑھیا سے خواہش ظاہر کی کہ اس پیری میں عمر کے پہاڑ کی ڈھلتے ہوئے جوانی کی کہانی قلم بند کرنے بیٹھ جاؤں۔ بھلا میں آپ کے ان قلموں سے کیا کہہ سکتی ہوں کہ میرا ساتھ دو۔ میں نے تو زندگی بھر اپنا قلم پکڑا ہی نہ تھا۔ ہاں آپ کی فرمائش بے جا نہیں ہے اب تک کی کہانی سنانے بیٹھ گئی۔ اب آپ کے قلم اگر اس کو قلمبند کر گئے تو یہ آپ کی کرامات ہوگی، لیکن بعد میں آپ کو اگر ٹیڑھی مسیاری کا طوق زیر نظر کرنا پڑتا تو اس کی ذمے داری آپ کی اپنی ہوگی۔

ہماری ملاقات اختر حسین رائے پوری سے ڈاکٹر کے۔ ایم۔ اشرف کے گھر ہوئی جو آل انڈیا کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری تھے۔ ڈاکٹر اشرف چوتھی کلاس سے میرے بھائی شوکت عمر کے ساتھ علی گڑھ میں پڑھ رہے تھے۔ ان کی پڑھائی کی ابتدا یوں ہوئی کہ جج صاحب کے بچے کے ساتھ کھیلنے اور ان صاحب کا حقہ بھرنے کے لیے ملازم رکھا گیا تھا۔ وہاں اشرف صاحب نے خود اپنی تعلیم کا آغاز کر دیا۔ جب بچے کو پڑھایا جاتا تو اشرف صاحب کی یادداشت میں سب محفوظ ہو جاتا۔ دونوں کی ختم کردہ کتابوں کی نقل اپنی کاپی پر کیا کرتے اور اس طرح اپنی اتالیقی خود کرتے رہے۔ اس لڑکے کی ذہانت اور شوق کو دیکھ کر اشرف کو اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ میرے بھائی شوکت عمر یہاں سے ان کے ہم جماعت بنے۔ دوستی کا ایک ایسا بیج بویا گیا جس نے ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر لی۔ جب اشرف صاحب کی کفالت کرنے والے صاحب کا تبادلہ ہونے لگا تو اشرف کے لیے مسئلہ پیدا ہوا کہ اب تو ان کو اپنے گاؤں متھرا ہی جانا پڑے گا اور تعلیم کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ اب وہ اپنے دوست سے مشورہ کرتے ہیں کہ ان حالات میں آخر وہ اپنی تعلیم کو کیوں کر جاری رکھ سکتے ہیں۔ میرے بھائی نے اپنے دوست کو دلاسہ دیا اور کہا چند روز بعد وہ بتا سکیں گے کہ کیا کرنا چاہیے۔ شوکت عمر نے اماں کو خط لکھا۔ یہ پانچ چھ سطروں کا خط اب بھی میری یادداشت میں محفوظ ہے۔

شوکت عمر نے لکھا تھا "ہماری اماں بچپن میں جو کہانیاں سناتی تھیں۔ ان میں سے ایک کہانی میں کوئی لڑکا کسی لڑکے کو بھائی بنا لیتا ہے اور ساری عمر اس کا ہاتھ پکڑ کے زندگی کی سیدھی سڑک پر چلتا چلا جاتا ہے۔ میں نے بھی کسی کا ہاتھ پکڑ کر اس کو اپنا بھائی بنا لیا تھا۔ اشرف نامی لڑکے کو اماں میرے توسط سے خوب جانتی ہیں۔ انھوں نے کئی بار فرمایا کہ گویا اللہ میاں نے ان کو چھٹا بیٹا دے دیا ہے۔ اب آپ کو صرف کرنا یہ ہے کہ میری بورڈنگ کی فیس کے ساتھ ساتھ اشرف کے اخراجات اور فیس کے روپے بھیج دیا کیجیے ورنہ ایک عظیم دماغ مشقت کے گرد و غبار کی تہوں میں ہمیشہ کے لیے دفن ہو جائے گا۔" جواب دینے سے پہلے میرے والد نے اماں سے بات کی اور دونوں نے نادیدہ اشرف کو اپنا بیٹا بنا لیا۔ خود والد صاحب نے بیٹے کو تار کے ذریعے "GO-AHEAD" کے الفاظ کے ساتھ اشرف کی ذمے داری اٹھانے کی حامی بھر لی۔ گرمی کی چھٹیوں میں اشرف صاحب، شوکت عمر کے ساتھ متھرا جانے سے پہلے ہمارے گھر آتے۔ اس طرح ان کو ڈھیر سارے نئے بہن بھائی مل گئے۔

میٹرک تک یہ حال تھا کہ کلاس میں کبھی اشرف صاحب اوّل تو کبھی شوکت عمر۔ میٹرک میں دونوں نے پوزیشن حاصل کی۔ اشرف اوّل اور شوکت عمر دوم رہے۔ کالج کے زمانے میں جو ہر سال الہ آباد میں آل انڈیا مباحثوں کا مقابلہ ہوتا تھا اس کی ٹرافی ہر سال کبھی

شوکت عمر اور کسی سال اشرف جیت کر پہلے ہمارے گھر آتے یعنی جہاں بھی والد کی تعیناتی ہوتی - پھر یہ ٹرافی علی گڑھ یونیورسٹی واپس جاتی تھی - ٹرافی ایک شیشے کے کیس میں مقفل رہتی تھی - علم کی مورتی ایک ہنس کے اوپر بیٹھی ہے - نیچے پانی میں ایک کھلا ہوا کنول کا پھول اس پر اس کا ایک پاؤں رکھا ہوا مسکرا رہی ہے - چاندی پر یہاں وہاں سونے کا پانی پھرا ہوا ہے اس وقت میری نگاہوں کے سامنے ہے - بی اے میں اشرف نے اوّل پوزیشن اور شوکت عمر نے دوئم پوزیشن حاصل کی -

اب والد صاحب نے شوکت عمر کو بجلی کی انجینئرنگ پڑھنے کے لیے ولایت بھیجنے کا انتظام شروع کر دیا - وہ بار بار والد صاحب سے یہ اصرار کرنے لگے کہ ولایت جا کر آگے تعلیم حاصل کرنے کا حق پہلے تو اشرف کا ہے ان کا نہیں - جب دیکھا کہ والد صاحب کی ان سنی کر رہے ہیں تو تنا کہا کر منہ بولا بیٹا بھلا کیسے اپنے بیٹے کی طرح آپ کو لگ سکتا ہے - ایسے لوگ اور ایسی دوستی بھلا اب کہاں نظر آ سکتی ہے - والد صاحب پر بیٹے کے اس جملے کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ فوراً ہی فیصلہ ہوا کہ اشرف کو بھی باہر بھیجنا ہے تاکہ دونوں دوست ساتھ ساتھ رہ کر آگے کی تعلیم حاصل کریں - ریاست ریوا کے مہاراجہ اور بیگم بھوپال والد کے بڑے قدر دانوں میں تھے - مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے مہاراجہ ریوا نے اسکالرشپ کی حامی بھری - یہ دونوں دوست اور ان کے تیسرے دوست ذکاء اللہ خاں جو (ڈاکٹر رشید جہاں کے شوہر محمود الظفر کے کزن تھے) اکٹھے ولایت کے لیے روانہ ہوئے - ذکی بھی پانچویں جماعت سے میرے بھائی شوکت عمر کے ساتھ پڑھ رہے تھے - ذکی (ذکاء اللہ خاں) کا بچپن سے ہمارے گھر آنا جانا یوں تھا کہ ان کے والد ممتاز اللہ خاں صاحب والد کے عزیز دوستوں میں سے تھے - بڑے ہی روشن خیال تھے کہ اپنی دو بیٹیوں زہرہ اور عذرا کو اودے شنکر کے ساتھ کام کرنے کی اجازت خوشی خوشی دے دی کہ جب قدرت نے ان کو ناچ اور ایکٹنگ کے لیے صلاحیت دی ہے تو کیوں نہ استعمال کریں - جمیل بھائی! سوچیے تو آج سے ساٹھ سال پہلے مسلمان لڑکیوں کے لیے سرِ عام اسٹیج پر آ کر ناچنا اور ایکٹ کرنا کیا معنی رکھتا ہو گا - خاندان والوں اور دوستوں کی لعن طعن کی بوچھار بھی ان پر ہوتی مگر انھوں نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی - بعد میں زہرہ کی شادی سہگل نامی ایک ہندو سے ہوئی اس طرح وہ زہرہ سہگل کے نام سے مشہور ہوئیں اور لندن میں بود و باش اختیار کر کے وہاں اپنا ایک ڈانسنگ اسکول کھول لیا - لندن میں بہت سے اسٹیج کے ڈراموں اور فلموں میں بھی کام کیا اور اب دو دو سال سے دہلی میں قیام پذیر ہیں ایک اکیڈمی کی سربراہ ہیں - عذرا کی شادی حمید بٹ سے ہوئی اور وہ بمبئی میں رہنے لگیں بہت سی فلموں میں کام بھی کیا - گاہے گاہے ٹی - وی میں ڈرامے کرتی رہیں - پھر پاکستان آ گئیں - بیوہ ہونے پر پنڈی سے لاہور میں رہائش اختیار کر لی ہے - اسی طرح اب تک تھیٹر اور ڈراموں میں حصہ لیا کرتی ہیں - چند ماہ قبل زہرہ سہگل تین ہفتے کے لیے پاکستان آئیں تو دونوں بہنوں نے اپنی بھتیجی ثمینہ ممتاز اور کامل ممتاز نے (جو ان کے بھتیجے ہیں) ان کی لڑکی ثمینہ ممتاز کے ساتھ مل کر ایک اسٹیج شو لاہور میں اور پھر کراچی میں کیا - اس طرح ایک ہی خاندان کی چار نسلیں ایک ساتھ اداکاری کر رہی تھیں - ایک تھی نانی" جس نے وہاں اور یہاں دیکھا ہے وہ کچھ ایسا تھا کہ کبھی فراموش نہ کر سکیں گے -

اشرف صاحب کے والد متھرا کے پاس ایک گاؤں میں رہتے تھے اور کھیتی باڑی کر کے کنبہ پال رہے تھے - جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ ان کا بیٹا ولایت پڑھنے کے لیے جا رہا ہے تو جانے کی اجازت اس شرط پر دی کہ وہ شادی کر کے جائیں ورنہ تو کوئی نہ کوئی میم ان کو دبوچ لے گی اور پھر وہ کبھی گاؤں واپس نہ آئیں گے - ولایت جانے کے شوق کی حامی بھر دی اور کسی کسان کی لڑکی کے ساتھ ان کا بیاہ رچا دیا گیا -

کی لڑکی کے ساتھ ان کا بیاہ رچا دیا گیا۔

تینوں دوست شوکت، اشرف اور ذکا اللہ ولایت پہنچ کر اپنی اپنی پڑھائیوں میں لگ گئے۔ اب شوکت عمر کو ایک یہ خیال آیا کہ غضب ہی تو ہو گیا، اشرف چار سال یہاں رہ کر جب گھر واپس پہنچیں گے تو اس بیچاری کلثوم کا جو جاہل مطلق ہے تو ان کا دل و دماغ ایک ایسی لڑکی کو کیوں کر قبول کرے گا؟ بہت سوچ کر اس نتیجے پر پہنچے اور والدہ صاحبہ کو یہ خط لکھا۔

والدہ محترمہ۔ آداب

خدا کرے گھر پر سب بخیر ہوں۔ میری، اشرف اور ذکی کی پڑھائی اطمینان بخش ہے۔ پر میرے دل و دماغ کا سکون غائب ہے کہ میں نے ایک دوست اور بھائی بن کر اشرف کے ساتھ ظلم کر دیا وہ یہ کہ جب وہ یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر متھرا واپس اپنے گھر لوٹیں گے تو بیچاری کلثوم کو کس طور قبول کریں گے۔ میری اماں، آپ میرے اور اشرف کی خاطر یہ کریں کہ بھنوں کو اپنے ساتھ متھرا لے جائیں اور اشرف کے والد اور والدہ سے یوں بات کریں کہ کلثوم کی سسرال آپ کا گھر بھی ہے۔ آپ ان سے اجازت لیں کہ اس عرصے میں کلثوم علی گڑھ آپ کے پاس رہ کر اور سب لڑکیوں کے ساتھ کلثوم کی تعلیم اور تربیت کریں۔ مجھے امید ہے کہ جس قدر ان دونوں کے دلوں میں آپ کا اور ابا کا احترام ہے وہ انکار نہ کریں گے۔ شاید ان کے دلوں میں بھی وہی پریشانی ہو جو میرے دل میں ہے۔ یہاں کلثوم "نیل چھتری"* آ کر اور آپ کے سلسلے میں رہ کر کچھ پڑھ لکھ جائیں گی اور نشست و برخاست کے طور طریقوں کی اس چار سال کے عرصے میں بہت کچھ سیکھ لیں گی۔

آپ کا بیٹا

شوکت[1]

اس طور کلثوم بھابی ہمارے گھر آ گئیں۔ ہمارے تو کسی بھائی کی شادی نہ ہوئی تھی۔ ہم سب بہنوں اور اماں نے بڑے لاڈ کیے۔ صبح ماسٹر اور شام کو مولوی صاحب پڑھانے آتے۔ دن میں والدہ سلائی سکھاتیں۔ جب ہم لوگ اسکول سے واپس آ جاتے تو ہماری باری پڑھانے اور لکھانے۔ ان کا دماغ تھک سا جاتا، کبھی کبھی کالی پیلی کتاب ہمارے منہ پر دے مارتیں کہ میرا پیچھا چھوڑ دو ورنہ کل سے کچھ نہ پڑھوں گی۔ قدرت نے ان کو بڑا کائیاں دماغ دیا تھا۔ ان کھانا پکانا اور سلائی جلد سیکھ گئیں۔ گرمی کی چھٹیوں میں کلثوم متھرا پہنچا دی جاتیں اور ہم سب والدہ کے پاس جس جگہ بھی ان کی آمد ہوتی چلے جاتے۔

وقت بھاگتے گھوڑے پر بھاگتا چلا گیا اور دیکھتے دیکھتے چار سال گزر گئے۔ اللہ کا کرنا دیکھیے کہ تینوں دوستوں کو اپنی اپنی ملازمت علی گڑھ یونیورسٹی میں ملی۔ شوکت عمر کیمسٹری کے اور ذکا اللہ خاں سول انجینیئرنگ کالج میں لگے اور اشرف بھائی ہسٹری کے لکچرار ہو گئے۔

* نیل چھتری۔ (والد نے اپنے پہلے ماسی دادا کے نام پر گھر کا نام رکھا تھا) کوٹھی کے ساتھ کئی ایکڑ زمین تھی جس پر پھلوں اور

---

[1] والد صاحب کی عادت تھی کہ اپنے بچوں کے خطوط کی فائل بنا کر رکھتے تھے۔ اس طرح بہت سے خطوط والد کے بعد مجھے پڑھنے کو ملے۔

سنڑیوں کے بارے۔ ایک کالج کافی سال پہلے اس پر بنوائی تھی جس میں ریاضی کے پروفیسر بھٹاچاریہ صاحب کرایے پر رہ رہے تھے۔ جب ان کو کالج خالی کرنے کو کہا تو ان کا جواب یہ تھا "آپ اپنا کوٹھی خالی کر دیں۔ آپ کرائی کرایہ بھی نہیں دیتے ہیں کرایہ دیتا ہوں۔ ہرگز خالی نہیں کروں گا" یہ اس منطق پر چپ ہو گئے اور ایک نئی کالج بیٹے کے واپس آنے سے پہلے بنوا کر اس کو نک سک سے سجا دیا گیا۔ ان کو یقین کامل تھا کہ پہلی ملازمت بیٹے کو علی گڑھ ہی میں ملے گی۔ بھائی جان کی خوشی کی حد نہ تھی کہ والدین نے کس پیار سے ان کے لیے کالج بنوا کر سجا دیا ہے۔ کپڑے اور کتابیں اور خود "نیلی چھتری" میں کالج سے واپسی کے بعد کا وقت والد صاحب اور ان کے دوستوں میں گزارتے۔ جب اماں کے پاس زنان خانے میں آتے تو پاس بیٹھ کر ولایت کے قصے سناتے۔ ہم چھوٹی بہنیں اور بھائی لوگ ان کو ایک ہیرو کی طرح سمجھتے۔ ڈرتے بھی تھے اور بے انتہا چاہتے بھی تھے اور جب والد صاحب اپنی پوسٹنگ پر چلے گئے تو ہم سب بہت خوش ہوئے کہ اب بھائی جان زیادہ وقت اندر ہم سب کے ساتھ گزارا کریں گے۔

اسی طرح ایک ماہ ان کو ملازمت کرتے گزر گیا۔ اپنی پہلی تنخواہ اماں کے ہاتھ میں لا کر دی۔ انھوں نے اس میں سے پچاس روپے رکھ کر پھر بیٹے کے ہاتھ میں دے دی اور دس روپے کا نوٹ ان کے سر سے گھما کر صدقہ اتارا۔ ہمیں یہ تماشا دیکھنے میں بہیں بار آیا تھا۔ پھر وہ ہم سب کو باری باری بلا کر دس دس روپے دیتے گئے۔ ہم سوچ رہے تھے کہ اتنے ڈھیروں روپیوں سے ہم کیا کریں گے؟ اماں ایک بار بول پڑیں "شوکت مجھے تو تمہارے چہرے پر کچھ اداسی اور پریشانی نظر آ رہی ہے۔ آخر بات کیا ہے۔ اب لاڈلا بیٹا کہتا ہے "کل اشرف اور کلثوم نے مل کر ایک گھر "امیر منزل" کرایے پر لیا ہے۔ جب گھر آ رہا تھا تو پہلے ان دونوں کے ساتھ گیا۔ صرف تین بان کی کھاٹیں اور چند برتن۔ مجھے شرم سی آئی اپنے کالج کے خیال پر۔ اماں کیا آپ اپنے دوسرے بیٹے کے گھر کے لیے کچھ نہ کریں گی؟" "مگر وہ دونوں تو ہوسٹل میں کر سے کر رہ رہے تھے" —— "اماں میری! آپ نے یہ کیوں نہ سوچا کہ کلثوم کب تک گاؤں میں رہیں گی" —— اماں نے کہا —— "تو تم جو مناسب سمجھو اور ان کی ضرورت کا سامان بھجوا دو" ——

دوسرے دن بھابی کلثوم متھرا سے آ گئیں "امیر منزل" "نیلی چھتری" سے بس ایک فرلانگ پر تھی۔ بھائی جان سامان بھجوا کر ہم تین بہنوں کو ساتھ لے کر "امیر منزل" گئے۔ بھابی کلثوم کو ہم نے اپنے ساتھ لگا کر خانے قاعدے سے بیٹھنے کا کمرہ، کھانے کا کمرہ اور پلنگ وغیرہ کمرے میں سجائے۔ باورچی خانے میں پتیلیاں برتن وغیرہ رکھے۔ اشرف بھائی انتہائی خوش مزاج انسان تھے۔ برابر ہم سے لڑتے جھگڑتے رہے کہ یہ چیز کہاں ہے اور وہ کدھر ہے۔ ساتھ ساتھ کہتے جاتے کہ میری بہنیں کس قدر بے ڈھنگی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ گو ہم برابر کہے جاتے ارے بابا! صبر کریں کچھ کل پر بھی تو چھوڑا جا سکتا ہے۔ ذکر خاموش طبع ضرور تھے پر جب اور جو بھی بولتے رو کھا سا منہ بنا کر بڑی مزے دار بات کرتے۔ بھابی کلثوم پکار پکار کہے جاتیں —— "شوکت بھائی سب کھانا کھا کر جائیں گے" "مگر بغیر اماں کی اجازت کے وہ ایسا کیسے کر سکتے تھے اور پھر ہم سب گھر آ گئے۔

ان دنوں لڑکیوں کا آنا جانا دوسرے گھروں میں صرف مولود شریف یا کسی شادی پر والدہ کے ساتھ ہوتا تھا۔ بھابی کلثوم کثر "نیلی چھتری" آ جایا کرتیں۔ بے حد خوش رنگ کوٹھی میں رہتی ہیں۔ شوہر ولایت پلٹ ہے اور پروفیسر ہے۔ انھوں نے اشرف بھائی کو بیچارے پروفیسر بنا دیا تھا، لیکن بیچاری کے ایک بات سمجھ میں نہ آتی تھی کہ آخر ہو کر کسی کا علاج کرنا کیوں نہیں چاہتے بہت سمجھانے کی کوشش کرتے کہ کچھ ڈاکٹر ایسے بھی ہوتے ہیں جو پڑھا کر دماغوں کا علاج کرتے ہیں تو وہ سہم سی جاتیں کہ کیا اشرف یونیورسٹی میں پاگلوں کا علاج کرتے ہیں یا پھر ان کو پڑھاتے ہیں۔

"امیر منزل" کی بناوٹ کچھ یوں تھی کہ پہلے آپ دس سیڑھیاں چڑھیں تو چھوٹا سا برآمدہ۔ اس کے ایک سرے پر ایک چھوٹا سا بیڈروم اور غسلخانہ۔ برآمدے کے دوسرے سرے پر باورچی خانہ۔ اندر دو بیڈروم، باتھ روم اور بیٹھنے کا خوب بڑا سا ہال پھر ساتھ ہی بڑا سا کھانے کا کمرہ اور کوٹھی کے سامنے بڑا سا باغ۔

ہمارے والد نے کبھی اماں سے پردہ کرایا اور نہ ہی کسی لڑکی کو پردے میں رکھا۔ جو بھی گھر پر ابا کے دوست آتے، ہماری اماں ان کے ساتھ بیٹھتیں اور ہر قسم کی بات چیت میں حصہ بھی لیتیں۔ ہم لڑکیوں کو اجازت تھی کہ ان کے سامنے آئیں، آداب کریں، مہمانوں کی خاطر مدارات کر کے خاموشی سے واپس چلے جائیں۔ نانا خاندان کے بہت سے لوگوں کو اس پر اعتراض ہوتا مگر ہمارے والدین نے کبھی برا نہ مانا صرف مسکرا دیتے۔ کہتے تعلیم کا یہ بھی ایک بڑا حصہ ہے۔

اکثر بھائی جان بھی "امیر منزل" آ جاتے۔ مرد بیٹھنے کے کمرے میں جمع ہوتے۔ ہم بھابی کلثوم کے پاس رہتے۔ جب کچھ اور دوست بھی آ جاتے تو گرما گرم بحثوں کی آوازیں ہم سنا کرتے۔ ایک دن بھابی کلثوم کی زبانی معلوم ہوا کہ برآمدے والے کمرے میں کسی اور کو مہمان کے طور پر نہیں رکھا جاتا کہ اشرف اور ذکی کی تنخواہ کرائے اور گھر کے اخراجات کے لیے ناکافی ہوتی ہے۔

ہم گرلس کالج کی بس پر اسکول آیا جایا کرتے تھے۔ ہمارے گھر میں ایسا دستور نہ تھا کہ لڑکیاں جو ہاتھ لگ جائے اس کو پڑھیں۔ ہمیشہ والدین کی نظر رہتی کہ کون سا رسالہ اور کون سی کتاب پڑھنے کو دی جائے۔ کبھی کبھار مجاز کی بہن صفیہ اپنے شوہر اور لاابالی بھائی کے کمرے سے کوئی رسالہ، کبھی کوئی ناول چپکے سے لے آئیں مگر صرف دن بھر کے لیے۔ ہم چند سہیلیاں جلدی جلدی پڑھتے اور پھر وہ گھر جاتے وقت اپنے ساتھ لے جا کر اس کو پھر وہیں رکھ دیتیں۔ ایک بار وہ رسالہ "نگار" لائیں جو صرف مردوں کے پڑھنے کے لیے سمجھا جاتا تھا۔ اس میں ایک افسانہ "زبان بے زبانی" تھا۔ اس کو ایک نہیں دو تین بار پڑھا۔ یہ افسانہ ڈگر سے ہٹ کر تھا اور ایسا محسوس ہوا کہ لکھنے والے نے اپنی تمام تر دل کی گہرائیوں کے ساتھ خون جگر سے لکھا ہے۔ اس کی اپنی زندگی تنہائیوں میں گزر رہی ہے۔ محبت اور خوشیوں کی محرومیوں سے لبالب بھری ہوئی ہے۔ وہ کہنا چاہتا ہے پر کوئی سننے والا نہیں۔ محبت کا بھوکا انسان امربیل تک پر مرا مٹا جاتا ہے۔

معلوم نہیں کہ رعنی کہ سعیدہ اور صفیہ نے بھی ایسا سوچا تھا یا نہیں۔ مگر دونوں کو بے حد پسند ضرور آیا۔ یہ خیال ہم تینوں کے دلوں میں یکساں رہا کہ کاش یہ رسالہ ہمارا اپنا ہوتا تو کئی بار اور پڑھتے یا پھر اس کے لکھنے والے کا کوئی اور افسانہ ہاتھ لگ جاتا۔ میری خوشیوں سے بھرپور زندگی چونکہ سکون اور چین سے گزر رہی تھی شاید اسی وجہ سے مجھے شدت سے ایک انسان کا، برگد کے پیڑ کی طرح تن تنہا رہ کر اطراف کی چہل پہل اور لوگوں کی خوشیوں کو حسرت سے دیکھنا اور سوچنا بار بار یوں سوچنے پر مجبور کر رہا تھا کہ ایسے لوگوں کی زندگی میں جو بھی ہمدردی اور محبت کی رنگ آمیزی کرے گا تو وہ صرف اس کے لیے نہیں بلکہ خود اپنی ذات کے لیے خوشیاں بٹورے گا۔ کاش مجھے اور بھی اسی شخص کا لکھا ہوا افسانہ ہاتھ لگ جائے۔ کاش "نگار" کا یہ پرچہ پھر سے مل جائے۔ کیا خبر تھی یہ افسانہ میری اپنی زندگی یوں موڑ کر رکھ دے گا کہ ساری عمر اسی برگد کے پیڑ تلے ساری زندگی گزار دوں گی۔ یہ تناور اور کیا پیڑ جیسے اکیلا ویران اور گھنا ہوتا رہے گا اور میں اس کو گردن اٹھا کر بس زمین پر کھڑی دیکھا کروں گی۔ اس کی گھنیری چھاؤں، بت جھڑ، موسم گرما اور شدت کا جاڑا مجھے سب ہی عزیز رہیں گے۔ گویا میں ایک امربیل بن جاؤں گی جس سے چھٹکارا صرف "موت" کے ذریعے ممکن ہوگا۔

ادھر بھابی کلثوم کا یہ بتانا کہ جانے کس خوشی میں لڑکے کو اپنے گھر کا کمرہ دے دیا ہے۔ ذکی، اشرف اور شوکت کہاں، پروفیسر اور انجینئر اور کہاں یہ کالج میں پڑھنے والا لڑکا۔ عمر اور رتبے کا اتنا فرق۔ مگر اس سے جیسے ڈرتے ہوں۔ وہ بولتا تو بولتا چلا جاتا اکثر بحث کرتا۔ اور غضب تو یہ کہ سب مل کر اس کی باتیں سنتے رہتے۔ یہ تینوں تو ولایت کے پڑھے ہوئے تھے مگر مجال ہے کہ کسی کو گردانتے ہوں۔ وہ لڑکا بڑا غصے والا تھا۔ مجھے تو وہ کچھ خبطی لگتا تھا۔ اپنا کمرہ بند کر کے قینچی سے اخباروں کو کاٹا کرتا پھر تالا لگا کر گھر سے نکل جاتا۔ یوں کمرے کی صفائی کا سوال ہی نہیں تھا۔ ایک دن تالا کھلا رہ گیا اور میں نے جمعدار سے کمرہ جھڑوا کر اخباروں کے کٹے پھٹے تمام کاغذ پھنکوا دیے۔ وہ بھی کیسا شیر کی طرح غراتا پھرا کہ کون میرے کمرے میں آیا اور کس نے میرے کاغذ پھینکے۔ کدھر ہیں وہ سب اخبار؟ مجھے بھی پھر غصہ آگیا اور صاف صاف کہہ دیا "اب آپ اگر لکھ پتھر بھی جمع کرتے رہے تو میں ہرگز کمرے کی صفائی کروانے کی نہیں اور آپ بھی کبھی میرے پکائے ہوئے کھانے میں سو سو طرح کی برائیاں گھمانی نہ شروع کریں۔ میرا کلیجہ پک گیا سن سن کر کہ یہ سالن ایسا ہے۔ سبزی ویسی ہے۔ مرچ کم ہے، نمک زیادہ ہے" کبھی یہ کہ اس لڑکے کی ٹانگیں بھی ایک دم لمبی، لٹکا بھر بھر بال، موٹے موٹے ہونٹ۔ علی گڑھ میں میاں صاحب پڑھتے ہیں مگر شیروانی نہیں پہنتے۔ روز دو آنے نائی کے بچتے ہیں۔ بڑے نواب کا بچہ بنتے ہیں۔ یہ تینوں جو ولایت میں چار سال رہے اور ڈگریاں لیں، ایسے سادے کپڑے پہنتے ہیں اور ان حضرت کی قمیض جانے کس طرح کی ہے۔ چکا چیٹا کالر ایک کالی ڈوری چاروں طرف بندھی ایسے ہی آستینوں کے کف ہیں۔

بھابی کلثوم کو جیسے اس لڑکے سے چڑ اور نفرت سی تھی۔ ایک دن میں پوچھ بیٹھی۔ بھابی اس لڑکے کا آخر کوئی نام بھی تو ہوگا؟ آپ ہمیشہ "وہ لڑکا" کیوں کہتی ہیں؟ "توبہ توبہ جیسا خود ہے ویسا نام بھی ہے اختر نان پوری۔ میں تو کہوں کہ وہ پوری بھی اپنے نام کے ساتھ نا لگائے تو زیادہ بہتر ہوگا" ہم سب ہنس پڑے۔ مگر مجھے "وہ لڑکا" دیکھنے کی خواہش مزید ہوگئی اور یکایک دماغ میں ایک خیال گزرا کہ کہیں اختر حسین رائے پوری کو تو یہ نان پوری نہیں سمجھ بیٹھی ہیں۔ پوچھا بھابی ذرا سوچ کر بتائیں کہ اختر رائے پوری تو نام نہیں؟ کچھ دیر چپ رہ کر بولیں "ہاں، ہاں شاید یہی نام ہے" ہم بہت خوش ہوئے کہ اب بھابی کے ذریعے "نگار" کا پرچہ حاصل کر لیں گے۔ جب ان کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ تو ایک بڑا لکھنے والا ہے ہم کو ان سے "نگار" رسالہ مانگ کر دلوا دیں۔ تو صاف انکار کر دیا: میں تو اس سرپھرے کے منہ نہیں لگوں گی۔ میں نے دل میں سوچ لیا کہ اگر کبھی ان صاحب سے آمنا سامنا ہوگیا تو جھٹ سے فرمائش کر دیں گے۔ اور شاید کچھ اور مضمون بھی پڑھنے کو مل جائیں۔

ایک دن شوکت بھائی کے ساتھ جو آئی تو وہ لپکتے ہوئے آٹھ سیڑھیاں چڑھ گئے۔ میں پیچھے چنبیلی کی بیل سے جو ان صاحب کے کمرے کی کھڑکی کو ڈھانپتی ہوئی اوپر چھت پر چڑھ گئی تھی۔ پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ کچھ پھول توڑنے لگ گئی۔ جب مٹھی بھر پھول توڑ کر پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو سامنے سے "وہ لڑکا" نیچے اتر رہا تھا۔ حیرت اور غور سے سر اٹھا کر دیکھا ہی کہ ہاں سچ تو ہے الجھا بھر بال، لمبی ٹانگیں، موٹے موٹے ہونٹ، روسی کٹ کی قمیض، بے ساختہ ہنسی آنے لگی۔ وہ مجھے یوں گھورتا اور حیرت زدہ محسوس کر کے آہستہ آہستہ رک رک کر نیچے اترنے لگا۔ جب ایک سیڑھی درمیان میں رہ گئی تو میں نے ہمت کر کے کہا "مہربانی کر کے مجھے "نگار" کا وہ پرچہ دے دیجیے جس میں آپ کا افسانہ "زبان بے زبانی" چھپا ہے۔ اختر

کے جلسے میں موٹے ہونٹ اور بھی موٹے لگنے لگے۔ یہ کہتے ہوئے آخری سیڑھی اترے وہ خوب وہی پہلے ہمارے پھول جیسی بڑی نوٹس "اب دیدہ دلیری سے 'نگار' منگا رہی ہیں!" یہ کہا اور یہ جا وہ جا۔ بڑی خفت ہوئی اور کچھ غصہ بھی آیا۔ سوچا کلثوم بھابی ٹھیک ہی تو کہتی ہیں، لیکن کچھ ضد سی بھی آ گئی کہ ہر مہینے رسالہ وصول کرتا ہے۔ صفیہ سے مشورہ مارنا نہیں۔ واپسی پر دو باتیں لکھ کر دروازے کے نیچے کھسکا دی گئی کہ "مہربانی کر کے رسالہ دے دیجیے۔ دو دن بعد واپس کر دوں گی۔"

کئی روز ہمارا تو وہاں جانا نہ ہوا اور بھابی کلثوم بھی نہ آئیں۔ پھر ایک دن جو وہ آئیں تو نگار کا پرچہ ہاتھ میں لیے ہوئے۔ یہ کہہ کر دیا: "اس لڑکے نے پڑھنے کے لیے بھیجا ہے۔" بیچاری بھابی نے اس کو کھول کر دیکھا بھی نہیں۔ اس میں اپنے افسانے کے اوپر ایک پرچہ لکھ کر پن سے اٹکا دیا تھا: "آپ کی ہمت اور جسارت داد طلب تھی۔ ورنہ ایک ہندوستانی مسلمان لڑکی کسی غیر مرد سے بات کرے اور کوئی شے مانگے۔ میں نے اب تک ایسا سا نہ دیکھا۔ واپس نہ کیا تو جرمانہ لیا ہم خرچ جاتے ہیں۔ آپ کی جسارت اور خوش مزاجی کی داد دیے بنا رہا نہ گیا۔ اس لیے مجبوراً ادائیگی خدمت ہے۔" لکھائی کچھ ایسی جیسے بچے کی ہی یا بچانی ہو۔ مشکل سے پڑھی گئی۔ دل ہی دل میں اپنی فتح پر اترائی اور خوش ہوئی۔ یہ خبر نہ تھی کہ زندگی بھر ان صاحب کی فتح ہوتی رہے گی اور میں تاحیات جرمانے بھرتی رہوں گی۔

اگلے روز صفیہ اور سعید کو دوسرے رسالہ دکھایا اور جب تک صفیہ سے دو روپے شرط کے وصول نہ کر لیے، ان کو نہ دیا۔ اس افسانے کو بار بار پڑھا ہی نہیں بلکہ باری باری نقل بھی کر لیا۔ پھر ہم تینوں سے نقل لے کر اور بھی بہت سی لڑکیوں نے اس کی نقل اتاری۔ اب ان دونوں کا حکم کہ جواب لکھ کر نیچے لگا کر واپس کرو گی۔ میرا انکار مان اس کا اصرار اور دو بہکتا۔ آخر کار صفحے کے نیچے رخ خاص ہو گئی اور چند سطری جواب جس پر تینوں نے اتفاق کیا: "بندی حضور کی خدمت میں شکریہ پیش کر کے امیدوار رہے گی کہ آگے جو رسالے جن میں آپ کا افسانہ شائع ہو عنایت فرماتے رہیں گے۔ شکریے کے ساتھ آپ کی امانت اس رسالے کے ساتھ واپس کر رہی ہوں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔"

—

(افکار، اگست ۹۳ء)

۲

جمیل بھائی آپ نے بڑا غضب کیا کہ دو جمع پھر نظم بھیج کر اعادہ کیا کہ جو کچھ سوچ رہی ہوں بس اس کو قلم بند کرتی جاؤں۔ قدرت کی ستم ظریفی کہ اختر اپنی جوانی ہی میں بوڑھے برگد کی کہانی لکھ گئے اور میں غضب ہے جو بڑھاپے میں جوانی کی کہانی سناؤں۔ آپ نے نصف صدی سے زیادہ مجھے پیچھے دھکیل دیا ہے۔ آپ کے نظم خرد ہیں پہلا تو نہیں۔ کہاں آپ اور کہاں میں؟ ایک زنگ خوردہ گاڑی جس کے کچھ کل پرزے جا چکے ہوں کے ہاتھوں کا ٹا ہی کی نذر ہو گئے باقی کل پرزے زنگ خوردہ۔ اب آپ کا ایسی گاڑی سے تقاضا ہے کہ "چلا چل مسافر چلا چل"۔

کل پورا ایک ماہ اختر کو اپنے آخری سفر پہ گئے ہو گیا۔ وہ ہزاروں بار سفر پہ گئے اور ہنستے ہوئے واپس آئے۔ کچا سوں سفر مجھے ساتھ لے کر کیے۔ میں نے اختر اللہ سے پوچھا کہ پہلے خط کے پڑھنے میں آپ نے مجھے دھمکی دی تھی کہ جرمانہ وصول کروں گا میں خوب جانتا ہوں، پر وہ کبھی وصول نہیں کیا۔ یا مجھے خبر نہ ہوئی۔ ہنستے اور کہتے "میں بھولنے والا بشر نہیں۔ جرمانہ وصول ضرور کروں گا اور صرف ایک ہی بار جس کو آپ تا حیات یاد رکھیں گی"۔ کل یوں لگ رہا ہے کہ جیسے ان کو یقین رہا ہو کہ وہ اپنے آخری سفر پہ پہلے روانہ ہوں گے اور مجھ غریب سے باقی کی زندگی جرمانہ وصول کرتے رہیں گے۔

ہاں تو پھر گاڑی کو دھکے دے کر آگے چلانے کی کوشش کرتی ہوں۔ کیا سوچ رہی تھی؟ اسی زمانے میں اختر اسید حسن کا "میر منزل" لانے لگے اور بھائی شوکت سے ان کی ملاقات ہو گئی۔ وہ پہلے کئی بار ہمارے گھر بھی آ چکے تھے اور اماں ابا اور ہم سب کی ان سے ملاقات ہو گئی۔ سال ہی دلوں "امیر منزل" کے اشتراکی گروپ میں ایک اور نوجوان شامل ہو گیا۔ حضرت احمد علی ایم اے مالدار صاحب کے دوست کے بیٹے تھے۔

اکثر "امیر منزل" جانے پر جیسے کوئی دھوم سے گھر سے کو رنگتا۔ کبھی "ساقی" کبھی "نگار" کا پرچہ ہاتھ میں تھما کر سے میں پھر غائب ہو جاتے۔ نیا کوئی افسانہ اس میں ہوتا اور کبھی کبھی ہندی کا رسالہ دے دیا جاتا۔ دو چار لائنیں بطور نوٹ اس تاکید کے ساتھ کہ ضرور پڑھئے۔ منزل کا نام ہے "میری ڈائری کے چند اوراق"۔ پڑھ کر میرے دل میں بڑی ہی کسک اٹھی کہ یہ شخص جو بظاہر بڑی اکڑفوں کرتا ہے، اندر سے کتنا تنہا ہے۔ کیا اس کا کوئی نہیں، کیا اس کو سمجھنے والا کوئی کبھی مل جائے گی۔ پر خدا کرے ایسی ہو جو اس کو سمجھ سکے میرا کیا۔"

اس کی نگاہ میں رہے۔

ادھر ادرتی " (دیشمیر جہاں میں ہمالیہ کی ترائی کے نزدیک ہے) جہاں ان دنوں والد صاحب کی پوسٹنگ تھی سامان کے نام تار آیا کرو وہ ہمارے یہیں کچھ عرصے کو آجائیں۔ کلثوم "نیل چھتری" آ کر رہ لیں۔ شوکت تو موجود ہی ہیں۔"

اماں کتنا پابند ہونے سے زیادہ بھابھی کلثوم ہم پر پابندیاں عائد کرتیں۔ نہ خود اپنے گھر جاتیں، نہ ہم وہاں جا سکتے تھے۔ بات یہ تھی کہ ان کو یہ غم تھی کہ شوکت کی شادی میرے ماموں (خان بہادر سید حامد حسین) کی بیٹی اور جنرل شاہد حامد کی بہن سے ہو چکی تھی۔ بھابی تہمینہ بڑی آزاد خیال اور روشن دماغ تھیں۔ سیاست، اشتراکیت اور سوشلزم پہ وہ ان کے گروپ میں بیٹھ کر باتیں کرتیں۔ سیاسی کی سرگرم رکن بھی تھیں۔ ڈاکٹر رشید جہاں سے گہری دوستی کی شاید یہی وجہ ہو۔ اشرف کے چھوٹے بھائی نے ایم۔ اے، تہمینہ نے بی۔ اے ہو چکی تھی۔ وہ شوکت بھائی کے گھر آ کر رہ رہے تھے۔ ان کی دیکھ ریکھ، غذا اور علاج کا تن من دھن سے خیال رکھ رہی تھیں۔ وہ آٹھ سال میرے بھائی کے گھر رہے۔ علی گڑھ سے روڑکی اور وہاں سے امرتسر ان کے ساتھ ساتھ گئے۔ ان سب کا ذوق بھی "امیر جنرل" اور کبھی بھائی جان کی کالج پر جمتا۔ اکثر باتوں باتوں میں "اس لڑکے" یعنی اختر کی شعلہ کلامی، بحث، دھونی اور دوستی رہی پر جب وہ بھائی جان سے بحث کرتیں تو ہم کان لگا کر سمجھنے کی کوشش کرتے مگر سب سر سے گزر جاتا۔

ان ہی دنوں یونیورسٹی کے ہال میں ایک مشاعرہ ہوا۔ جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی، ساغر نظامی، مجاز اور جیسے نامور شاعر آئے۔ ہم بہنیں تڑپ اٹھیں کہ کاش ہمیں بھی جانے کی اجازت ہوتی۔ بھابھی تہمینہ ایک دفعہ اور بات غنیمت کی مالک تھیں۔ دل میں کچھ ٹھان لیا ہم کو تسلی دی کہ وہ یہاں "نیل چھتری" میں ایک مشاعرہ کرا دیں گی۔ ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ اماں یہاں ہیں نہیں، بغیر ان کی اجازت یہ کیسے ممکن ہے۔ مشاعرے سے آگے کی خوشی ہم کو یہ خوشخبری دی کہ انہوں نے شوکت کو راضی کر کے چند شاعروں کو کل رات کے کھانے پر بلا لیا ہے۔ بعد میں ہم ان کا کلام سن سکیں گے۔ دو چار کو ان میں پڑھنے کے لیے مستقل "نیل چھتری" میں رہتی ہی تھیں۔ جگر اور دوستوں کو بھی بلا لیا۔ ہماری سب کی عید ہو گئی۔

کھانے کے بعد ڈرائنگ روم میں شاعروں اور مردوں کی بیٹھک ہو گئی۔ ہم لڑکیاں کالی دروازے والے حصے میں کھانے کی میز کے قریب قالین پر بیٹھ گئے۔ ہماری پشت پر دروازہ تھا۔ اس کے آگے چھوٹا سا برآمدہ۔ اس کے ایک طرف پینٹری تھی جس میں کھانے کے برتن، گلاس، پیالیاں اور پانی کے گھڑے رکھے تھے۔ کھانا پکنے کے بعد وہاں پتیلیاں رکھ دی جاتیں۔ یہاں سے کھانا نکل کر پہلے زنان خانے کے کھانے کی میز پر چھوٹی بود کے لیے رکھ دیا جاتا۔ بعد میں کھانا ڈونگوں اور رکابیوں میں نکل کر مردانے میں جاتا۔ یہ دستور ہمارے گھر کا تھا کہ جو دس سال سے اوپر کے لڑکیاں لڑکے باہر کھانا کھاتے۔ کھانے کی یہ میز جو بیس لوگوں کے لیے تھی۔ "نیل چھتری" درحقیقت ایک چھوٹا سا محل تھا۔ اس میں صرف ان کی اپنی اولاد ہی نہ رہتی تھی، دس بارہ چچا، ماموں اور خالاؤں اور والدین کے دوستوں کے لڑکے جن کو ہوسٹل سے ان کی شرارتوں یا نالائقیوں کی وجہ سے نکالا مل جاتا۔ وہ "نیل چھتری" کے بورڈنگ ہاؤس میں جگہ پا لیتے۔ دو سال سے مولانا محمد علی کے نواسے خالد علی اور مولانا شوکت علی کے پوتے اور مولانا محمد علی کے نواسے طارق علی جانے کس جرم کی پاداش میں بورڈنگ سے نکل کر ہمارے ہاں پہنچ گئے تھے۔ گو ہم کو ان میں کبھی یہ نہ لگا کہ یہ کوئی ناقابل برداشت برائی کر کے نکالے گئے ہوں گے۔ خالد علی بے حد ہنس مکھ، حاضر جواب اور خوش مزاج اور طارق بیچارے ہر وقت سر جھکائے خاموش اور سکڑے سمٹے رہتے۔

ہاں تو ذکر مشاعرے کا ہو رہا تھا۔ بیٹھنے کے کمرے میں خوب تیز روشنیاں تھیں۔ کھانے والا حصہ تاریکی میں تھا۔ ہال کے پیچھے کے برآمدے کی تھوڑی بہت روشنی ہم سب لڑکیوں پر پڑ رہی تھی۔ ہم سب اس طور سے بیٹھی ہوئی تھیں کہ برآمدے کا دروازہ ہماری پشت پر تھا۔ اس لیے اتنا گھس کر بیٹھ گئے کہ اگر کوئی پانی یا پان بتہ وغیرہ لینے پینٹری میں جائے تو اس کی گزر آسانی سے ہو سکے۔ میری پشت دروازے کے پاس تھی۔ ہم نے کبھی نہ کوئی مشاعرہ یوں سنا تھا، نہ کسی مشاعرے کو اتنے قریب سے دیکھا تھا۔ دل بے طرح دھڑک رہے تھے۔ سب سے پہلے مجاز کی باری آئی "شاید" رات اور ریل" سے شروع کیا۔ ایک دبلا پتلا، سوکھا، چیمڑ، لمبے لمبے الجھے ہوئے بالوں کے ساتھ کس خوش الحانی سے پڑھ رہے تھے۔ کمرے کم ہم سب لڑکیاں تو حیرت زدہ، مسحور کن، جادوئی کیفیت میں تھیں۔ اتنے میں کوئی برابر سے دو گلاس پانی ہاتھ میں لیے گزرا تو کچھ پانی میرے سر پر گرا گیا۔ دوپٹے سے پونچھ لیا۔ اس وقت سر اٹھا کر بھلا کیا دیکھتے نگاہیں تو مجاز پر تھیں۔ پھر ان سے فرمائش کر کے ایک اور نظم سنی گئی۔ یہ نظم جس جذبے اور انداز سے انھوں نے لکھی تھی۔ اسی جوش اور جذبے سے انھوں نے پڑھا تو ہمارے آنسو نکل پڑے۔ مجاز کی یہ نظم آگے چل کر علی گڑھ یونیورسٹی اور گرلس کالج کا ترانہ بن گئی اور آج تک وہاں اس کو ہر موقع پر جوش اور جذبے کے ساتھ پڑھا جاتا ہے یوں مجاز علی گڑھ کے ساتھ ہمیشہ زندہ و تابندہ رہیں گے اور ان کا ترانہ فضاؤں میں گونجتا رہے گا۔ مجاز کے بعد ساغر نظامی کلام سنانے آئے۔ صاف و شفاف، سڈول جسم، مناسب قد و قامت چکنے چہرے، بال جمے ہوئے۔ پھر کوئی پاس سے گزرتا ہوا برآمدے میں چلا گیا۔ واپسی پر جب قریب سے گزرا تو پھر سر پر گلاس سے پانی گرا گئے۔ اب سر اٹھا کر دیکھا تو حضرت اختر حسین رائے پوری ہیں۔ غصہ دل کے اندر ہی رہ گیا کہ ساغر جس انداز سے پڑھ رہے تھے ان کو سنیں یا ان صاحب کو کچھ سنا دیں۔ آنچل سے پھر پانی خشک کر لیا اور محو ہو کر سننے لگے۔ میں صفیہ سے اور چپک کر بیٹھ گئی پر ایک ہاتھ جہاں کا تہاں رہا۔ اب جاں نثار اختر (جن کو صفیہ جان و دل سے پسند کرتی تھیں اور یہ راز خود عیاں کر چکی تھیں) کوئی خوب صورت رومانی غزل پڑھنے لگے اور صفیہ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ میرے ہاتھ کو کسی نے بڑے جھٹکے سے ہٹاتے ہوئے کہا "باہر جانے کا راستہ کیوں روک دیا؟" بے ساختہ منہ سے نکل گیا "اف کتنا سرد ہاتھ ہے؟" جواب دیا "ہمارا دل جو گرم ہے" یہ بھی کونٹ ہوں گا۔ یہ مشاعرہ نہ خود سن رہے ہیں نہ سننے دیتے ہیں۔ بس پانی پر پانی بڑی تہذیب سے پیش کیے جا رہے ہیں۔ لیجیے، جگر مرادآبادی کی باری آگئی۔ دبلے پتلے انسان کے گلے سے بڑے دلکش انداز میں سریلے اشعار نکل رہے تھے۔ دل نے کہا یہ ہمیشہ پڑھتے رہیں اور ہم سنا کریں۔ فرمائش پر ایک اور غزل سنائی اور پھر جب جوش صاحب گورے چٹے، بالشت بھر کا چمکتا چوڑا ماتھا۔ بڑی بڑی آنکھیں جن میں بلب جیسی چمک تھی جو ہم سب اتنی دور سے بھی دیکھ سکتے تھے۔ اختر شاید جن ان کے سامنے اپنی ساقی گری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ جوش صاحب نے ڈپٹ کر کہا "میاں آپ سامنے سے ہٹ جائیے پیچھے کچھ خواتین بھی بیٹھی ہیں۔" لیجیے ہٹنا کیسا ہم بالکل باہر ہی چلے جاتے ہیں۔ اپنے جھبا بھر بالوں کو طیش میں جھٹکا دیتے ہوئے پھر برآمدے میں آگئے۔ ہم سب تو جوش صاحب کی گھن گرج، پاٹ دار، مگر موسیقی سے بھری آواز اپنے پورے وجود سے سننے میں محو تھے۔ جوش صاحب اپنا کلام پڑھتے ہوئے ایسا لگ رہا تھا جیسے کچھ اور اونچے اور چوڑے ہو گئے ہیں۔ واہ واہ کا شور ہال میں گونج رہا تھا۔ اختر اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پاس سے گزرے اور ذرا جھک کر یہ کہتے ہوئے "باہر دیوار پر ایک شعر لکھا ہے ذرا دیکھ لیجیے گا" نکل گئے اور کسی نے نہ سنا۔ میں تو سہم سی گئی۔ جوش صاحب ہک لک کر

پڑھ رہے تھے۔ میں چپکے سے برآمدے میں سرک گئی۔ ہوتے ہوتے درختوں میں کہیں سے یہ شعر لکھا ہوا تھا:

اتنی کسے پڑی تھی کہ پتھر کو پوجتا
سجدوں سے میرے رونقِ بت خانہ ہو گئی

ڈوپٹہ گیلا کر کے جلدی جلدی اس کو مٹایا تاکہ کوئی اور نہ دیکھ لے۔

محفل ختم ہو گئی۔ میں رات کو دیر تک اس شخص کے متعلق سوچتی رہی کہ بے شک یہ انسان بہت ڈھیٹ، نڈر اور بے باک ہے۔ اس سے ڈر اور بچ کر رہنا چاہیے۔ ان صاحب کا تو مذاق ہوگا اور میں بری طرح ماری جاؤں گی اگر اماں، ابا کو ذرا بھی بھنک پڑ گئی۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس شخص کے ساتھ میری زندگی کا بندھن بندھنا تھا اور میری تھوڑی عمر دل ہی دل میں سجدے کرتے گزر جائے گی اور مجھے اپنی قسمت پہ ناز ہوگا۔ آج جب وہ نہیں ہیں تو ایک کٹی پتنگ کی طرح ہوا میں اڑ رہی ہوں۔ دل میں یہ درد کہ یہ آرزو کر رہی ہوں کہ کسی سخت سے ٹکرا کر میں فضائیں میں بکھر جاؤں۔

ہاں کیا سنا رہی تھی آپ کو، تیسرے دن بھائی جان کے ہاں محمود الظفر اور ڈاکٹر رشید جہاں آئے۔ کھانے پر امیر منزل کے مکیں سبط حسن، شرف الدین اور مجاز بھی آئے۔ بھائی جمیل نے مجھے، خدیجہ اور رشیدہ کو بھی بلا لیا۔ ان سب کی گفتگو اتنے اعلیٰ قسم کی تھی، ہم سب بور ہونے لگے۔ چپکے سے کھسک جانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اختر ہمارے قریب آ کر یوں بیٹھ گئے جیسے کوئی بالکل اپنا ہی ہو۔ ہلکی پھلکی باتیں کرنے لگے۔ "برگد کا پیڑ بے شک بول نہیں سکتا مگر انسان تو بول سکتے ہیں۔ آپ سب خاموش ٹک ٹک ہم سب کو گھورے جاتی ہیں۔ منہ میں زبان ہے یا نہیں؟ مجھے تو یہ شک ہو رہا ہے۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکل پڑا "تو کیا آپ ہم سب کو گونگا سمجھ رہے ہیں؟" "کوئی ہم سے تو سیکھے، ہم کسی سے؟" "ارے بات کہیں تو کہی بھی۔ یہ کیوں نہیں مان لیتیں کہ آپ نے کچھ نہیں پڑھا، اخبار پڑھیں، کچھ سیریس کتابیں پڑھیں۔ افسانوں اور ناولوں کی دنیا سے باہر آئیے۔ آپ کو یہ معلوم ہی نہیں کہ اس وقت یونیورسٹی میں کمیونزم نامی ایک مرض کے جراثیم بڑی تیزی سے پھیل رہے ہیں اور ہم سب کی کوشش ہے کہ جلد سے جلد اور تیزی سے اس مرض کو پھیلایا جائے۔ ملک کو آزاد کرانے کی کوشش ہر جتن سے کر رہے ہیں۔ آپ خواتین کو بھی اس نیک کام میں شریک ہونا چاہیے۔ پرسوں میں اور سبط حسن، جواہر لال نہرو کو دہلی سے علی گڑھ لا رہے ہیں۔ پروفیسر حبیب صاحب کے یہاں ٹھہرائیں گے۔ وہاں آپ سب کا آنا لازمی ہے۔ جمیل کے ساتھ وہاں آئیے۔ شاید ان کی باتیں سن کر آپ لوگ بھی جاگ جائیں۔ یہ ملک کی صدیاں ہیں کہ اگر ملک کی آدھی آبادی بیٹھی رہے گی تو کام کیوں کر بنے گا؟ قطرہ قطرہ دریا می شود۔ جو بھی اور جب بھی اس نیک کام میں شامل ہوگا، گاڑی آگے بڑھے گی اور انگریزی غلامی کا طوق ہمارے ملک کے گلے سے اتر سکے گا۔" بے شک یہ باتیں ہم کچھ بھی اور ایک نیا سا جذبہ دل میں جگہ پانے لگا تھا۔ میرے ہاتھ میں ساقی کا پرچہ اختر نے تھما دیا۔ اس میں ان کا افسانہ "اندھا بھکاری" چھپا تھا۔

تیسرا دن آیا تو سنا کہ جواہر لال نہرو وائس چانسلر کے مہمان ہیں، پروفیسر حبیب کے نہیں۔ اسی شام اسٹریچی ہال میں ان کی تقریر ہے مگر وہاں ہم لوگ کیسے جا سکتے تھے۔ تقریر ختم ہوتے ہی وائس چانسلر کے پائیں باغ کی کھڑکی سے اختر جواہر لال نہرو کو پیدل کر کے گئے کہ صرف اسی طرح حبیب صاحب کے ہاں لے جایا جا سکتا ہے۔ وہاں پر ہم خیال چیدہ چیدہ حضرات آ جائیں گے اور کھل کر آپ سے بے تکلف خیالات کا تبادلہ ہو سکے گا۔ اس پر وہ جانے پر راضی ہو گئے۔ کھڑکی کے قریب پروفیسر شریف نے اپنی موٹر پارک

گزرگئی تھی وہ اسی میں بیٹھے ہی تھے کہ بقول ان کی بیٹی عفت کے کہ ایک جھبرے بالوں اور لمبی قلموں والے دبلے پتلے سکھ نے دروازہ کھول کر کہا: "ڈرائیور جواہر لال جی کو حبیب صاحب کی کوٹھی لے چلو۔" انھوں نے اس وقت اپنے کو ڈرائیور ظاہر کرتے ہوئے موٹر اسٹارٹ کر کے حبیب صاحب کی کوٹھی پر جا کر گاڑی روکی اور جب ان کی نظر روشنی میں پروفیسر شریف کو دیکھی ہے تو لپکتے ہوئے برآمدے اور پھر کمرے میں چلے گئے۔ جواہر لال آہستہ آہستہ اسی رخ ہو لیے۔ میں فوراً سمجھ گئی کہ یہ کون ہو سکتا ہے

دوسرے دن شوکت بھائی کے پاس خط آتا ہے کہ رڑکی میں بجلی کے انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ میں سرکاری ملازمت کے لیے ان کو منتخب کر لیا گیا ہے اور پھر اماں کا خط آتا ہے کہ وہ فی الحال علی گڑھ واپس نہیں آئیں گی کہ ابا بہت کمزور ہو گئے ہیں حمیدہ، خدیجہ اور رشیدہ کو بورڈنگ میں چھوڑ کر وہ رڑکی چلے جائیں۔ چھوٹے بھائی اور ذکیہ تو پہلے ہی ان کے ہمراہ جا چکے تھے محمودہ ۳۔ اکالج لکھنؤ جا چکی تھیں۔ یوں "نیلی چھتری" کچھ عرصے کے لیے سونی ہو گئی۔ باقی بہنیں بھی اپنے اپنے ٹھکانوں پر روانہ کر دی گئیں

بورڈنگ سے "امیر منزل" جانے کا سوال ہی نہ تھا۔ ساری فکر یہ لاحق تھی کہ اب اختر رائے پوری کی کوئی چیز پڑھنے کو نہ ملے گی۔ راتوں کو اشرف، ذکی، اسپلے، مجاز اور اختر کی ٹولی "نیلی چھتری" کے آگے سڑک پر عجیب و غریب قسم کے گانے ایک نرالے انداز میں گاتے گزرتی تھی۔ وہ اب تو کبھی سننے میں نہ آئیں گے۔ یہ کیا خبر تھی کہ اپنے ہی گھر بیٹھ کر سن سکیں گے جب تک جب بے تکلف دوستوں کی دعوت کی اور جب ذکی کا ساتھ برسوں کراچی میں رہا اور میرے بھائی تاجور، شوکت سب یہاں تھے تو کھانے کے بعد ان کی فرمائش پر یہ دونوں مل کر بلا تکلف ان گانوں کو اسی طرح گاتے۔ جمیل بھائی کیا آپ بھی سنیں گے؟ تو لیجیے دو چار گانے آپ کو بھی سنا دوں سے

گاڑی جھاڑی میں کو آئی
گاڑی سرارا را ہوئے
اس میں بیٹھے ہیں شوقین
کپڑے پہنے ہیں مہین
ان کی جیبوں میں ہے کوکین
چوری نا ہونے کرائی
چوری اور وں پہ لگائی
گاڑی جھاڑی میں کو آئی

کھڑکیاں کھول دے بابو
ہمیں گرمی ستاتی ہے
کھڑکیاں نہ کھلیں رہ
ہوا کمرے سے آتی ہے

آگ لادے پانی لادے
حقہ کر دے تازہ
میاں ٹمن ٹمن۔ میاں جمن جمن
تیری ایسی تیسی
کوک شبا کو لا یا
میاں جمن تمن
حقہ جب حضرت ملا کے ہاتھ میں
کبکشاں بھر جیسے ٹرنک کے ہاتھ میں

اللہ میاں خوب ہی تیری شان
سب جیسی میں کیوں لی لی سدی بی بی ناظم
سب کتابوں میں اکیلو کتاب خالی
اللہ میاں وہ بھی کتاب کہاں
ساری چھتوں میں کیوں چھجے چھوایا
اللہ میاں تونے بنایا آسماں
سب برتن میں بکتو برتن بنایا
وہ بھی برتن پاندان
سارے خاندانوں میں ایک ہی خاندان
اللہ میاں تونے بنایا عمر خاندان

عجیب نرالی دھن۔ اور کچھ سُر تال۔ ہم سب بھاگ کر زنان خانے کے صحن والی سیڑھیوں پر چڑھ بیٹھتے اور جس جس کر لوٹ پوٹ ہوتے۔ گانے والوں اور سننے والوں میں فاصلہ اتنا ہوتا کہ کسی کی شکل کی پہچان کرنا ناممکن تھا۔ "نیلی چھتری" آخری کوٹھی تھی۔ آگے جا کر ایک قلعے کے کھنڈر تھے جس میں لوگ دن میں جاتے ڈرتے تھے رات تو پھر رات تھی۔ ہم سب کا خیال تھا کہ کسی بھانڈوں کی ٹولی نے قلعے میں بسیرا کر لیا ہے۔ حالانکہ یہ وہی لوگ تھے جو گاتے گاتے قلعے میں جاتے اور وہیں سو جاتے۔ وہ بھی بڑی خاموشی سے۔ بہت شادی کے بعد پتہ معلوم ہوا کہ یہ ان کی ہی اختراع تھی۔

ہوسٹل کی زندگی چند سال پہلے بھی لکھنؤ میں گزر چکی تھی اس کا اپنا رنگ۔ امتحانات کی پابندیاں اور سب مزہ کچھ نہ یاد تھے۔ ایسے بورڈنگ میں رہنا زیادہ شاق نہ گزرا پھر بھی کچھ یادیں کبھی کبھی دل میں چٹکیاں سی لیتی رہتیں۔ کبھی سوچتی کہ "امیر مرزا" جیسی رہائش کیا ہوتا ہو گا۔ بھابھی علوم ستھرے کا ڈ ایک ماہ کے لئے چلی گئی تھیں۔ وہ بھی تو ملنے آئیں گی اور اس آس کہ اس کی اونچی اونچی دیواروں کے باہر کی کوئی خبر نہیں مل سکے گی۔

(افکار، ستمبر ۹۳ء) ←

٣

"نیلی چھتری" کے زنان خانے کے لق و دق صحن کی پشت پر آٹھ نوکروں کے کوارٹر تھے۔ ان میں شکورن بی ہمارا دھوبی اس کے بیوی بچے، ان میں معمار مطلوب اور اس کا کنبہ، دو کوارٹروں میں دو عدد مالی اپنے ٹبر سمیت اور ان سب کی گائے بکریوں کا چارا دانہ بھرا رہتا۔ صحن کی دوسری طرف دیوار کے ساتھ ابا کے بیرے کا چھوٹا سا گھر، پھر خانسامہ کا کوارٹر، ساتھ ہی رجی خانہ، اس کے بعد ڈرائیور عنایت کا کوارٹر۔ ہم سب تو پاکستان بنتے ہی یہاں چلے آئے، مگر شاباش ہے کہ وہ سب نمک خواری اور وفاداری کا ثبوت دینے کے لیے آج بھی اسی طرح جمے بیٹھے ہیں۔ وہ خود تو رہے نہیں ان کی اولادیں ہیں۔ ہم میں سے جب بھی کوئی گیا، اور ہمیشہ بن بتائے اطلاع کیے تو خدا بخش کے کمرے میں اماں ابا کی بڑی سی تصویروں پر تازے بیلا چنبیلی کے پھولوں کے گجرے دیکھ کر رو پڑے۔ "نیلی چھتری" خود تو آثار قدیمہ کی شکل اختیار کر چکی ہے، مگر ان سب کے کوارٹر درست حالت میں ہیں۔ سارے باغ کے اونچے گھنے پیڑ کٹ پٹ کر چولہوں کی لکڑی کی شکل اختیار کر کے ختم ہو چکے۔ پھلوں کے درختوں کا نام و نشان نہ رہا۔ نہ کسی طرف کسی جگہ پھول اور بیلے کی جھاڑیاں ہیں نہ ہی لان، مگر پیچھے ان لوگوں نے سبزیوں کے کھیت اور بیلے کے پھول لگا رکھے ہیں تاکہ موتیا اور چنبیلی کی کمی نہ ہو کیوں کہ گجرا بھی تو بنانا ہے اور تصویر پر ڈالنا ہے۔ اس لیے کہ بیگم صاحبہ کو موتیا، چنبیلی سے عشق تھا۔ ان کا پورا وجود ان کی خوشبوؤں سے بسا رہتا۔ سبزیاں یوں ضروری ہیں کہ یونیورسٹی کے کسی نہ کسی ہوسٹل کے باورچی خانے کے لیے وہ ہمیشہ بھیجا کرتی تھیں۔ والدہ کی نیز یونیورسٹی کے قبرستان میں ایک مثالی قبر ہے۔ سنگ مرمر پر بڑا سا حجرہ کٹاؤ دار جالی سے بنا ہوا ہے۔ انار کے پیڑ اور موتیا کی کیاریاں اسی لیے شاداب و تر و تازہ ہیں کہ ان کی دیکھ ریکھ کرنے والے اب بھی "نیلی چھتری" کے صحن کی پشت پہ آباد ہیں اور پشت در پشت آباد رہیں گے اور اس عظیم خاتون کی قبر کو جس کو وہ مزار کہتے اور سمجھتے ہیں جانے کب تک اسی طرح اس کی دیکھ ریکھ کرتے رہیں گے۔

ہمارے کپڑے شکورن دھوبی کی بیوی دھو کر ہوسٹل پہنچاتی تھی۔ دوسرے چنے کپڑے رکھتے ہوئے میری نظر ایک لفافے پر پڑی۔ "بنام حمیدہ عمر" بذریعہ شکو۔ آدھ مرن، لکھاوٹ جانی پہچانی تھی۔ دل زیر و زبر ہوا۔ وحشت کہ نگاہ کو ڈانٹا دیکھ نہ لے۔ شکر کہ اس وقت رشیدہ، خدیجہ اور چوتھی روم میٹ کمرے میں نہ تھیں۔ جلدی سے چھپا دیا۔ دوپہر کو باغ میں ایک پیڑ تلے بیٹھ کر پڑھا اور پھر

پڑھا۔ پھاڑ کر پھینک دینے کو دل نہ چاہا۔ پھر الماری میں چھپا کر رکھ دیا۔ رات مجھے نیند نہ آئی کہ الٰہی اب میں کیا کروں، کیسے اس انسان کو منع کروں کہ آئندہ ایسی حرکت ہرگز ہرگز نہ کریں۔ کسی کو معلوم ہو گیا، پرنسپل خاتون آپا کو خبر ہو گئی تو بورڈنگ سے نکالا مل جائے گا۔ خط اماں ابا کو بھیج دیا جائے گا اور پھر کیا ہوگا؟ کئی رات تک میں جاگتی اور کروٹیں بدلتی رہی۔ پھر ایک ترکیب سوجھی کہ فوراً بھابی حمیدہ کو روزی خط لکھوں کہ وہ اختر کو خط لکھ کر اچھی طرح ڈانٹیں اور آئندہ ایسی حرکت سے منع کریں۔ فوراً خط لکھا اور جانے والی ڈاک کے ڈبے میں رکھ دیا۔ اس کا اثر اتنا ضرور ہوا کہ سیکنڈ ایئر کا نامہ بر جانے کے بجائے صفیہ (بھابی) کی بہن، کبھی ساقی، کبھی نگار رسالے جان کو دے جاتے اور جس میں ایک خط ضرور ہوتا۔ مجھ تک پہنچ جاتے ہر بار جان سی نکل جاتی۔ میٹرک کے امتحان کی تیاری تھی اور منتشر سا دماغ، خوف اور دہشت طاری۔ کبھی صفیہ یا سعیدہ کی زبانی معلوم ہوتا کہ اختر حسین رائے پوری نے یونیورسٹی میں ایک اودھم سا مچا رکھا ہے۔ ایک ہفتہ وار اشتراکی قسم کا اخبار، ہاتھ سے لکھ کر ہوسٹل کی دیوار پر چسپاں کر دیتے ہیں جس کی نقل تیزی سے ہر ہوسٹل کی دیوار پر لگا دی جاتی ہے۔ اس کی خبریں ساری ہی تو اشتراکی اور آزادی کے لیے جد و جہد کی ترغیب، ہندو مسلم اتحاد (ایکتا) کے لیے کام کرو، انگریزوں کی مخالفت کرو۔ نماز ظہر کی حاضری رجسٹر پر لگائی جاتی تھی۔ اختر ایک ہزار دانوں والی تسبیح ہاتھ میں لیے عربی جبہ پہن کر نماز کے لیے جاتے، اس پر بیچارے نیری صاحب عرضنت بھی نہ کر سکتے تھے، لیکن اور لڑکوں کی ہنسی ان کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اختر امیر منزل سے اٹھ کر واپس ہوسٹل میں اس لیے آ گئے تھے کہ بھابی کلثوم (اختر کی) اور جمیل نہ سکتی تھیں اور یہ خود ان بیچاری کی بھولی بھالی باتوں کو جہالت گردان کر مزید برداشت نہ کر سکتے تھے۔

میں سوچا کرتی کہ ایم اے کا امتحان سر پہ ہے اور یہ لا ابالی پڑھائی پر دھیان دینے کے بجائے کیسے کیسے چکروں میں ہیں۔ ان کی ذات سے میری ہمدردی بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ خطوط سے بخوبی اندازہ ہو گیا کہ انھیں ہر طرح کی محرومیت کا احساس ہے کہ وہ دنیا میں اکیلے ہیں۔ ماں باپ کی شفقت اور محبت سے ناآسودہ۔ ملک کی غلامی کے احساس سے دبا ہوا، انقلاب برپا کرنے کی فکر میں ہر لمحہ، ہر انسان سے ٹکر لینے کے درپے۔ میری دنیا میں خوشیوں اور محبتوں کے انبار تھے۔ زندگی بھر اپنے چاروں طرف یہی بکھری پائی تھیں۔ پھر ایک ایسے شخص کے لیے ان سب کی قربانی دوں گی؟ کس طرح اعزا سے سب سمیٹ کر اس کے حصے میں ڈال دوں؟ یوں اس کے خلوص دل سے ملک اور قوم کی خدمت کی چنگاری کو ہوا دینے کے بجائے تیز تر کر دوں۔ یہ شخص تو عام انسانوں سے کس قدر مختلف ہے۔ ایسا سوچنے پر شاید میں اس لیے مجبور تھی کہ میں تو واقف نہ تھی کہ دل کا اندھیرا، تنہائی، اپنوں کی کمی، راحت و آرام کا نہ ہونا کیا ہوتا ہے۔ میں تو کسی بھی ایسی شے سے آشنا نہ تھی۔ ایک چھوٹے شہر رائے پور سے نکل کر کلکتہ جیسے شہر میں سولہ سال کی عمر میں پڑھ بھی رہا ہو اور ساتھ ہی ملازمت کر کے اپنے پاؤں پر کھڑا بھی ہو گیا ہو۔ کسی مسلمان لڑکے یا لڑکی کا ہندی، سنسکرت اور بنگلہ جاننا ایک عجیب و غریب سی بات لگتی تھی اور پھر اتنی کم عمری میں اتنے بڑے ہندی اخبار میں کام کرنا اور لکھنا۔ اردو فارسی اور گجراتی سے واقفیت!! قدرت نے اس کو ایک طرف ہر محرومی دے کر کس کس طرح نوازا بھی ہے۔ آخر یہ معمّا کیا ہے؟ جانے کیا کیا الٹے سیدھے خیال دل میں آتے۔ پڑھائی خاک نہ ہو سکتی تھی۔ اور اپنے فیل ہونے کا یقین بڑھتا گیا تھا۔

امتحان ختم ہو گئے۔ کالج بند ہوا۔ میں پہلے میرٹھ اپنے چچا آفتاب عمر کے ہاں چلی گئی اور رشیدہ اور خدیجہ اماں ابا کے پاس اور سلی۔ اور یہ ہو دہلی، لاہور ہوتے ہوئے بمبئی اور وہاں سے پھر علی گڑھ پہنچ گئے اور یہاں سے مولوی عبدالحق اختر کو اپنے ساتھ حیدرآباد لے گئے۔ ہم تین بہنیں میرٹھ میں سو گرما گزار کر آ گئیں۔ خط پہلے رڑکی جاتا۔ بھابھی حمیدہ لفافے میں بند کر کے مجھے بھیج دیا کرتیں۔ جانی پہچانی لکھائی کا خط مجھے کھلا مل جاتا۔

اب مجھ کو حیدرآباد پہنچ کر یہ خبر دیتے ہیں کہ مولوی صاحب ان سے ڈکشنری پر جو کام کروانا چاہتے ہیں اس کی نوعیت یہ ہے کہ جہاں جہاں سنسکرت، ہندی، بنگلہ اور گجراتی کے الفاظ آئے ہیں وہ صحیح ہیں یا غلط۔ "رسالہ اردو" کے مدیر کی حیثیت سے بھی کام کرنا ہے اور وہ مقالہ "ادب اور انقلاب" حیدرآباد جانے سے پہلے "رسالہ اردو" میں چھپ چکا تھا۔ اسی مقالے سے مولوی صاحب کو اختر جیسے شخص کا انتخاب کرنے اور ان کو ہر حال میں انجمن کے لیے نہایت موزوں و مناسب شخص سمجھا۔ جب پروفیسر رشید صاحب کے گھر پر انھوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا اور بہت زور دیا کہ وہ مزید کچھ نہ کریں ان کے ساتھ حیدرآباد چلے جائیں۔ اختر کا اصرار تھا کہ ان کو تو ایک اخبار نکالنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرنا تو مولوی صاحب نے ان سے وعدہ کیا کہ جیسے ہی ڈکشنری کا کام ختم ہو جائے گا وہ ان کو دہلی جانے کی اجازت ہی نہ دیں گے بلکہ ایک سال اخبار نکالنے کا کل خرچ بھی برداشت کریں گے۔ اخبار تب تک اپنا خرچ برداشت کرنے لگے گا۔ اختر نے ساتھ جانے کی حامی بھر لی کہ یوں ان کی زندگی بھر کی تمنا پوری ہو جائے گی۔ "ادب اور انقلاب" کا چرچا ہر طرف ہو رہا تھا۔ میں سوچتی کہ الٰہی یہ انقلاب کس قسم کا ہے جو ادب میں آنا چاہتا ہے۔ کچھ سمجھ میں آیا اور کچھ نہ آیا۔

میری بڑی بہن محمودہ لکھنؤ آئی ٹی کالج سے بی اے کر رہی تھیں۔ اب ان کی معرفت کچھ کتابیں بھی میرے لیے آنے لگیں۔

تمہیں بھائی میری زندگی کا سب سے قیمتی اور عزیز ترین سرمایہ اختر کے وہ سب خطوط ہیں۔ ان کی کوشش یہ رہی کہ ان کے ہاتھ لگ جائیں تو وہ ان کو پھاڑ کر پھینک دیں۔ بھلا میں یہ انمول علم و ادب کے شہ پارے کیسے ان کے ہاتھ لگنے دیتی۔

آپ کا اصرار ہے کہ اصل کہانی کو آگے بڑھاؤں۔ یہ ادھر ادھر کی کیا باتیں لے بیٹھی ہوں۔ ہاں تو پھر یوں ہوا کہ حیدرآباد سے اختر نے ایک خط خود ابا کو پیغام کا لکھ ڈالا۔ (یہ میں نے ابا کی کسی فائل میں "انیتا چھتری" کی لائبریری میں دیکھا تھا) جس جس کر میرا برا حال ہوا اور اس تصور سے کہ ابا پر اس کا کیا اثر ہوا ہوگا۔ اس قسم کے خط سے ان کو طیش ضرور آیا ہوگا۔ بھلا بزرگوں کو اپنے معاملے میں کوئی خط لکھا کرتا ہے۔

یہ خط القاب کے بعد یوں شروع ہوتا ہے:-

پردوں میں شکوے سے یوں راگ ہے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

ایک بندۂ ناچیز جس کا دنیا میں کوئی نہ ہو، پر علم کی دولت کے خزانے کی چابی مٹھی میں

تھامے ہوئے مزید اس کو حاصل کرنے کے عزم کے ساتھ اس کی سمت رواں دواں
ہے۔ آپ کی صاحبزادی حمیدہ عمر کے لیے درخواست گزار ہے۔ اگر قبول کر لیں تو نصیب
اور قبول نہ فرمائیں تو شکوہ آپ سے نہیں بلکہ اس خدا سے ہوگا جو بڑا رحیم و کریم ہے!

اب آپ خود سوچ لیں کہ اس انداز کے خط سے والد صاحب کیسے چراغ پا ہوئے ہوں گے۔ ابا نے اس کی نقل شوکت بھائی کو بھیجی، اصل کو فائل میں لگا دیا اور ان کا جواب بھی فائل میں دیکھنے کو ملا۔ میری یاد میں وہ کچھ یوں تھا۔
"اس لڑکے کو میں اور حمیدہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اختر نام ہی کا اختر نہیں بلکہ وقت کے ساتھ درحقیقت ایک روشن ستارہ اور بخت کا اختر بنا کرے گا۔ یہ مولانا عبدالحق کے ساتھ رہ کر مجھ سا ہی سے کام کر رہا ہے میں ان سے دریافت کر لیں کہ ان کی ذاتی رائے کیا ہے اور پھر فیصلہ جو بھی آپ اعلان کریں گے"

والد صاحب نے اپنے اس بیٹے کی بات کبھی ٹالی نہیں تھی۔ انھوں نے مولوی صاحب کو خط لکھا۔ خط انگریزی میں تھا۔ مولوی صاحب اور والد صاحب کے یہ خطوط میرے پاس اسی طرح موجود ہیں کہ ایک روز نہ جانے کس ترنگ میں تھے کہ مجھ سے پوچھا "یہ تو بتاؤ تم نے میرے خط دیکھے تھے جو میں نے ظفر عمر کو لکھے تھے" میرا جواب یہ تھا کہ بھلا ابا مجھے کیوں دکھاتے۔ کچھ دیر سوچ کر بولے "اچھا تو میں تم کو دکھاتا ہوں" اٹھے اور اپنی کمرے کی کیبنٹ کی تالے دار الماری میں سے ڈھونڈ نکال کر یہ چند خط میرے ہاتھ میں دے دیے۔ یہ خط انھوں نے انگریزی میں اپنے قلم سے لکھ کر ٹائپ کرا کر دستخط کر کے ابا کو بھیجے تھے اپنا پیسنے لگی۔ ذرا ٹھہر کر پوچھا "اردو کی جنتی کیوں ہو؟" میں نے کہا یہ دیکھ کر کہ آپ اردو خط انگریزی میں لکھیں" ہنس کر بولے "اس لیے کہ تمہارے ابا پر رعب ڈالنا منظور تھا کہ حضرت یہ نہ سمجھیں کہ سیدھے سادے مولوی کے گھر اپنی بیٹی کیسے دے دیں اور کچھ دنیا: اردو کی صاحب بہادر اور روشن خیال ہوتے ہیں؟"

تمیں بھائی ان خطوں کو پڑھ کر آپ ایمان سے بتائیں کہ بابائے اردو کے قلم سے کسی بھی شخص کے لیے اس قدر تعریف کے الفاظ آپ کی نظر سے گزرے۔ فوٹو کاپی ساتھ میں ہے۔ اب اس کا ترجمہ آپ خود کر لیں۔ ان کے معیار کی کسوٹی پر اختر پورے اترے نا۔

مجھے یوں اس خط کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہمارے والد اختر کے خاندان یا ان کے حالات کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں کرنا چاہتے اور ہاں کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

والدہ صاحبہ گھبرا رہی تھیں۔ وہ لڑکی کا ہاتھ اس طرح کسی معلومات کے بغیر تھما دینے کے خلاف تھیں۔ البتہ مولوی صاحب کے خط سے اتنا ان کو معلوم ہو گیا ہے کہ اختر کا کوئی تعلق اپنے والد سے نہیں ہے۔ شوکت بھائی اور حمید بھائی بھی سولی صاحب رشتے کی موافقت میں ہیں۔

اماں کی سمجھ میں ایک ہی بات آئی کہ وہ مجھ سے تحریری انکار لے کر ابا کو دے دیں۔ شروع جولائی کا مہینہ ہے۔ رات گھپ اندھیری، سیاہ بادلوں نے رات کی سیاہی کو تاریک تر کر دیا ہے۔ گاہے گاہے بجلی کی چمک، بادل کی گرج سے میں ڈر کے مارے تکیہ سر پر رکھ کر کان بند کر لینے کی ترکیب کر رہی ہوں کہ اماں کے قدموں کی چاپ میرے پلنگ کے پاس آ کر رک جاتی ہے۔ میں سخت حیران ہوئی کہ اس وقت یہ کیوں آئیں اور پھر خاموش کیوں کھڑی ہیں۔ کچھ دیر کی خاموشی

کے بعد آہستہ سے پوچھتی ہیں "حمیدہ جاگ رہی ہو نا؟" "تم آخر بجلی کی کڑک اور چمک سے اتنا کیوں ڈرتی ہو۔" میں خوش ہی تو ہو گئی کہ آج اماں کو میرے ڈر کا خیال آیا (ہماری اماں دوسری ماؤں سے بہت مختلف تھیں۔ اولاد کے ساتھ کبھی لاڈ پیار اور چاؤ چونچلے نہ کرتی تھیں۔ لفظ ڈر سے ان کو نفرت تھی)

اب اماں میرے پلنگ پر سرہانے کی طرف بیٹھ گئیں۔ زور کی بجلی چمکی تو ان کا چہرہ صاف دیکھ سکی۔ پریشانی صاف عیاں تھی۔ میرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ پھر بولیں۔ "آج میں تم سے ایک بہت سنجیدہ بات کرنا چاہتی ہوں۔" میں نے گھبرا کر کہا "جی؟" بولیں "تم اب بڑی ہو چکی ہو۔ ماشاءاللہ جوان ہو۔ بھولی اور سیدھی بہت ہو مگر اتنی بھی نہیں کہ بات کو سمجھ نہ سکو" زور کی گرج اور چمک پر میں اماں سے چمٹ گئی۔ وہ آہستہ سے مجھے پرے ہٹا کر سوال کرتی ہیں — "حمیدہ اگر ایسی ایسی بجلیاں رات دن تم پر گریں اور گرتی ہی رہیں تو تم کو کیسا لگے گا؟" میں حیران کہ آخر اماں کہہ کیا رہی ہیں؟ "میری بات کا جواب دو۔"

اماں اس کا کوئی جواب ہی نہیں کیونکہ جب بجلی کسی پر گرتی ہے تو اسی وقت اس کو بھسم کر دیتی ہے۔ بار بار اس پر گرے تو اس کو بھلا کیا معلوم ہو سکتا ہے۔

اماں "بے وقوف لڑکی وہ بجلیاں جو بار بار کسی ایک ہی انسان پر گر سکتی ہیں وہ اس آسمانی بجلی کی طرح کی نہیں ہوتیں۔ وہ بجلیاں کسی کے اخلاق کی، کردار کی، عدم توجہی کی، بے حسی کی اور بے پروائی کی ہوتی ہیں۔"

میں کچھ بھی نہ سمجھ پائی۔ ماں سے بس اتنا کہا "اماں آخر آپ مجھ سے کہنا کیا چاہتی ہیں؟"

"تو سنو۔ تمہارے ابا نے تمہاری شادی ایک اختر حسین نامی لڑکے سے کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ میں نے تو ان کو بہت سمجھایا کہ پہلے اس شخص کے متعلق معلومات کر لینی چاہئیں کس خاندان کا ہے اور باپ سے تعلق نہیں تو کیوں نہیں ہے؟ مگر وہ تو کسی طور میری بات سننے کو تیار نہیں۔ کہتے ہیں جب مولوی عبدالحق صاحب نے تعریفوں کے پل باندھ دیے ہیں اور شرکت اور عید اس رشتے کے حق میں ہیں تو مزید معلومات کی کیا ضرورت ہے۔ بہت کہا کہ کم سے کم لڑکے کو طلب کر لیجئے تو۔ اس کی بھی ان کو ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ مولانا کی رائے اس کے متعلق اس قدر اچھی ہے تو ان کو نہ ملنے کی ضرورت ہے نہ معلومات حاصل کرنے کی۔ لڑکی کا ہاتھ تھماتے وقت ساری باتیں معلوم کی جاتی ہیں۔ اب میری سمجھ میں صرف ایک ہی بات آ رہی ہے کہ تم کاغذ پر خود ہی لکھ دو کہ مجھے یہ رشتہ منظور نہیں ہے۔ پھر وہ کچھ نہ کر سکیں گے۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا "مگر کیوں؟"

"تو سنو یہ لڑکا ایک رائٹر ہے۔ میرے خیال میں ہر شاعر، ہر رائٹر، ہر مصنف اپنی شریک حیات سے چاہتا ہے کہ میری آنکھ سے دیکھو، اور میرے دماغ سے سوچو۔ جو ممکن نہیں ہوتا کہ ہر شخص اپنی آنکھ رکھتا ہے اور اپنا دماغ۔ ہر ایک کی زندگی میں اونچ نیچ آتی ہے۔ مگر ایسے لوگوں کے ساتھ بہاؤ اور سمندر پار کرنا بہت مشکل کام ہے۔ پھر تم جیسی سیدھی لڑکی کے بس کی یہ بات ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لئے یہ بیل منڈھے نہ چڑھ پائے گی۔"

میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج سے بے پرواہ ہو کر ان کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرنے کی عادت اور جسارت عمر بھر ہم میں سے کسی کو نہ ہوئی تھی، مگر خدا جانے وہ کون سا لمحہ تھا کہ ان کی طرف دیکھتی رہی۔ بجلی کی چمک تھا جو اس سے بھڑک پڑی تھی۔ دل کڑا کر کے جواب دیا "اماں آپ نے ہم سب کو ہمیشہ یہ سبق پڑھایا کہ میری ڈکشنری

ہی لفظ ناممکن نہیں۔ اگر انسان خدا پر بھروسہ کرکے، ہمت اور حوصلے کے ساتھ جو بھی کام کرے گا اس کو کر ہی لے گا۔ ہو سکتا ہے محنت بہت کرنا پڑے، کبھی ناکامی بھی ہو، مگر حوصلہ اس کو کامیاب ضرور کراتا ہے (ان کی اپنی زندگی کا ہمیشہ یہ فلسفہ رہا۔) کوئی وجہ نہیں کہ آپ کی بیٹی ہوکر میں کبھی ہمت ہار دوں یا آگے بڑھا کر قدم روک لوں۔ اچھا رات بھر سوچ کر صبح مجھے جواب دینا۔ یہ کہہ کر وہ اٹھ کر چلی گئیں۔

ساری رات صبح چار بجے تک جاگتی رہی، کبھی خوشی سے بے حال، کہ ابا نے فیصلہ کر لیا ہے، کبھی گھبراہٹ، کہ دن کی روشنی میں اماں کی نظروں سے نظر ملا کر میں کیسے انہیں کیا کہوں گی؟ اماں کی گفتگو اور بھابی کلثوم کے سارے وہ الفاظ "وہ لوگ کا بہ کر کر بیان کرتا کہ بڑا جلالی ہے، خود سر ہے، غصہ ناک پر دھرا رہتا ہے۔ کسی پیر و فقیر کو بھی اپنے آگے کچھ سمجھتا نہیں، اپنی ہی بات پر اڑا رہتا ہے اور جیل میں تو گویا اس کا مشغلہ ہے وغیرہ وغیرہ" مسلسل گونجتے رہے۔ مجھے کیا کہنا ہے اماں سے؟ ملی "کہا جیلانی احمد کے خط پھر سے پڑھا ایک بار۔ سوچتی کیا جب اس خط کو پڑھا جس میں لکھتے ہیں: "تمہیں حاصل کرنے کے لیے نہ اپنی خودداری کو سرنگوں ہونے دوں گا اور نہ ضمیر فروشی کروں گا۔ میں آزاد ہوں اور ایسے ہی رہوں گا۔ آج نہیں تو کل جیل جانے کے لیے کمر بستہ رہوں گا، بلکہ اس سے بھی زیادہ کے لیے۔ میں تمہیں عیش سے نہ رکھ سکتا ہوں نہ اس کی کوشش کروں گا۔ اب تم خود اپنے دل سے پوچھو کہ اس کے باوجود ایسے آدمی کا ساتھ دے سکتی ہو یا نہیں؟ میں نہ کوئی وعدہ کرتا ہوں نہ ترغیب دیتا ہوں۔ اتنا اوچھا نہیں کہ اپنے لیے کوئی قربانی کرنے کو کہوں۔ یہ تو میرے ایمان پر مبنی ہے۔ میری تو ہمیشہ یہ خواہش رہے گی کہ جس سے محبت کی ہو انہیں سامنے سے دیکھوں۔ میں نے تو اغراض و مقاصد کی یکانگت کا ذکر صرف اس لیے کیا تھا کہ تم میری شورش طلب زندگی دیکھو اور سمجھ لو اور یہ جان لو کہ ایسے آدمی سے محبت تب ہی ہو سکتی ہے جب اس کی ذات سے نہیں بلکہ ان چیزوں سے ہمدردی ہو جن کے لیے وہ زندہ ہے۔ بابا، تمام مردوں کے معیار سے مجھے کیوں جانچتی ہو، جو گھر بار سے بے نیاز، نہ نام اور شہرت کا خواہاں نہ دولت اور غرض کا بندہ۔ آخر دوسروں سے وہ کچھ تو مختلف ہے۔"

یہ خط پڑھتے ہی باقی بے پڑھے بند کرکے رکھ دیے۔ پلنگ پر آ کر بیٹھی تو نانا وہم، حوصلے اور ولولے سے سرشار تھی کہ جس کے خیالات اتنے بلند ہوں، جو زندگی سے دو قدم آگے بڑھ رہا ہو، جو ملک اور قوم کی خاطر جیل بھی جانے کو خوشی سمجھتا ہو مجھے اس کی دنیا میں تنہائی سی تنہائی رہی ہو جس نے بچپن سے کوئی خوشی نہ دیکھی ہو اور پھر بھی اتنی ہمت کہ خوشیاں حاصل کرنے کے لیے ذرا سا جھکاؤ بھی برداشت کرنے سے صاف منکر ہو؟ ہاں یہی ہے اس انسان کی عظمت۔ یہ ایک عظیم انسان ہے اور میں کیا ہوں کچھ بھی تو نہیں۔ بس ساری عمر، محبت، ان کی عزت، احترام حاصل کرتی رہی۔ خوشیاں، قہقہے اور مسرتیں بٹورا کی۔ آخر جو محبت کے ساتھ علم کی دولت سے آراستہ ہیں۔ ان کا ساتھی بن جانا میرے لیے باعث فخر ہوگا اور جو اماں کہہ رہی تھیں۔ بجلیاں، سمندر، پہاڑ، تو میں ایسے ہم سفر کے ساتھ وہ سب کو پار کر لوں گی۔ ایک پرچے پر بس اتنا لکھا کہ "ابا کا فیصلہ مجھے منظور ہے۔" اسے تکیے کے نیچے رکھ کر خالی سو گئی۔

صبح بہت دیر سے اٹھی، بجے کوئی نیا سورج کے نکلنے سے پہلے چار پہر ہو گئے۔ تخت پر اماں بیٹھی سبزیاں کاٹ رہی تھیں۔ آداب کہہ کر وہ پرچہ ان کے سامنے رکھا اور دالان سے دوڑ گیا رہ ہو گی۔ دوسرے کمرے کا پردہ ہٹا کر آڑ سے ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

انھوں نے یہ پرچہ کئی بار پڑھا۔ ان کا چہرہ اداس سا لگا۔ میں سارا دن ان کے سامنے نہ گئی۔ اب ان کو مجبوراً صبر کرنا تھا۔

میری بڑی بہن محمودہ آئی ٹی کالج لکھنؤ میں پڑھ رہی تھیں۔ تین دن بعد چھوٹی دو بہنیں خدیجہ، رشیدہ لکھنؤ مسلم گرلس اسکول بھیج دی گئیں۔

اب اماں میری شادی کے کپڑے وغیرہ سینے اور سونے کی تیاری میں لگ گئیں۔ میں ان سے دور دور ہی رہتی جب میرا ان سے آمنا سامنا ہوتا تو میں ان کے چہرے پر اداسی محسوس کرتی۔ کچھ میری وجہ سے اور کچھ سب سے بڑی بہن مسعود بیگم کی وجہ سے، جن کو ہم سب آپا کہتے تھے۔ وہ ٹی بی کے موذی مرض میں مبتلا تھیں۔ آپا کے دو ننھے منے بیٹے خورشید عمر اور جمشید عمر بڑے ہی پیارے تھے۔ سینی ٹوریم میں ایک سال کے قریب رہ کر گھر واپس آ گئی تھیں کیونکہ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا۔ ان کی طرف سے اماں کی پریشانی جائز تھی اور پھر ان کا غم بھی پریشان کر رہا تھا۔ میں تو زیادہ وقت ان دو بچوں کے ساتھ گزارتی کیونکہ بچے آپا کے کمرے میں جا نہیں سکتے تھے۔ پھر میری ہمت بڑھاتی رانی جی تو تھیں۔ جب موقع ملتا آپا کے کمرے میں چلی جاتی۔ کس ہمت اور حوصلے کی خاتون تھیں۔ کبھی اپنی بیماری یا مایوسی کی باتیں نہ کرتیں۔ بس مجھے آنے والی زندگی کے اونچ نیچ بتایا کرتیں کہ کس قسم کی لڑکیاں کامیاب زندگی گزارتی ہیں۔ اس کے لیے کیسے کیسے جتن کرنے ہوتے ہیں۔ انھوں نے مجھے مولوی عبدالحق صاحب کے متعلق بہت کچھ بتایا کہ ان کی شخصیت کتنی عظیم ہے۔ ان کی زندگی کا مشن صرف اور صرف اردو زبان کو فروغ دینا ہے۔ انھوں نے شادی کبھی نہیں کی۔ ان کی کوئی آل اولاد نہیں۔ کبھی کہتیں کہ جب تم بیاہ کر اپنے گھر جاؤ گی تو ہر طرف کتابوں کے ڈھیر اور اخباروں کے انبار پاؤ گی۔ اس گھر میں صرف دو شخص ہوں گے۔ اختر اور مولوی صاحب۔ بڑی وقیع قسم کی گفتگو سنو گی جو شاید تمہاری سمجھ سے باہر ہو۔ مگر دیکھو کبھی اپنے چہرے سے عیاں نہ ہونے دینا کہ تم کچھ سمجھ نہیں رہی ہو۔ غور سے سنو گی تو آہستہ آہستہ دماغ کو جلا ملتی ہی جائے گی۔ رشتے اور تنہائی کا احساس ہو بھی تو کبھی اپنے منہ پر نہ لانا۔ بے شک تم ایک اتنے بڑے کنبے سے نکل کر ایک اور ہی ماحول میں پہنچ جاؤ گی۔ مگر اپنے کو وہاں کے ماحول کے مطابق ڈھال لینا تاکہ زندگی بھر خوش رہو۔ اور ہاں دیکھو کبھی بات بات پر ہمارے گھر میں یہ، ہمارے گھر میں وہ، ہرگز نہ کہنا کیونکہ درحقیقت چند ماہ بعد تمہارا یہ گھر نہیں رہے گا۔ اصل گھر وہ ہوگا۔ میں سوچتی۔ اللہ وہ کیسا گھر ہوگا؟ دل کہتا وہاں اختر جو ہوں گے۔ پھر بھی ایک وحشت سی ضرور تھی۔

یہ چند ماہ تیزی سے گزر گئے۔ دسمبر آ گیا۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۳۶ء کی صبح برات آ جائے گی۔ شام کو نکاح اور دعوت کا کھانا۔ بھائی شوکت عمر اور حمیدہ بھابی ایک ہفتہ پہلے آ گئے۔ مولانا عبدالحق برات لے کر آ رہے ہیں ان کے شایانِ شان انتظام ہونا چاہیے۔ وہ انتظامات کے ماہر تھے۔ مولوی صاحب نے پہلے سے لکھ دیا تھا کہ نکاح کے دوسرے روز وہ "کالپی" دریا کے کنارے لنچ کھانا چاہتے ہیں۔ اس لیے وہاں کا ریسٹ ہاؤس بھی سجایا گیا۔

ہر ضلع میں اس وقت تین بہت باحیثیت شخصیتیں ہوا کرتی تھیں جو عام طور سے انگریز ہوتے۔ کبھی اکا دکا آپ کو کوئی ہندو یا مسلمان مل سکتا تھا۔ "اورئی" میں میرے والد مسلمان سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے۔ باقی دونوں انگریز، سول سرجن اور کلکٹر تھے۔ انگریزوں نے اپنے افسروں کے لیے ہر ہر ضلع میں کئی کئی ایکڑ زمین پر کوٹھیاں بنائی ہوئی تھیں۔ یہ شہر سے ہٹ کر چھاؤنی کے قریب ہوتیں بے شمار بڑے بڑے کمرے بے حد اونچی چھتیں یا تو کھپریل کی یا بلیاں رکھ کر دو دو فٹ موٹا پھوس۔ بڑے بڑے دالان اور

کھانے کے کمرے تاکہ بوقت ضرورت ان کو ڈانس ہال کی طرح استعمال میں لایا جا سکے۔ گھر کی دیواریں بے تحاشا موٹی تاکہ گرمی کا اثر کم ہو۔ چوڑے چوڑے برآمدے۔ کوٹھی کے چاروں طرف جانے کیوں؟ ہر کوٹھی گولائی میں بنائی گئی تھی۔ چاروں طرف ان کے باغات، کئی کئی ایکڑ زمین پر پھیلے ہوئے، سرکاری چار چار مالی دیکھ ریکھ کے لیے۔ آموں، امرودوں اور سنگتروں کے گچھے باغات، جن کے تلے لڑکیوں اور بچیوں کے کھیل آج بھی یاد ہیں۔ یہاں صحن کا سوال ہی نہ تھا۔ کوٹھی سے آدھ فرلانگ ہٹ کر باورچی خانہ اور ملازمین کے کوارٹر۔ دوسرے ساتھ پر گارڈ کے کوارٹر الگ۔ ان تینوں کوٹھیوں پر بارہ عدد پولیس کی نفری تعینات رہتی۔ مجھے سب ہی ان میں اچھے لگتے جن میں دو دو لوگ کوٹھی کے اطراف پہرہ دیا کرتے۔ شہر سے بالکل باہر ہونے کی وجہ سے رات بھر گیدڑ شور کیا کرتے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا چیتا اپنے شکار کے تعاقب میں بنگلے کے باغ سے کود جاتا اور سپاہیوں کی بلند آوازیں ہم کو سوتے سے جگا دیتیں۔

بنگلے میں سامنے لق و دق لان اور چاروں طرف پھولوں کی کیاریاں، ایک طرف ٹینس کورٹ کا وجود ضروری ہوتا۔ ان چند ماہ میں اپنی پیاری آپا کے دو چھوٹے بچے، تین چھوٹے بھائیوں اور ایک پانچ سالہ بہن ذکیہ کے ساتھ رہی۔ کوئی ہم عمر نہیں تھی۔ آپا کو میرے اکیلے پن کا خیال آیا تو شام کو کلب کے ٹینس کورٹ پر جا کر میرے ٹینس کھیلنے کا انتظام کر دیا۔ بیڈمنٹن تو خوب کھیلا کرتی تھی۔ خاصی جلدی مجھے اس کھیل میں بھی مہارت حاصل ہو گئی اور دو گھنٹے کھیلنے کے بعد گہری نیند آ جاتی۔

سونے سے پہلے اپنی آپا کے کمرے میں جا کر ان کے پلنگ کی پٹی سے لگ دری پر بیٹھ جاتی اور وہ اپنے محبت بھرے ہاتھ میرے سر پر پھیر پھیر کر بڑے خوب صورت طریقے سے جیسے کہ گنگنایا کرتیں، ایک اچھی بیوی کے فرائض ذہن نشین کراتیں۔ ایک بار خوب ہنس ہنس کر کہا "حمیدہ! تم کو خبر نہیں اس گھر میں پہنچ کر تمہیں دو بچے ایک بوڑھا اور ایک جوان ملیں گے" آپا میری آنکھ پر یکھ کر ہنس کر بولیں "ایک بچہ جو ماں باپ کی محبت سے محروم رہا اور دوسرا جس نے طبیعت اشعار و ادب کے عشق میں سرشار رہ کر اپنے کو ہر چیز سے بے نیاز کر لیا۔ پہلی بار ایک گھر میں ایک لڑکی کی موجودگی کا احساس جاگے گا۔ دونوں من چلے ضدی بچوں کی طرح تم جیسی الھڑ لڑکی پر اپنا حق جتایا کریں گے۔ بڑی عقلمندی برتنا پڑے گی۔ اگر ڈوری کو ڈھیل دے کر رکھا تو چین سے زندگی گزارو گی۔ چلو بھاگو یہاں سے، نماز پڑھ کر سو جاؤ۔ کل ہماری چھوٹی سی بہن کی برات آ رہی ہے۔"

ان تمام مہینوں میں خاص کر آج کی رات مجھے اپنے زاہد عرف جو ہمارے سب سے چہیتے اور لاڈلے بھائی تھے، یاد بے طرح ستا رہی کہ ان سے میں بے تکلف تھی اور بلا جھجک ان سے بہت کچھ کہہ سکتی تھی، مگر وہ تو ہم سے ہزاروں میل لندن میں پڑھ رہے تھے۔ میرا دل آپا کی آدھی رات کی باتوں سے بری طرح دھڑک رہا تھا۔ بار بار سوچتی کہ آپا آخر کیا کہہ رہی تھیں کہ میرا واسطہ ایک جوان اور ایک بوڑھے بچے سے پڑے گا۔ مگر کچھ پتا ہوا ہی!!

میرٹھ سے میرے ماما اور دادی، چچا آفتاب عمر اور پھوپھی جو میری تائی ساس بھی تھیں اور ان کے بچے۔ لکھنؤ سے جمیل بیگ ماموں، آپا دلہن شاہد حامد کے والد رحمان بھائی اور سید حامد حسین وغیرہ پہنچ چکے تھے۔ سب سو رہے تھے اور میں پلنگ پر لیٹی جاگ رہی تھی۔

(افکار، اکتوبر ۹۳ء) —

۴

۳۰ دسمبر ۱۹۳۵ء کو گیارہ بجے وہاں ٹرین پہنچی۔ پلیٹ فارم پر فرسٹ کلاس کے ڈبے کے سامنے لال قالین بچھے ہوئے تھے۔ اور ان اطراف پولیس کے بینڈ والے کھڑے ہلکی دھنوں میں شادی کے گانوں کی دھن بجا رہے تھے۔ قالین کے دونوں طرف شہر کے معزز لوگ اور خاندان والے برات کی پیشوائی کے لیے کھڑے تھے۔ سہرے چمک چمک کر [illegible] رنگ گئی۔ سب سے پہلے کود کر مولوی صاحب پھر ان کے پیچھے اختر وارد ہوئے اور پھر یکے بعد دیگرے ڈاکٹر اشرف، سبط حسن، مجاز، ذکا اللہ خاں (اشرف)، اختر علی البیر صاحب (علی گڑھ یونیورسٹی کے لائبریرین) اختر کے دو بنگالی دوست، مہندر ما اور رام لعل برآمد ہوئے۔
مولوی صاحب سب سے آگے تھے اور ساتھ میں دولہا میاں اختر اور سارے براتی باآواز بلند گا رہے تھے

"للا رو پتا لایا ہو، للا کی شادی کر دیں گے، ابھی کر دیں گے، ابھی کر دیں گے

لائق دولہا لائیوں ہیں (زاہدہ اور سب کی تالیاں)
ان پڑھ لڑکی لے لیں گے
بھئی لے لیں گے۔ بھئی لے لیں گے (پھر تالیوں کی گونج)

بینڈ والے ایک منٹ کی خاموشی کے بعد اسی دھن کو بجانے لگے!! ابا، چچا، ماموں کی گردنیں جھک سی گئیں۔ مگر شوکت عمر بھائی مسکرا رہے تھے۔ باقی لوگ حق حیران ان انوکھے براتیوں کو دیکھ رہے تھے۔ برات کے ساتھ کوئی خاتون نہ تھیں۔

اشرف بھائی اور اختر کو شوکت بھائی نے اپنے ساتھ موٹر میں بٹھایا۔ بیٹھتے ہی پوچھا کہ یہ کیا انوکھی اور نرالی حرکت تم سب نے کی؟ اور مولانا کو کیا ہو گیا تھا؟ بتایا گیا کہ گاڑی رکنے سے پندرہ منٹ پہلے مولوی صاحب نے خود ہی تک بندی کی، ذکی اور مجاز نے دھن نکالی، پھر ان ہی کی رائے ہوئی کہ سب گاتے ہوئے اتریں اور ذرا خاکی وردی والے صاحب (یعنی والد صاحب) کا پیچ و تاب دیکھا جائے۔

یہ قوان کی اپنی خوشی کا اظہار تھا۔ باغ میں ہر براتی کے لیے بڑے خوب صورت خیمے لگائے گئے تھے۔ مولوی صاحب اور اختر کے خیمے زیادہ بڑے تھے۔ ہر غسل خانے میں گرم پانی رکھا ہوا تھا۔ نہا دھو تیار ہو کر کھانے بنگلے میں آنے کے سب نے باغ کا رخ

گیا۔ دور ڈرامہ روم کے باغ میں ہلکی سی گانے کی آواز سن کر شوکت بھائی لپکتے ہوئے وہاں پہنچے تو ان کو معلوم ہوا کہ اختر اور ذکیہ کسی گانے کی دھن نکال رہے ہیں اور مولوی صاحب ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو کر اس کی طرز بنانے کی کوشش کر رہے ہیں! شوکت بھائی کو آتا دیکھ کر سب کے سب چپ ہو گئے۔ شوکت بھائی سب کو گھور کر اندر لاتے ہوئے کہتے جاتے تھے کہ "اب کوئی اور گل نہ کھلانا۔ ابا پہلے ہی اسٹیشن پر سب کے سامنے شرمندہ ہو چکے ہیں۔"

اور کسی کو تو ہمت نہ ہوئی کہ اماں کو اسٹیشن پر بدتمیزوں کے اترنے اور گانے کا حال سناتا مگر ماموں ابا بہن کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گئے اور بہت مسکرا کر سارا سین بیان کیا۔ اماں اپنے بھائی جان سے لپٹ کر آب دیدہ ہو کر بولیں "خدارا بھائی جان آپ شوکت کے ابا کو سمجھائیں ابھی وقت اپنے ہاتھ میں ہے۔ میرا ماتھا تو جب ہی ٹھنکا تھا جب پچھلے ماہ مولوی صاحب کو ہزار روپے کا چیک یہ لکھ کر اختر نے بھیجا کہ اس میں سے ایک شیروانی، کرتا پاجامہ اور ایک سوٹ اور جوتے وغیرہ لے لیں (اس وقت کے ہزار روپے آج کے دس ہزار روپے کے برابر تو ضرور ہوں گے) تو ان حضرت مولانا نے چیک کے چار ٹکڑے کرکے یہ لکھ کر "تم نے مجھے اختر سے شرمسار کرایا۔ کیا سمجھا ہے؟ کہ ان کے پاس اپنے کپڑے جوتوں کے لیے روپے نہیں؟" چیک کے ٹکڑوں کے ساتھ خط بھیجا۔ ماموں ابا نے ہنس کر کہا "تو یہ اسٹیشن پر گانا ان کا ظفر کو شرمندہ کرنے کی ترکیب تھی۔ مولانا کے مذاق کے طریقے، سنا تھا کہ کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ دیکھو اب کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ مالک ہے اس لڑکی کا!"

بہت بڑے کھانے کے ہال میں چوبیس لوگوں کی میز پر لنچ (جو سب انگلش کھانا تھا۔ اس کے ساتھ ہر ایک کے سامنے ایک ایک ٹماٹر سوس کی بوتل تھی) سفید کپڑوں میں بیرے اونچی کلاہ کے ساتھ باوردی مؤدب کھڑے تھے۔ لال وردی میں ہیڈ کے بیگ پائپر اسٹیچو کی طرح منتظر کھڑے تھے کہ مہمان کرسیوں پر بیٹھ جائیں تو یہ میز کے چاروں طرف گھوم گھوم کر کوئی دھن بجانا شروع کریں۔ شوکت بھائی نے ہر ایک کو خاص انداز سے بٹھایا۔ بیرے گرم گرم کھانے کی ڈشیں لا کر کھانا پیش کرنے لگے اور دور بھی شروع ہو گیا۔ سب نے کھانا لے لیا۔ مولوی صاحب براتیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "بھئی اس شور، شور، پیں، پیں میں کھانا کیوں کر کھایا جا سکتا ہے؟ چلو تو پھر پی ہی لیں" یہ کہہ کر ٹماٹر سوس کی بوتل منہ سے لگا کر غٹ غٹ پینے لگے۔ ان کی دیکھا دیکھی ہر براتی اور اختر نے بھی یہی حرکت کی۔ ابا نے ہاتھ کے اشارے سے بیگ پائپر کو باہر جانے کو کہا۔ تب ٹماٹر سوس کی بوتلیں میز پر رکھ دی گئیں اور مہمانوں کے سامنے ابا کو پھر کیسی شرمساری ہوئی۔ بہنیں دوسرے کمرے کے پردوں کی آڑ سے یہ تماشا دیکھ کر ہنسی سے بے حال میرے کمرے میں دوڑی آئیں اور سارا ماجرا بیان کیا۔ میری تو جان نکلے جا رہی تھی کہ الٰہی یہ کس قسم کے لوگ ہیں۔ آگے کیا ہوگا؟

کھانا ختم کرکے مولوی صاحب یہ کہتے ہوئے اٹھے "چلو چلو اپنے اپنے خیموں میں۔ ہم سب کو تو بخار آ بھی گیا ہے" ان کے پیچھے سب چل پڑے۔ باقی مہمان حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

پھر شام آ ہی گئی۔ نکاح کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ قاضی صاحب بھی آ گئے۔ تب یہ نہ ہوتا تھا کہ مہر پہلے سے طے کر لیا جائے بلکہ اسی وقت خاموشی سے سر جوڑ کر بات چیت کرکے مہر طے پاتا تھا۔ نہ نکاح کے چھپے ہوئے فارم ہوتے تھے۔ قاضی صاحب اپنے قلم سے لکھتے۔ لڑکے اور لڑکی کی طرف والے دستخط کر دیتے۔ سید حامد حسین میرے ماموں مولوی صاحب کے

پاس آکر مؤدب ہو کر جھک کر بڑی آہستہ آواز میں دریافت کرتے ہیں: "مولانا صاحب آپ مہر کا طے کر دیں" مولوی صاحب اچھل سا پڑتے ہیں اور باآواز بلند بڑی معصومیت سے کہتے ہیں: "میاں تم یہ مہر کا کیا نام لے رہے ہو۔ ہم تو اختر کی شادی حمیدہ سے کرنے آئے ہیں" وہ گھبرا کر کچھ پیچھے ہٹ کر پھر آگے بڑھتے ہیں یہ کہتے ہوئے "جی وہ مہر کوئی لڑکی نہیں ہے۔ یہ تو شادی کے وقت جو رقم بطور مہر طے کی جاتی ہے میں تو اس کی بات کر رہا ہوں" تو مولوی صاحب بے ساختہ اور بھی زور سے کہتے ہیں "اچھا تو تم لڑکی کو بیچ رہے ہو۔ سنا لوگو!" سب حق حیران کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں "اچھا بھلو بھلو، کیا بولی تم سب نے اس بیچاری لڑکی کی لگا لی ہے؟"

" جو بڑی بہن اور گھر کی بہو کا ہے یعنی پچیس ہزار، وہی مہر رکھیں گے" مولوی صاحب نے جھٹ جیب سے چیک بک نکال اتنی رقم کا چیک لکھ کر ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ پہلے قاضی صاحب کے کان میں کچھ کہہ کر چیک لے کر اماں کے پاس اندر آئے اور ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ میری والدہ کے تن بدن میں جیسے آگ سی لگ گئی۔ چیک کے چار ٹکڑے کر کے (جیسے والد صاحب کے چیک کے چار ٹکڑے کر کے مولوی صاحب نے ان کو واپس کیے تھے) ایک چاندی کی تھالی میں رکھ کر اپنے بھائی کے ہاتھ میں دی اور بولیں، "بھائی جان یہ آپ ان بزرگوار کو دے آئیں۔ انھوں نے سمجھا کیا ہے کہ مہر لینے کے لیے لکھوایا جاتا ہے۔ یہ تو مجھے انتہائی بدنیت لوگ لگ رہے ہیں" ماموں آیا انکار کیے جاتے کہ نا بابا میں تو یہ ٹکڑے جا کر ان کو دے کر بھری محفل میں مولانا کی الٹی سیدھی بات سننے والا نہیں۔

اماں نے بھائی کو قسم دی کہ آپ یہ ان کو دے آئیں۔ آخر کو وہ باہر گئے اور خاموشی سے چاندی کی طشتری ان کے ہاتھ میں دے کر جلدی سے وہاں سے ہٹ گئے۔ مولوی صاحب چیک کے ٹکڑے دیکھ کر خوب ہنسے اور ایک ایک ٹکڑا ہاتھ میں پکڑ کر پھونک مار مار کر ادھر سے ادھر اڑا دیا۔ اندر آکر پہلے مجھ سے پوچھا گیا پھر باہر جا کر "حمیدہ بنت ظفر ۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ آپ کو قبول؟" مولوی صاحب بول اٹھے "قبول نہ ہوتی تو ہم حیدرآباد سے اٹھ کر آتے ہی کیوں؟" قاضی صاحب، مولوی صاحب کی حیثیت اور دبدبے سے ناواقف ذرا بگڑ کر بولے "اس کا جواب دولہا میاں خود دیں گے۔ آپ خاموش رہیں" تو جھٹ ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر خاموش ہو بیٹھے۔ چلیے یہ مرحلہ ختم ہوا۔ اب جو صاحب سہرا لکھ کر لائے تھے، وہ اٹھ کر کھڑے ہوئے کہ "ایک سہرا بندہ لکھ کر لایا ہے وہ پیش خدمت ہے" تو مولوی صاحب جھٹ سے کھڑے ہو کر کہتے ہیں کہ "جناب آپ کس خوشی میں سہرا پڑھیں گے۔ خوشی کا موقع تو ہمارے لیے ہے کہ ہم دلہن بیاہ کر لے جا رہے ہیں" مجاز کی طرف دیکھ کر کہا "میاں اب چونکہ آپ ادھر آ جائیں" قریب بیٹھے لوگ سمجھے کہ میاں جوش کہا۔ ادھر ادھر دیکھ کر آپس میں کہا مگر جوش صاحب یہاں تو نظر نہیں آئے۔ آخر تخت سے اٹھ کر مولوی صاحب کے پاس آ گئے۔ باقی بھائی تو پہلے ہی سے ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ پہلے مولوی صاحب کھڑے ہوئے اور ساتھ ہی بھائی کھڑے ہو گئے۔ ابا، چچا، آفتاب عمر، ماموں حامد حسین صاحب اور شوکت عمر کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں کہ اب کیا اور گل یہ سب مل کر کھلائیں گے اور ہوا بھی یہی۔ جمیل بھائی ذرا سہرے کے بول تو سنیے۔ بھلا آپ اس قدر جھینپ کیوں رہے ہیں۔ یہ تو ہمارے اردو کے خود جوڑ توڑ کر کے کہا ہے ؎

ایک یار ہمارا پھرتا تھا یوں مارا مارا
جیسے ہو اک مرغ بیچارا

ڈھنڈورے سہاما ڈھب کا، ڈربے کا
یہ کیا تم نے دل میں ٹھانی
لکھ ڈالی سب رام کہانی
مسٹنڈر کی، کبھی منڈر کی
بس کھلنا بھائی تماشا
آگے تانگا پیچھے گھوڑا
پہنے خاکی وردی ہاتھ میں ڈنڈا
تن کے چلے ہے دلہن کا بابا

جمیل بھائی آپ ایمان سے کہیں کہ اگر اس نئے زمانے میں بھی ہماری ایسی حرکات کریں تو کیا ڈنڈے لگا کر بارات اسی وقت بھگا دی جائے۔ مگر یہاں واسطہ تو مولوی عبدالحق صاحب سے تھا جن کے اس وقت سارے ہندوستان میں ڈنکے بج رہے تھے۔ بزرگوں کا حال بس یہ تھا "ٹک ٹک دیدم ۔ دم نہ کشیدم"

کھانا میز پر لگ گیا۔ پہلے ہم باتیں کر رہے کہ شوکت عمر آگے بڑھے اور چپکے سے ببلے اور اشرف سے کہا "خدا کے لیے اب کوئی اور نیا گل نہ کھلانا۔ آپ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے تو ٹھیک ہے" اب مولوی صاحب اپنے بچاؤ کے مورچے سے نکل چکے تھے۔ مختلف لوگوں سے سنجیدہ ہو کر بات چیت کرتے رہے۔

کھانے کے بعد مہمان رخصت ہونا شروع ہو گئے۔ جانے بھائی جان کو کیا سوجھی جو مولوی صاحب سے کہا "ذرا اندر تشریف لے چلیں اور ایک نظر جہیز دیکھ لیں تاکہ جہیز بند کر دیا جائے۔" کالپی (اورائی شہر سے دس میل پر ہے) یہ کالپی نامی دریا بڑے حسین مقام سے گزرتا ہے۔ دونوں طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں، ڈھلان پر پہلے پھلوں کے باغات اور اس کے بعد ہرے بھرے کھیت حدِ نظر تک چلے گئے تھے۔ چھوٹی چھوٹی کشتیاں جب گزرتیں تو دسمبر کے مہینے میں وہ لاکھوں پرندے جو برفانی علاقوں سے پناہ لینے آ جایا کرتے تھے، پھر سے اڑ کر ادھر سے ادھر ہو جاتے۔ ٹیلوں پر سے کبھی کبھار ہرنوں کی ٹولیاں کھیتوں کا رخ کرتیں، نیچے کی طرف چھلانگیں لگاتی دکھائی دیتیں اور کبھی بارہ سنگوں کا غول نظر آتا۔ اس علاقے میں چیتوں کی کمی نہ تھی۔ ریسٹ ہاؤس جو خاصی بلندی پر تھا وہاں سے چیتے کو ہرن یا بارہ سنگھے کے شکار کے تعاقب میں زنانے بھرتے بھی دیکھ سکتے تھے۔ اسی لیے لوگ بس ریسٹ ہاؤس کے کنارے سے دریا اور ان جانوروں کا نظارہ کرنے پر اکتفا کرتے۔

ہاں تو شوکت عمر مولوی صاحب کو لے کر اس کمرے میں گئے جہاں جہیز سجا کر رکھا گیا تھا۔ ان کی نظر سب سے پہلے اس کونے کی طرف گئی جہاں پتیلیاں ایک دوسرے پر رکھی ایک چھوٹے سے مینار کی شکل میں تھیں۔ اپنی چھڑی سے ان کو ٹھک ٹھک کیا۔ وہ دھڑا دھڑ نیچے ڈھلک کر گرنے لگیں۔ "ارے! یہ بھی یہ سب کیا ہے۔ کیا ہمارے گھر میں پکانے کو برتن نہیں؟"

۱؎ اختر کا ایک افسانہ "میرے خوابوں کا مندر" ہے، اشارہ اسی کی طرف ہے۔

میز پر سب سے پہلے ان کو چاندی کا پاندان اور خاصدان نظر آیا۔ اس کو بھی چھڑی سے پیچھے سرکایا۔ "چھی چھی یہ اور ہمارے گھر جائے گا؟" پھر ادھر ادھر نظر دوڑا کر کہا "یہ اُگالدان بھی ہمارے ساتھ نہیں جائے گا۔" صرف حمیدہ کے اپنے پہننے کے کپڑے اور روزانہ استعمال کی دو چار چیزیں اور یہ بستروں کا ڈھیر! کیا ہمارے گھر میں بستر نہیں؟" بھائی جان نے ڈرتے ڈرتے آہستہ سے کہا "مگر یہ سب چیزیں تو ہر لڑکی کو دی ہی جاتی ہیں۔" "تمہارے گھر میں اور جو دسیوں لڑکیاں ہیں ان کے لیے رکھ لو۔" یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ پل پل کی خبریں چھوٹے بہن بھائی آ کر دے رہے تھے۔ اپنی بڑی بہن محمودہ کی بڑی خوشامد کی کہ سوٹ کیس میں کپڑے رکھ کے میرے دونوں تکیے ضرور رکھ دیں کیوں کہ بنا ان کے سو نہیں سکتی تھی اور یہ میری عادت آج تک نہ گئی۔ رات کو کئی گھنٹے دم آتش بازی چھٹتی رہی اور وہ سب گم ہو کر دیکھا کیے۔

صبح ناشتے کے بعد وہ سب اور ہم جہیز کا سامان لے کر کالپی روانہ ہو گئے۔ ریسٹ ہاؤس میں پہلے اطلاع کی جا چکی تھی ہر طرح کا انتظام تھا۔ بھائی جان نے اپنے ساتھ اختر، اشرف اور سبطے کو بٹھا لیا۔ مولوی صاحب، ابّا اور ماموں آپ کے ساتھ موٹر میں بیٹھے۔ ہم سب اور باقی براتی پانچ موٹروں میں روانہ ہوئے۔ اب ابّا کی مولوی صاحب سے کیا بات چیت ہوئی۔ وہ مجھے یوں معلوم نہیں کہ مولوی صاحب نے نہ خود ذکر کیا اور نہ میں نے پوچھا۔ اختر نے کبھی ہنس ہنس کر بتایا کہ بھائی جان نے تینوں کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ تم سب کی حرکات بڑی شرمساری کا باعث بنیں، موقع محل تو دیکھنا تھا۔ جس پر اشرف بھائی نے کہا "ہم سب کو موقع محل ہی تو مدِ نظر تھا، کیوں کہ مولوی صاحب نے کہہ دیا تھا کہ ہم سب بہت خوش خوش ایک بڑی خوشی پر جا رہے ہیں۔ ہر صورت میں ہماری طرف سے خوشی اور مسرت کا اظہار ہونا چاہیے تاکہ لوگ عرصے تک اس شادی کے ہنگاموں کو یاد رکھیں۔ پھر انھوں نے خود سب کے ساتھ مل کر تک بندی کی۔ اس میں اختر کا بھی ہاتھ تھا۔ اب یہ اور بات ہے کہ تم لوگ برے بد مذاق ہو، سمجھنے اور محظوظ ہونے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ یا گردنیں جھکی ہوئی تھیں یا چہرے ہونق تھے۔ شادی کی محفل تھی۔ خوشی کا موقع تھا، کوئی مجلس تو نہ تھی جو ہم سب ماتم کرتے ہوئے اترتے!" "کالپی میں تو خدارا انسانیت کا دامن پکڑے رہنا!" اختر نے کہا "شوکت تم انسانیت کہیں سے اگر ہم کو لا دو تو ہم صرف دامن ہی نہیں اس کا گریبان بھی پکڑ لیں گے۔"

موٹروں سے جب سب اتر گئے تو شوکت بھائی میرا ہاتھ پکڑ کر مولوی صاحب کے پاس لے گئے۔ "یہ حمیدہ ہیں۔" میں نے جھک کر آداب کیا۔ میرا سر ضرورت سے زیادہ ہی شاید جھکا ہوا تھا اور دوپٹہ اس طرح کھینچ کر اوڑھے ہوئی تھی کہ منہ نہ دیکھ سکیں۔ اس وقت میرے دبلاپے کا ایک عالم تھا۔ ان کو شاید میں بہت ہی چھوٹی سی لگی۔ خود کو خوب جھکا کر میرا منہ دیکھا اور اپنا سر اونچا کرنے کے بعد کہا "بھئی ہم کو تو ڈر ہے کہ کہیں "شاردا ایکٹ"[1] میں ہم لوگ دھر نہ لیے جائیں۔ یہ تو ذرا سی لڑکی ہے۔" پھر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور ایک ڈھیر میرے ہاتھ پر رکھ دی۔ اکڑے بے ڈھب صورت بنے کے لیے بنے تھے۔ جواب میں نے اپنی سب سے چھوٹی بہو کو دے۔ میرا دوسرا ہاتھ پکڑ کر اختر کے پاس لائے اور بولے "بیٹی ان کو بھی سلام کرو، ان کا نام اختر حسین رائے پوری ہے۔ گھر میں بڑی توپ چیز۔ ذرا سی بات پر بگڑ جاتے ہیں۔ چھوٹی سی بات پر خوش

---

[1] انڈین گورنمنٹ نے ایک شاردا ایکٹ بنایا تھا کہ چودہ سال سے کم عمر کی لڑکی سے شادی کرنے پر جیل کی سزا ملتی تھی۔

بھی ہو جاتے ہیں۔ یہ دل بے صبر چاہا کہ ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھوں کہ بگڑنے کے موڈ میں ہیں یا خوش ہو گئے۔ پر اتنی ہمت کیسے کرتی؟

اختر نے ایک ڈبیہ اپنی جیب سے نکالی اور میرا الٹا ہاتھ پکڑ کر انگوٹھی پہنانے کی کوشش کی۔ انگوٹھی فیروزے کی تھی مگر اتنا چھوٹا کہ میری چھوٹی انگلی میں آئی۔ اب مولوی صاحب اماں کی طرف بڑھے۔ انھوں نے تسلیم کرنے کے بعد پوچھا، "آپ کے مزاج حال ٹھیک ہیں نا؟ میں آپ سے صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں۔ حمیدہ ایک بہت بڑے کنبے سے نکل کر آپ کے ساتھ بہت دور جا رہی ہے۔ سیدھی اور معصوم بہت ہے۔ اس کے ساتھ آپ اور اختر میاں بس اتنا مذاق روا رکھیے گا جتنا اس کا کچا دماغ سمجھ سکے۔ ہو سکتا ہے اس کو آپ کے گھر میں تنہائی کا احساس ہو اور اس کا اظہار بھی کبھی کبھار کر دے تو آپ درگزر کیجیے گا۔" اماں کا انداز تکلم ان کو کچھ اس قدر دل دار لگا کہ بغیر جواب دیے میرے پاس آ کے میرا ہاتھ پکڑا، پھر اختر تک جا کر ایک ہاتھ ان کا پکڑا اور گردن موڑ کر ماں کو کہا، "ہم دریا کے کنارے سیر کو جا رہے ہیں، کھانے کے وقت تک لوٹ آئیں گے اور تم سب بھی تو سیر کر آؤ۔" میں نے گردن موڑ کر اماں کو اجازت طلب نظروں سے دیکھا، انھوں نے سر سے اشارا کر دیا گویا اجازت دے رہی ہیں۔

جب ہم ریسٹ ہاؤس سے ڈھلان پر اترنے لگے تو مالی بھاگا ہوا آیا، "بہت نیچے زیادہ نہ جائیے گا، آج کل کئی چیتوں کے جوڑے اس علاقے میں گھسے ہوئے ہیں۔" مولوی صاحب بولے، "یہ تو بہت اچھا ہے ان سے بھی ملاقات ہو جائے گی پھر جانے کبھی یہاں آنا ہو بھی یا نہیں۔" اور تیز تیز قدم بڑھاتے باغوں میں سے گزرنے لگے۔ سامنے جب لہلہاتے ہوئے کھیت اور بل کھاتا ہوا دریا احساس میں تیرتے ہوئے آنکھوں پر سے نظر آئے تو بہت خوش ہوئے۔ بلا تکلف مجھ سے باتیں کرتے جاتے۔ "اگر چیتا سامنے آ گیا تو تم ڈر کر کیا کرو گی؟" میں نے جواب دیا، "میں کیوں ڈروں گی۔ چیتے تو ہزار بار میں نے بھاگتے ہوئے دیکھے ہیں۔ ہاں شیر کی اور بات ہے، جب وہ دھاڑتا ہے تو اس کی آواز سے ڈر کر پتے کی طرح کانپ اٹھتی ہوں۔ ہمارے والد، ماموں اور بھائیوں کو شکار کا بے حد شوق تھا۔ کئی بار والد کی پوسٹنگ ہمالیہ کی ترائی والے ضلعوں میں ہو چکی تھی۔ بچپن سے ان کے ساتھ شکار پر جاتے۔ شیر کے شکار میں پیڑوں پر بنے مچانوں پر بیٹھتے، گو وہ شیر کی گرفت سے بہت اونچی ہوتیں، لیکن جب بھی شیر کی چنگھاڑ سنتی سارا جسم کانپ اٹھتا تھا۔ شکار کے چکر میں والد کی ایک ٹانگ شیر کی نذر ہو چکی تھی۔ ایک بھائی کے ہاتھ پر گولی لگ چکی تھی مگر ان کا شوق اسی طرح رہا اور ہماری والدہ بھی ان حادثوں سے ڈریں۔ اکثر جب والد ہم سب کو اپنے ساتھ لے جاتے تو وہ خود بھی جاتیں۔

اب میری باری تھی کہ مولوی صاحب کو ذرا غور سے دیکھا جائے۔ میرے ایک ہاتھ کو مولوی صاحب بڑی آہستگی سے پکڑے ہوئے تھے اور دوسرے ہاتھ کو اختر بہت مضبوطی سے۔ ایک ٹہل رہے تھے اور دوسرے خاموش۔ میں نے ایک منٹ کے لیے قدم روک لیے تو لامحالہ دونوں کو رکنا پڑا۔ میں مولوی صاحب کی طرف گردن موڑ کر ان کی آنکھوں کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ ان کی نظریں میری اس جسارت پر حیران ہو کر پھر کو مجھے غور سے دیکھنے لگیں۔ ساتھ ہی ماتھے پر دو بل بھی نمودار ہوئے۔ کتنی صاف شفاف اور محبت شفقت سے لبریز نگاہیں تھیں۔ نظر جھکا کر وہ بھی میری طرف دیکھنے لگے۔ ان کی نگاہ کی گہرائی کا احساس ہوا کہ جیسے یہ مجھے پڑھ رہے ہیں۔ مجھے تو یوں لگا جیسے میرا ایکسرے لیا انھوں نے۔ اس عمر

ہر کیسی روشن اور موتی جیسی چمک۔ ہلکا سا مسکرائے بولے "بس دیکھ لیا۔ کیا لگا میں تم کو ہٹا تو نہیں ہوں؟" میرا جواب تھا "نہیں ایسی کوئی بات نہیں، مجھے تو لگا کہ آپ کی شفقت بھی ملے گی اور دوستی بھی؟" خوب ہنسے کہا "بھئی اختر یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ وہ کی بولنا جانتی ہے اور نہ ہم سے ڈرتی ہے اور نہ جھجکتی ہے؟" اب اختر مجھ سے مخاطب ہو کر بولے "آپ کسی خوش فہمی میں نہ رہیے گا۔ یہ حضرت گھڑی میں مہربان اور پل میں قہربان ہو جاتے ہیں؟" پھر کچھ شکار کی باتیں شروع کر دیں اور اختر سے کہنے لگے "کیا خیال ہے اگر ہم یہاں کالپی میں اس دریا کے کنارے ایک زمین خرید کر چھوٹا سا کاٹیج بنا لیں۔ سال میں ایک بار ایک دو ماہ یہاں آکر رہا کریں۔ اور تنگ آباد کا حسن انسانوں کے ہاتھ کی سجاوٹ کے ساتھ ہے اور یہاں حسن صرف قدرت کی کرشمہ گری ہے؟" ایک کھیت میں سے لوٹتے ہوئے ایک بڑا سا برگد کا پیڑ تھا جس کی جڑ کے ساتھ ایک پکا چبوترا اور اس پر ایک مورتی بیٹھی ہوئی تھی، کچھ دیے جو کبھی جلائے گئے ہوں گے رکھے تھے۔ ادھر ادھر کچھ سپید اور سوکھے گیندے کے پھول بکھرے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب یہاں رک گئے اور جھک جھک کر حیدرآبادی طریقے کی سلام کیے۔ اختر نے کہا "حضرت مولوی صاحب دیوی کو سلام نہیں نمسکار کی جاتی ہے؟" ہنسے اور بولے "جناب میں تو زبان بے زبانی" سے (اختر کا یہ پہلا افسانہ میں نے پڑھا اور پڑھ کر اس کا اثر ہوا) اور سچ تو یہ ہے کہ اس افسانے ہی نے ہم دونوں کو یکجا کر دیا) بولد کو سلام کر رہا تھا جس کے طفیل ہم کو ایک بیٹی بھی مل گئی۔ اچھا اب تم دونوں دریا کے کنارے تک سیر کر آؤ۔ میں تو چبوترے پر لیٹ کر لطف اٹھاؤں گا۔

مجھے اب مولوی صاحب ذرا بھی اجنبی انسان نہ لگے اور نہ ان سے ڈر لگا جیسے ہمیشہ سے ان کو جانتی ہوں۔ میں نے کہا۔ "جی نہیں، ہم آپ کو اکیلے چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔ آپ کے ہاتھ میں تو چھڑی ہے۔ کوئی چیتا آ گیا تو آپ اس کو چھڑی سے ماریں گے اور وہ ہم پر پل پڑے گا؟" خوب ہنسے اور بولے "پھر تم دونوں بھی دس منٹ یہاں بیٹھ جاؤ پھر واپس چل پڑیں گے۔ ورنہ قلعہ عمر کے سپاہی ہماری تلاش میں نکل پڑیں گے؟" کچھ دیر بعد ہماری واپسی شروع ہو گئی۔

لان پر بڑی سی لال اور نیلی دھاری کی دری بچھی ہوئی تھی۔ اس کے درمیان ایک سفید براق دسترخوان، سلیقے سے برتن اور گلاس رکھے ہوئے، درمیان میں اچار چٹنیاں چھوٹی چھوٹی کٹوریوں میں، اور بڑے بڑے تھالوں میں ملے جلے پھل۔ جیسے ہم تینوں کے انتظار میں سب لوگ تھے۔ فوراً ہی تو کھانا لگنا شروع ہو گیا۔ مولوی صاحب ان کے پاس بیٹھے "کالپی" کی خوب صورتی کی باتیں کرنے کے بعد اردو کے متعلق باتیں کرنے لگے کہ "اوری" ضلع میں جو اسکول ہیں ان میں کتنوں میں اردو زبان ہے؟ کتنوں میں ہندی؟ ان کی معلومات رکھنا ہر مسلمان افسر کا فرض ہے۔ میرے والد ایک باخبر انسان تھے تفصیل سے ان کو بتایا تو مولوی صاحب نے بڑے افسوس کے لہجے میں کہا۔ جب اس ضلع کی مسلمان آبادی زیادہ ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہر اسکول میں ہندی کے ساتھ "اردو" شامل نہ ہو۔ تمہاری یہ لائبریری بھی مگر اپنے اثر و رسوخ سے گورنمنٹ کی توجہ دلانے کے لیے کوشاں ہو جانا چاہیے۔ یہ ہر شخص کا فرض ہے۔ وقت تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ غفلت برتنا تباہی کے غار میں گرنے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ پھر بہت سارے ان لوگوں کے بارے میں دریافت کیا جن کے ادب یا کے مشترک جاننے والے اور دوست تھے۔ آخر میں پوچھا کہ پھر ان یوسف الزماں[1] کی بیٹیوں کا کیا بنا جن کو وہ خدا کو پیارے ہوتے

---

[1] یوسف الزماں لکھنؤ کے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے (خلیق الزماں کے سب سے چھوٹے بھائی)

وقت تمہارے سپرد کر گئے تھے۔ ہم سب بہن کے کان کھڑے ہوگئے کہ مسز یوسف اور ان کی باجی سے ہم سب کا واسطہ پڑتا تھا اور لندن میں ہمارے زاہد عمر بھائی کا مسز یوسف سے اسی وقت، جب وہ لندن میں پڑھنے گئے۔ مسز و ... ان صاحب کے گھر رہے تھے وہاں پہنچنے کے بعد سے ان کا ہر خط مسز یوسف کے لاڈ اور سلوک کے تذکروں سے بھرا ہوتا تھا۔ یہ ایک بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ وقت میرے پاس کم ہے اس کو لکھنے بیٹھ گئی تو اصل کہانی شاید ادھوری ہی رہ جائے گی۔

ہاں تو شام کی چائے پی کر کالج سے واپسی ہوئی۔ سات کو ٹرین کی گاڑی سے حیدرآباد روانہ ہونا تھا۔ اب شدت سے احساس ہوا کہ ارے میں تو سب سے ہزاروں میل دور جا رہی ہوں۔ بار بار رونا آتا۔ امی آپا کے کمرے میں گئی رونا شروع کر دیا وہ بستر پر ہر وقت لیٹی رہتی تھیں۔ اٹھ کر بیٹھ گئیں اور بہت ہنس کر پیار سے کہا بے وقوف لڑکی یہ کوئی رونے کی بات ہے تم تو اب اپنے نئے گھر جا رہی ہو۔ جاؤ اختر کو تو بلا کر لے آؤ۔ میں بھی تو ذرا ان سے ملوں۔ آنسو پونچھ کر بھائی جان سے کہا، اختر کو بلا دیں کہ وہ آپا کو سلام کر لیں۔ آپ کو تو خود یہ خیال آنا چاہیے تھا کہ اختر ان کے پاس لے جا کر ملاتے۔ واقعی وہ بہت شرمندہ سے ہو کر رہ گئے۔ اختر، مولوی صاحب کے پاس بیٹھے تھے، بلا لائے اور مجھ سے کہا جاؤ اب تم خود ہی اختر کو ان سے ملوا دو۔ اندر کے کئی کمرے پار کر کے پیچھے کے برآمدے میں اختر کو لائی اور اس کے کونے والے چھوٹے کمرے میں لے گئی۔ آپا ایک ہاتھ کو اپنی ٹھوڑی پر رکھے ہوئے بیٹھی ہوئی تھیں۔ لیمپ کی روشنی ان کے چہرے پر سب سے زیادہ پڑ رہی تھی۔ کس قدر رعب دار صورت لگ رہی تھیں۔ بے حد صاف رنگ، بہت تیکھے نقوش، سیاہ لمبے بال، ان کی بڑی بڑی آنکھیں اور چہرہ کا رنگ تمتماہٹ سے دمک رہا تھا، ایسا ہوتا ہی ٹی۔ بی کے مریض کو شام سے ہی بخار چڑھ جاتا ہے۔ قدموں کی چاپ سن کر چہرہ دروازے کی طرف موڑا، مسکرائیں اور بولیں "آئیے، میاں اختر آئیے، اس کرسی کو ذرا لیمپ کی طرف کھینچ کر دو گھڑی بیٹھ جائیں کہ میں اچھی طرح آپ کو دیکھ سکوں۔ برسوں سے لڑکیوں کی زبانی مزے مزے کی باتیں آپ سب کی سنتی رہی ہوں۔ بڑا اشتیاق تھا آپ کو قریب سے دیکھنے اور کچھ باتیں کرنے کا۔ قدرت کی ستم ظریفی پر ہنسی سی آتی ہے کہ جو ہماری بہن سب سے زیادہ بدھو ہے وہ آپ جیسے علم کے رسیا کے پلے پڑ رہی ہے۔ شاید اللہ میاں توازن کو ایسے ہی طریقوں سے قائم رکھتے ہیں۔

اختر کی نظریں ان کے چہرے پر یوں جمی ہوئی تھیں۔ جیسے یہ مرقع چغتائی کو ہمیشہ کے لیے اپنے ذہن کے کینوس پر چھاپ رہے ہیں۔ اختر کے بھرے وجود پر مجھے یوں لگا کہ جیسے غم کا سایہ پھیل گیا ہو۔ پھر بولیں "ہماری یہ بہن ایسی ہے کہ کچھ نے کا سب کچھ دے کر واپس مانگنا نہیں جانتی۔ اس کا آپ اگر تھوڑا سا بھی خیال رکھیں گے اور بڑی کنجوسی سے محبت دے سکے تو خود آپ عمر بھر بہت کچھ اس سے حاصل کریں گے۔ میری ایک ہی نصیحت دونوں کے لیے ہے کہ خوش رہیں اور خوش رکھیں، دو دن اس زندگی میں دعا ہی کیا ہے۔" ہم دونوں کو اپنے پاس بلا کر اپنا نازک لمبی لمبی انگلیوں والا ہاتھ پھیرا۔ "خدا تم دونوں کا حافظ ہے۔ اچھا اب جاؤ" میں رو پڑی تو ذرا ڈپٹ کر بولیں "یہ بودا پن نہ اماں کو پسند ہے نہ مجھے۔ ہاں وہ سامنے سونے کی گھڑی تمہارے لیے تیار کر کے رکھی ہے اٹھا لو وہ سرہانے رکھی ہے تم کو وہ سونے کی ملے گی نہ بٹن دبا کر۔ اس گھڑی کی یہ تاریخ ہے کہ اماں کی نانی کی تھی۔ بیٹیوں کو ملتی رہی۔ اسی طرح تم بھی کسی بیٹی کو دے دینا۔ سوچو کہ یہ چار پشتوں کے ہاتھوں سے گزر کر تم کو مل رہی ہے۔ بھلا بتاؤ کہ اس کی عمر کتنی ہو چکی ہے" میں وہ گھڑی ہاتھ میں اٹھا کر ان کو مڑ مڑ کر دیکھتی اختر کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آئی۔ بولے "تمہاری یہ بہن کتنی خوش شکل ہے" مجھے ایسا لگا کہ مرقع چغتائی سے کوئی تصویر

گلے لگ کر پلنگ پر بیٹھ گئی تھیں اور میں گہری سی سانس بھی لی۔ اختر نے اپنی اتنی کم عمری کے باوجود دنیا بہت دیکھ لی تھی۔ شاید وہ سمجھ گئے کہ ان کی زندگی کی شمع بس بجھنے والی ہے۔ میں ان کے اتنے پاس رہ کر بہن ہو کر بھی نہ سمجھ سکی۔

اسٹیشن کے لیے روانگی کا وقت آ چکا تھا۔ سامان اسٹیشن پہلے ہی بھیج دیا گیا تھا۔ میں ایک ایک سے مل کر رونے لگی تو اختر خود بھی رو پڑے۔

اماں نے مجھے ذرا سا پرے ہٹا کر میرا چہرہ اونچا کر کے کہا "آنسو تو بہاؤ نہیں مجھے یہ بہت ناپسند ہیں۔ حمیدہ یہ یاد رکھنا گھر اینٹ پتھر سے نہیں بنا کرتے۔ بلکہ دل میں بنتے ہیں۔ کبھی دل و دماغ میں اختر کا اپنے بھائیوں سے مقابلہ نہ کرنا۔ نہ کبھی اپنے ابا کے گھر سے ان کے گھر کا مقابلہ کرنا۔ تمہارے ابا اپنی زندگی کے آخری سرے پر آ گئے ہیں اور اختر زندگی شروع کر رہے ہیں۔ کبھی کسی کا زیور، مانگے کے کپڑے پہننا اور نہ ادھار پر گھر چلانا۔ جو روپے تم کو گھر کے خرچ کے لیے دیے جائیں اس کا حساب ہر روز لکھنا۔ اس کو یوں سمجھنا کہ یہ امانت تمہارے ہاتھ میں دی گئی ہے۔ مولوی صاحب کا ادب اپنے ابا کی طرح کرنا اور اس کوشش میں لگی رہنا کہ اختر اپنے والد سے مل جائیں۔ تب ہی تم میری بیٹی ہو گی۔ اچھا اب تم سوار ہو۔" جس طرح انھوں نے یہ باتیں کیں، مگر ان کی آواز یا آنکھوں سے مجھے یہ معلوم نہ ہونے پایا کہ غمگین ہو رہی ہیں تو لا محالہ مجھے اپنے کمزور دل سے باندھنا پڑا۔ ابا نے دو قدم آگے بڑھ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا، خدا حافظ کہا اور اپنے کمرے کے اندر چلے گئے۔

بھائی جان، چچا ابا، چھوٹے بہن بھائی اور بہت سے رشتے دار اسٹیشن پر ہم کو سوار کرانے آئے۔ ریل کھڑی ہوئی تھی۔ جو ڈبہ مولوی صاحب حیدرآباد سے رزرویشن کروا چکے تھے، اس میں سامان رکھا جا چکا تھا۔ یہ چار سیٹ والا کوپے نہ تھا بلکہ چھ سیٹ والا تھا۔ ایک بنگالی صاحب ان کی بیگم مع دو عدد بچوں کے پہلے سے موجود تھے۔ مولوی صاحب کا مزاج ایک دم بگڑ گیا۔ "میں نے تو چار برتھ کا کوپے بک کروایا تھا۔ خیر ہم خود ہی راستے میں ان صاحب اور ریلوے سے نمٹ لیں گے۔"

ہم تینوں ڈبے میں چڑھے۔ ریل نے سیٹی بجائی، گارڈ نے جھنڈی دکھائی اور ریل چل پڑی۔ نیچے کی تین سیٹیں ہماری تھیں۔ ایک پر دو بنگالی بچے اور اوپر کی دو سیٹوں پر ان کے والدین بستر بچھائے براجمان تھے۔ اختر کا موڈ بھی ان کی موجودگی سے خراب سا ہو گیا۔ ریل نے جب اسپیڈ پکڑی تو مولوی صاحب نے اختر کے کان میں آ کر کچھ کہا۔ اختر ہنس کر بولے "بہت خوب بہت خوب۔" ہم دونوں ایک سیٹ پر پاس پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب ایک اخبار لے کر سیٹ پر لیٹ گئے۔ میں نے اختر سے پوچھا "مولوی صاحب نے آپ کے کان میں کیا کہا تھا۔" "چلیے اور کیا، کچھ دیر میں خود دیکھ لینا۔" میں نے گھبرا کر پوچھا "کہ وہ ان بچوں کو کہیں باہر نہ پھینک دیں۔ کہہ تو رہے تھے کہ ہم خود نمٹ لیں گے۔" "نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں کریں گے۔" میں تو چونکی ہوں، سمجھی کہ اب یہ کیا کرنے والے ہیں۔ کہ اتنے میں دونوں بچے زور زور سے چیخنے اور بنگالی میں کچھ کہنے لگے۔ میں اور مولوی صاحب بنگالی نہ سمجھ سکے۔ اختر سمجھ گئے اور خوب زور سے ہنسے۔ میں نے بہت پوچھا، کچھ بتائیں یہ کیا ہوا۔ بولے کچھ بھی تو نہیں، بھوکے بنگالی کھائیں بھر بھر تھالی، اور پھر بھی خوب روتے اور ڈرتے ہیں۔ میں بچوں کی طرف دیکھ رہی تھی کہ پھر ان کا زور سے ڈر کر رونا اور بنگالی میں کہنا۔ اب بنگالی بابو نے مولوی صاحب سے مخاطب ہو کر بگڑ کر اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا "مولانا صاحب آپ بچوں کو ڈرا کیوں رہا ہے؟" مولوی صاحب جھٹ بول اٹھے "ہمارا تو منہ ہی ایسا ہے" اور منہ ٹیڑھا کر کے دونوں ہاتھوں سے چوچ بنا کر بجانے لگے۔ بچے پھر چلا کر رو دیے۔ اب ان کی نظروں

اختر کی طرف نہیں۔ میں نے جلدی سے گردن موڑ کر اختر کی طرف دیکھا تو وہ بھی ٹیڑھا منہ کیے، ہاتھوں کی چڑیا بنائے ان کو سناسٹ گھما رہے تھے۔ میں ڈر کر ذرا پرے کو سرک گئی اور پوچھا الٰہی خیر یہ آپ دونوں کر کیا رہے ہیں۔ تو کہا ان حضرات سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش۔ اوپر سے بنگالی بابو اٹھ کر بیٹھ گئے اور بولے "تم دونوں صاحب پاگل ہے کیا؟" بولے "تو اور کیا پاگل تو ہے ہم، تم نے باہر لکھا پڑھا نہیں کہ اس ڈبے میں دو پاگل بھی سفر کر رہا ہے؟" بنگالی بابو نے بیوی سے کچھ کہا۔ دونوں نے جلدی جلدی اپنے بستر لپیٹ لیے۔ نیچے اترے۔ بچوں کے بستر تک جا کر ایک بستر بند میں باندھ دیا اور بیچ سیٹ کے رکھے ہوئے دو ٹین کے بکسے کھینچ کر دروازے کے قریب لگا کر پیٹھ ہماری طرف کر کے بچوں کو گود میں دبکا کر آنے والے اسٹیشن کا انتظار کرنے لگے۔ اب مولوی صاحب کسی کسی وقت ہولناک آوازیں نکالنے لگے۔ بچے چیخ کر ماں باپ سے بندروں کی طرح چپک جاتے اور ایسا لگتا جیسے ڈر کر لرز رہے ہیں۔ ماں باپ بھی پاگلوں کے خوف سے کانپ کانپ اٹھتے۔ میں حق دق یہ حادثات دیکھ رہی تھی اور خود بھی ہنسی ہو رہی تھی۔ گو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ ان سب کو ڈبے سے بھگانے کے لیے یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے۔ آخر اسٹیشن آیا۔ ریل رکی اور یہ بڑی جلدی سے نیچے اتر گئے تو مولوی صاحب کے قہقہے اس قدر زوردار تھے کہ ڈبہ گونج اٹھا۔ کہتے جاتے "پاگل بن جانے میں کس قدر مزا آیا، ورنہ حیدرآباد تک ان کا ساتھ سچ مچ ہم کو پاگل بنا دیتا۔"

اب مولوی صاحب اطمینان کا سانس لے کر اپنی سیٹ پر دراز ہو گئے۔ کہنے لگے "اس وقت تو حقہ بہت یاد آ رہا ہے" شاید حقے کی تمنا کو تصور کر رہے ہوں گے مگر ناک میں کسی اور قسم کی خوشبو کو محسوس کرتے ہوئے ناک کو چڑھا، بھنویں سکیڑ، نظریں مجھ پر جما کر پوچھتے ہیں "یہ کھانے جیسی خوشبو کہاں سے آ رہی ہے۔" میں نے بتا دیا کہ اماں نے کل کے لیے کچھ کھانا ساتھ کیا ہے۔ پتیلیاں سیٹ کے نیچے رکھی ہیں۔ ایسے جھٹکے سے اٹھے جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ بولے اب اس سے بھی چھٹکارا حاصل کر لیں۔ جیسے ہی ریل ہلکی ہوئی جلدی جلدی پتیلیاں گھسیٹ کر دروازے کے پاس کر لیں۔ ریل رکی تو یہ آواز بلند پکارنے لگے "کسی کو کھانا چاہیے۔" کوئی نہیں آیا تو ایک قلی سے کہا کہ جلدی سے یہ سامان اتار دو۔ جب تینوں پتیلیاں اتار لی گئیں تو جھٹ سے دروازے کی کنڈی لگا کر کھڑکی میں سے کہا "جاؤ یہ گھر لے جاؤ۔ موج کرو۔"

اسٹیشن چھوٹا سا تھا۔ ریل زنّاٹے بھرتی ہوئی چل پڑی۔ میں نے دل میں شکر کیا کہ اگر مجھے اتار دیتے تو میں کیا کر لیتی۔ دل پھر سہم گیا کہ آخر یہ لوگ ایسے کیوں ہیں۔ پھر ایک خیال دل میں آیا کہ شاید یہ سوچ کر آئے ہوں کہ اگر یہ کوشش روز اول ہو مجھے اچھی طرح سمجھا رہے ہیں کہ سوچ لو ابھی ہم یوں بھی کر سکتے ہیں۔ میں نے فوراً ہی تو سوچ لیا کہ اگر میں ان دونوں سے بھی اور ڈری تو زندگی حرام ہو جائے گی۔ اس لیے مجھے ڈٹ کر پہلے پردہ ہٹانا ہی پڑے گا۔ میں جا کر اپنی سیٹ پر لیٹ گئی۔ تب سے جدائی کا احساس اجاگر ہوا اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اختر نے ہاتھ بڑھا کر میری طرف کی لائٹ بند کر دی۔ مولوی صاحب کے پاس ان کی سیٹ پر بیٹھ گئے "پیکس کانفرنس میں مدراس جانا ہے" اس کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ میں یہ سوچتے ہوئے سو گئی کہ پھر میرا کیا ہے "؟"

صبح کو پہلے خود سے اٹھنے کا سوال ہمارے طرز تھا۔ جب تک کوئی جھنجھوڑ کر نہ اٹھا دے۔ صبح پانچ بجے مولوی صاحب خود اٹھ گئے ہوں گے اور اختر کو آواز دے کر اٹھایا ہوگا یا وہ خود ہی جاگ گئے ہوں گے۔ دونوں بے چین ہو کر

آوازوں پر آوازے لگاتے رہے بھلا مجھ پر کیا اثر ہو سکتا تھا۔ آٹھ بجے بیرا ناشتے کی ٹرے دے گیا ہوگا اب تو نو بجے گزرتے مولوی صاحب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ دونوں ناشتہ کر چکے۔ میری چائے ٹھنڈی پانی جیسی ہوگئی۔ دونوں میں سے کسی میں یہ ہمت نہ تھی کہ ہاتھ سے جھنجھوڑ دیں۔ آخر مولوی صاحب کو ترکیب سوجھ گئی، وہ دور کھڑے ہو کر اپنی چھڑی سے میرے تلوؤں کو کونچنے لگے۔ میں گھبرا کر اٹھی اور ایک منٹ کے لیے یہ بھول گئی کہ میں ہوں کہاں اور یہ ہو کیا رہا ہے؟ نیند سے بوجھل آنکھیں ہاتھ سے مل کر کھولیں تو دیکھا کہ مولوی صاحب بھرے اپنی سیٹ پر چھڑی سمیت لیٹ گئے۔ بولے "یوں نہیں کام چلے گا کہ تم نو نو بجے تک سوتی رہیں، ہمارے گھر میں سب پانچ بجے اٹھ جاتے ہیں۔ سو سو کر سارا سفر گنوا دیا۔ بھوپال کی پہاڑیوں کے پیچھے سورج خان کس شان سے نکل رہے تھے۔" میں سمجھی کسی صاحب کا ذکر کر رہے ہیں۔ "جی" کہہ کر چپ ہوگئی۔ "اچھا اب جلدی سے اٹھ کر ٹھنڈا ناشتہ کرو اور ٹھنڈی چائے پیو۔"

اب دن کی جھلملاتی روشنی میں دو انجان مردوں سے دوبدو سارے دن سامنا کرنا ہے۔ خطوط اور افسانوں والے اختر کو تو خوب جانتی تھی مگر ان صاحب کو نہ جاننے کے برابر تھا اور یہ مولوی صاحب سارے دن اتنے قریب بیٹھ کر جانے کیا کیا فقرے بازی کریں گے۔ اختر سے شک مجھے بہت سی باتیں پوچھنا تھیں کہ مجھے ان کے گھر جا کر کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں؟ مگر وہ تو اب اجنبی پن کا اظہار کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ جیسے میرا وجود ان کے لیے کوئی معنی نہ رکھتا ہو۔ اخبار پڑھ رہے ہیں۔ مولوی صاحب سے سیاست پر باتیں ہو رہی ہیں۔ گھوم پھر کر ڈکشنری پر تان ٹوٹتی۔ ناشتہ کر کے میں نے بھی ایک اخبار ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اب تک اخبار پڑھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی کہ ہم سے مطلب کہ سارے جہان میں کیا ہو رہا ہے۔ پھر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ اختر کہنے لگے آپ نے ٹھیک ہی کیا کہ اخبار رکھ دیا کیوں کہ پڑھتیں تو کچھ نہ پڑھا ہوتا۔ یہاں ہرے بھرے کھیت دیکھیے۔ کہیں کہیں ہرن بھاگتے بھی نظر آئیں گے تو شکار یاد آئے گا اور بھی بہت کچھ۔

مولوی صاحب کو جیسے کچھ یاد سا آگیا۔ "ہاں یہ تو بتاؤ کہ تمہارے ابا اور بھائی لوگ ان معصوم حسین جانوروں کے پیچھے کیوں لگے رہتے ہیں۔ ان بیچاروں نے آخر ان کا کیا بگاڑا ہے؟" "یہ بات تو آپ کو انہی سے پوچھنا تھی" بس پھر مسکرا کر چپ ہوگئے۔

آخر دن گزر ہی گیا۔ ہر بڑے اسٹیشن پر مولوی صاحب کے ملنے والے جن کو اطلاع دی جا چکی تھی ملنے آتے اور ڈھیر ڈھیر پھولوں کے ہار جمع ہوگئے تو مجھے اپنی اماں کے وجود کی خوشبو سی آتی محسوس ہونے لگی۔ ان کو بیلے چنبیلی کا بے حد شوق تھا۔ ڈھیر سارے پھول وہ اپنی کپڑوں کی الماری کے ہر خانے میں ڈال دیا کرتیں۔ پھر رات آگئی اور خیر سے گزر گئی۔ صبح نو بجے حیدرآباد اسٹیشن پر گاڑی رکی۔ شکر کیا کہ یہ ایک مرحلہ بخوبی طے ہوگیا۔ اسٹیشن پر مولوی صاحب اور اختر کے بہت سے دوست چنبیلی اور بیلے کے موٹے موٹے ہار اور گلدستے اور کیمرے لیے کھڑے تھے۔ نیچے اترے، اپنے حصے کے ہار تو میں پہن چکی تھی، اختر نے لینے والے اور مولوی صاحب کے بھی میرے گلے میں ڈال دیے۔ نظر جھکی جا رہی تھی اور بچی نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ شاید اب کوئی خاتون نظر آجائیں مگر اس کا کیا سوال تھا۔ اسٹیشن سے باہر آئے ایک موٹر پھولوں سے سجی کھڑی تھی اس میں بیٹھ کر روانہ ہوگئے۔ رستے میں پھلوں کی دکانوں پر جو نظر پڑی تو کیا ہی بڑے بڑے خربوزے دکھائی دیے۔ میری جان شریفے پر جاتی تھی۔ دل کرے کہ موٹر رکوا کر کچھ خرید لوں، مگر یہ ممکن نہ تھا۔

(افکار، نومبر ۹۳ء)

۵

لیجیے ہم آ گئے! پہنچ گئے۔ نادرہ منزل۔ ایک پہاڑی ٹاٹنگی پر دور سے دکھائی دی۔ اختر نے ادھر اشارہ کر کے بتایا کہ وہ رہی "نادرہ منزل"۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ گھبراہٹ اور وحشت سی شروع ہو گئی۔ آج سال کا پہلا دن یعنی ۱۹۵۱ء نیا گھر، زندگی کا نیا دن اور نئے لوگ! موٹر پھاٹک کے اندر داخل ہوئی اور سیدھے ہاتھ پر بہت بڑے لان کے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ الٹے ہاتھ کی طرف گھنے پیڑ اور ساتھ ہی ڈھلان کا سلسلہ شروع ہوتا تھا جس پر بڑی گنجان جھاڑیاں تھیں۔ لان کے ایک طرف ایک بہت ہی اونچا اور ایک ہی پیڑ تھا اور وہ بھی "برگد" کا! جس کے چاروں طرف بہت ہی اونچا اور چوڑا چڑیوں کے لیے پنجرہ تھا جو کہ چار حصوں میں تقسیم کر کے چار طرح کی خوب صورت رنگا رنگ چڑیاں اڑ رہی تھیں اور کچھ بیٹھی ہوئی چہچہا رہی تھیں۔ لان اور کوٹھی کے درمیان پورچ تھا جس میں موٹر جا کر رک گئی۔ برآمدے میں چار ملازم ہاتھوں میں ہار لیے۔ ادب کھڑے تھے۔ ہم تینوں اترے۔ انھوں نے سلام کرنے کے بعد میرے اور اختر کے گلے میں ہار ڈالے مولوی صاحب بڑی شفقت سے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر برآمدے سے گزر کر ڈرائنگ روم میں لائے۔ اس کے بعد ہم بہت بڑے ہال سے ہوتے ہوئے ایک چھوٹے کمرے میں سے گزرے جہاں لکھنے کی میز اور دو کتابوں کی الماریاں تھیں جن میں موٹی موٹی ڈکشنریز نظر آئیں تو سوچا شاید مولوی صاحب کا اپنا دفتر ہوگا۔ "لو بیٹے چلو اب گھر میں چلو، ادھر سب دفتر اور مہمان خانہ ہے۔"

اب ہم ایک بہت بڑے چوڑے اور لمبے برآمدے میں داخل ہوئے۔ اس کے ایک کونے والے کمرے کے قریب ایک چھوٹی سی میز اور چار کھانے کی کرسیاں رکھی تھیں۔ تھوڑے فاصلے پر چند مونڈھے۔ ایک آرام دہ لمبی کرسی۔ قریب ہی ایک عجیب قسم کا حقہ۔ ایک چمکدار تھال میں رکھا ہوا۔ اس حقے کو دیکھ کر یوں لگا جیسے کسی بہت لمبے سانپ نے چاروں طرف کنڈلی ڈال رکھی ہو۔ چاندی کی منہ نال لگی ہوئی تھی۔ برآمدے کی دو سیڑھیاں اتر کر ایک جیسی نٹ چوڑی جگہ پر سرخ بجری پڑی تھی۔ اس کے ساتھ ہی سلامی لیے ہوئے ڈھلان شروع ہو گئی۔ اس جگہ ہری ہری گھاس پھر چھوٹی چھوٹی پھولوں کی کیاریاں، جن میں پھول کھلے ہوئے تھے۔ اس کے آگے پھر سپاٹ بہت بڑی جگہ تھی اور آگے پھر ڈھلان شروع

ہو جاتی جو بہت گھنی سبز جھاڑیوں سے یوں ڈھکی ہوئی جیسے کسی جنگل کا حصہ ہو۔ بیچ بیچ میں اکا دکا گھنے درخت تنے کھڑے تھے۔ میں چند منٹ رک کر ادھر دیکھتی اور سوچنے لگی کہ مولوی صاحب کا ذوق بہت اچھا ہے۔ اختر نے کہا۔ "چلیں اپنا کمرہ دیکھ لیں۔ نہا دھو لیں" میں نے کہا "پہلے میں مولوی صاحب کا کمرہ تو دیکھ لوں" جو برآمدے کے ایک سرے پر تھا اور دوسری طرف ہمارا۔ مولوی صاحب کا کمرہ نہ بہت بڑا نہ چھوٹا اس کے ساتھ ایک ڈریسنگ روم اور غسلخانہ۔ پہلے یہ اختر کو دے رکھا تھا مگر ہماری آنے سے پہلے بڑی ضد کر کے اپنا بڑا سا کمرہ ساتھ ڈریسنگ روم اور غسلخانہ ہم دونوں کے لیے خالی کر کے خود ادھر والے کمرے میں منتقل ہو گئے۔ ان کے کمرے میں دو طرف کتابوں کی الماریاں۔ بیچ میں مسہری کچھ ہٹ کر ایک لکھنے کی میز اور کرسی۔ اس کے ساتھ ہی ایک لوہے کی کیبنٹ۔ اس پر کچھ برتنوں میں خشک میوہ اور چند دوائیں۔ (اختر کی ڈرنگ کے پاس بھی ساری عمر خشک میوے کی بوتلیں رہیں۔ ان میں سے نکال کر بچوں کو اپنے ہاتھ سے پیار سے دیتے تھے۔ بچے سب بڑے ہو گئے تو ان کے بچوں کو دیا کرتے۔)

اب وہ خود تو اپنے کمرے میں رہ گئے۔ اختر مجھے برآمدے میں سے کر چلے تو میری نظر اس چھوٹی میز پر پڑی جو مولوی صاحب کے کمرے کی دیوار سے ملی ہوئی رکھی تھی۔ جس پر چار پانچ طرح چائے کے ڈبے اور ایک سماوار رکھا دیکھا۔ اس میں سے ابلتے پانی کی بھاپ نکلتی دکھائی دی۔ ایک طرف چند پیالیاں اور چائے دان بھی تھا۔ برآمدے کی دوسری طرف ہمارا کمرہ تھا۔ اس کے دو دروازے برآمدے میں کھلتے تھے۔ ایک برآمدے میں، دوسرا باغ کی طرف۔ ان پر چقیں پڑی تھیں۔ کمرہ بڑا کشادہ، دو مسہریاں درمیان میں۔ ادھر کی مسہری کے قریب ایک چھوٹا ڈیسک اور کرسی۔ دوسری طرف دو بڑی کتابوں کی الماریاں کتابوں سے بھری ہوئی۔ ایک پھول دان اس پر رکھا تھا جس میں گلاب کے تازہ سرخ پھول بھی تھے ایک پھول دان ڈیسک پر بھی تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں دو آرام دہ کرسیاں اور سامنے کی میز پر ایک 555 کا سگریٹ کا ٹن اور ایش ٹرے اور ماچس دان۔ سارا فرنیچر عمدہ قسم کی ٹیک کی لکڑی کا، دیکھیں پالش کیا ہوا جھل مل کر رہا تھا۔ ڈریسنگ روم میں دو بڑی بڑی کپڑوں کی الماریاں، ایک سنگھار میز، اس کے سامنے اسٹول۔ کمرے میں نیلے رنگ کا بڑا سا قالین تھا۔ اس میں بھی ایک چھوٹا سرخی رنگ کا قالین۔ ایک طرف کو میرے کیبن ٹرنک اور اختر اور میرے سوٹ کیس ایک پر ایک رکھے ہوئے۔

پہلے اختر نہانے چلے گئے۔ میں نے جلدی جلدی اٹیچی کیس سے سامان نکال کر ڈریسنگ ٹیبل پر لگا دیا۔ سوٹ کیس سے اپنے دونوں تکیے جلدی سے نکال کر اپنے پلنگ پر رکھے اور وہ گدھا سا موٹا روئی کا تکیہ پلنگ کے نیچے چھپا دیا۔ اپنے کپڑے نکال چکی تو اختر نہا کر باہر نکل آئے۔ میں نے اختر کو سفید کرتے پاجامے میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ مجھ سے بال دھلنے کے بعد عجیب سے دکھنے لگے۔ کریسٹ کرا کے اچھے خاصے ہو گئے۔ کن انکھیوں سے اختر کو دیکھتی ہوئی اپنے کپڑے لے غسلخانے میں چلی گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد اختر آوازیں دے رہے تھے "جلدی آیئے چائے تیار ہے۔ مولوی صاحب زیادہ دیر انتظار کرنے کے عادی نہیں۔" بھیگے بال پیچھے کر کے دوپٹہ اوڑھ کر برآمدے میں آئی تو دیکھا پیالیاں میز پر رکھی ہوئی ہیں۔ شکر دان اور دودھ دان بھی۔ اب وہ خود کھڑے ہو کر مختلف ڈبوں میں سے کسی حساب کے ساتھ پتی چائے دان میں ڈال رہے تھے۔ پھر سماوار کی ٹونٹی کھول کر چائے دان میں کھولتا ہوا پانی ڈالا اور میز پر چائے دان رکھ کر ایک چھوٹا سا تو یہ ڈھانک دیا کر جائے کچھ

دیر دم کھائے۔ میں نے نہایت غور سے سب دیکھا کہ شام کی چائے میں دم کر لوں گی۔

مجھے تو گھر میں اماں نے یہ سکھا دیا تھا کہ لڑکی یا کوئی خاتون جب تک چائے پیالیوں میں اس کو ڈالنا چاہیے۔ میں نے ٹیبے ہی ہاتھ کے تولیہ ہٹا کر چائے بنانے کا قصد کیا۔ مولوی صاحب نے اپنی کرخت اور آواز میں کہا "ارے بی یہ یہ کیا کرتی ہو۔ چائے ہم خود بنائیں گے" میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ اب انھوں نے آہستہ سے پہلے ٹی کوزی ہٹا کر مجھ سے پوچھا کہ "تم ہلکی چائے پیتی ہو یا تیز" میرے منہ سے ملائے یہ کیسے نکل گیا کہ "چائے اور چائے جیسی بھی مل جائے"۔ مولوی صاحب ہنس ہنس کر دوہرے ہو گئے۔ اختر بھی ہنس پڑے۔ بس میں تو کھسیانی سی ہو گئی۔ مولوی صاحب چائے بناتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے "لڑکی ہے ہٹ ہی"۔ اچھا چائے کی پیالی ختم کر کے کہا "چلو تم کو ذرا ہمارا دفتر وغیرہ بھی دکھا دیں۔ یہ صرف آج کے لیے تم کو ادھر آنے دیا جا رہا ہے کچھ ہمیشہ کے لیے تمہارا اس طرف داخلہ ممنوع رہے گا۔ آج جمعہ ہے دفتر میں کام نہیں ہو رہا ہے۔" ایک بہت بڑا ہال جس میں چاروں طرف بہت سی اونچی اونچی الماریاں موٹی موٹی کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ہال کے بیچ میں ایک چٹائی بچھی ہوئی جس پر طرح طرح کے رسالے، اخبار رکھے ——— کچھ کرسیاں ادھر ادھر رکھی ہوئی۔ میں نے دل میں سوچا یہ اسی کوٹھی کا اصل ڈرائنگ روم ہوا کرتا ہوگا۔ اب وہ دوسرے قدرے چھوٹے ہال میں لے کر گئے۔ اس میں بھی چاروں طرف الماریاں الماریاں بوسیدہ حال تھیں۔ ان الماریوں پر تالے لگے ہوئے تھے۔ ایک بہت بڑا ڈیسک جس کے دونوں طرف درازیں تھیں ان میں بھی تالے لگے رہتے تھے۔ ایک لمبی پتلی میز پر ویسا ہی سماوار جیسا بڑے کمرے میں تھا۔ کئی قسم کی چائے کے ڈبے، چائے دان، شکر دان رکھا تھا۔ مجھے بتایا کہ ان سب الماریوں میں نہایت قیمتی قلمی نسخے اور بہت انمول قیمتی کتابیں ہیں اور یہ ان کا اپنا آفس ہے۔ میں نے سوچا یہ شاید کبھی کھانے کا کمرہ ہوگا۔ اس کے پیچھے چار پانچ اور کمرے تھے۔ ایک کے پاس سے گزرتے ہوئے کہا یہ آفس حامد حسین کا ہے اور وہ کمرہ پنڈت کیفی کا۔ [illegible] کیا نام لیا اور جب تیسرے کمرے کے سامنے آئے تو اس کا دروازہ نیم باز کھلا ہوا تھا۔ یہاں ایک صندلی پر جانماز بچھی ہوئی تھی اس پر چھوٹا سا ڈیسک۔ ادھر ادھر پیلے پیلے رنگ کے بے ملے کاغذ جیسے ان میں کلف لگا کر کی ہوئی بستر کھلے اور کچھ کیڑے شدہ رکھے ہوئے تھے۔ کاغذوں پر بہت کاٹا پیٹی، لال سبز رنگ کے تعویز کی ہوئی دوات سے بھی نظر آ رہی تھی۔ میں سوچنے لگی کہ یہ صاحب بیٹھ کر کام کرتے ہیں۔ پر اس قدر لکیریں کسی کے ساتھ کچھ دینے کی مشکل اور ہمیں کس طرح گور کے سینے سے کیوں بتاتے ہیں؟ کہ مولوی صاحب نارنگی کے انداز میں بولے "احتشام کا کمرہ کھلا چھوڑ کر لاکھوں بیٹھے دو تین بجے حالت کو خوش دل سے اور دروازہ بند کیا۔" اس نام پر میرے کان کھڑے ہوئے کہ راستے آتے آتے وقت مجھ سے کہا تھا کہ اپنے تمہیں دوستوں کو وہ خط لکھ چکے ہیں اور یہ تینوں میرا خیال ضرور رکھیں گے۔ ان میں سے ایک نام احتشام بھی لیا تھا۔ احتشام کو کر کے بتایا۔ ادھر والے تین کمرے کاتبوں اور پروف ریڈروں کے لیے ہیں۔ کوٹھی کے پچھلے حصے پر باورچی خانہ اور ملازمین کے لیے کوارٹر ہیں۔ اور ہاں کوٹھی کی پشت پر جو کھلا پڑا سا میدان ہے اس میں ملاجی اور ان کے اپنا اکھاڑہ جما رکھا ہے۔ دیکھو کہ بتاؤ کہ تمہاری ساڑی زیادہ اچھی ہے یا ہماری؟" میں بغیر دیکھے ہی بتا سکتی ہوں کہ آپ کی ساڑی زیادہ اچھی ہوگی۔

سے میرے اس خط میں اختر کے ہاں ساڑی پہننے کے متعلق لکھی تھی۔ مولوی صاحب سے انھوں نے اس کا ذکر کیا تو کہا کہ ہم ایک ہندو اور ہندنی پال رہے ہیں۔ ایک ساجد اور ایک ساڑی۔

کہ اس کا راجہ اس کے ساتھ ہے اور میری رانی کی اداس اداس بڑی بڑی آنکھیں اپنے راجہ کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔" خوش ہو کر بولے "یہ بات تو تم سچ کہہ رہی ہو۔"

واپسی کے وقت اختر سے کہا "بہت وقت ضائع ہو چکا بس اب کل سے اوقات میں باقاعدگی ہونا چاہیے۔"
جس کمرے میں سے ہو کر ہم برآمدے میں داخل ہوئے۔ بتایا کہ یہ اختر کا آفس ہے۔ اس کی میز پر بھی کاغذات کا ڈھیر لگا ہوا تھا مگر سب قاعدے سے رکھے ہوئے تھے۔ قریب ہی دو نیچی نیچی الماریوں میں موٹی موٹی کتابیں۔ ذرا غور سے دیکھا تو جیسے کئی اور زبانوں کی ہیں۔ شاید ہندی، بنگلہ وغیرہ کی ہوں۔ کہا "یہاں بھی آپ کی تشریف کا گزر نہیں آ سکتا۔"

برآمدے میں آ کر جب دو لمبی کرسی پر دراز ہو گئے تو محبوب نے حقہ لا کر خاصے فاصلے پر رکھ کر اس کے گرد پیچوان کی نے کو گھمانا شروع کیا۔ یہ کم از کم دو گز لمبی ہوگی۔ دریافت کیا۔ خوب اچھی طرح کئی بار پیچوان کو گرم کیا تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ یہ پیچوان ہے۔ یہ بھی پوچھا گیا۔ "لکھنؤ سے تمباکو کا پارسل آ گیا تھا؟" "جی سرکار۔"

یہ دونوں آپس میں کاپی کی خوب صورتی کا ذکر کرنے لگے۔ پھر ڈکشنری کی بات چیت۔ میرا وجود جیسے بھول گئے ہوں۔ میں اکتا سی گئی اور چپکے سے وہاں سے سرک کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ جلدی جلدی اپنے کپڑے نکال کر الماری میں لگائے۔ کچھ کڑھی ہوئی چیزیں ادھر ادھر بچھائیں۔ سوچا چلو اب اختر کے کپڑے نکال کر ان کی الماری میں رکھ دوں تاکہ یہ سب سوٹ کیس ٹرنک بیچ سے ہٹا دوں۔ ایسا ہی کیا۔ قاعدے سے جوتے کے اسٹینڈ پر اپنے جوتے اور چپلیں رکھنے کے بعد اب اختر کے جوتے رکھ رہی تھی کہ اختر آ گئے۔ میرے ہاتھ میں ان کے جوتے تھے۔ گھبرا کر کہا "ہائیں ہائیں یہ کیا کر رہی ہیں؟" میرے ہاتھ سے جوتے گر گئے۔ میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر بولے "دیکھیے اب کبھی میرے جوتوں کو ہاتھ نہ لگائیے گا۔" گو شادی کے بعد سے دو سال تک ہر روز ان کے جوتے کو اس طور ہاتھ لگایا کہ اختر جوتے کی ڈوری میں ڈبل بو باندھنا نہیں سیکھ پائے۔ میں ماہر استاد ان کا ایک پاؤں کرسی یا اسٹول پر رکھ کر ڈبل بو باندھنا سکھاتی مگر یہ نہ سیکھ پائے۔ ہر بار بڑبڑ کرتے کہ آخر ڈوری اتنی لمبی کیوں بنائی گئی ہے۔ آدھی ڈوری کی شکل سے جوتے میں ٹھونس لیتے۔ آخر کو میں نے تنگ آ کر سکھانا چھوڑ دیا اور ہار مان لی۔

دوپہر کو ہلکا پھلکا کھانا ہوا۔ بعد میں محبوب نے پھل لا کر رکھ دیے۔ سبز اور کتھئی رنگ کے بے حد بڑے بڑے بیر! گویا یہ پھل ہیں۔ مجھے یہ بھی کچھ بہت عجیب سی بات لگی۔ دریافت کیا "دلی سے نواب لوہارو کے باغ سے بیروں کا پارسل آ گیا تھا؟" "جی جناب" چھری سے بیر تراش کر مزے لے کر کھاتے رہے۔ میں نے ہاتھ سے اٹھا کر بیر کھانا شروع کیا۔ کچھ بڑی ناگواری سے میری طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہے ہوں کہ ان کو کھانے کا طریقہ یہ نہیں۔

شام کی چائے پر مولوی صاحب نے خود اپنے ہاتھ سے دم کی اور پیالیوں میں ڈالی۔ میں نے سوچا کل سے میں خود چائے دم کر کے پیالیوں میں ڈال لوں گی۔ یہ تو بہت بری بات ہوگی کہ میری موجودگی میں مولوی صاحب یہ زحمت کریں —— چائے کے بعد اپنے کمرے میں گئے اور اپنی الماری کی ایک دراز کنجی لگا کر کھولی اور ایک گڈی نوٹوں کا نکال کر میرے ہاتھ میں دیا "یہ رکھو کل سے تم بشیر خانساماں کو بتا دو گی کہ کیا پکے اور سب کی تنخواہیں بھی دے دینا۔ میرے فرشتوں کو کیا خبر کہ کس کو کیا دینا ہے۔ اور یہ دونوں کیا کھانا پسند کرتے ہیں۔" بولے "یہ کنجیاں تمہارے ڈریسنگ کے خانوں کی ہیں۔" مطلب یہ کہ میں ان کو [illegible] رکھ لوں۔

کچھ دیر میں ان کا منہ تکتی رہی۔ اختر نے بھی میری مدد کو نہ آئے۔ کھڑے مسکراتے رہے۔ گھر سے میں چل گئی۔ کچھ دیر نوٹوں کو دیکھتی رہی۔ میں نے تو اپنی زندگی میں اتنے ڈھیر سارے نوٹ اپنے ہاتھ میں نہ لیے تھے۔ ایک پریشانی کی کیفیت تھی۔ ایسا لگا جیسے امتحان کا پرچہ سامنے رکھ دیا گیا ہو۔ نوٹ بند کر کے کرسی پر بیٹھ کر سوچنے لگی کہ کل بیگم صاحبہ پوچھیں گی تو سو کو کیا بتانا چاہیے۔ سارے اختر سے پوچھ لوں گی۔ جب ان سے پوچھا تو جواب ملا۔ میں کیا جانوں جو مناسب سمجھنا بتا دینا۔

رات کا کھانا [illegible] ہونے کی بجائے مغرب کے وقت ہی میز پر لگ گیا۔ مجھے اس بات کی حیرت نہ ہوئی کہ یہ وقت تو بچوں کے کھانے کا ہوتا ہے۔ ایسے تو بڑے ہی کھاتے ہیں۔ کھانا کھاتے ہوئے اختر سے عباس کے والد کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ اور میں ظاہر ہے مجھے ساتھ لے جائیں گے۔ اسی فکر میں مجھے اکیلا تو نہ چھوڑیں گے۔ کھانے کے بعد اختر نے کہا۔ موسم بڑا ابر آلود ہے۔ تم دونوں حسین ساگر ہو آؤ۔ ہم دونوں چل دیے۔ جب وہاں پہنچے تو دل خوش ہو گیا۔ کس قدر بڑا تالاب تھا۔ جیسے کوئی جھیل ہو۔ جہاں حسین ساگر ختم ہوتا تھا اس کے بعد تھوڑی بڑی پہاڑیوں کا سلسلہ تین طرف پھیلا لگا جیسے یہ اسی حسین جھیل کو ہاتھ پھیلائے اپنی گود میں لیے ہوئے ہیں۔ چاند نکل چکا تھا۔ پہاڑیوں پر کوٹھیاں ان کی بتیاں یوں لگ رہی تھیں کہ ہزاروں جگنو جگمگ کر رہے ہوں۔ کنارے پر بیٹھے ہی اختر نے کہا، یہ آپ کا جواب بہت ہو گیا مجھ سے تم کر کے بات کیا کرو۔ اور ہاں ایک بات اچھی طرح باندھ لو کہ کبھی مجھ سے میرے خاندان کے متعلق سوال جواب نہ کرنا۔ یہی ایک ایسی لکیر کھینچ دی جس کو مجھے پار کرنے کی اجازت نہیں۔

جیسا بھائی خدا گواہ ہے کہ میں نے ساری عمر ان سے خاندان کے متعلق کچھ نہ پوچھا۔ شادی ہو کر جس دن وہ لکیر جو پہلے دن کھینچی گئی۔ اس کے قریب جا کر تو نہ بھولا نکلا۔ ہاں وہ دو دوست کس کس طرح کچھ [illegible] معلوم کر لیا جس کا بے حد مزا آیا اور [illegible] میں اختر اور ہم دو بچے ہو گئے۔ اس شخص نے بچپن میں [illegible] اللہ [illegible] ساتھ ان کی اپنی والدہ کی طرف سے ملنے والی جائیداد سولہ سال کی عمر میں [illegible] پڑھنے [illegible] بینک میں جمع [illegible] ان کے لیے زیورات اتنے کہ ایک چھوٹے ٹرنک کو ایک مرد مشکل اٹھا سکے۔ شہر میں دو مکان تھے۔ کئی مکانات [illegible] گاؤں بھی لڑکا اپنی سولہ سال کی عمر میں جب یہ سنتا ہے کہ ایک گاؤں اور اس مکان کے علاوہ کچھ نہیں۔ اگر آگے پڑھنا ہے تو خود کماؤ اور اپنے کو پڑھاؤ۔ وہ اب ایک چھوٹے سے شہر [illegible] پورے نکل کر [illegible] میں لگتا جیسے [illegible] شہر [illegible] کی جستجو میں خالی ہاتھ پہنچ کر روزی کماتا ہے اور علم حاصل کرتا ہے۔

ہاں تو پھر بات۔ آئی اور گزر گئی۔ صبح کو یا تو اختر خود اٹھ گئے ہوں گے یا مولوی صاحب نے آواز دی اور ہمیشہ کی طرح سیر کو نکل گئے۔ وہاں سے آ کر تیار ہو جانا۔ پھر ناشتہ کر کے اخبار پڑھ کر دفتر چلے جانا اس گھر کا روز کا معمول تھا اختر ابھی نہانے چلے گئے۔ میں سو رہی ہوتی اور مولوی صاحب کمرے میں جھانک کر دیکھتے۔ [illegible] ناگوار گزری ہو گی۔ اب مجھے اٹھانے کی ترکیب یہ کی کہ ڈھیر ساری موٹی موٹی کتابیں میرے اوپر لا دیں۔ مجھے اوندھا ہو کر سونے کی عادت تھی۔ میں پھر بھی نہ جاگی تو ایک [illegible] پر رکھ دیا۔ پھر بھی نہ اٹھی تو [illegible] کرسی۔ بڑی احتیاط سے رکھی ہو گی خود تو غائب ہو گئے۔ میں تو لیٹی ہوئی تھی مجھے تو کچھ دکھائی نہ دیا۔ مگر سانس جیسے رک جاتی۔ [illegible] ہاتھ ہے نہ پاؤں۔ الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ اختر نے پلنگ پر [illegible] سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ [illegible] غصہ آیا کہ یہ کس قسم کا بیہودہ مذاق ہے۔ اختر نے

پھاڑ بیٹھے۔ بڑی زور لگا کر سیدھے ہونے کی کوشش کی۔ دھڑام سے صندوقچہ گرا۔ تالا کھل گیا۔ دھڑ سے کرسی اور کتابیں گریں۔ چیخ کر کے جاگ رہے ہیں وحیدہ بیگم! آپ کیا توڑ رہی ہیں؟ بکھری ہوئی چیزوں کو دیکھ کر میں اتنا ہی بگڑ اٹھیں کہ یہ جو آپ کتابیں، صندوقچہ، کرسی میرے اوپر رکھ گئے ہیں ان کو گرا رہی ہوں۔ یہ کس قسم کا بیہودہ مذاق ہے سوتے ہوئے انسان کے ساتھ؟

اختر غسل خانے سے چیخ کر بولے "خیر ہوا کچھ دماغ تو ٹھیک ہے یا آپ پر لاد گیا۔ یہ کیا کہہ رہی ہیں؟" غسل خانے سے نکل کر ڈرائنگ روم میں گئے۔ ادھر ادھر گری ہوئی چیزیں نظر آئیں۔ حیرت زدہ ہو کر کھلتے ہوئے برآمدے سے نکل کر مولوی صاحب کے کمرے کی طرف گئے۔ جانے کہاں سے اتنی عقل آ گئی۔ (لو ہاتھ سے برابر کی) معاً ہاتھ میں چمٹا اختر کے پیچھے مولوی صاحب کے کمرے کی طرف بھاگی۔ وہ ابھی غسل خانے ہی میں تھے۔ اختر دروازے پر بہت بگڑے ہوئے غصے میں کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے اختر کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر ذرا زور سے کہا "آپ حد کرتے ہیں کہ مجھ بیچنے کو یہ سب مولوی صاحب نے کیا تھا۔ ہم نے تو آپ سے مذاق کیا تھا۔ خود آپ لوگ تو محفلوں تک میں الٹے سیدھے مذاق کریں تو وہ سب ٹھیک اور جائز اور ہم سا میں نے مذاق کیا کہ دیکھوں آپ کتنے پانی میں ہیں۔ کس قدر بہادر ہے؟ بس اتنے سے مذاق پر لیا جانا کہ مولوی صاحب سے میری شکایت کرنے آ گئے۔" اب مولوی صاحب دروازہ کھول کر باہر آئے۔ میری بات سن کر ہی لاحول ہونے لگے۔ "کیا ہو رہا ہے؟ ہم سب نے بھی تو کوئی حد نہ چھوڑی تھی۔ دوسرے یہ کہ جب آپس میں لڑو جھگڑو تو شکایت میرے پاس نہ لانا۔" اس قدر معصومانہ انداز سے مجھے دیکھا جس میں بڑے معنی پنہاں تھے۔ "ہم تو دوست ہو گئے" میں نے کہا "مولوی صاحب بالکل یہی ہماری اماں بھی ہم سے کہا کرتی تھیں کہ نہ مجھ سے پوچھ کر کھیلیں نہ مجھ سے شکایت کریں۔"

"میں اختر کو یہی مشورہ کرنے ان کے پیچھے پیچھے اتنی صبح آپ کے کمرے تک آئی تھی۔" اختر نے پہلے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر مولوی صاحب کی طرف دیکھ کر گویا حقیقت سمجھنے کی کوشش کی۔ مگر ان کا روکھا سا چہرہ دیکھ کر کچھ بھی اندازہ نہ لگا سکے۔

جالی بھائی! سنی آپ نے یہ انوکھی واردات۔ ساری عمر جب بھی میں نے نئی نویلی دلہن کے ناشتے کی تیاری کو دیکھا کہ کس کس اہتمام سے تیار کرکے گھر والی خواتین دلہن کے اٹھ کر نہا کر آنے کی منتظر ہیں تو اپنی پہلی صبح یاد آ جاتی اور بے اختیار ہنسی آتی۔ ہر کسی سے کیا کہتی کہ میری خاطر کس طرح ہوئی۔ مگر اپنے ہی دل میں ایک طرح کا فخر محسوس کرتی کہ یہ گھسا پٹا طور طریقہ تو ہر دلہن دیکھتی ہے۔ پر میرے ساتھ جو ہوا وہ کبھی، کسی دلہن کے ساتھ ہوا اور نہ کبھی ہوگا۔

ناشتے پر مولوی صاحب سر پس بوڑھے رہے، مگر جب میری طرف دیکھتے تو مجھے لگتا کہ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ اور موقع آنے پر جب اختر سامنے نہ تھے، تو کہہ ہی بیٹھے "تم نے تو بڑے غضب سے مجھے بچا لیا، ورنہ وہ بگڑتا تو میری جان کو آ جاتا۔" اختر کو وہ پیار میں مجھ سے جب اکیلے میں بات کرتے تو ماسٹر جی کہتے۔ ناشتے پر مجھ سے پوچھا کہ "یہ تو بتاؤ تم لوگ شاموں کو اپنے گھر پر کیا کرتی تھیں۔" میری شامت اعمال ہی تو تھی جو بتا دیا کہ "جب تک اندھیرا نہ ہوتا تھا ہم سب بیڈمنٹن کھیلتے تھے۔ کھانے کے بعد کبھی تاش کھیل لیے، کبھی کبھی کیرم۔" "تو پھر تم یہاں بھی یہی کرنا۔" پوچھا "کس کے ساتھ؟" بولے "میرے اور اختر کے ساتھ۔"

ناشتے کے بعد دونوں اخبار پڑھتے رہے۔ ۹ بجے دونوں اپنے اپنے دفتر میں جا بیٹھے جو میرے ہی علاقہ میں موجود تھا۔ میں وہیں کمرے میں بیٹھی سوچتی رہی تھی کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے کہ اتنے میں بشیر خانساماں نے آ کر دریافت کیا "دلہن پاشا آج رات کھانے پر کیا پکنا ہے۔" "پہلے تو دن کے کھانے کی بات کرو۔" میں نے کہا۔ وہ حیران ہو کر میرا منہ دیکھنے لگا۔ پھر بولا "ہمارے گھر میں دن کا کھانا نہیں کھایا جاتا، اس لیے پکتا ہی نہیں ہے۔" "کیا؟" میں حیران کہ یہ کیسی بات ہے۔ کہنے لگا "شاید آپ کو اختر میاں نے بتایا نہیں ہے۔" میں "نہیں" کہہ کر کچھ دیر چپ رہ کر بولی "مگر کل تو دن کا کھانا ہم سب نے کھایا تھا۔" اس پر اس نے بتایا کہ "جمعہ کا دن تھا، چھٹی ہوتی ہے بس اس دن مولوی صاحب کے دوست آتے ہیں اور بہت سے لوگ ان کے ساتھ کھانا بھی کھاتے ہیں۔" "تو پھر یوں کرو کہ پرسوں رات پکایا تھا وہی پکا لو۔" بشیر اس پر ہنس پڑا کہ "پرسوں رات آپ لوگ یہاں کب تھے؟" "اچھا تو پھر یوں کرو کہ جو ہمارے گھر میں پکتا ہے وہ پکا لو۔" بشیر حیران سا مجھے دیکھ رہا تھا۔ بولا "دلہن پاشا مجھے کیا خبر کہ آپ کے ہاں کیا پکایا جاتا ہے۔" "دیکھو بشیر اسی طرح مجھے بھی کچھ ابھی معلوم نہیں کہ مولوی صاحب کس طرح کا کھانا پسند کرتے ہیں اور اختر صاحب کی پسند کیا ہے۔ تم خود ہی بس سوچ کر ان کی مرضی کے مطابق پکا لیا کرو، بس اتنا کرنا کہ ایک کاپی لیتے آنا، روز مجھے حساب لکھوا دیا کرنا۔" بشیر خوش ہو کر کہنے لگا "آج لا دوں گا۔ جب ... کے آ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" جب جانے لگا تو میں نے یہ بھی کہا کہ "ہاں اچھے شریفے ضرور لیتے آنا۔" اس نے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھ کر کہا "دلہن پاشا مولوی صاحب کے گھر شریفے تو ہرگز نہیں آ سکتے۔ میری نوکری ہی چھوٹ جائے گی۔ اور اختر صاحب کو بھی بہت ناپسند ہیں۔" میں نے کہا "تو بے شک وہ دونوں ختم کھائیں میں ہی سب خود کھا لوں گی۔ دوپہر کو تم کھانا تو دو گے نہیں، اگر شریفے اور کوئی پھل تو بیٹھ کر ..." "بشیر اچھا ذرا یہ تو بتاؤ کہ شریفے میں آخر خرابی ہے کیا؟ اور کیوں اس کو اس قدر ناپسند کرتے ہیں؟" "یہ آپ خود ہی ان سے پوچھ لیجیے گا۔ مگر آج تو ضرور ہی لے آؤں گا۔" وہ چلا گیا۔ میں سوچ رہی تھی کہ میں تو اس مزے سے کھا رہی تھی جیسے کوئی بڑی نعمت ہو اور شریفے کے خلاف۔

دوپہر تک مجھے کیا کرنا ہے۔ ہاں ایک وہ گٹھڑی سی ڈالوں کہ چلتے وقت تو لیا ہے دھڑا نکالا جائے۔ میرے سامان میں وہ گٹھری میری آپا نے رکھ دی تھی۔ اس کو کھولا تو اس میں سے سب ہی کچھ نکلا۔ سوئی تاگے، فیتہ، قینچی، بٹن، اس میں بہت سے مختلف رنگوں کے سلک کے ٹکڑے بھی تھے۔ اس گٹھری کی انھوں نے مجھے یہ بشارت بتائی تھی کہ والدہ کی نانی کی تھی۔ تھوڑی دیر سوچا کی کہ یہ بہت بوڑھی ہو گئی ہے۔ چوتھی پشت کے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔ اب میں نے اس کو سنوار کر آپا کی طرح ... سلائی کا سامان رکھ کر اس کو شادی پہنا دی۔ پرانی گٹھری تو سوتی کپڑے سے بنا ہے۔ پلنگ کی چادر میں سے بچے کھچے کپڑا پھاڑ کر ساتھ سے سی کر اور پلنگ پر جو گدھا سا موٹا تکیہ تھا جس کو میں نے پلنگ کے نیچے ڈال دیا تھا۔ اسی میں سے ... نکال کر بھری۔ ... ہوئے ... گٹھری کا کونا، پھر جا کر مولوی صاحب کے چائے دان کو اٹھا آئی۔ واپس آتے اختر کے دفتر کی چق ذرا سی ہٹا کر اندر جھانکا۔ ان کی پیٹھ میری طرف تھی۔ بڑے انہماک سے کام کر رہے تھے۔ میں کھڑی کچھ دیر سوچا کی کہ اختر قریب بھی اور پھر دور بھی ہیں۔ پھر جلدی سے وہاں سے کھسک آئی کہ یہ تو میرے لیے ممنوعہ علاقہ ہے اور یہ دونوں بڑے ہی مختلف لوگ ہیں۔

بشیر نے ایک بیگ بڑے لا کر دی جس میں سنترے کا جوس اور ایک کیلا تھا۔ ساتھ ہی ایک چھوٹی سی شریفے کی تھیلی بھی دی یہ کہہ کر "کھانے کے بعد چھلکے اور بیج اسی تھیلی میں ڈال کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیجیے گا۔" میں شریفے دیکھ کر اتنا خوش ہوئی کہ دروازہ بند کرنا بھول ہی گئی۔ شربت پی کر اطمینان سے پلنگ پر پیر رکھ پالتی مار کر بیٹھی شریفے کھا رہی تھی۔ مولوی صاحب اپنے کمرے میں کسی کام سے جانے کے لیے برآمدے میں آئے ہوں گے۔ کہیں میری موجودگی اور اپنی صبح والی حرکت کا خیال شاید آیا ہو۔ میرے کمرے کی چق اٹھا کر جھانکے تو یہ دیکھ کر کہ میں شریفے کھا رہی ہوں، اچھل پڑے۔ "ارے ارے یہ کیا کر رہی ہو۔ کس نے لا کر دیے؟" کہا "بشیر نے۔ کیوں کہ میں نے اس سے منگائے تھے۔" "خیر اب کبھی نہ یہ کھانا۔" "آخر کیوں؟ مجھے تو شریفے بہت پسند ہیں۔ ایسے تو میں نے کبھی دیکھے نہ کھائے۔ آپ بشیر کو تو کچھ نہ کہیں۔ وہ تو لانے سے انکار کر رہا تھا۔ جب میں نے کہا کہ کیا تم میری پہلی فرمائش کو پورا نہ کرو گے۔ تو بیچارا لے آیا۔ آخر اس کے کھانے پر آپ کو اور اختر کو اعتراض کیوں ہے؟" "ہم بتائیں کیوں ہے؟" جھٹ سے اپنا منہ خوب ایک طرف کو ٹیڑھا کر لیا کہ "منہ یوں ہو جاتا ہے۔" میں حیرت زدہ ہو کر بولی۔ "پھر میرا ہی منہ ٹیڑھا ہو گا۔ آپ یا اختر کا تو نہیں ہو گا۔" تو کہا "ہم ایک لقوہ زدہ منہ والی لڑکی کو اپنے گھر رکھ رہیں گے۔ اسی وقت ٹکٹ کٹا کر ظفر عمر کے پاس روانہ کر دیں گے۔" یہ کہا، ماتھے پر بل ڈالے ٹھنک ٹھنک کرتے ہوئے چلے گئے۔

ایک دم مجھے ان دو ہرنوں کا خیال آیا جو پالے گئے تھے، جن کا ذکر اختر نے میرے نام اپنے کسی خط میں کیا تھا۔ ہم نے اورئی میں ایک ہرنی پالی تھی اس کا نام رانی رکھا تھا۔ جب مولوی صاحب سے اختر نے بتایا تو بولے "ہم تو رانی اور راجہ کیوں نہ پال لیں۔" دوسرے ہی دن ایک ہرنوں کا جوڑا منگا لیا تھا۔ صبح شام دونوں کھڑے ہو کر ان کو دیکھ کر خوش ہوا کرتے تھے۔ میں برآمدے سے اتر کر کوٹھی کے پچھلے حصے کی طرف جا کر رانی اور راجہ کو چوکڑیاں بھرتے دیکھ رہی تھی۔ سامنے سے کوئی بزرگوار، کمر اتنی جھکی ہوئی جیسے یہ دوہرے ہوتے جا رہے ہوں۔ بہت ہی گورا چٹا رنگ، ہاتھ میں باریک سی چھڑی لیے میری طرف بڑھ کر قریب آ کر کہنے لگے "میں بھی ظفر عمر کا دوست ہوں، ان کا خط مجھے کل ملا کہ میں تمہاری خیر خبر لیا کروں، تم ٹھیک سے ہو۔ جب بھی کسی چیز کی ضرورت ہو کوئی تکلیف ہو تو بلا تکلف مجھ سے کہہ دیا کرنا۔ میں تمہارا چچا ہوں۔" آداب کر کے ان کو بتایا کہ "میں ٹھیک ٹھاک ہوں کوئی تکلیف نہیں سوائے اس کے کہ شریفے اس گھر میں نہیں آ سکتے۔ بس آپ کبھی کبھار چند شریفے میرے لیے لے آیا کریں۔ مگر آپ مجھے دیں گے کس طور کیوں کہ کوئی اندر سے باہر کے حصے میں جا نہیں سکتا اور کوئی دفتر سے ادھر قدم نہیں رکھ سکتا۔" بولے "تم اس کی فکر نہ کرو، میں کاغذ میں لپیٹ کر پھولوں کی کیاری میں رکھ دیا کروں گا۔" یہ صاحب شان الحق حقی کے والد تھے۔ جب وہ واپس جا رہے تھے تو سوچ رہی تھی کہ ذرا تند سی ہوا چلی تو یہ بیچارے اڑ ہی تو جائیں گے۔ دل میں خوش کہ چلو کوئی میرا اپنا اس دیار غیر میں موجود ہے۔

اپنے کمرے میں آ کر سو گئی۔ اختر نے اگر کسی وقت اندر آ کر میری خیر خبر لینے کی زحمت کی ہو تو وہ مجھے کیا معلوم ہو سکتا تھا۔ پانچ بجے ہوں گے کہ اختر نے مجھے بلا کر اٹھایا کہ "جلدی اٹھیں۔ مولوی صاحب چائے بنانے والے ہیں۔ منہ دھو کر جھٹ پٹ باہر آ جائیں۔ آپ کے شریفے کھانے سے ان کا پارہ بہت چڑھا ہوا ہے۔" میں جلدی جلدی منہ دھو، بال برابر کر کے برآمدے میں آئی تو دیکھا مولوی صاحب ٹی کوزی ہاتھ میں پکڑے کبھی چائے دان پر رکھتے اور کبھی اٹھا لیتے۔ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور بولے "آج تو حد ہو گئی کہ ہمارے چائے دان کو کسی نے ٹوپی پہنا دی۔ یہ بات تو بہت اچھی کی جس نے بھی کی۔ اب چائے دیر تک

گرما گرم رہا کرے گی۔ تم صاف سمجھ رہے ہیں کہ میں نے کیا ہے مگر بار بار کہے جاتے کوئی بالغ ہیں سے بڑے گدھے میں آیا چلاتے رہے کوئی اگر جاتا اور چلتا بنا۔ اگر ہم سے مل کر جاتا تو اس کا بہت شکریہ ادا کرتے" میں دل میں بہت خوش ہوئی۔ جلدی سے میز کی طرف بڑھی کہ آج چائے میں دم کر دوں گی۔ چائے کے ڈبے کا جوں ہی ڈھکن کھینچتے بولی "ارے ارے یہ کیا کرتی ہو۔ ہم کسی بھی جنیٹ کے ہاتھ کی بنائی چائے پیا ہی نہیں کرتے" میں نے مڑ کر کہا "بھلا آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں جنیٹ ہوں۔ اگر یہی بات ہے ہم تو کسی کے کہنے سے کوئی میں جنیٹ ہو جاؤں گی۔" تم مسکراتے رہے آنکھوں سے جیسے شفقت ٹپک پڑے گی۔ میرا ترت جواب حاضر کر دینے پر جیسے ان کو اچھا لگ رہا تھا۔ وہ کہاں عادی تھے کہ ان کے رعب کے مارے کوئی جواب دینے کی جسارت کرے۔ مگر میں نے تو پہلی ہی میں یہ ایسا دل میں کر لیا تھا کہ بی تمیزہ ہوشیار رہنا ورنہ بری طرح ماری جاؤ گی۔ تمہارا پالا پڑا ہے بہت بگڑے قسم کے لوگوں سے۔ بڑی ہمت کر کے ہوشیاری کے ساتھ ہر قدم اٹھانا ہوگا۔

مولوی صاحب نے جب چلتے سنا تو تم نے کہا "اگر پانچ منٹ کی گرمی کو دھکا رہنے دیا جائے تو چائے اچھی طرح دم کھا جائے گی۔ چلتے وقت ڈھکن تو دیا مگر اصل بچوں کی طرح گھڑی پر نظر جما کر ہر منٹ کے گزرنے کا اعلان ہوتا رہا۔ لو ہو گئے پانچ منٹ۔ ایک۔ دو تین کہہ کر چائے پیالیوں میں ڈالی۔ خود ان کو زیادہ مزے دار لگی۔ یہ لڑکی کبھی کبھی بات ٹھیک بنا لیتی ہے۔"

اختر نے مولوی صاحب سے پوچھا ہم دونوں آج جا کر نسا بابا اور سروجنی نائیڈو سے مل آئیں۔ بولے "ہاں ہاں ضرور مل آؤ تم ہماری لڑکی کو ان کے کتے سے دکھوا دینا۔ بڑا خوفناک ہے۔" میں کتوں سے بے حد ڈرتی تھی۔ "اگر وہاں ایسا کتا ہے تو میں وہاں ہرگز نہ جاؤں گی۔" "آپ کسی کی باتوں میں آ گئی ہیں۔ ان کو تو لوگوں کو ڈرانے اور بہلانے میں مزا آتا ہے۔ کتا وہاں ضرور ہے اور بھی بہت سے جانور ہیں۔ سب کے ساتھ مل جل کر رہتے ہیں۔" مجھے اطمینان ہو گیا۔ جلدی جلدی تیار ہوئی۔ خوش ہو رہی تھی کہ اس گھر سے باہر کی دنیا تھوڑی دیر کو دیکھنے میں آئے گی اور ان لوگوں سے ملاقات ہوگی جن کا ذکر اختر اپنے خطوں میں کچھ اس طرح سے کیا کرتے کہ ایسا لگ رہا تھا کہ جانے پہچانے ہی لوگوں سے ملنا ہوگا۔ چلتے چلتے اختر نے کہا "اگر بابا نے بہت اصرار کیا تو شاید ہم دونوں کھانا وہاں کھا لیں۔ آپ وقت پر کھانا کھا لیجئے گا۔" "جی نہیں سیدھے سیدھے ٹھیک وقت پر آ جائیں۔ آج تو پہلے روز حمیدہ کا پکایا ہوا کھانا کھلے گا۔" میرا دل گھبرایا کہ خاک میں نے پکایا۔ بشیر نے جو بھی پکایا ہو۔ گوشت ہی جل نہ گیا ہو۔ کہیں پوچھ نہ بیٹھیں کہ کیا پکایا ہے۔ جلدی سے ایک ساری پہنی۔ جوتا پہن کر باہر آئی۔ دونوں باہر کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ زور سے ہنسے اور کہا "لڑکی یہ تو ایک جنگلی بن گئی"۔ اختر نے خود بھی مجھے آج پہلی بار ساری میں دیکھا۔ بولے "آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔" میں جیسے جل بھن سی گئی۔

—

(افکار، دسمبر ۹۳ء)

ذکا صدیقی

تذکرۂ غوثیہ کا حقیقی مصنف — اسمٰعیل میرٹھی

تذکرۂ غوثیہ کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ مولانا گل حسن شاہ صاحبؒ کی تالیف ہے۔ اس خیال کی وجہ بھی ہے، وہ یہ کہ کتاب پر بطور مؤلف انھیں کا نام چھپا ہوا ہے — لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاہ صاحبؒ ملفوظات کے محض ناقل تھے، انھیں تحریر مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کے قلم نے کیا تھا — ملفوظات اولیا و صوفیہ کی صنف ہی میں نہیں، ہمارے پورے ادبی و علمی سرمائے میں نثر کا یہ کرشمہ اردوئے معلیٰ، عود ہندی اور دربار اکبری کے ماسوا اپنی نظیر کا عدم رکھتا ہے۔ یاد ش بخیر جس زمانے میں تدریس کے پیشے سے وابستہ تھا، ایم۔ اے اردو کے طلبہ کے لیے میں نے تذکرۂ غوثیہ کا مطالعہ لازمی قرار دے رکھا تھا گو ظاہر ہے، نصاب میں یہ کتاب نہیں تھی۔

اس واقعے کے متعدد شواہد و دلائل ہیں کہ تذکرۂ غوثیہ مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی نے تحریر کیا تھا۔ سب سے اہم شہادت خطی نسخے کے وہ اجزا ہیں جو مولانا محمد اسلم سیفی مرحوم (خلف اکبر مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی) نے اپنے والد مرحوم سے ورثے میں پائے تھے۔ یہ اجزا، متعدد دیگر اہل نظر مثلاً مرحوم مالک رام صاحب کے علاوہ خاکسار نے بھی مولانا اسلم سیفی کے اپنے دولت خانے، واقع اسمٰعیل نگر، محلہ مشائخان، میرٹھ، پر دیکھے اور پڑھے اور پڑھوا کر سنے تھے۔ قیاس ہے کہ جناب ابو سلمان شاہ جہاں پوری بھی یہ اجزا دیکھ چکے ہیں۔ یہ اجزا مولوی اسمٰعیل کے اپنے ہاتھ کے تحریر کردہ ہیں۔ اس امر کی تصدیق تزک اردو اور مقدمۂ قران السعدین کے خطی نسخوں، بہ شمول دعاؤں، مکتوبات، طغروں اور وصیتوں کے ملاحظے سے ہوتی ہے — حیات و کلیات اسمٰعیل میں مولانا اسلم سیفی نے مولوی محمد اسمٰعیل کے خطی نسخوں کے عکس بھی چھاپے — مالک رام صاحب مرحوم نے بھی رسالہ تحریک دہلی میں تذکرۂ غوثیہ کے منتخب صفحات کے عکس چھاپے تھے۔

مولانا گل حسن شاہ صاحب نے اپنی عمر کے اکیس بائیس سال سرحد اور پشاور میں گزارے۔ بقدر کفایت علم سفینہ حاصل کرلینے کے بعد انھیں علم سینہ کی طلب ہوئی تو ایک دن والدہ کی اجازت کے بغیر چپ چاپ نکل پڑے۔ شہر شہر، قریہ قریہ گئے، کہیں شرح صدر نہ ہوا، لیکن طلب چونکہ صادق تھی اس لیے ایک رات خواب میں حضرت سلطان باہوؒ نے بشارت دی کہ تم ہندوستان کو جاؤ وہاں تمھارے سب مقاصد پورے ہوں گے۔ مولانا مرشد کی تلاش میں ملتان سے روانہ ہوئے اور پنجاب ہوتے، اہل اللہ کے پتے ٹھکانے ڈھونڈتے، خانقاہوں اور مزاروں پر حاضریاں دیتے، چلتے کھنچتے آخر کار پانی پت پہنچے۔ یہاں حضرت بو علی شاہ قلندر پانی پتی کے مزار پر اپنے خواب کی تعبیر پائی، یعنی حضرت غوث علی شاہ قلندر قادری کی جناب میں نیاز حاصل ہوا۔ مولانا گل حسن شاہ صاحب جوہر قابل تھے ہی، مرشد کامل کی نگاہ کیمیا اثر نے جلد ہی ذرے کو آفتاب بنا دیا تا آں کہ حضرت قلندر صاحب کے وصال کے بعد ان کے تمام جانشینوں اور دور و نزدیک کے مریدوں نے انھیں مرشد کا خلیفۂ مجاز تسلیم کرلیا۔

مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی بھی حضرت قلندر صاحبؒ کے ایک با اخلاص مرید تھے۔ اپنی سرکاری ملازمت کی مصروفیات کی وجہ سے مرشد کی خدمت میں حاضری کے مواقع انھیں نسبتاً کم نصیب ہوتے تھے — ویسے بھی یہاں تو مرشد کے خلیفہ کی خوشنودی منظور تھی، چنانچہ کتاب پر بطور مؤلف مولانا گل حسن شاہ صاحبؒ ہی کا نام لکھا گیا، ملفوظات کے راوی و ناقل وہی تھے۔ اہل علم و نظر خاص طور پر اہل ادب ذوق رکھتے ہوئے یہ بھی جانتے ہیں کہ سادہ و پرکار نثر نگاری کا یہ جوہر مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کے ماسوا پورے ہندوستان میں باستثنائے مولانا محمد حسین آزاد و مولانا حالی کسی کے قلم کو ودیعت نہیں ہوا — مولانا گل حسن شاہ صاحب یہ تہمت آزاد کیسے کر سکتے!

●●

"فنون" جولائی۔ دسمبر ۱۹۳ء

ڈاکٹر اے بی اشرف

اردو کا پہلا ترک پروفیسر



پروفیسر ڈاکٹر ارکن ترکمان کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ پاک و ہند کے علمی و ادبی

اے کالج سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ مولانا روم سے عشق ہونے کی وجہ سے

سلجوق یونیورسٹی قونیہ میں شعبۂ اردو کا قیام ڈاکٹر ترکمان کی مساعی جمیلہ کا ہی نتیجہ

حلقوں میں ان کو اچھی طرح جانا پہچانا جاتا ہے۔ ان کا علمی اور تحقیقی کام بڑا وسیع ہے اور یہی کام ان کی شناخت کا وسیلہ بھی ہے لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ان کا اصل کارنامہ سلجوق یونیورسٹی قونیہ میں شعبۂ اردو کے قیام و دوام کی مساعی جمیلہ ہے۔ حقیقتاً اس شعبے کے اجراء و ارتقاء کا سہرا صرف اور صرف ڈاکٹر ارکن ترکمان کے سر جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے یہاں اردو زبان و ادب کی تدریس کا سلسلہ آج سے پانچ سال پہلے شروع کیا۔ اب اس شعبے میں گریجویشن تک کی چار کلاسوں کے علاوہ ایم اے اردو کی تدریس بھی ہو رہی ہے۔ شعبے میں طالب علموں کی تعداد ساٹھ سے متجاوز ہے۔ یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ جب اس شعبے کا آغاز ہوا تو پروفیسر ارکن ترکمان نے اپنی کوشش سے شعبے کے لیے نہ صرف دو ریسرچ اسکالرز منظور کرائے بلکہ ایک پاکستانی استاد کی خدمات بھی حاصل کیں۔ اس طرح اب اردو زبان و ادب کے اس شعبے میں انقرہ یونیورسٹی کی طرف سے لیکچرر بھی موجود ہے۔ اردو زبان کی تدریس محض ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے ہو رہی ہے۔ اس سے ڈاکٹر ارکن ترکمان کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے بغیر کسی وسائل کے خود اس شعبے کو کس طرح قائم کیا اور اب اس کی توسیع میں کوشاں رہے۔

پروفیسر ارکن ترکمان کے آباؤ اجداد ترکستان کے رہنے والے تھے لیکن والد گرامی شکور صاحب کا زیادہ تر وقت ہندوستان (پاکستان) میں گزرا۔ ڈاکٹر صاحب کی والدہ محترمہ پاکستانی خاتون تھیں۔ ارکن ترکمان بھی ہندوستان میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی تعلیم پائی۔ پھر لاہور آ گئے اور ایم

قونیہ کو اپنا مستقل مسکن بنا لیا۔ مولانا روم پر ان کی ضخیم اور جامع کتاب (The essence of Rumi Masnvi) نہ صرف ترکی میں بلکہ دنیا کے بہت سے ممالک میں بے حد احترام کی نگاہ سے دیکھی گئی ہے اور بہت مقبول ہوئی ہے۔

ڈاکٹر ارکن ترکمان بہت زبانیں ترکی کے علاوہ اردو، انگریزی، فارسی، عربی، پنجابی اور پشتو وغیرہ اس روانی اور مہارت سے بولتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ وہ بن غازی یونیورسٹی لیبیا میں انگریزی زبان کے استاد رہ چکے ہیں اور ترکی کی مختلف یونیورسٹیوں میں بھی گزشتہ ۳۰ برس سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس سے پہلے وہ ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اردو کے چیئرمین اور مشرقی زبان و ادب کے شعبہ جات کے سربراہ تھے۔ سال گزشتہ کے اواخر میں ان کے علمی و تحقیقی کام، ماہرین کی مثبت آراء اور جیوری کے متفقہ فیصلے کے مطابق انہیں اردو پروفیسر کے طور پر ترقی دے دی گئی ہے۔ اس لحاظ سے وہ پورے ترکی میں پہلے اور واحد ترک ہیں جو اردو پروفیسر ہیں۔ ان کا یہ اعزاز نہ صرف سلجوق یونیورسٹی قونیہ کے لیے بلکہ خود ہمارے لیے بھی باعث مسرت و صد افتخار ہے۔ سفیر پاکستان جناب انعام الحق نے ان کے اس اعزاز پر انہیں پیغام تہنیت بھجوایا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر ارکن ترکمان کے تنقیدی اور تحقیقی مقالات ترکی، پاکستان اور ہندوستان کے متعدد جریدوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ دنیا کی کئی یونیورسٹیوں میں توسیعی لیکچر بھی دے چکے ہیں۔ اور کانفرنسوں میں مقالات بھی پیش کر چکے ہیں۔ ●●

تحریر: ڈاکٹر محمود الحسن عارف

قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتیؒ

بحیثیت شاگرد امام العصر شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

حضرت قاضی صاحب کو قدرت نے بہت سی سعادتوں سے بہرہ اندوز کیا تھا: وہ اپنے جدی سلسلے سے بتیس واسطوں کے ساتھ حضرت عثمان ذی النورین کی اور ننھیالی جانب سے چالیس پشتوں کے ذریعے حضرت ابو ایوب انصاری میزبان نبوی کی اولاد ہیں۔ ان کی ددھیال چشتیہ سلسلے کے قطب الاقطاب حضرت مخدوم جلال الدین عثمانی پانی پتی (م ۷۶۵ھ / ۱۳۶۳ء) سے اور ننھیالی خاندان شیخ الاسلام عبداللہ انصاری المعروف بہ پیر ہرات (م ۴۸۱ھ / ۱۰۸۸ء) کے ذکر سے معطر و مزین ہے۔ قاضی صاحب کے خاندان میں تقریباً بارہ پشتوں سے "علم دین" کا سلسلہ متوارث ہوتا ہوا ان کی ذات تک پہنچا اور ان کی اولاد بھی کئی نسلوں تک علم دین کی وارث و حامل رہی۔ قاضی صاحب کے دادا قاضی ہدایت اللہ عہد مغلیہ میں پانی پت کے قاضی اور ایک نامور عالم دین تھے۔ شیخ محمد عابد سنامی (م ۱۱۶۰ھ / ۱۷۴۷ء) سا مرشد کامل ان کے زیر درس رہ چکا تھا اور قاضی صاحب کے والد قاضی محمد حبیب اللہ کے علم و فضل کا یہ حال تھا کہ ان کے مرشد کامل نے خرقہ خلافت دینے کے بعد ان کی تربیت کا آغاز کیا تھا۔ دوسری طرف ان کے نانا نواب لطف اللہ خان شمس الدولہ بہادر تہور جنگ دربار مغلیہ کے چھ ہزاری منصب دار تھے۔ اسطرح قاضی صاحب کی ذات دین و دنیا کا ایک حسین امتزاج تھی۔

قاضی صاحب مشہور مردم خیز قصبے "پانی پت" میں تخمیناً ۱۱۴۰ھ / ۱۷۲۷ء اور ۱۱۴۳ھ / ۱۷۳۰ء کے مابین پیدا ہوئے۔ یہیں انھوں نے شہر کے علماء و فضلاء سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ان کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ انھوں نے محض سات برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا اور سولہ سترہ سال کی عمر میں کتب درسیہ سے فراغت حاصل کر لی تھی۔ مزید لطف کی بات یہ ہے کہ انھوں نے اس سولہ سترہ برس کی عمر میں اپنی پہلی کتاب "احقاق حق" تصنیف فرمائی۔ جو حضرت مجدد الف ثانی پر شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے اعتراضات کے مدلل جوابات پر مشتمل ہے۔

تحصیل علم میں بھی قدرت نے انھیں بہت سی سعادتوں سے بہرہ ور کیا تھا: انھوں نے بیک وقت ہندوستان کے تین نامور محدثین سے حدیث کا علم حاصل کیا، جن میں امام العصر شاہ ولی اللہ محدث

دہلوی (م ۱۱۴۳ھ ، ۱۷۳۰ء) شاہ فخر الدین الہ آبادی محدث (م ۱۱۶۳ھ ، ۱۷۵۰ء) اور مرزا مظہر جانجاناں دہلوی (م ۱۱۹۵ھ ، ۱۷۸۰ء) جیسے اکابر حضرات شامل ہیں ' مرزا مظہر جانجاناں جو قاضی صاحب کے خصوصی مربی و سرپرست بھی تھے۔ بہت بڑے صوفی کامل ہونے کے ساتھ اونچے درجے کے محدث بھی تھے۔ اور اپنی خانقاہ میں باقاعدہ درس حدیث دیا کرتے تھے۔ اور جو شیخ محمد افضل سیالکوٹی (م ۱۱۴۶ھ ، ۱۷۳۳ء) تمیذ شیخ عبداللہ سالم مکی کے شاگرد اور امام العصر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے ہم سبق تھے۔

امام العصر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور مرزا مظہر جانجاناں شہید کے مابین نہایت خوشگوار مراسم قائم تھے۔ بعض مآخذ سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں کے درمیان شاگردوں اور مستفیدین کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ حضرت شاہ صاحب اپنے خطوط میں مرزا صاحب کو بجا طور پر "قیم طریقہ احمدیہ" اور "راعی سنت نبویہ" لکھتے تھے اور حضرت مرزا صاحب بھی حضرت شاہ صاحب کا غایت درجہ ادب و احترام ملحوظ رکھتے تھے ' قاضی صاحب کا تعلق ابتداء حضرت مظہر سے ہی قائم ہوا تھا ' اس لئے یہ قیاس ہوتا ہے کہ غالباً انہوں نے ہی قاضی صاحب کو حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں بغرض استفادہ علم حدیث ارسال کیا تھا : بہر یہ قاضی صاحب کی بھی انتہائی خوش نصیبی تھی کہ انہیں شیخ ملا تو حضرت مظہر جانجاناں شہید سا اور استاد حدیث ملا تو امام العصر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جیسا۔

امام العصر شاہ ولی اللہ کی زندگی کا یہ وہ دور تھا کہ جب ان کی حجاز مقدس سے واپسی ہوچکی تھی (۱۱۴۵ھ) اور وہ اس وقت اپنے علم و فکر کی اس انتہا کو پہنچ چکے تھے جو ان کی عظیم الشان کتب حجۃ اللہ البالغہ اور تفہیمات الٰہیہ وغیرہ میں نظر آتی ہے۔ اس وقت "اکہرے دالان ' تین دروالی صندوق نما لداؤ والی مسجد اور ایک کمرے " پر مشتمل "مدرسہ رحیمیہ" کی شہرت کا آفتاب عالمتاب مین نصف النہار پر تھا۔ اس دور میں تاریخ اسلام کا یہ نامور معمار قوم نونہالان وطن میں مستقبل کے ایسے گوہر نادار تلاش کرنے اور انہیں تراش خراش کو عظیم مقاصد کے لئے تیار کرنے میں مصروف تھا ' جو اس کے مشن اور پروگرام کو اقصائے عالم تک پہنچا سکیں اور یہ اس درسگاہ کی بھی خوش بختی تھی کہ انہیں ایسے جواہرات تلاش کرنے میں مایوسی نہیں ہوئی۔ خود قاضی صاحب بھی ایسے ہی بیش قیمت جواہرات میں شامل تھے۔

حضرت قاضی صاحب جن ایام میں امام العصر شاہ ولی اللہ کے ہاں زیر تعلیم تھے (اندازاً ۱۱۴۰ھ ، ۱۷۳۶ء) ان دنوں میں مرزا صاحب کے ہاں بھی کئی کئی روز تک حاضر نہ ہوسکتے تھے۔ مرزا مظہر جانجاناں شہید کو قاضی صاحب سے غایت درجہ محبت تھی جس میں عقیدت کا رنگ بھی جھلکتا تھا اس لئے انہیں قاضی صاحب کی غیر حاضری نہایت شاق گزرتی تھی۔ چنانچہ مرزا صاحب نے امام العصر

کو آیہ۔ مکتوب میں لکھا ' جس میں ان سے چند مسائل بھی پوچھے اور قاضی صاحب کے بارے میں استفار کیا کہ وہ کب تک امام العصر کے ہاں زیر تعلیم رہیں گے ۔ اس کے جواب میں شاہ صاحب نے رقم فرمایا :

" مولوی ثناء اللہ مصابح و صحیحین اسماع نمودند مستعد کتب ستہ بلکہ عشرہ متداولہ اند ۔

بمیں توجہ ہمت سامی توقع است کہ آئندہ بظہور رسد و بعد ازاں احرام صحبت شریف بندند۔"

مولوی ثناء اللہ مصابح اور صحیحین (صحیح بخاری مسلم) پڑھ چکے ہیں اور اب صحاح ستہ بلکہ عشرہ متداولہ پڑھنے کا ارادہ رکھتے ہیں ۔ آپ کی مبارک توجہ کے باعث امید ہے کہ ان کا مقصد پورا ہوگا ۔ پھر وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا احرام باندھیں گے ۔

امام العصر شاہ ولی اللہ کے خط سے ان دونوں اکابرین امت کے ہاں قاضی صاحب کے مقام و مرتبے کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے ' علاوہ ازیں اس سے قاضی صاحب کی تحصیل علم کے لئے مستعدی اور اس میں گہرے انہماک کا تاثر بھی ملتا ہے ۔

تحصیل علم حدیث سے فراغت ہو جانے کے بعد بھی قاضی صاحب ' امام العصر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے ہاں آتے جاتے رہے اور ان سے استفادہ علمی کرتے رہتے تھے ۔ چنانچہ امام العصر کے وصال سے چند سال پیشتر کے ایک خط میں بھی قاضی صاحب کا ذکر ملتا ہے ' امام العصر تحریر فرماتے ہیں :

بعد سلام واضح باد کہ مولوی ثناء اللہ بار قیہ کریمہ رسیدند موجب مسرت گردید...... توقع آنست کہ در اوقات موجودہ دعائے سلامت از آفات ظاہرہ و باطنہ در حق بندہ ضعیف و فرزندان و متعلقان بوجود می آمدہ باشد ' والسلام ۔

سلام کے بعد واضح ہو کہ مولوی ثناء اللہ مکتوب گرامی کے ساتھ پہنچے (اس یاد آوری) پر بے حد خوشی ہوئی ...... امید ہے کہ خصوصی اوقات میں میرے لئے ' اور میرے فرزندان اور متعلقین کے لے ظاہری و باطنی آفتوں سے سلامتی کی دعا کا سلسلہ جاری رکھیں گے ' والسلام ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فراغت کے بعد بھی قاضی صاحب نے امام العصر کے ہاں آمد و رفت کا باقاعدہ سلسلہ جاری رکھا ۔

۲۔ عملی زندگی ۔

یہاں تک تو قاضی صاحب کے امام العصر سے استفادہ علمی کا ذکر تھا ۔ اب قاضی صاحب کی عملی زندگی میں ولی اللہی اثرات پر بھی چند اشارات پیش کیے جاتے ہیں ۔

امام العصر جب ۱۱۴۵ھ / ۱۷۳۲ء میں حجاز اقدس کے سفر سے واپس تشریف لائے تو ان کے

سامنے "امت" کی اصلاح کا ایک واضح نصب العین تھا ۔ چنانچہ انہوں نے ہندوستان واپسی کے ساتھ ہی اپنے اس پروگرام پر عمل در آمد شروع کردیا ۔ امام العصر شاہ ولی اللہ کا نصب العین زندگی کے محض ایک دو پہلوؤں کی اصلاح نہ تھا بلکہ ان کا نصب العین یہ تھا کہ مسلمانوں کی زندگی کا ہر گوشہ اپنی اصلی آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہو کر سامنے آ جائے ۔

قدرت نے امام العصر کو ایک ایسے زمانے میں بھیجا تھا جب فی الواقع امت کو ان جیسے رہنما کی اشد ضرورت تھی ۔ دنیائے اسلام اس وقت اختلاف و انتشار کے آخری نقطے کو پہنچ رہی تھی ہندوستان میں مسلمانوں کی صدیوں کی حکومت کا سایہ اب برائے نام باقی تھا ۔ ہندوستان کے طول و عرض میں غیر مسلم طاقتیں ہندو جاٹوں ' مرہٹوں اور سکھوں کی صورت میں منظم ہو رہی تھیں ۔ یورپین طاقتوں نے بھی ہندوستان کے ساحل پر مکر و فریب اور سازشوں کے ذریعے اپنی اپنی طاقتوں کا مظاہرہ شروع کر دیا تھا ۔ عالمی سطح پر بھی مسلمان زوال و انتشار کا شکار تھے ۔ سلطنت عثمانیہ اندرونی خلفشار میں مبتلا تھی اور یورپین ممالک سے اس کی پسپائی کا عمل اس صدی سے شروع ہوچکا تھا ۔ الغرض دنیائے اسلام کو اس وقت فی الواقع ایک ایسے امام و قائد کی ضرورت تھی جو زندگی کے ہر پہلو میں وقت کے تقاضوں کے مطابق ان کی رہنمائی کرسکے ۔

اس پس منظر میں امام العصر نے اپنے تجدیدی کام کو دو حصوں میں تقسیم فرمایا (ا) ان کے تجدیدی کام کا مرحلہ اول یہ تھا کہ امت کی فکری و علمی رہنمائی کی جائے ' اس دور کا مسلمان طرح طرح کے رسم و رواج میں مبتلا ہو کر اپنا دین و مذہب گم کر بیٹھا تھا ۔ اور رسوم و رواج ہی کو دین و شریعت کا مقام دیا جا رہا تھا ادھر دینی درسگاہوں میں منطق و فلسفہ نے حدیث و تفسیر کی جگہ حاصل کرلی تھی اور علماء و فضلا زندگیوں کا بیشتر حصہ انہی علم کی تحصیل و تعلیم میں صرف کر دیا کرتے تھے ۔ امام العصر نے حدیث اور تفسیر کو ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں اپنا مقام دلایا ۔ آج دنیا بھر میں حدیث پڑھنے پڑھانے کے لئے ان سے عملی ۔ ان سے بہتر اور ان سے کثیرالاشاعت اور کوئی سند ہے ہی نہیں ۔

حدیث کی طرح امت قرآن سے بھی واجبی سا تعلق قائم رکھے ہوئے تھی ' امام العصر نے اس تعلق کو بھی از سر نو مستحکم کیا اور ترجمہ فارسی ترجمہ و تفسیر فتح الرحمان لکھ کر اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے ایک بہت بڑی تحریک کا آغاز کیا ۔

فقہ کی دنیا میں امام العصر نے گرانقدر خدمات انجام دیں ۔ مسالک کے مابین فقہی اختلافات کو کم کیا ۔ دور جدید کے تقاضوں کے مطابق آٹھ شرائط پر پورا اترنے والے فقہا کو اجتہاد کرنے کی ترغیب دی اور اجتہاد کو ہر دور کے لئے فرض کفایہ قرار دیا ۔ الغرض فکری و علمی دنیا میں ان کے بے شمار

کارہائے نمایاں ہیں۔ جن کا ذکر موجب طوالت ہوگا۔

(۲) جبکہ اس کا دوسرا مرحلہ اسلام کے غلبے کے لئے سیاسی کوششوں کا آغاز ہے۔ وہ ہندوستان کی تاریخ کے پہلے شخص تھے، جنھوں نے "درویش" ہوتے ہوئے بھی بادشاہوں جیسا کردار ادا فرمایا اور ایک ایسی عظیم سیاسی و مذہبی تحریک کی بنیاد رکھی جس کے اثرات علماء دیوبند کی جدوجہد کی صورت میں اس وقت بھی باقی ہیں اور شاید قیامت تک باقی رہیں گے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی بھی اپنے بلند مرتبہ استاد سے بہت زیادہ متاثر تھے، اس لئے اگر یہ کہا جائے تو بجا ہوگا کہ انھوں نے بھی اپنی پوری زندگی اپنے عظیم المرتبت استاد کے نصب العین کی تعمیل و تکمیل میں صرف کر دی۔

قاضی صاحب نے امام العصر سے "عشرہ متداولہ" (حدیث کی دس بڑی کتابیں) کیا پڑھی تھیں کہ اس سے ان کی زندگی کا نقشہ ہی بدل گیا۔ قاضی صاحب نے مختلف علوم وفنون پر کم و بیش ۳۶ کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ ان میں سے آپ کوئی کتاب اٹھا کر دیکھ لیں اس میں آپ کو حدیث کا رنگ غالب نظر آئے گا۔ ایک چھوٹی سی مثال پیش کرنا مناسب ہوگا۔

قاضی صاحب نے علم ضرورت کے مسائل پر ایک چھوٹی سی فارسی کتاب "مالا بدمنہ" (جس کے بغیر چارہ نہ ہو) لکھی ہے بظاہر تو یہ ایک عام سی کتاب ہے اور مبتدی طلباء کے لئے لکھی گئی ہے۔ مگر اس میں بھی حیرت انگیز طور پر حدیث اور مسالک اربعہ کے جمع و تطبیق کا رنگ غالب ہے، مثلاً ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں:

"در فجر قراءت طویل خواند ـــ ابوبکر صدیق

ـــ در نماز فجر دریک رکعت۔ سورہ بقرہ خواندہ و پیغمبر در دو رکعت مغرب سورہ اعراف خواند و عثمان در نماز فجر اکثر سورہ یوسف میخواند لیکن رعایت حال مقتدیان ضرور است

حضرت ابوبکر صدیقؓ نماز فجر کی ایک رکعت میں سورہ بقرہ پڑھتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مغرب کی نماز میں سورہ اعراف پڑھتے تھے۔ حضرت عثمانؓ فجر میں اکثر سورہ یوسف تلاوت فرماتے تھے۔ لیکن مقتدیوں کے حال کی رعایت رکھنا ضروری ہے۔

اس طرح دیہات میں نماز جمعہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

"پس نزد امام اعظم در دیہات جمعہ جائز نیست و نزد شافعی و اکثر ائمہ جمعہ جائز است

امام اعظم کے نزدیک دیہات میں جمعہ جائز نہیں۔ مگر امام شافعی اور اکثر ائمہ کے نزدیک جائز ہے۔

اسی طرح انھوں نے قرآنی علوم کے عام کرنے کے لئے عربی زبان میں "تفسیر مظہری" تصنیف فرمائی۔ راقم الحروف نے اپنے تحقیقی مقالے میں یہ ثابت کیا ہے کہ "تفسیر مظہری" عربی زبان میں:

ہندوستان بھر میں پہلی باقاعدہ مکمل تفسیر ہے۔ اس سے پہلے جو تفاسیر لکھی گئی ہیں انہیں مکمل تفاسیر ہرگز نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اور یہ تفسیر امام العصر شاہ ولی اللہ کے معارف قرآنیہ کو عام کرنے کے مشن کا ہی حصہ ہے۔

قاضی صاحب نے اپنے بلند پایہ استاد کے تصور فقہ و اجتہاد کو مکمل طور پر اختیار کیا۔ انہوں نے اپنی تفسیر میں اور بعض دیگر کتابوں میں اس موضوع پر اتنا مفصل اور جامع کام کیا ہے کہ ہندوستان بھر کی مسلم تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ وہ اپنے استاد و مربی امام العصر شاہ ولی اللہ سے اس بارے میں پوری طرح ہم آہنگ ہیں 'کہ حدیث پر کسی کے قول و قیاس کو ترجیح نہیں' دی جاسکتی۔ اپنے اس اصول کے تحت انہوں نے کس جگہ شوافع اور دوسرے اہل مسالک کی خبر لی ہے۔ تو خود احناف کو بھی معاف نہیں کیا۔ وہ خود ایک مقام پر امام ابو حنیفہ کا یہ قول نقل فرماتے ہیں:

عن عبداللّٰہ بن المبارک قال سمعت ابا حنیفہ یقول اذا جاء عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم فعلی الراس و العین ...... و نقل انہ قال اذا اصح الحدیث فھو مذھبی (۱۳) ....

عبداللہ بن مبارک بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے امام ابو حنیفہ کو کہتے ہوئے سنا کہ جب کوئی آنحضرت صلی اللہ علی وآلہ وسلم کی حدیث ملے تو وہ ہمارے سر آنکھوں پر۔ اور اس طرح ان سے یہ نقل کیا گیا ہے کہ جب کوئی صحیح حدیث مل جائے تو وہی میرا مسلک ہے۔

علاوہ ازیں، تصوف کے میدان میں بھی انہوں نے بہت کچھ لکھا اور تصنیف کیا اور اپنے استاد محترم کی تعلیمات کے مطابق وہ تصوف کو احسان قرار دیتے ہیں، انہوں نے "احسان" کے باب کو اپنی فقہ کی کتاب "مالا بدمنہ" میں بھی شامل کیا ہے، حالانکہ فقہاء اپنی کتابوں میں تصوف کو قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتے، مزید برآں انہوں نے تفسیر مظہری میں صوفیانہ معارف و نکات کو ہر جگہ نمایاں طور پر پیش کیا ہے۔ تاکہ ظاہر کے ساتھ ساتھ باطن کی بھی اصلاح ہوسکے، وہ اپنی تفسیر میں اصلاح کے نقطہ نظر سے ہی فقرا کے دامن سے وابستہ ہونے کو فرض و واجب قرار دیتے ہیں۔

عملی زندگی میں "روزگار" کے طور پر انہوں نے منصب قضا کو اختیار فرمایا۔ حالانکہ بظاہر دنیوی کاموں اور سرکاری مناصب میں انہماک و صوفیاء کے منصب کے خلاف ہے۔ لیکن جیسا کہ راقم الحروف نے اپنے تحقیقی مقالے میں ثابت کیا ہے کہ قاضی صاحب کا عہدہ قضا کو قبول کرنا اور کم و بیش نصف صدی تک اس کے ذریعے اہل علاقہ کی خدمت کرنا اپنے استاد و مربی کے مشورہ کے عین مطابق تھا۔ اور قاضی صاحب کا یہ اقدام امام العصر کی سیاسی پالیسی کا ہی حصہ ہے۔ کیوں کہ وہ دور سخت افراتفری اور انتشار کا دور تھا۔ غیر مسلم طاقتیں اپنی اپنی جگہ منظم ہو رہی تھیں۔ ان حالات میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور مرزا مظہر جانجاناں شہید نے ایک واضح پروگرام کے تحت اپنے اپنے

شاگردوں اور فیض یافتگان کو مختلف علاقوں، مختلف لشکروں اور مختلف دفاتر میں مامور فرمایا۔ ان کے ان شاگردوں کے ذریعے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ لوگوں کو صالح قیادت میسر آئی اور دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ ان افراد کے ذریعے مختلف عمال اور گورنروں کے ساتھ قریبی رابطہ اور تعلق پیدا ہوا۔ ان دونوں بزرگوں نے اس تعلق کو مسلمانوں کی تنظیم اور وحدت پیدا کرنے کے لئے بھرپور طریقے سے استعمال کیا۔ چنانچہ بطور قاضی، قاضی صاحب کو، دہلی، پانی پت اور بعض دیگر نواحی علاقوں میں کام کرنے کا موقعہ ملا۔ اور وہ غازی الدین عماد الملک (موجود ۱۷۵۹ء)، نواب نجیب الدولہ (م ۱۱۸۴ھ / ۱۷۷۰ء)، نواب افضل الدولہ (برادر نواب نجیب الدولہ) نواب ضابطہ خان (م ۱۱۹۹ھ / ۱۷۸۴ء)، نواب ابوالقاسم (م ۱۷۷۶ء) ملا رحیم دار روہیلہ اور نواب مجد الدولہ کے ساتھ منسلک رہ کر کام کرتے رہے۔ یہ تمام لوگ وہ ہیں جو اس زمانے کی مسلم سیاست کے اہم ستون تھے۔ اور جیسا کہ تاریخی شہادت سے ثابت ہے کہ ان میں سے چند ایک ایسے ہیں جن سے امام العصر شاہ ولی اللہ نے بھی ہندوستان کی مسلم دنیا کو بچانے کا کام لیا۔

جب امام العصر کے ایما پر ابدالی نے پانی پت کے میدان میں مرہٹہ طاقت کو ہمیشہ کے لئے کچلا اور بلامبالغہ اس میدان میں لاکھوں مرہٹے کام آئے، اس وقت بھی قاضی صاحب پانی پت میں موجود تھے اور علاقے کے حاکم تھے۔ قاضی صاحب کی انہی خدمات کے پیش نظران کو پانی پت کا قلعہ دار بنانے کی بھی تجویز ہوئی۔ حضرت مظہر جانجاناں چاہتے تھے کہ قاضی صاحب یہ عہدہ قبول کرلیں۔ لیکن قاضی صاحب نے اس کو اپنی ذات کے لئے پسند نہ فرمایا۔ الغرض قاضی صاحب کا یہ عہدہ بھی ان بزرگوں کی منشا کے عین مطابق تھا اور ان کی وجہ سے علاقے میں ایسا امن و امان دیکھنے میں آیا جو اس دور میں کسی جگہ دیکھنے میں نہ آیا۔ مولوی نعیم اللہ بہڑائچی لکھتے ہیں:

فقیر کاتب گوید کہ ایں چنیں اجرای و نفاذ احکام شریعت از برکت وجود شریف ایشاں کہ در قصبہ پانی پت رو باوجود غلبہ کفار مرہٹہ موجود است در ممالک دیگر اسلام بالفعل یافتہ نمیشود۔

فقیر کاتب یہ کہتا ہے کہ ان کی وجہ سے قصبہ پانی پت میں احکام شریعت کا نفاذ باوجود کفار مرہٹہ کے سیاسی غلبہ کے ہوتے ہوئے ایسا دیکھنے میں آتا ہے کہ فی الوقت دوسرے کسی اسلامی ملک میں بھی ایسا نفاذ شریعت موجود نہیں ہے۔

(الحق، جولائی ۹۳ء)

سید مصطفیٰ علی بریلوی

پروفیسر پنڈت حبیب الرحمٰن

پنڈت حبیب الرحمٰن ضلع کھیری اودھ کے رہنے والے ۔ عربی ، فارسی ، اردو کے فاضل ، سنسکرت کے عالم اور ، بہار اینڈ اڑیسہ سنسکرت ایسوسی ایشن آرا ، بہار بھارت سے شاستری کی سند حاصل کی ۔ ۱۹۲۳ء تا ۱۹۵۶ء علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں سنسکرت کے لیکچرر رہے ۔

آپ کی دو کتابیں بہت مقبول ہوئیں جن کے نام ۔۔ فلسفۂ انبساط مطبوعہ مسلم یونیورسٹی ۱۹۳۰ء (شاعری و ڈرامہ سے متعلق سنسکرت کی اصطلاحات پر فلسفیانہ بحث) اور ۔۔ ایش اپنشد کی تفسیر ۔۔ تنویر کا وش ۔

ہندوستان کے قدیم براہمین دور کے عالم ڈاکٹر بھگوان داس نے پنڈت حبیب الرحمٰن کی آنوالذکر کتاب پر اظہار رائے کرتے ہوئے فرمایا :

" آپ کی لامحدود علمیت پر تعجب ہوا ، فارسی ، عربی ، سنسکرت اور انگریزی چار مشکل زبانوں پر آپ کو ملکہ ہے "

انڈیا کونسل فار کلچرل ریلیشنز میں پنڈت جی کی تقریر پر اخبار ہندوستان ٹائمز دہلی نے اپنی اشاعت ۱۸ میں لکھا کہ ،

" حبیب الرحمٰن شاستری نے ان کتابوں کی روشنی میں کچھ تخلیقی نظریات پیش کر کے بعض مشہور پنڈتوں کے مقابل میدان میں آگئے ہیں "

پنڈت حبیب الرحمٰن کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے شدھی سنگھٹن کی تحریک کے زمانہ میں ہندو دھرم پر بحث سے مناظرے میں غیر مسلم پنڈتوں کو علمی انداز میں مغلوب کیا ۔ مزید تفصیلات کے واسطے ملاحظہ کیجئے کتابچہ " علامہ " اپنے خطوط کے آئینے میں ، مرتبہ جناب حبیب الرحمٰن ۔

پنڈت حبیب الرحمٰن کی توجہ سے درجنوں سنسکرت کے عالم پیدا ہوئے ۔ جن میں قاری بشیر الدین پنڈت بدایونی ثم شاہجہاں پوری نے بڑا نام پیدا کیا ۔

ڈاکٹر سید داؤد اشرف

پچاس سال قبل حیدرآباد میں اسٹوڈنٹس کنونشن کا پہلا سشن

نمائندہ شخصیتوں کی سرپرستی اور وابستگی

پچاس سال قبل نومبر ۱۹۴۳ء میں آل حیدرآباد اسٹوڈنٹس کنونشن کا پہلا سشن شہر حیدرآباد میں منعقد ہوا تھا۔ اس سشن کے بارے میں اسٹیٹ آرکائیوز سے اہم راز کا مواد دستیاب ہوا ہے جس میں سشن کی تفصیلی روئیداد اور بعض راز کی رپورٹ بھی شامل ہے۔ اس سے ایک سال قبل بھی اس یونین کے کنونشن کا ۱۱ر دسمبر ۱۹۴۲ء کو انعقاد عمل میں آچکا تھا لیکن اس میں شرکا کی تعداد کم تھی۔ صدر استقبالیہ کے شریک نہ ہونے کی وجہ سے خطبۂ استقبالیہ اور خطبۂ صدارت ملتوی کردیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ ریاست کی کوئی اہم اور ممتاز شخصیت اجلاس شریک نہ تھی غالباً یہی وجہ تھی کہ نومبر ۱۹۴۳ء میں منعقد ہونے والے سشن کو آل حیدرآباد اسٹوڈنٹس کنونشن کا پہلا سشن کہا گیا۔ آرکائیوز سے دستیاب شدہ مواد کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ پچاس سال قبل حیدرآباد کے باشعور نوجوان کن رجحانات کے حامل تھے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے حیدرآباد میں نئی نسل کے دل و دماغ پر اثر انداز ہونے والی شخصیتیں کون سی تھیں۔ اس زمانے کے حالات کیا تھے اور ان کی جانب طلبا اور نوجوانوں کا ردعمل کیا تھا؟ اس بات سے بھی آگاہی ہوتی ہے کہ تعلیم یافتہ اور زیر تعلیم نئی نسل پر بائیں بازو کے خیالات کی چھاپ گہری تھی جو چند سال بعد نمایاں طور پر ابھری۔ اس کے علاوہ حکومت وقت کی جانب سے تحریر و تقریر کی آزادیوں اور دیگر بنیادی حقوق پر جس قسم کی تحدیدات اس زمانہ میں موجود تھیں اس پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

آل حیدرآباد اسٹوڈنٹس کنونشن کے پہلے سشن کی راز کی رپورٹ جسے اس وقت کے کوتوال بلدہ حیدرآباد رحمت یار جنگ نے معتمد تعلیمات و امور عامہ کو پیش کی تھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس سے نہ صرف مندوبین کی تفصیلات منظر عام پر آتی ہیں بلکہ حیدرآباد میں طلبا کی ابتدائی سرگرمیوں کا ایک واضح خاکہ بھی ابھر آتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ طلبائی سرگرمیوں سے حیدرآباد کی چند نامور شخصیتوں کی دلچسپی اور وابستگی کا بھی پتہ چلتا ہے جن میں سے اکثر نے آگے چل کر بین الاقوامی شہرت حاصل کی جیسے سروجنی نائیڈو، پدمجا نائیڈو، قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر سید عبداللطیف، ڈاکٹر ابشر، نامنہ نوبا، علی اختر، اکبر وفاقانی، مخدوم محی الدین، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، صاحبزادہ میکش اور سلیمان اریب وغیرہ۔

کوتوال بلدہ حیدرآباد کے راز کی رپورٹ کے مطابق سشن کی تفصیلات کچھ اس طرح ہیں؛

آل حیدرآباد اسٹوڈنٹس کنونشن کا پہلا سیشن۔ آل حیدرآباد اسٹوڈنٹس یونین کے زیر اہتمام خاص طور پر ۱۳ لغایت ۱۵ نومبر ۱۹۴۳ء کو منعقد ہوا۔ تقریباً تین ہزار طلبا اور دیگر افراد کو دعوت نامے جاری کیے گئے تھے۔ لیکن شرکت کرنے والوں کی تعداد حوصلہ افزا نہیں تھی اور کسی بھی نشست میں چار سو سے زیادہ طلبا موجود نہیں تھے۔ یہ سیشن حسب ذیل پروگرام پر مشتمل تھا۔

۱۔ اصل اجلاس (Proper Session) بصدارت قاضی عبدالغفار ایڈیٹر پیام
۲۔ مشاعرہ زیر صدارت سید محمد اکبر وفاقانی
۳۔ کلچرل کانفرنس سیشن کی آخری نشست بصدارت ڈاکٹر سید عبداللطیف۔

اصل اجلاس (Proper Session) کا آغاز سیٹھ جارجس جمنازیم میں ۱۳ نومبر کو نو بجے پرچم کشائی کی تقریب سے ہوا۔ مس پدمجا نائیڈو نے ایک بڑا سرخ پرچم ساٹھ طلبا کے اجتماع میں لہرایا جس پر آزادی، امن اور ترقی کے الفاظ تحریر تھے۔ پرچم کشائی کے بعد پدمجا نائیڈو نے مختصر تقریر کی جس میں انھوں نے طلبا سے اپنے آپ کو اس رول کے لیے تیار کرنے کے لیے کہا جو انھیں مستقبل میں ادا کرنا ہے۔ انھوں نے موجودہ نازک دور میں دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات سے باخبر رہنے کی تاکید کی لیکن عملی سیاست میں داخل نہ ہونے کا مشورہ دیا۔ اس کے بعد مسز سروجنی نائیڈو کا پیام پڑھ کر سنایا گیا۔ مسز سروجنی نائیڈو نے اپنے پیام میں اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا کہ وہ امور جو طلبا سے متعلق ہیں ان کے علاوہ ایسے بھی امور جو بڑی اہمیت کے حامل ہیں مثلاً غذائی مسئلہ وغیرہ اس سیشن کے پروگرام میں شامل کیے گئے ہیں۔ اپنے پیام کے آخر میں انھوں نے طلبا کو ان کے مختلف فرائض کی جانب ان الفاظ میں توجہ دلائی۔ اگرچہ طلبا کی پہلی ترجیح یہ ہونی چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اپنی تمام تر توجہ کے ساتھ تعلیم کے لیے وقف کر دیں لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی تعلیم کے ایک جزو لاینفک کی حیثیت رکھتی ہے کہ طلبا دنیا کی تاریخ پر اثر انداز ہونے والی تحریکوں میں بھی اپنی ذہانت کی انتہائی گہرائیوں کے ساتھ وسیع تر دلچسپی لیں اور ترقی کے متعلق تمام عصری خیالات و نظریات سے بھی آگاہ رہیں۔ ریاست حیدرآباد کے نوجوانوں کا وقت اور حالات کے تقاضوں سے ہم آہنگ مشن یہ بھی ہو کہ وہ ریاست کے تمام طبقات میں جو ریاست کے جزو لاینفک ہیں اتحاد اور اشتراک باہم کو فروغ دیں۔

کوکب دری، ایل ایل۔ بی کے طالب علم اور صدر نشین استقبالیہ کمیٹی نے ایک طویل خطبہ استقبالیہ پڑھا جس میں انھوں نے وہ تمام باتیں کہیں جو کہ کمیونسٹ طلبا جلسہ عام کو مخاطب کرنے کا موقع ملنے پر بیان کرتے ہیں مثلاً فسطائیت کی مخالفت، ہندوستان کے خلاف جاپانی جارحیت کی مزاحمت، کانگریس اور مسلم لیگ میں مفاہمت کی حمایت، قومی حکومت کا قیام، خوراک کے مسئلے کا حل وغیرہ۔ اپنے خطبے کے آخر میں کوکب دری نے حیدرآباد کے تعلیمی نظام پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ یہ نظام صرف دفتر کے اہلکار پیدا کر رہا ہے اس سے اچھے محب وطن شہری پیدا نہیں ہو رہے ہیں جو کہ قوم کے لیے اثاثہ ہوتے ہیں۔

قاضی عبدالغفار ایڈیٹر پیام کے مختصر صدارتی خطبہ کی نوعیت کم و بیش پدرانہ نصیحت کی تھی جس میں طلبا کو کیا کرنا اور کیا نہیں کرنا چاہیے کی ہدایت دی گئی تھی۔ انھوں نے طلبا کو مشورہ دیا کہ وہ پہلے اپنی پڑھائی کی جانب توجہ دیں اور اس کے بعد بچے ہوئے وقت کو تعلیم کی اشاعت اور دیہی بازتعمیری کاموں کے لیے صرف کریں۔ انھوں نے کہا کہ طلبا کو یقیناً سیاسیات کا مطالعہ کرنا چاہیے لیکن سیاست میں سرگرمیوں کے ساتھ حصہ لینے کے خلاف انھوں نے سخت انتباہ دیا اور کہا کہ طلبا اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد سیاست میں حصہ لے سکتے ہیں۔ آخر میں انھوں نے طلبا کو غیر دوراندیش سیاسی قائدین سے جو طلبا کی قوت اور جوش و جذبہ کا استعمال کر کے اپنے مقاصد
[illegible]

اس کے بعد اورنگ آباد، ناندیڑ، پربھنی، ورنگل اور کھمم میٹ کے نمائندوں نے اپنی اپنی شاخوں کی سالانہ رپورٹیں پڑھیں۔ ان رپورٹوں کی پیش کشی کے بعد راج بہادر گوڑ، صدر کامریڈ اسوسی ایشن اور آل اسٹوڈنٹس یونین کے سرکردہ کارکن نے مرکزی یونین کی سالانہ رپورٹ سنائی۔ راج بہادر گوڑ نے اپنے خطبے کی ابتدا میں ان حالات کا تفصیل سے جائزہ لیا جن کی وجہ سے یونین کی تشکیل عمل میں آئی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے یونین کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اسٹوڈنٹس یونین نے اتحاد اور عمل کا پیام دیتے ہوئے طلبا کا پیام دیتے ہوئے طلبہ برادری کے جمود کو توڑا، طلبا کو ان کے اہم حقوق اور فرائض کا احساس دلایا۔ اس کے علاوہ یونین نے طلبا کو اپنے مسائل سے خود نمٹنے اور مشکلات میں مخصوص بنیادوں پر متحد اور منظم ہونے پر زور دیا۔ مختصر یہ کہ آزادی، امن اور ترقی کے پرچم تلے یونین نے حیدرآباد کی طلبا برادری کو ایک مرکز پر مجتمع کرنے کی ذمہ داری نبھائی۔

اس کے بعد راج بہادر گوڑ نے اضلاع میں قائم کی گئی شاخوں کے بارے میں تفصیلات بتائیں۔ مرکزی یونین کی جانب سے طلبا کی شکایات دور کرنے کے لیے جو اقدامات کیے گئے تھے اس پر بھی انھوں نے روشنی ڈالی۔ بعد ازاں انھوں نے یونین کی دیگر سرگرمیوں جیسے کتب خانوں، مطالعہ گھروں اور فرسٹ ایڈ جماعتوں کے انعقاد کی تفصیلات بھی پیش کیں۔ راج بہادر گوڑ نے بتایا کہ یونین کی سرگرمیوں میں سب سے اہم سرگرمی ودیارتی اخبار کا اجرا ہے۔ اس اخبار کے اجرا کا مقصد یونین کی سرگرمیوں کی تفصیلات شائع کرنے کے علاوہ موجودہ سیاسی، معاشی، سائنسی اور سماجی مسائل کو مختصر اور سریع الفہم انداز میں طلبا کی معلومات کے لیے پیش کرنا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یونین کے اراکین کو چاہیے کہ وہ یونین کی سرگرمیوں کے تعلق سے جو بھی رائے دینا چاہتے ہوں یا تنقید کرنا چاہتے ہوں ودیارتی اخبار پر تحریر کر دیں۔

اس کے بعد صبح کی نشست اختتام کو پہنچی۔ سہ پہر کی نشست میں حسب ذیل چار قرار دادیں متفقہ طور پر منظور کی گئیں۔

۱) پہلی قرارداد میں طلبا سے آل حیدرآباد اسٹوڈنٹس یونین میں شامل ہونے پر زور دیتے ہوئے کہا گیا کہ ایک غیر سیاسی اور ایک غیر طبقاتی جماعت ہے اور جو طلبا کے حقوق کے لیے جد و جہد کر رہی ہے۔

۲) دوسری قرارداد میں طلبہ سے اپنے اپنے مدرسوں میں یونین تشکیل دینے کی اپیل کی گئی اور ارباب ذمہ دار سے درخواست کی گئی کہ وہ طلبا کے یونین تشکیل دینے کے حق کو تسلیم کریں۔

۳- تیسری قرارداد میں جامعہ عثمانیہ کے ناقص نتائج پر احتجاج کرتے ہوئے جامعہ کے تمام امتحانات سال میں دو مرتبہ منعقد کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔

۴- چوتھی قرارداد میں جامعہ عثمانیہ کے طلبہ کے بارے میں ضابطۂ اخلاق کو منسوخ کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ قراردادوں کے مکمل متن کا انگریزی ترجمہ کوتوال بلدہ حیدرآباد کی رپورٹ کے ساتھ منسلک کیا گیا۔

۱۳ر نومبر کو ریڈی ہاسٹل میں مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا جس کی صدارت سید محمد اکبر وفا قانی نے کی۔ اس مشاعرے میں مخدوم محی الدین، علی اختر، کامریڈ سلیمان (سلیمان اریب)، صاحبزادہ محمد علی خاں میکش اور دوسرے شعرا نے کلام سنایا۔

تیسری اور آخری نشست ۱۴ر نومبر کو ریڈی ہاسٹل میں منعقد ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر سید عبد اللطیف نے کی۔ حاضرین کی تعداد تقریباً پانچ سو تھی۔ ڈاکٹر ایشور ناتھ ٹوپا، لیکچرر عثمانیہ یونیورسٹی نے ہندوستانی تہذیب کے عنوان پر تقریر کی۔ اس نشست میں بس ایک تقریر ہوئی۔ مقرر نے ہندو مسلم اتحاد کے موضوع پر تفصیل سے اظہار خیال کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندو مسلم مسئلہ موجودہ دور کے خود غرض قائدین کے دماغ کی اختراع ہے۔ اگر یہ کوئی بنیادی سوال ہوتا تو اس وقت ہی اٹھتا جب کہ ہندوستان پر مسلمان حکمراں تھے اور ان کی رعایا میں ہندو

اکثریت میں تھے۔ مقرر نے پاکستان کے مطالبہ کا بھی حوالہ دیا۔ انھوں نے اس مطالبے کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کے تمام مسلمان اور ہندو تہذیبی اکائیاں نہیں ہیں کہ ان کے لیے علاحدہ ہندوستان اور پاکستان بنایا جائے۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف نے اپنے صدارتی کلمات میں پاکستان کے تعلق سے ڈاکٹر ثریا کے خیالات کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر لطیف کی پاکستان اسکیم کا مقصد ہندوستان کے حصے بخرے کرنا نہیں۔ اس طرح ڈاکٹر ثریا کے اعتراضات بے بنیاد ہیں۔

رپورٹ کے آخر میں کوتوال بلدہ حیدرآباد نے لکھا کہ یہ بات تعجب خیز تھی کہ سامعین کی اکثریت نے پاکستان کے تعلق سے ڈاکٹر ثریا کے نقطۂ نظر کی تائید کی حالاں کہ سامعین میں بیشتر ریفرنسٹ تھے اور کمیونسٹوں نے مختلف دیگر موقعوں پر مطالبۂ پاکستان کی تائید کا موقف اختیار کیا تھا۔

کوتوال بلدہ حیدرآباد کی مذکورۂ بالا راز کی رپورٹ وصول ہونے پر حکومت کی جانب سے جو کارروائی کی گئی تھی اس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

علی یاور جنگ معتمد تعلیمات نے ایک راز کا مراسلہ مورخہ ۳۰ دسمبر ۱۹۴۳ء سید محمد اعظم ناظم تعلیمات کو روانہ کیا۔ جس میں انھوں نے آل حیدرآباد اسٹوڈنٹس کنونشن نام کی تنظیم کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کی خواہش کی اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دریافت کیا کہ آیا اس تنظیم کو مسلمہ حیثیت حاصل ہے اور کیا محکمۂ تعلیمات کے اسٹاف کو اس تنظیم کی سرگرمیوں میں شرکت اور جلسوں کو مخاطب کرنے کی اجازت حاصل ہے؟

سید محمد اعظم ناظم تعلیمات نے اپنے مراسلہ مورخہ ۳ جنوری ۱۹۴۴ء میں جواباً تحریر کیا کہ ان کے ہاں آل حیدرآباد اسٹوڈنٹس کنونشن کے بارے میں کوئی معلومات موجود نہیں تھیں لیکن یہ آل حیدرآباد اسٹوڈنٹس یونین ہی ہے تو اس کی پالیسی و سرگرمیوں کے بارے میں کافی معلومات دستیاب تھیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنے ایک سابقہ مراسلے کا حوالہ دیا اور طلبا کو سیاسی سرگرمیوں سے باز رکھنے کے لیے جو سرکیولر نظامت تعلیمات کی جانب سے جاری کیا گیا تھا اس کی اس کی ایک نقل اپنے مراسلے کے ساتھ منسلک کی اور لکھا کہ محکمۂ تعلیمات کے اساتذہ اور عہدیدار اس تنظیم کی سرگرمیوں میں نہ تو حصہ لے سکتے ہیں اور نہ ہی اس کے جلسوں کو خطاب کر سکتے ہیں۔

علی یاور جنگ معتمد تعلیمات نے ایک راز کا مراسلہ مورخہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۴ء قاضی محمد حسین پرو وائس چانسلر کو لکھا جس میں انھوں نے تحریر کیا کہ حیدرآباد میں طلبہ کی چند غیر مسلمہ اور قابل اعتراض تنظیمیں موجود ہیں۔ جیسے آل حیدرآباد اسٹوڈنٹس کنونشن۔ اس محکمہ کو مصدقہ حلقوں سے ملنے والی رپورٹوں سے اس بات کا علم ہوا ہے کہ آپ کے ایک اسٹاف ممبر ڈاکٹر ثریا نے حال ہی میں آل حیدرآباد اسٹوڈنٹس کنونشن کے ایک جلسہ میں شرکت کی تھی۔ چوں کہ یہ بات مناسب نہیں ہے اس لیے مجھ سے خواہش کی گئی ہے کہ میں آپ سے درخواست کروں کہ آپ ڈاکٹر ثریا سے ذاتی طور پر یہ بات کہیں اور کسی میٹنگ میں دیگر اسٹاف ممبران سے بھی کہہ دیں۔ اس بارے میں سرکیولر جاری کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

قاضی محمد حسین پرو وائس چانسلر نے اپنے جوابی مراسلہ ۲۹ مارچ ۱۹۴۴ء میں یہ اطلاع دی کہ اس بارے میں وہ ڈاکٹر ثریا سے گفتگو کر چکے ہیں اور اس گفتگو کے دوران انھیں ڈاکٹر ثریا نے بتایا کہ تقریباً دو ماہ قبل چند طلبا ان کے پاس یہ درخواست لے کر آئے تھے کہ وہ کسی بھی موضوع پر سالانہ میٹنگ میں تقریر کریں۔ انھوں نے یہ دریافت نہیں کیا تھا کہ ان کی اسوسی ایشن کون سی ہے اور اس کے اغراض و مقاصد کیا ہیں۔ وہ آئندہ احتیاط برتیں گے۔ پرو وائس چانسلر نے یہ بھی لکھا کہ چوں کہ اس وقت جامعہ میں امتحانات ہو رہے ہیں اس لیے اسٹاف ممبران کی میٹنگ طلب کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے۔ بعد میں جب موقع ملے گا تو اسٹاف کو اس بارے میں مطلع کر دیا جائے گا

سہا مجددی

دیکھا خرام ناز سہا جا رہے ہیں وہ
پستی کو سوئے عالم بالا لیے ہوئے

سہا صاحب نے یہ شعر کہا ہے جس بہو قامت کے خرام ناز سے متاثر ہو کر کہا ہو۔ صادق انہیں پر آتا تھا۔ اس کا قد مشکل سے ساڑھے تین فٹ ہو گا۔ لیکن اس کوتاہ قامتی کے ساتھ جب وہ اپنی شاعرانہ فرض لے چلتے تو نظر آتا کہ پستی بلندی کی طرف گزر رہی ہے۔

سید ممتاز احمد سہا جنہیں دنیائے ادب نے احترام سے ہمیشہ مولانا سہا کہہ کر یاد کیا۔ ۹ فروری ۱۸۸۲ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے اور زندگی کے کم و بیش بچپن سال خوش و ناخوش گزار کر اسی خاک کا پیوند ہو گئے۔

مولانا سہا کے شعر نے روئے زمین تمام لیا ہو یا نہ ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ اٹھارہ بیس سال تک ان کے اشعار کا کیا کہیں کمان ابروئے غزل بنا رہا۔ صاف معلوم رہا تھا کہ حسرت، فانی، اصغر، جگر اور یگانہ کے ساتھ ایک اور منفرد آواز ایوان غزل میں گونج رہا ہے لیکن جس تیزی سے یہ آواز بلند ہوئی تھی اسی سرعت سے کھو گئی اور مولانا سہا کا نام مخصوص ادبی حلقوں کے سوا اردو داں طبقے کے ذہن سے اتر گیا۔ اس فراموش کاری کا الزام زمانے کی عام روش پر بھی ہے اور خود مولانا کی شان بے نیازی پر بھی۔ وہ اپنی قدر و قیمت سے بے خبر نہ تھے۔ لیکن ان کا خمیر بھوپال کی مٹی سے اٹھا تھا جس کا خاصہ یہ ہے کہ اس میں نمود و نمائش کی کوئی رمق نہیں پائی جاتی۔ مولانا نے نہ اپنے دیوان کی اشاعت سے دلچسپی لی نہ پابندی سے ادبی رسائل کے ذریعے اپنے شعری وزن و وقار کا پڑھنے والوں کو احساس دلاتے رہے تاہم مولانا کا جس قدر کلام وقتاً فوقتاً ادبی جرائد میں شائع ہو چکا تھا اور خاص کی چیز سمجھا جاتا تھا اس کے پیش نظر ارباب نقد و نظر سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ مولانا سہا کے ادبی مرتبہ کا تعین کرنے میں غفلت سے کام نہ لیں گے۔ لیکن

کھویا سہا کو بھی تری بیداد ناز نے
کن خوبیوں کا شخص کہ پیدا نہ ہو کہیں

ادبی شخصیات کے ذکر میں مولانا سہا کی پست قدی ایسا واقعہ ہے جس کی نظیر ابھی کہیں نہیں ملتی۔ اتنے چھوٹے سے قد کا انسان اتنے بڑے ادبی کا مالک ہو

از اختر سعید خاں

سکتا ہے اس کا اندازہ مولانا سہا کو دیکھے اور ملے بغیر ممکن نہ تھا۔ مولانا غیر معمولی طور پر پست قد تھے لیکن بدوضع نہ تھے ان کے اعضائے جسمانی ان کے قد کے لحاظ سے حد درجہ متناسب تھے۔ ان کے چھریرے بدن، کھلتے ہوئے گندمی رنگ اور چہرے پر شوخی و متانت کی آمیزش نے انہیں کچھ ایسا بنا دیا تھا کہ دیکھو تو بھلے لگتے تھے۔ ان کی کوتاہ قامتی پر پیار آتا تھا جسے کوئی نہ چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قد آور سے قد آور شخصیتوں کی محفل میں بھی سہا کی جلوہ گری ماند نہیں پڑی۔

وہ سرو قامت حسینوں کی انجمن میں بھی بار یاب رہے اور دراز قامت ادیبوں سے بھی لوہا لیتے رہے لیکن ان کی پست قدی کو نہ تمسخر کا نشانہ بنایا گیا نہ طنز تضحیک کا۔

مولانا سہا کے والد سید یحییٰ حسن صاحب شاہ جہاں بیگم والیہ بھوپال کے عہد میں نائب ناظم (ڈپٹی کلکٹر) کے عہدے پر فائز تھے۔ یحییٰ حسن صاحب کے بڑے بھائی سید محمود صاحب جو فن تجوید و قرأت میں کامل تھے بھوپال میں ملازم تھے۔ سید محمود صاحب کے پوتے رشید الحسن صاحب حال ہی میں آئی۔ جی۔۔۔۔۔۔۔ کے عہدے سے سبکدوش ہو کر بھوپال میں سکونت پذیر ہیں اور اس طرح مولانا سہا کا تعلق بھوپال سے قائم ہے۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم و تربیت بھوپال میں ہوئی۔ وہ مدرسہ سلیمانیہ اور جہانگیریہ اسکول کے طالب علم رہے لیکن ۱۸۹۸ء میں جب ان کے والد کا انتقال ہو گیا تو وہ بلند شہر چلے گئے جہاں ان کا ننھیال تھا۔ بلند شہر کے قیام میں انہوں نے فارسی اور عربی کا درس لیا۔ پھر علی گڑھ کالج میں داخل ہو گئے۔ کالج میں مولانا کی شعر گوئی کی بڑی دھوم تھی اور اسی خصوصیت کی بنا پر انہیں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت

کے لیے ٹونک کی طرف سے رنگون بھیجا گیا۔ ان کی صلاحیتوں کے پیشِ نظر نواب وقار الملک نے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ مولانا سہا نے علی گڑھ کالج میں ایف۔اے تک تعلیم حاصل کی۔

وہ ۱۹۲۱ء میں بھوپال آ گئے اور دیوانِ غالب کی شرح مطالب الغالب لکھی جو ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی۔ اس شرح میں مولانا نے اپنے ذہن کی رسائی سے غالب کے اشعار کے کچھ ایسے مطالب بیان کیے اور کچھ ایسے معانی تلاش کیے جن معانی اور مطالب تک غالب کے شارحین کی نظر نہیں پہنچی تھی۔ مولانا سہا کے بیان کردہ مطلب سے اتفاق کیا جائے یا نہ کیا جائے لیکن ان کی ذہانت اور فطانت کا ضرور قائل ہونا پڑتا ہے۔ مطالب الغالب کا ایک زمانے میں بڑا شہرہ تھا اور اردو دنیا میں مولانا سہا کا نام ادب و احترام سے لیا جاتا تھا۔ غالبیات کے مباحث میں اس شرح کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

۱۹۲۳ء میں مولانا سہا حکیم احمد شجاع کی دعوت پر لاہور چلے گئے اور ماہنامہ ہزار داستان سے منسلک ہو گئے۔ مطالب الغالب کی اشاعت سے پہلے مولانا سہا کے تغزل کی انفرادیت نے انہیں ادبی حلقوں میں امتیازی حیثیت عطا کر دی تھی اور صاحبانِ فکر و نظر ان کے کلام کو توجہ سے پڑھتے تھے۔ والد مرحوم (حامد سعید خاں صاحب حامد) فرماتے تھے کہ انہیں لاہور میں ایک بار مولانا سہا کے ساتھ علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔

علامہ نے دورانِ گفتگو فرمایا: "مولانا جب ہزار داستان آتا ہے تو پہلے میں یہ دیکھتا ہوں کہ کہیں سہا کی غزل ہے یا نہیں۔" ہزار داستان سے تعلق کے کچھ دن بعد مولانا سہا ریاست خیرپور میں نواب کے پرائیویٹ سیکریٹری ہو گئے۔ نواب خیرپور خود بھی شاعر تھے اور مولانا کی بے حد قدر کرتے تھے۔ یہ زمانہ مولانا کی فارغ البالی اور مکمل آسودگی کا تھا۔ والد مرحوم کا کہنا ہے کہ "جن دنوں مولانا سہا خیرپور میں تھے مجھے ایک خاص امر میں نواب زادہ سعید الظفر خاں صاحب مرحوم (نواب صاحب بھوپال کے بھتیجے) کی جانب سے نواب خیرپور کے پاس بھیجا گیا۔ مجھے وہاں کئی دن ریاست کا مہمان رہنا پڑا۔ مولانا سہا ایک شاندار کوٹھی میں تھے جس کا انتظام انہوں نے اہتمام سے رکھا تھا، خدم و حشم تھے اور وہ شاہانہ زندگی بسر کرتے تھے۔" یہی وہ زمانہ ہے جب مولانا کی سفارش پر میرے والد بھی خیرپور کے شاعرِ دربار مقرر ہوئے تھے۔ لیکن اپنی نظم "ترکمانہ" کی بنا پر معتوب ہوئے اور انہیں خیرپور چھوڑنا پڑا۔ مولانا ۱۹۲۷ء تک خیرپور میں رہے پھر کسی وجہ سے لاہور واپس آ کر ادبی رسائل خصوصاً "نیرنگِ خیال" سے متعلق ہو گئے۔ وہ ۱۹۲۹ء میں پھر بھوپال آ گئے۔

ان دنوں بھوپال میں ملکی اور غیر ملکی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ اہلِ بھوپال کا مطالبہ تھا کہ انہیں سرکاری ملازمتوں اور اعلیٰ عہدوں سے محروم رکھا جاتا ہے اور غیر بھوپالیوں کو ان پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اہلِ بھوپال کا حق ہے کہ وہ ملازمتوں اور عہدوں پر فائز ہوں۔ مولانا سہا نے بھی ایک بھوپالی ہونے کے رشتے سے اس تحریک کا ساتھ دیا لیکن حکومت سے تصادم کا نتیجہ ان کی معاشی پریشانیوں کے سوا کچھ نہ نکلا اور وہ بھوپال کو خیرباد کہہ کر لکھنؤ چلے گئے جہاں کسی بیمہ کمپنی میں آرگنائزر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ وہ لال باغ میں رہتے تھے۔ اس عرصے میں مولانا کی مصروفیات اور ادبی سرگرمیوں کی تفصیلات سے ہم بے خبر ہیں۔ حضرت جوش ملیح آبادی کی یادوں سے کچھ سراغ ملتا ہے لیکن وہ ان کی زندگی کی ایک جھلک ہے اور بس۔

مولانا کی زندگی میں لاہور اور لکھنؤ کا قیام کافی اہمیت رکھتا ہے۔ لاہور میں مولانا کے ادبی مشاغل اور وہاں کے ادیبوں اور شاعروں سے ان کے تعلقات کا کسی حد تک پتہ چلتا ہے لیکن لکھنؤ میں ایک طویل عرصہ تک قیام کے باوجود جوش صاحب کے سوائے ان کے کسی ادبی رفیق کا پتہ چلتا ہے نہ ان کی تخلیقی سرگرمیوں کا۔ وثوق کے ساتھ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس دوران مولانا نے کون کون سی غزلیں کہیں اور دبستانِ لکھنؤ سے کس حد تک اثر قبول کیا۔

۱۹۴۰ء تک مولانا بھوپال سے بے تعلق رہے لیکن جنوری ۱۹۴۰ء کے ایک کل ہند مشاعرے میں شرکت کے لیے وہ آ گئے۔ یہی وہ مشاعرہ ہے جس میں حضرت جوش، فانی، جگر، سیماب اور دوسرے چوٹی کے شعرا شریک تھے۔ مشاعرے کا ہنگامہ تو چند روز میں ختم ہو گیا لیکن مولانا سہا کے قدموں کو سرزمینِ وطن نے مضبوطی سے جکڑ لیا۔ انہوں نے دوبارہ بھوپال میں سکونت اختیار کر لی اور کچھ عرصہ بعد بھوپال کے ایک قدیم گھرانے میں شادی کر لی۔ مولانا جب بھوپال میں پھر سے آباد ہوئے تو دوسری جنگِ عظیم پورے زور پر تھی۔ ریاست کے معاشی وسائل زیادہ تر جنگ کے لیے وقف تھے۔ معاش کا سوال مولانا کے لیے پھر ایک پریشان کن مسئلہ بن گیا۔

بھوپال میں جنگی قیدیوں کے کیمپ تیار ہو رہے تھے اور برطانوی سرکار کو ہر طرح کی چیزیں درکار تھیں۔ باربرداری کے لیے گاڑیاں سپلائی کرنے کا ٹھیکہ مولانا کو مل گیا۔ کچھ دن اچھے گزرے لیکن وقت پر گاڑیاں سپلائی نہ کیے جا سکنے کے سبب ٹھیکہ منسوخ ہو گیا۔ مولانا نے جو سرمایہ ادھر ادھر سے فراہم کر کے اس تجارت میں لگایا تھا وہ بھی واپس نہ ہو سکا اور زندگی کے باقی دن پریشان حالی اور درماندگی کی نذر ہو گئے۔ فکرِ معاش اور امراض سے لڑتے لڑتے مولانا سہا ہار گئے۔

لقوے کے شدید حملے نے ان کی جان لے لی اور ۲۷ دسمبر ۱۹۴۹ء کو ایک چھوٹی سی قبر میں اپنی ساری تخلیقات کو سمیٹے ہوئے سو گئے۔ کچھ دنوں میں ان کی تربت کا نشان بھی مٹ گیا اور اب کسی کو نہیں معلوم کہ بھوپال کا یہ مایۂ ناز شاعر کس جگہ تہہِ خاک ہے۔

میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد مولانا سہا کو پہلی بار جنوری ۱۹۴۰ء میں دیکھا تھا۔ لیکن بچپن کی خوابناک فضا کا تصور کرتا ہوں تو یاد آتا ہے کہ ہر روز سہ پہر کو ایک طفل صورت شخص شیروانی پہنے کالے بالوں کی گول ٹوپی لگائے انگلیوں میں سگریٹ دبائے تانگے سے اترتا اور میرے والد کی بیٹھک میں جو اسی مکان کے مین متصل تھی چلا جاتا۔ مجھے اپنی وہ حیرت بھی یاد ہے جو اتنے چھوٹے سے لڑکے کو سگریٹ پیتے دیکھ کر ہوتی تھی۔ خدا جانے کس نے بتایا کہ یہ چھوٹا سا آدمی بہت بڑا شاعر ہے۔

جب میں خود کچھ بڑا ہوا تو اس وقت شاعری کی باتیں کچھ اپنے آپ کی زبانی سنیں، کچھ ادھر ادھر سے ان کے اشعار لوگوں سے سنے، کچھ پرانے رسالوں میں پڑھے اور بچپن ہی سے ایک ذاتی رشتہ مولانا سے قائم ہو گیا۔

میں دیکھتا تھا کہ وہ بے حد خود پسند آدمی ہیں، کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ عزتِ نفس کا اس قدر پاس ہے کہ بڑے سے بڑا نقصان مول لیتے ہوئے نہیں ہچکچاتے۔ اس سلسلے میں ان کا یہ واقعہ بہت مشہور تھا کہ ایک بار کسی اسٹیشن پر گاڑی چھوٹنے کے انتظار میں مولانا فرسٹ کلاس کے ویٹنگ روم میں گئے۔ وہاں ایک انگریز پہلے سے ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ مولانا سامنے کی خالی کرسی پر بیٹھ گئے۔ اس کے پاؤں سے انگریز نے ٹانگیں نہیں سمیٹیں۔ مولانا نے کچھ دیر تامل کیا۔ پھر اس انگریز کے مقابل اپنی ٹانگیں پھیلا دیے۔

صورت حال کی تاب نہ لا کر اس انگریز نے اپنے پیر سمیٹ لیے تو مولانا نے بھی اپنے پاؤں کھینچ لیے۔

مولانا کی عشق پیشگی اور رند مشربی کے قصے بھی عام مشہور تھے۔ لیکن جب وہ ۱۹۵۳ء میں بھوپال آکر بس گئے اور انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو ایسا محسوس ہوا کہ مولانا اپنے ماضی سے تقریباً دست بردار ہو چکے ہیں۔ شاعری سے بھی بس یوں ہی سا تعلق رہ گیا تھا۔ میں نے انہیں ۷-۸ سال کے عرصے میں صرف تین یا چار مشاعروں میں شریک ہوتے دیکھا۔ وہ بے حد اصرار کے بعد اپنا کلام سناتے تھے جس میں لکھنوی تکلف یا تصنع کو دخل نہ تھا بلکہ انہیں شعر سنانے سے الجھن سی محسوس ہوتی تھی۔ ایک مشاعرے میں مولانا شریک تھے لیکن کچھ سنانے کے لیے تیار نہ تھے، لوگوں نے کہا کہ میں مولانا سے استدعا کروں۔ میری درخواست پر وہ مسند پر تشریف لائے اور فرمایا۔

"بچوں کی درخواست ٹھکرائی جا سکتی ہے لیکن بھولوں کا کہا نہیں ٹالا جا سکتا۔" اس فقرے سے مولانا کی مزاجی کیفیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ وہ اہل ناز سے کبھی نیاز مندانہ نہیں ملے لیکن اہل نیاز سے ناز بھی نہیں کیا۔ ان کی نازک مزاجی کو غرور و تکبر سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ وہ بڑے خلیق، بذلہ سنج اور بے نیاز انسان تھے۔ انہیں اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی دس برسوں میں جو شہرت و مرتبہ مل گیا تھا وہ اچھے اچھے شاعروں کو ایک عمر میں نصیب نہیں ہوتا۔ لیکن نہ وہ اپنی شاعری پر نازاں تھے نہ شہرت پر۔ میں نے کبھی انہیں اپنے بارے میں گفتگو کرتے نہیں سنا۔ وہ ہر صاحب کمال کے مداح تھے لیکن اپنے عہد کے بعض اہل فن کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ وہ جدیدوں کے حوصلے بڑھاتے تھے۔ شاگردی استادی کی روایت سے انہیں سروکار نہیں تھا لیکن کوئی نو آموز ان کی توجہ سے محروم نہیں رہتا تھا۔ وہ مشرقی تہذیب اور شائستگی کا نمونہ تھے لیکن بے تکلف احباب کی محفلوں میں ان کی تقریریں گالیاں ان کی کتاب زندگی کا ایک ورق بن گئیں۔ مولانا کی مزاجی کیفیت کا اندازہ غالب کے اس شعر سے کیا جا سکتا ہے

ہے وصل ہجر عالم تمکین و ضبط میں
معشوق شوخ و عاشق دیوانہ چاہیے

مولانا سا صوفی نہیں تھے لیکن تصوف سے انہیں اصل لگاؤ تھا اور وہ حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب علیہ الرحمۃ سے بیعت تھے اور اسی تعلق سے خود کو بھاری سمجھتے تھے۔ وہ سالک نہیں تھے لیکن سلوک کے رمز آشنا تھے، یہی وجہ ہے کہ عہد شباب کی رندی اور ہوسناکی کے باوصف ان کے مزاج میں ایک توازن تھا جس نے انہیں رند اور صوفی دونوں کا پسندیدہ کردار بنا دیا تھا۔

مولانا سا اپنی آزاد مشی کے باوجود سماجی رشتوں سے منحرف نہیں تھے۔ وہ دوبار رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ ان کی پہلی شادی جوانی میں ہوئی لیکن یہ رشتہ زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکا۔ دوسری شادی اس وقت ہوئی جب وہ زندگی کے پچاس سال پورے کر چکے تھے۔ مولانا کے ہم زلف جناب غلام اللہ صاحب افسوں مرحوم کے بیان کے مطابق مولانا کے بیحد اصرار پر انہوں نے اپنی سالی سے ان کا نکاح کرا دیا تھا اور اول اول مولانا اس شادی سے بے حد خوش تھے لیکن تنگ دستی اور اختلاف طباع کے باعث آگے چل کر تعلقات میں وہ نشاط انگیزی باقی نہیں رہی جو ابتدا میں نظر آتی تھی۔ افسوں صاحب کا کہنا تھا کہ اس عقد نے جہاں مولانا کی زندگی میں ایک خوشگوار باب کا اضافہ کیا تھا وہیں یہ شادی ان کے مصائب کا سبب بن گئی۔ مولانا کی کوئی آمدنی نہیں تھی اور وہ اس درجہ گوشہ نشین ہو گئے تھے کہ گھر سے باہر نکلنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ ضرورت مند ہونے کے باوجود ایسے مشاعروں کی شرکت کو بھی ٹال دیا کرتے تھے جن سے انہیں کافی معاوضہ ملنے کی امید ہوتی۔ افسوں صاحب کہتے تھے کہ مولانا نے شادی سے پہلے فرمایا تھا کہ میری آئندہ زندگی اپنی بیوی کے لیے وقف ہوگی اور اس قول کو انہوں نے ایسا نبھایا کہ مرنے کے بعد ہی گھر سے نکلے۔ سا صاحب نے طویل عمر نہیں پائی لیکن ان کی عمر کے پچپن سالوں میں سے صرف پانچ سال ہی ایسے نظر آتے ہیں جو انہوں نے سماجی ذمہ داریوں کے ساتھ گزارے۔ اوائل عمری کا زمانہ چھوڑ کر باقی زندگی وہ تنہا اور آزادانہ جیا کیے۔ ۱۹۳۳ء میں جب ان کی شرح دیوان غالب "مطالب الغالب" کے نام سے شائع ہوئی تو ان کی عمر ۳۰ سال کے قریب تھی اور ان کی علمی اور ادبی حیثیت مسلم ہو چکی تھی۔ ریاست خیرپور کے توسل نے ان کو معاش سے بے نیاز کر دیا تھا لیکن انہوں نے رہنے کے لیے گھر بنایا نہ مادی اسباب فراہم کیے ان کے بعد ان کے گھر سے تصویر بتاں اور حسینوں کے خطوط بھی نہ نکلے۔ بے سروسامانی جو صاحبان کمال کا ورثہ ہے اسی ورثہ کو چھوڑ کر وہ دنیا سے اٹھ گئے۔ توقع تھی کہ مولانا سا نے کم از کم ایک ضخیم دیوان اپنی یادگار چھوڑا ہوگا لیکن وہ بھی سو سوا سو غزلوں پر مشتمل نکلا۔ مولانا سے ان کے آخری ایام میں اہل کرم اور ارباب ہمم کی بے تعلقی کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہے۔ ایک ناہموار معاشرے سے اس کے علاوہ توقع بھی کیا کی جا سکتی تھی لیکن ان کے مرنے کے بعد اردو ادب نقاد اور صاحبانِ نظر آنکھیں چرا گئے اور ان کی حیات و شاعری کے بارے میں کسی نے کچھ لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بھوپال میں سا صاحب کو سراج میر خان سحر کے بعد سرآمد شعرا تسلیم کیا جاتا تھا اور ان کے اشعار زبان زد خاص و عام تھے لیکن ان کے جن اشعار کا سکہ چل رہا تھا۔ وہ ۱۹۳۰ء تک کے ہوئے تھے۔ بھوپال سے دس برس کی مکمل بے تعلقی کے بعد جب وہ بھوپال واپس آکر پھر سے بس گئے تو اس وقت بھی اہل ذوق کا ذاتی تعلق مولانا سا کے ان ہی اشعار سے قائم تھا جو انہوں نے بھوپال سے بے تعلق ہونے سے پہلے کہے تھے ان درمیانی دس برسوں میں کہے ہوئے اشعار کی نہ مولانا سا نے خود نشاندہی کی ہے نہ وہ عام ہوئے۔ ان کے معاصرین سے جب بھی میں نے مولانا سا کے اشعار سنے تو وہی سنے جو اپنے لڑکپن میں ہزار داستان، گلزار، شمس الملک یا نیرنگ خیال کے پرانے شماروں میں پڑھ چکا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا تو صحیح نہ ہوگا کہ ۱۹۳۰ء کے بعد مولانا سا نے کچھ کہا ہی نہیں یا ان کی شاعری اپنی تاثیر اور کیفیت کھو چکی تھی کہ ان کے بعد کے اشعار لوگوں کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے لیکن ہمارے لیے یہ دشواری ضرور پیدا ہو گئی کہ ہم مولانا کے ذہنی ارتقاء اور مدارج کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ امید تھی کہ ان کی بیاض سے کچھ سراغ مل سکے گا لیکن ان کا مجموعہ کلام پورے پینتیس برس پردہ اخفا میں رہا اور جب دستیاب ہوا تو غزلوں کی ترتیب سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہو گیا کہ کون سی غزل عمر کی کس منزل پر کہی گئی تھی۔

مولانا سا کے انتقال کے بعد اتنی بات تو سب کے علم میں تھی کہ ان کی بیاض ان کی بیوہ اور ہم زلف جناب افسوں کی تحویل میں ہے۔ خود جناب افسوں نے ۱۹۵۸ء میں بھوپال کے مقامی اخبار کے ذریعہ اپیل کی تھی کہ اگر کسی کے پاس مولانا سا کا کلام محفوظ ہو تو ان تک پہنچا دیا جائے تاکہ اسے مولانا کے دیوان میں شامل کیا جائے۔ افسوں صاحب کا خیال تھا کہ مولانا سا کا کلام ان کی بیاض میں محفوظ ہے

وہ ان کا کلی سرمایہ نہیں ہے۔ اس اپیل کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور مولانا سہا کے کلام میں کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔ جو بہ ہو کر ۳۰ سال تک مولانا سہا کے کلام کا بیشتر حصہ قاموس میں "پڑا رہتا" رہا اسے شعر و ادب کے ساتھ انصاف کے منافی قرار دیا۔ لیکن اکبر علی صاحب کا یہ کارنامہ قابل ستائش ہے کہ انہوں نے اس قیمتی سرمایہ کو تلف ہونے سے بچایا۔

مولانا سہا کی بیاض کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے اشعار پر "ق" و "ل" نظر ثانی کرتے رہتے تھے۔ ان کے بعض اشعار جس طرح لوگوں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں یا پرانے رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں وہ ان کے بیاض میں کسی قدر فرق کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ مناسب معلوم ہوا کہ بعض اشعار کی جو شکل اخبار و رسائل میں شائع ہو چکی ہے یا زبان زد عوام ہے یہاں نقل کر دی جائے تاکہ پیش نظر مجموعہ کی صحت کے بارے میں کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ مولانا سہا کا مشہور مطلع ہے

بیٹھ کی [illegible] میں یوں [illegible] ہے اختیار ابھی
سکوت [illegible] ہے جو [illegible] ابھی

اس مطلع کے پہلے مصرعہ میں "یوں" کا لفظ حذف کر کے غزل سرا سے [illegible] گیا ہے جو پہلے سے بیان ہو چکا ہے۔ اسی طرح کا مطلع پہلے اس طرح شائع ہو چکا ہے اور [illegible] کی زبان پر چڑھا ہوا ہے

سا [illegible] ہے "اپنی اصل" سا خیال ہے اپنی ادا
[illegible] عوام [illegible] سامنے تصویر [illegible] ابھی

اس مطلع کے پہلے مصرعہ کی ترتیب بدل گئی ہے یوں کر دیا گیا ہے

[illegible] ہے اپنی اصلی سا [illegible] ہے اپنی ادا [illegible]
[illegible] ہے کہ [illegible] سے شعری صورت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

ایک اور شعر اس طرح زبان زد ہے

مجھے نہ [illegible] سے تو [illegible] میں [illegible]
صورت ہے شامل کی [illegible]

اس مطلع کی اصل صورت یہی ہے جو ابتدائی شکل سے کہیں بہتر ہے۔

[illegible] کو سہا تمام کے [illegible] میں ہے کہ [illegible] ہے [illegible] ایک ہی [illegible] ہی اور ایک مسری غزل کا مطلع مشہور ہے

جاؤ [illegible] اضطراب [illegible]
[illegible] کے تکمیل میں [illegible] خواب [illegible]

پہلے مصرعہ میں جاؤ، مولا جان کے بجائے "تولی اس قدر بھا دیا گیا ہے جو بلحاظ صورت ہے۔ ہم نے غزل لکھنے کے طور پر چند اشعار انتخاب کیا ہے۔ وہ [illegible] کہ پہلا سلسلہ کا غزل ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو تبدیلیاں کی گئی ہیں ان کے نتیجے میں اشعار کی ظاہری اور معنوی حیثیت میں معتد به اضافہ ہوا ہے۔

بیاض کا مجموعہ میں غزلوں کی ترتیب ردیف وار رکھی گئی ہے جو ماہنامہ سہا کی دی ہوئی ہے۔ "ابتدا" جو غزلیں [illegible] میں دستیاب ہو سکیں ماہنامہ نقاد اور حسن الملک میں شائع ہو چکی تھیں ان کو آخر میں درج کر دیا گیا ہے۔

مولانا سہا اپنی زندگی کے آغاز سے ہی اردو رسائل سے منسلک تھے ان میں ان کے مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ ان کی نثر میں ایک خاص شان پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ ان کی تحریروں میں اور فارسی الفاظ و تراکیب سے بوجھل ہیں لیکن اشعار مطالب میں کوئی الجھاؤ نہیں پایا جاتا اور ان کا لطف دو گنا ہو جاتا ہے۔

مولانا سہا کا نثری سرمایہ پرانے رسائل میں محفوظ ہے۔ خیال تھا کہ ان کی تحریروں کو جمع کر کے کتابی شکل میں پیش کیا جائے لیکن فی الحال وہ رسالے جاری دسترس سے باہر ہیں۔ مولانا کی شرح "مطالب الغالب" بھی نایاب ہے۔ صرف ایک نسخہ بیت الرخ کا جوہری میں محفوظ ہے۔ الوری کے مصنفوں میں "مطالب الغالب" کی دوبارہ اشاعت بھی شامل ہے۔ مولانا سہا کی نوازشات "مضامین اور مطالب الغالب" کی اشاعت کے بعد کہا جا سکے گا کہ جوہر ہیں سے اپنے عظیم المقدر فرزند کو اور سرد و سیاست کر کے اپنے اپنی کاوش میں انفرادیت کر لیا ہے۔

ہمیں اس اعتراف میں تامل نہیں ہے کہ مولانا سہا کا کلام اس وقت شائع ہو رہا ہے جب زمانے کا ذوق بڑی حد تک بدل چکا ہے اور وہ محفلیں اجڑ چکی ہیں جن سے ہمارے پیشرو بزرگ شعراء کی دنیائے دل آباد تھی۔ شعری اسالیب اور موضوعات میں انقلاب آ چکا ہے۔ اس لئے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ مولانا سہا کی شاعری آج بھی دلوں میں اس طرح گھر کر سکے گی جس طرح آج سے ساٹھ ستر سال پہلے ان کے سامعین کے دلوں میں گھر کر چکی تھی۔ تو بھی ہے کہ اچھا شعر تمام وجوہ کی حدبندیوں سے ماورا نہیں کیا جا سکتا اور وہ سال کی گردش اس پر اثر انداز ہو گی۔ ہم شعری روایتوں اور مضامین کی قدر و قیمت کا اندازہ اس وقت کیا جا سکتا ہے جب اس عہد کو سامنے رکھا جائے جس نے اسے جنم دیا۔ مولانا سہا انیسویں صدی کی آخری دہائی میں پیدا ہوئے تھے اور پچاس سال ہے کہ لگ بھگ سال کی عمر میں انہوں نے شعر کہنا شروع کر دیا ہو گا کیونکہ ۱۹۰۰ء کے سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے وہ اپنی [illegible] شہرت کے مالک ہو چکے تھے۔ یہ وہ عہد تھا جب ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی کوشش کو ناکام ہوئے پچاس سال سے اوپر ہو چکے تھے اور برطانوی سامراج کا سورج نصف النہار پر تھا۔ اس دھوپ میں ایک طرف ہندوستان کا زوال پذیر جاگیرداری نظام اپنے قدموں پر پسپا ہو رہا تھا اور دوسری طرف "وحشت" "قومیت" اور جذبہ آزادی کی کرنیں ذہن و شعور کو جگمگا رہی تھیں۔ ہماری سیاسی "اصلاحی" "مولی" سماجی اور ادبی تحریکیں سب انیسویں صدی کے آخری پچاس سالوں اور بیسویں صدی کے آغاز کی دین ہیں۔ یہ ساری تحریکیں عہد نو کی بشارت تھیں۔ اسی دور میں سرسید کی تحریک نے اردو زبان و ادب کو ایک نیا موڑ عطا کیا اور حالی نے روایتی غزل گوئی کے خلاف آواز بلند کی۔ حالی کی صدائے احتجاج کا اپنے وقت میں خوش دلی سے استقبال کیا گیا ہو یا نہ ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جانے عہد کا شعری مزاج اسی آغاز نوائی کا ساتھ دینا رہا ہے۔ حالی "آزاد" اور ان کے ہمنشیں کی انقلاب انگیزی و ہمہ ہے ہنگامہ جزاری کے باوجود یہ ماننا پڑے گا کہ اردو کے شعر و ادب پر غزل کی حکومت تھی اور حکومت کی لگام اسی طرح اتنے کے ہاتھوں میں تھی جن کی سند ہی اصلاح ادب کے طور پر نمایاں تھی اور شاعری ادب سے پہچانی جاتی تھی اور پڑھنے والے بھی کبھی اپنی دانست پر بچ کر آخر ہی رہ جاتے تھے۔ لیکن وہ شاعری جس کا بدن خواص و عوام کے سرچشمہ کرتی رہا تھا، امیر داغ اور ان کے شاگردوں کی غزل تھی۔ یہ داستان عجیب ہے کہ یہی ہے اور حالی بھی کہ غزل کی بہاریں ہیں۔ غالب کی تخلیق شعر اور مومن کی نازک خیالیوں کے وہ معیار کام آیا، قافیہ پیمائی کر کے داغ "امیر" اور ان کے طلاب کے اس رنگ غزل پر کہیں سر دھنتے تھے جو عام گوئی اور ذہنی سے عبارت تھا۔ حالانکہ اس عظیم مقاصد کے لئے "زبانی انتقام" لکی ہو گا کہ حسن عشق کا زوال ایک عظیم الشان تہذیب کا زوال تھا اور اس ادراک و ملاحظہ میں عشق اور اولیٰ پر [illegible] عوام دیتے تھے۔ جاہ ہمیں ہوتے "انہیں انہی" [illegible] ہیں جو نئی صداقت لکی ہیں "اتنا" رد کرتی ہیں۔ اگرچہ بات دامن بچا کر جی [illegible]

ہوں سے بازو شاہ کا شمار دور تھیں ہوا تھا۔ بابر نے ہندوستان کی حکومت حاصل کر کے یہ جیتی کوشش کا ہندوستان بلند کیا تھا لیکن اس کے جانشینوں نے سلطنت کھو کر اس کی نوائے شاعرانہ کو حرز جاں بنا لیا۔ موسیقی اور شاعری کی تندہی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن ربع ناؤں کو وجد میں لانے والا تحریک' انسانی خواہشات کو بیدار کرنے والی ٹھمریاں' کجریاں اور دادروں میں بدل گیا اور شاعری شعلہ عشق کے قرینے سے وابستگی ہو کر کھاجی ہائے نگار' عامیانہ معاملات عشق' رکیک خیالات' بتذل جذبات' رندی وہوسناکی اور بازاری معشوق کے ناز وادا کے لیے عام طور پر وقف ہو گئی۔ یہ تمام موضوعات غزل کا سرمایہ تھے اور غزل کا ڈنکا سارے ہندوستان میں بج رہا تھا۔

یہ کہنا پوری سچائی نہیں ہے کہ حالی صنف غزل کے مخالف تھے' ہاں یہ سچ ہے کہ حالی اور ان کے ہم نواؤں نے غزل کے اس سانچے پر پوری قوت کے ساتھ وار کیا جس سانچے میں غزل کو داغ وامیر نے اجال دیا تھا اور اس کا کسی حد تک نتیجہ بھی برآمد ہوا۔ لیکن حقیقی مطلب براری اس وقت ہوئی جب حالات نے کروٹ لی' سوسائٹی کا مزاج بدلا۔ شعر کا مفہوم ازسرنو متعین ہوا۔ اور شاعری کو زندگی کی عکاسی اور صورت گری کا آلہ قرار دیا گیا۔

غزل کی رگوں میں نیا خون دوڑانے کا سہرا حسرت کے سر ہے جن کی زندگی غم دوراں' اور شاعری غم جاناں سے عبارت ہے۔ حسرت کی زندگی کو نہ ان کی شاعری سے الگ کر کے دیکھا جا سکتا ہے نہ شاعری کو زندگی سے جدا کیا جا سکتا ہے۔ ایسی طرفہ تماشا طبیعت اردو کے شعری ادب میں کہیں اور نظر نہیں آتی۔ حسرت نے غزل کی عاشقانہ شاعری کی ازسرنو تہذیب کی اور اس کا دامن زندگی کے ساتھ باندھ دیا۔ یہاں حسرت کی شاعری سے بحث مقصود نہیں ہے لیکن حسرت کا نام لیے بغیر ہمارے عہد کی غزل کا تذکرہ مکمل ہی نہیں ہو سکتا۔ حسرت کے ساتھ غزل کی نئی صورت گری میں فانی' اصغر' جگر کے نام ایک ساتھ لیے جاتے ہیں۔ ان میں ہر ایک اپنی طرز میں منفرد اور اپنے رنگ سخن کا موجد قرار دیا جاتا ہے۔ ان چاروں کے ساتھ غزل کا ایک عہد خود شامل ہے جس کی شدید انفرادیت کے سب قائل ہیں لیکن اس کی تیغ قوالی خود اس کی شہرت اور مقبولیت کو لے ڈوبی۔ میری مراد یاس یگانہ چنگیزی سے ہے۔ ان حضرات نے غزل کو نئی رفعتوں سے آشنا کیا' جذبات واحساسات کی تطہیر کی' حیات وکائنات پر حکیمانہ نگاہ ڈالی' حسن کی جلوہ گری اور عشق کی سرشاری کا ازسرنو جائزہ لیا اور غزل کو ایک مہذب سوسائٹی کا مہذب فن بنا کر پیش کیا۔ فانی اور اصغر تو اپنے مستقل فکری میلانات کے اعتبار سے بھی امتیازی حیثیت کے مالک ہیں۔ غزل کی تشکیل جدید میں ان ہی دنوں ایک اور ذہن کارفرما تھا جو ایک ربع صدی تک شعری ادب کے افق پر جلوہ گر رہنے کے بعد گمنامی کی تاریکی میں کھو گیا۔ اس شعلہ شخص کو تاریخ ادب مولانا سہا کے نام سے جانتی ہے۔ سہا جب ایوان غزل میں داخل ہوئے تو ان کے ایک ہاتھ میں دیوان غالب تھا اور دوسرے میں گلزار داغ۔ وہ حسرت' فانی' یگانہ' اور اصغر کے کچھ بعد اور جگر سے ذرا پہلے آئے تھے۔ وہ حسرت کی واردات غزل کے معترف تھے لیکن فانی کی غم دوستی کے خلاف تھے۔ انہیں جگر کا والہانہ انداز پسند تھا لیکن اصغر کی جسمانیت سے عاری حسن کے قائل نہ تھے۔ ان کے سامنے عزیز لکھنوی' شاد عظیم آبادی اور حسرت موہانی کی غزل کے قابل قدر نمونے تھے لیکن وہ اپنی طرز کے خود ہی موجد تھے اور خود ہی خاتم' وہ ہمیشہ اپنے منفرد اسلوب سے پہچانے گئے۔ سہا غزل کی کلاسیکی روایات کے پاسدار ہیں ان کے تغزل کی دنیا میں بھی محبوب کی ستم گری' اپنی مجبوری ووفاداری' رقیب کی خوش طالعی' رشک' طعن' شکوہ' وشکایت اور آرزومندی سے آباد ہے لیکن جو رکھ رکھاؤ اور وقار کے ساتھ۔ ان کی غزل میں اسلوب کی جدت کے ساتھ ہی توانائی' وارفتگی' اور خود اعتمادی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ معاملات حسن وعشق میں داغ وحسرت کی طرف دیکھ لیتے ہیں لیکن جہاں انہیں بے تکلف پاتے ہیں' ان سے آنکھیں چرا لیتے ہیں۔ وہ حسن کی ایک ایک ادا کے رازدار ہیں لیکن بڑی بڑی تحریک پر حد سے نہیں گزرتے اور دامن کو سا تھام کے ہوش میں ہے کہ وہ آگے نہیں بڑھتے' ان کے اشعار میں عاشقانہ دیوانگی اور جنوں پرور خود معتدل کا ایسا رچاؤ ہے کہ مضمون اگر پست بھی ہو تو فکری کرشمہ نظر آنے لگتا ہے۔

چلی ہی آئی ہے شوق دل سے زباں پہ بے اختیار باتیں
سکوت ٹوٹا بھی [illegible] دیوانہ وار باتیں
ادھر طلب میں [illegible] ادھر [illegible]
ہوا ہے کس کس طرح سے [illegible] باتیں
نشاط محفل میں رات گزری مگر خدا جانے ہم کہاں تھے
وہی [illegible] باتیں

یہ تینوں شعر عشق کی بے باک مزاجی کے تین مرقعے ہیں۔

مزاجی کی تصویریں' اردو شاعری میں جس کثرت سے نظر آتی ہیں ان کے تصور سے بعض اوقات یہ گمان ہوتا ہے کہ غزل نام ہی دیوانگی کا ہے اور جیسے جنون عشق کے لفظ سے الجھن سی ہونے لگتی ہے لیکن سہا کے ان اشعار میں دیوانگی کی جو فضا ہے' جذبات کا جو تموج ہے اور بیان کا جو حسن ہے اس کی مثالیں شاذ ہی نظر آئیں گی۔ سہا کے یہاں شکایت یار گستاخی ہو تو ان کا لطیفہ' حیات اور طنز کی ہلکی سی لہر ہے وہ ان کی غزل کی امتیازی خصوصیت ہے۔ محبوب سے گفتگو کا یہ پیرایہ سہا کے کسی ہم عصر کے یہاں نظر آتا ہے تو وہ حسرت ہیں' لیکن حسرت کی باتوں میں سادگی اور کبھی کبھی معصومانہ حیرت ہوتی ہے اور سہا کے یہاں ایک چلتے ذہن کا جادو' حسرت باتیں کرتے وقت اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ ایسی باتوں سے وہ کافر گراں ہو جائے گا لیکن سہا ادا شناس ہیں اور محبوب کی مزاجی کیفیت کو سامنے رکھ کر اس طرح بات کرتے ہیں کہ ایسی ہی کہہ بھی جائیں اور کافر کو بدگمانی بھی نہ ہو۔

میں عجب کیا کہتا تم کو [illegible]
[illegible] تم جو کرتے ہو [illegible] نہیں کرتے
کوئی تم کو کیا جانے اور ہاں [illegible] تم
[illegible] نہیں کہتے [illegible] نہیں [illegible]
[illegible] دل کے بہلانے سے مطلب [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

○✿○

[illegible]
[illegible]

○✿○

[illegible]
[illegible]

مولانا سہا غالب کے شارحین میں سے ہیں اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ انہوں نے غالب کا گہرا مطالعہ کیا ہے اسی مطالعہ کا اثر ہے کہ غالب کے انداز بیان اور اس کی پرچھائیں جابجا ان کے اسلوب میں نظر آتی ہے اور کبھی کبھی معاملات عشق میں وہ غالب کے قریب سے گزر جاتے ہیں اور اس میں بھی شک نہیں کہ وحدت وجود کے تخیلات [illegible]

بھی انہوں نے غالب کی نگاہ سے دیکھا ہے لیکن وہ اس سے آگے نہیں بڑھے اور غالب کی ازخود رفتگی اور وسیع کائنات سے بے تعلق رہے۔ وہ غزل کے حسن و عشق کے بیان سے ہٹ کر دیکھنا نہیں چاہتے اور تصوف ان کی شاعری میں موضوعاتی نہیں ہے۔ میر کے واسطے تھوڑا سا ہی لکھا ہے۔ وہ زندگی پر غالب کی طرح گہری نگاہ نہیں ڈالتے نہ حیات و کائنات کی گم شدہ کڑیوں کو تلاش کرتے' نہ غالب کی طرح پوچھتے کہ تمنا کا دوسرا قدم کہاں ہے اور یہ کہ اسے خدا کیا ہے۔ انہیں غالب کی یہ شان طرز ادا ہی پسند ہے اور جب وہ کہتے ہیں۔

[illegible]

○○○

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
[illegible]
[illegible]

○○○

[illegible]

○○○

[illegible]

○○○

[illegible]

○○○

[illegible]

○○○

[illegible]

تو ایسی دور سے غالب کی حد اعتدال ہی ہے۔

[illegible]

○○○

رات کے وقت مے پیے ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

○○○

[illegible]

○○○

[illegible]

○○○

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم
کر دیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے

ان اشعار کے حوالوں سے ہمارا مقصود محض ایک مثال ہے، اہم مطلوب اشعار کی تلاش نہیں ہے۔ نہ ایسی کسی کاوش سے ساحر کی قدر و قیمت میں کوئی اضافہ ممکن ہے۔ ہم نے غالب کے ان پہلوؤں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی ہے جس کی پرچھائیں ساحر کے اشعار پر پڑ رہی ہے اور بس۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا ساحر نے مسئلہ وحدت الوجود سے اپنے شعر کے لیے ایک لطافت پیدا کرلی۔ انہوں نے غالب کے موضوعاتی وحدت الوجود کو بطور کلیہ کے قبول تو کر لیا ہے اور کہیں کہیں خاص فلسفیانہ انداز میں اسے دہرا بھی گئے ہیں لیکن ان کی شاعری کا بیشتر حصہ ماورائی تصوف سے عاری ہے۔

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

غالب کی فکری اساس ہے اور وحدت وجود کی فلسفیانہ تمیز پر فکر غالب کی اہم خصوصیت نہیں ہے۔ یہ وجود حقیقی اور کائنات موجود کے رشتہ کی توجیہ ہے جو ہم قدیم زمانہ سے کی جاتی رہی ہے اور اہل تصوف نے اسے مروجہ بنا دیا ہے۔ ساحر بھی اسی فکر کے قائل

ہیں۔ کہتے ہیں

[illegible]

[illegible]

وہ حقیقت کے جلوہ راز کو عاشق کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کبھی کبھی ٹھہر کر سوچنے لگتے ہیں۔

[illegible]

لیکن موجودات کے جمال اور اس کے ابدی رنگ کے سامنے یہ سوال اپنے ہیں' ٹھکراتے ہیں

جب اس قدر حسن سے رنگے ہیں مظاہر کائنات اس کے
ہر ایک صورت پکارتی ہے مری حقیقت مجاز کیوں ہے

ساحر حسن کے ماورا تصور میں اپنے ازلی جمال کو تسکین نہیں پاتے وہ حسن کی انسانیت کے طالب ہیں اور اسے سامنے بٹھا کر نظارگی کی تکمیل اور مجاز کی ساری رنگینیاں سمیٹ لینا چاہتے ہیں۔

[illegible]

[illegible]

مجاز میں حقیقت کی جلوہ گری کوئی اچھوتا مضمون نہیں ہے' لیکن حقیقت میں مجاز کو دیکھنا ایک نئی کیفیت سے آشنا کرتا ہے۔

[illegible]

[illegible]

تصوف کا مدار عشق پر ہے اور عشق کی سرشاری ساحر کا بنیادی موضوع ہے۔ ان کا یہ حسن ازل کے جلووں سے آشنا آنکھوں کا منظور دیکھ چکے ہیں ساحر کی نگاہ عشق بھی جب اٹھتی ہے تو ہر جگہ اسی حسن کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔

[illegible]

عشق کا ذوق نظر پایا ہے تم میں ہر حال
یاد ورنہ بھی کی، ملال بھی ہو

حسن ہے حجاب ہے مگر بھی لامکاں سا ہے
وہ سائیں کس طرح تہ حل جانے میں

اس سے انکار نہیں کہ سہا کا تصوف رسمیات سے بھرا نہیں ہے لیکن جہاں تصوف ان کا اپنا ہے' بیان کی ندرت سہا کا امتیازی وصف ہے اور اسی صنف نے اس راہ کو جو سنائی عطار اور رومی کے عہد سے آج تک صدیوں کی روندی ہوئی ہے کچھ کچھ جگمگا دیا ہے۔

تصوف کی وسیع تر دنیا میں زندگی——

رشتوں کی تہذیب خاصا اہم موضوع ہے۔ اہل دل نے اسے بھی عشق کے دائرے میں لے لیا ہے' لیکن اہل فکر نے اس کی اساس وجدان سے زیادہ بصیرت پر رکھی ہے۔

سہا اپنے خاص انداز میں کہتے ہیں

جو کمال عشق وفا یہاں کیا ہے
حیات تلی ہے پکار مرنے والوں میں

کچھ عشق جاتا ہے اس وسیع زندگی کو
ہے ہم پہ نیند طاری خوابوں میں جا رہے ہیں

اوروں کی طرح سہا بھی زندگی کو طلسم وہم سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کی بے ثباتی کے گلہ مند ہیں۔

ہے ایک طلسم وہم جہاں یہ ہستی عالم خواب سی ہے
ابھرے ہوئے جو حباب میں کوئی منظور ہے اور سراب سی ہے

دل کے آئینے میں ہے ہستی عالم جلوہ بہار بھی
پروانے جل رہے ہیں لیکن دل کے شعلوں میں جل رہے ہیں

سہا شکل ہی سے اپنے موضوعات سے دلکش ہوتے ہیں تاہم ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے کہ

[illegible]
[illegible]

وہ اس حقیقت کو بھی محسوس کرتے ہیں کہ زندگی کو عظمت سے آشنا کرنا اہل جاہ کے بس کا نہیں ہے

یہ اہل پندار و جاہ کیا سمجھیں گے کیا قیمتی کی باتوں سے
کریں گے پرواز و سکوں تک تو ہم سے بے بال و پر کریں گے

لیکن سچ یہ ہے کہ مولانا سہا کا یہ میدان نہیں ہے۔ ہاں ان کا مسلک وسیع المشربی سے ضرور عبارت ہے جیسا کہ خود کہتے ہیں۔

نہیں دیر و حرم کی قید کوئی وسیع دامانی ہے کہ
ہم جس آستاں پر جا پہنچے اسی کو سمجھ لیا

یہ داغ اور ان کے تلامذہ کی بے جھجک واقعہ نگاری سے تائب ہو کر غزل جب حسرت اور ان کے معاصرین تک پہنچی تو اس نے گھریلو زندگی اختیار کر لی۔ حسرت ضرور اس سے بے تکلف تھے اور کھل کر گفتگو کرتے رہے لیکن دوسروں کے لیے اس کا پیرایہ اظہار رموز و علائم بن گیا۔ جادہ و منزل' گلستان و بیاباں' قفس و آشیاں' صیاد و باغباں' موج و طوفاں' ساحل و دریا' بہار و خزاں اور ان کے تلازموں سے شعری اسالیب مرتب ہونے لگے۔ اس سے اتنا ضرور ہوا کہ غزل کے چہرے پر تہذیب کے غازے سے نکھار آگیا لیکن سادہ بیانی کا پایا کہیں ملتوی تھا۔ جب غزل ان تلمیحات کے گرد گھومنے لگی تو ایک طرف اکتاہٹ کا احساس بڑھنے لگا دوسری طرف معاصرین کی آوازیں اس درجہ خلط ملط ہو گئیں کہ ایک کو دوسرے سے تمیز کرنا مشکل ہو گیا۔ سہا کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے ان تراکیب اور تلمیحات سے اپنے شعری پیکر نہیں تراشے۔ ان کے مجموعہ کلام میں مشکل سے دو چار جگہ بہار و خزاں' صحرا و گلستاں کے الفاظ ملیں گے۔ موج و طوفان' ساحل و دریا' قفس و آشیاں اور جادہ و منزل کا تو ذکر نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے معاصرین کی آوازوں میں خود ان کی آواز صاف پہچانی جاتی رہی۔

سہا کی غزل جمالیاتی اظہار ہے جو ان کے ہی وجدان کا نتیجہ ہے۔ ان کی تمام تر شاعری میں ایک ہی احساس کارفرما ہے کہ ہم حسن کی تلاش کے سوا کوئی اور کام نہیں دے سکتے۔ سہا کا جمالیاتی مشاہدہ حقیقی اور غیر حقیقی میں کوئی فرق و امتیاز روا نہیں رکھتا

وہ جسمانی حسن کے بھی عاشق ہیں اور ماورائے حسن کے بھی اور ان میں کوئی حد فاصل نہیں کھینچتے۔ ہر چند کہ ان کی شاعری کا آغاز اس وقت ہوا جب محبوب کے خارجی حسن اور اعضائے جسمانی کا بیان حرف لے لے کر کیا جاتا تھا لیکن سہا کے احساس جمال کی نزاکت اسے قبول نہیں کر سکی۔ وہ محبوب کے عارض و لب اور چشم و کمر میں حسن کی تلاش نہیں کرتے۔ وہ حسن کی جلوہ گری سے پیدا ہونے والے ارتعاشات اور کیفیات کی تصویر کھینچتے ہیں اور ایسی جلوہ ریزی ہے کہ رنگوں ہی کی نہیں معانی کی دنیا بھی نظروں میں بھر جاتی ہے۔

ہم اس کو ڈھونڈتے ہیں جلوہ ہائے کائنات میں
شراب جس سے نشہ ہے شراب جس سے مست ہے

حسن ہے ہر طرف ہم بھی اب اس کو کیا کہیں
تو ہی کی تجلی نہیں اور وہ نظر ابھی نہیں

فضاؤں کی سی عرشیں ہیں نسیم کی سی ادائیں ہیں
جنسے جو آسمان کے ہیں یہ لگتے ہیں ان کے نفس میں لیے ہیں

کسی نے بھی نہ انہیں دیکھا ہنس کر جو
انہیں کسی نے بتایا اس طرح دل میں اتر جانا

یہاں بدوامت ہم کچھ ہم ہے کم نہیں
حاصل ہے اور وہ سراب ہو گیا

کچھ نرگس سا نظر آیا ہے بہاروں کا رنگ
کیا ادائے ہو اپنی آنکھوں سے بہاروں کا رنگ

ہجوم حسن' وارفتہ' عشق' کیا قیامت ہے
الفاظ اک نظر کا اور اک اشارہ ہو گیا
اور بطور شعر

اگر سہا کچھ اور نہ کہتے تو بھی
انہیں زندہ رہنے کے لیے کافی تھا

معشوقہ پیچ نہ اس دام کا اشارہ ہے
دیکھ کر آتے ہیں ملتے کا تذکرہ ہو ہے

سہا کی شعری جہات کا جائزہ لیجئے تو ان کا مطلع بر دیوان ان کی شاعری کا مقصود اصلی معلوم ہوتا ہے۔

اپنے کو نہیں جانتے جو کچھ ہے عشق ہے
سمجھے تو گھر کے تو نہ ہوا ہے نہ دل ہے

زندگی کی سب درماندگیاں نے صبا کو دربار سے اٹھا دیا ہو تو اٹھا دیا ہو لیکن شاعری میں وہ اس کوچے سے باہر نہیں نکلے۔ اتفاق نہیں کہ دربار کے باہر ان کے نزدیک کوئی دنیا نہ تھی' انہوں نے درد عشق کو رگ و پے میں اس طرح بسا لیا تھا کہ جسم کا ہر حصہ درد بن گیا تھا

وہ درد اٹھا جسم میں یوں پھیل گیا ہے
پہنچا ہے جہاں ہاتھ سمجھتا ہوں یہیں ہے

درد عشق کا سارے جسم میں اس طرح پھیل جانا کہ جس جگہ ہاتھ پڑ جائے درد کا احساس ہونے لگے اظہار درد کا نادرہ کار پیرایہ ہے۔ جس کی مثالیں اردو کی عشقیہ شاعری میں کم ہی ملتی ہیں اور یہ اس معیار کے دوسرے اشعار جو صبا کی شاعری میں نظر آتے ہیں ان کی اہمیت مسلّم لیکن ان کے یہاں عشق کی داخلی کیفیات کا سراغ نہیں ملتا۔ نہ غم عشق کی اس آنچ کا پتہ چلتا ہے جو انسانی زندگی کی متاع بے بہا ہے۔

عشق جہاں خود غم ہے اس لئے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ صبا اس کی لذت سے آشنا نہیں تھے لیکن وہ معنوی کیفیت جو دل کی تڑپ سے پیدا ہوتی ہے اور سننے والوں کے دل میں ارتعاش پیدا کر دیتی ہے صبا کے شعر میں نہیں پائی جاتی۔ شاید اس لئے کہ زندگی اور عشق کو انہوں نے نہ وبال سر بنایا نہ وبال دل۔ صبا صاحب کی زندگی کے نشیب و فراز کا تو ہمیں تھوڑا بہت علم ہے' انہوں نے اچھے دن بھی دیکھے اور برے دن بھی گزارے لیکن ان کی حیات معاشقہ کا ورق گم شدہ ہے۔ جوش صاحب کی یہ شہادت کہ وہ لکھنؤ کی ایک طوائف کو سنجیدہ پر فریفتہ تھے' واقعہ کو عشق کی حدود تک نہیں لے جاتی۔ کچھ ایسا ہی معاملہ جوش صاحب کو خود اپنی حیات معاشقہ کے بارے میں بھی ہوا ہے۔ اس قسم کے واقعات کو جنس روائی کے سوا دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا اگر اصطلاحاً اسے عشق نام بھی دیا جائے تو صبا کے کلام میں ان رشتوں کو ڈھونڈنا بیکار ہے جو دو دلوں کے اتصال اور دلوں کی لگن سے وجود میں آتے ہیں اور غم اور خوشی کی دھوپ چھاؤں میں نشوونما پاتے ہیں۔ شاید صبا کی زندگی کا یہ ورق سادہ رہا۔

وجہ یہ ہے کہ عشق کو جسمانیت سے علیحدہ کر دیکھنا تو تصوف کا مسئلہ بن کر رہ جاتا ہے۔ مولانا صبا اپنی جسمانی ساخت کے اعتبار سے صنف نازک کے لئے باعث کشش نہیں ہو سکتے تھے اس لئے ان کا عشق صرف ان کے دل کی پکار تھا اور ان کے دل کی دنیا ان حسینوں سے روشن تھی جو انہیں محفلوں میں ہوتی ہیں' یہ تو نہیں ہے کہ حسن سراپا ابن انسانی کی ذلت آشنا نہیں کر سکتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ عشق کے لطیف' پاکیزہ' نازک بے جذبات اسی وقت وجود میں آتے ہیں اور دردمندی' جاں سوزی' محویت اور کیفیت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب اسیری یکطرفہ ہو یا کم از کم دیوانہ کے صید ہو جانے کے امکانات ہوں' صبا اسیر زلف تو ہو سکتے تھے لیکن کسی زلف کا ان کے لئے بکھر جانا ممکن نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں ہمیں حسن کی جلوہ ریزیاں اور عشق کی جنوں خیزیاں تو ملتی ہیں لیکن عشق کی رعنائیاں نہیں ملتیں نہ غم عشق کی وہ توانائی نظر آتی ہے جسے قوت حیات کہا جاتا ہے۔ ہر چند کہ صبا کا عشق یکطرفہ ہے لیکن وہ اپنے احترام اور خودداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

محبت پر بھی دیکھو ناز ان کے اٹھ نہیں سکتے
صبا ہم اور طبیعت اپنی ہموار رکھتے ہیں

کیا محبت ہی زیاں ہے حاصل صبا
آپ کیوں گھبرائے جاتے ہیں

روز کی یاد صبا ٹھوکریں محبت کی
ہم اٹھائیں پر گرے کامیاب ہو کے اٹھے

ہر گام محبت پر اک جبر سلامت ہیں
دل کو تری الفت کے انداز سکھاتے ہیں

صبا کے کلام کا بیشتر حصہ زبان اور انداز بیان کی پختگی' ندرت و تازگی اور محاورہ کاری سے مزین و مرصع ہے' ان کی شاعری ترکیب غالب' مومن اور حسرت کی یاد دلاتی ہیں' ان کے یہاں سادگی کے بجائے ایک طرح کا تصنع ہے لیکن کہیں کہیں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں ادائے حسن اور واردات قلبی کا اظہار ایسے بھولے بھالے انداز میں کیا گیا ہے کہ صبا کے غزل کی معصومیت پر پیار آنے لگتا ہے۔

حسن دعوائی کی کشش ہے یا کوئی دل توڑتا ہے
مستی سے تم چلتے ہو یا ہم پہ جادو چلتا ہے
ہاں ہوا تو کیا ہے تم کی قدرت پہ ہم کو
تم ایسا نشہ ہی نہ کہ جب شعلوں سے ہی جلتا ہے

یہ حسن ہمت ہے جو دل میں' کچھ ان کا تصور آ ہی
جب اس کی خاطر ہوتی ہے تو عالم اور ہی ہوتا ہے

کیسے اٹھ کے دل اپنا دام میں آ کے گرداب سے
چلنے والے دیتے تھے ہونے والے ہو نہ سکے

روداد ہے یا کہانی اس اور اطوار کی سرمستیوں غزل کی روایات کا حصہ بن چکی ہیں۔ صبا تو اور ذوق کے تتبع تک بھی نہ گئے' لیکن سچ یہ ہے کہ صبا کا کلام اس موضوع سے خالی ہو' لیکن حیرت ہے کہ ان کے یہاں بادہ و ساغر کا ذکر کرنے والے کے برابر ہے۔ تاہم اس حلقے میں وہ سب کی توجہ کھینچ لیتے ہیں اپنا انفرادی رنگ بھی رکھتے ہیں اور ایک زندہ مضمون کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔

ابھی تک ہے نظر میں وہ شب لطف ساقی کی
وہ توبہ کا شمار گردش جام ہو جانا

فضائے چمن دل و دروں' منصب حسن بیکراں
آہ وہ چاند کے لمحے گئے اور کتاب میں

رحمت نے کر لیا ہے ابھی سے عہد دوام
ساقی عدد کر کہ گزشتہ واعظ ابھی نہ گیا

صبا کی شاعری جمالیات کا فنکارانہ اظہار ہے اور ان کی غزل ان کے ذوق جمال کا آئینہ ہے' ان کی شاعری رنگ و روشنی کی شاعری ہے اور ان کی دنیا حسن و عشق کی دنیا ہے جس کے باہر وہ قدم رکھنا پسند نہیں کرتے ان کا بیان تصوف بھی حسن و عشق کی جلوہ گری ہے وہ زبردست مداح تھے اور شدت سے اظہار پسند۔ انہوں نے اپنی منافقی اور اظہاریت سے ان مضامین کو جنہیں ہزاروں بار دہرایا جا چکا ہے نئی زیبائی عطا کی' انہوں نے غزل کو تہذیب اور تہذیب کو نئی معنویت بخشی۔ انہوں نے تو استاد حسن و عشق کی جو ایک ہی رنگ اور اپنے اپنے انداز کو پچھلے بیتوں کی لے میں نظر سرا ہو کر دکھایا۔ یہ لے صبا کے ساتھ ساتھ فضا میں گونجتی تھی اور انہیں کے ساتھ فضا میں تحلیل ہو گئی۔

کہا صبا کو بھی تری یاد نے
کن خوبیوں کا لطف کہ پیدا نہ ہو سکیں

[معیار (کراچی)، ستمبر ۹۳ء]

محمد مثنیٰ رضوی

عطا محمد شعلہ — ایک شعلۂ مستعجل

[محمود ایاز کے نام جن کے ایک اداریہ نے "سوغات" (۳) میرے اندر اس تاثراتی مضمون کے لکھنے کی تحریک پیدا کی۔]

عطا محمد کے نام سے میں پہلے پہل اس وقت واقف ہوا، جب میں الٰہ آباد یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ یہ بات (۱۹۴۵ء - ۴۶ء) کے آس پاس کی ہے میں استاذِ محترم پروفیسر اعجاز حسین کے کمرہ سے ان کا لیکچر سن کر نکل رہا تھا کہ اچانک میری نگاہ ان کی میز پر رکھے ہوئے ایک اردو ہفتہ وار پرچہ پر پڑی یہ بمبئی سے شائع ہونے والا رسالہ "نظام" تھا ایک مضمون نے خاص طور پر متوجہ کیا یہ دراصل ایک طویل اور جامع تبصرہ تھا جو عطا محمد نے کرشن چندر کی مرتب کی ہوئی کتاب "نئے زاویے" پر کیا تھا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تبصرے کا لب و لہجہ خاصا سخت تھا مگر اس میں جو تازگی اور شگفتگی تھی اس سے میں بہت متاثر ہوا۔ لکھنے والے کا نام ذہن پر نقش ہو گیا کچھ دنوں بعد اپنے ہوسٹل کے ایک کمرہ میں ایک دوست کے پلنگ پر "نیا ادب" کا ایک شمارہ پڑا دیکھا اِدھر اُدھر سے پلٹ کر دیکھا بڑے بڑے نام نظر آئے۔ عطا محمد کا ایک مقالہ بھی شامل تھا جس میں "جدید غزل" کے مزاج اور امکانات سے بحث کی گئی تھی پھر سے شدت اور جدتِ فکر کا احساس ہوا۔ میں نے ایک ہی نشست میں پورا مقالہ پڑھ ڈالا اس بار نقش کچھ زیادہ ہی گہرا تھا۔ شاید یہاں یہ ذکر بیجا نہ ہو کہ اسی ہوسٹل کے ایک دوسرے کمرہ میں ضمیر الدین احمد سے پہلی اور آخری ملاقات ہوئی وہ مجھ سے ایک سال آگے تھے ابھی تک اس ملاقات کا تاثر محو نہیں ہو سکا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے علاوہ اردو کے نئے نقادوں پر بڑی لمبی گفتگو ہوئی۔ مجنوں گورکھپوری کے طالب علم رہ چکے تھے اور ان کی تنقیدی فکر کے بڑے معترف تھے۔ ضمیر الدین احمد نے آگے چل کر افسانہ نگار کی حیثیت سے شہرت حاصل کی لیکن ان دنوں وہ افسانے لکھتے تھے یا نہیں مجھے اس

کا علم نہیں اس ملاقات میں، تھا اندازہ ضرور ہوا کہ وہ غیر معمولی طور پر ذہین ہیں اور ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ذکر تھا عطا محمد کا اور ذکر چھڑ گیا نثیر الدین احمد کا۔

جب میں ایم۔ اے کرنے کے لئے خلیل الرحمن اعظمی کے ایما پر علی گڑھ پہنچا تو "نیا دور" (لکھنؤ) میں نئے نقادوں پر بڑے تیکھے اور شگفتہ انداز میں لکھے ہوئے مضامین کا ایک سلسلہ نظر سے گذرا۔ یہ سارے مضامین عطا محمد کے زور قلم کا نتیجہ تھے ان میں کلیم الدین احمد اور آل احمد سرور کی تنقید نگاری پر بڑی سخت باتیں کہی گئی تھیں۔ کلیم الدین احمد نے جس جارحانہ انداز میں اردو شعراء کی تنقید کی تھی عطا محمد نے اس سے بھی زیادہ کڑے لب و لہجہ میں کلیم الدین احمد کی خبر لی تھی۔ لیکن انہوں نے جو کچھ لکھا تھا اس میں منطق اور استدلال کی قوت بھرپور موجود تھی۔ انتہائی فکر خیز اسلوب میں عطا محمد نے کلیم الدین احمد کی تنقیدی ڈھانچے کی پوری بنیاد اکھاڑ پھینکی تھی۔ اس مضمون کے تیکھے پن اور نئے فن کا لطف اور مزہ آج بھی یاد ہے۔ ان کی نظر میں کلیم الدین احمد شعری ذوق اور ادبی حس سے عاری تھے۔ سرور صاحب پر ان کا مضمون کم جارحانہ نہیں تھا۔ ان کے خیال میں سرور صاحب شعر و ادب کے متعلق اپنی آزادانہ رائے قائم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس کے علاوہ رشید احمد صدیقی کے اسلوب نثر کا جو اتباع کی کوشش میں ان کی تنقید نگاری اور بھی بگڑ گئی۔ نیچے عطا محمد کی ہر رائے قطعیت کا شکار نظر آئی۔ غالباً اس کا سبب یہ تھا کہ ان دنوں دوسرے نوجوان طالب علموں کی طرح آل احمد سرور کی تنقید مجھے بھی اچھی لگتی تھی۔ جیسے تاثر کے [illegible] سے انداز میں لکھی ہوئی شیریں تنقید۔

کچھ دنوں بعد باقر مہدی کے ساتھ سرور صاحب سے ملنے میرس روڈ والے مکان پر گیا وہ ان دنوں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریڈر تھے۔ ان کے سامنے "نیا دور" کا شمارہ پڑا ہوا تھا باتوں ہی باتوں میں پوچھ بیٹھا کہ عطا محمد کے اس مضمون کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ انہوں نے صرف اتنا کہا کہ عطا محمد نے بہتر سا نہ انصاف نہیں کیا ہے۔ میں نے انہیں سے یہ جاننے کی کوشش کی کہ عطا محمد ہیں کون صاحب۔ سرور صاحب کو تھوڑی بہت واقفیت تھی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اتر پردیش کے کسی ضلع میں نائب تحصیلدار ہیں۔ پڑھنے لکھنے کے شوقین ہیں۔ ایک بار وہ حسن عسکری کے ساتھ علی گڑھ آئے تھے اور کسی ادبی جلسے میں ایک مختصر سا مقالہ بھی پڑھا تھا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ اور ایک مدت تک ان کا خیال بھی نہیں آیا۔ اچانک ایک دن جب میں برادر محترم سبط محمد نقوی کے یہاں اکبر پور میں ٹھہرا ہوا تھا عطا محمد کا ذکر نکل آیا۔ باتیں کرتے کرتے سبط بھائی نے مجھ سے پوچھا کہ عطا محمد کے نام سے میں واقف ہوں یا نہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں ان کے کئی مضامین پڑھ چکا ہوں جنہوں نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ [illegible] سبط بھائی نے بتایا کہ عطا محمد اکبر پور کے تحصیلدار ہو کر آئے ہیں آج شام کو ان کے گھر چلیں گے۔ ایک عجیب سی مسرت کا احساس ہوا کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ عطا محمد سے ملاقات ہو گی اور وہ بھی اپنے ہی ضلع میں۔

شام کو میں جب سبط بھائی کے ساتھ تحصیلدار کے سرکاری بنگلے کی طرف جا رہا تھا تو خوشی کے احساس کے ساتھ تھوڑی سی ہچکچاہٹ بھی تھی۔ اس لئے کہ ایک دو دن پہلے "قومی آواز" کے [illegible] میں آل احمد سرور پر میرا ایک مضمون شائع ہوا تھا جو کچھ زیادہ ہی تحسین آمیز تھا۔ دراصل مجھے عطا محمد صاحب کے اسی مضمون کا خیال آگیا تھا جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ اتنے میں ہم لوگ ان کے مکان پر پہنچ گئے جہاں پہلے ہی سے محفل سجی ہوئی تھی۔ ان سے باقاعدہ تعارف ہوا۔ ادب، سیاست، صحافت، اور نہ جانے کن کن موضوعات پر کھل کر باتیں ہوئیں۔ بڑے دلچسپ اور صاف گو آدمی تھے۔ میں گھبرا رہا تھا کہ کہیں میرے اس مضمون کا ذکر نہ نکل آئے جو "قومی آواز" میں شائع ہوا تھا۔ لیکن یہ حادثہ پیش نہیں آیا۔ اور میں بہت خوش خوش گھر لوٹ آیا۔

دو تین دن بعد میں شام کے وقت ان سے پھر

ملنے گیا۔ بڑے تپاک اور محبت سے ملے ایک بڑی سی آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے اور سامنے ملنے والوں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی، خاصے وجیہہ آدمی تھے۔ سرخ و سفید، لمبے چوڑے اور بھاری بھرکم جسم والے مسکراتا ہوا چہرہ غرض کہ بیک وقت باوقار اور دل آویز شخصیت کے مالک تھے لوگوں سے پتہ چلا کہ جب اپنے دفتر میں ہوتے ہیں تو نظم و ضبط کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں تو ٹھیک ہی کہتے ہوں گے لیکن میرا ان کے سرکاری معاملات سے کیا لینا دینا۔ دوسری ملاقات میں شعر و سخن کی محفل گرم ہو اٹھی۔ انہوں نے تحت لفظ میں اپنی کئی غزلیں بعض دوستوں کی فرمائش پر سنائی۔ مجھے پہلی بار ان کے اچھے شاعر ہونے کا علم ہوا ابھی تک میں ان کو ایک بانکے، تیکھے اور ضبط نقاد کی حیثیت سے جانتا تھا اب مجھ پر ان کی شخصیت کا ایک نیا گوشہ روشن ہوا اپنے سرکاری حیثیت میں وہ جس قدر سخت اور بارعب شخص رہے ہوں لیکن نجی محفل میں بہت خوش اخلاق نرم گفتار اور دلچسپ انسان تھا وہ۔ ان کے ماتحت اہل کار بھی ملاقاتیوں میں شامل تھے اور وہ ان کے ساتھ بھی بڑی بے تکلفی کے ساتھ پیش آرہے تھے اسی طرح کے ذہنی تحفظات کے بغیر اس بار انہوں نے مجھ سے شاد عظیم آبادی پر

وہ شاد عظیم آبادی پر ایک زمانہ سے ایک طویل مقالہ لکھنا چاہتے تھے لیکن ان کے پاس شاد کا مجموعہ کلام "[illegible]" "میخانۂ الہام" موجود نہیں تھا انہیں اس کی تلاش تھی جب میں چھٹیاں گذار کے بہار واپس پہنچا تو ایک لائبریری سے کتاب حاصل کرکے ان کے پاس بھیج دیا بعد میں بات چیت کے دوران اندازہ ہوا کہ انہوں نے "میخانۂ الہام" کا مطالعہ غائر نظروں سے کیا تھا اور کئی نئے اور عجیب نکتے ان کے ذہن میں آئے تھے مگر دفتری کاموں کی مشغولیت نے انہیں شاد پر تنقیدی مضمون لکھنے کا موقع ہی نہیں دیا اگر وہ یہ مضمون لکھ سکتے تو مجھے یقین ہے کہ وہ شاد عظیم آبادی پر عزیز احمد کے تنقیدی مقالہ سے کم اہمیت کا حامل نہ ہوتا جہاں تک مجھے علم ہے شاد پر وہ اپنا مضمون نہیں لکھ سکے شاد پر ان کا لکھا ہوا کوئی مضمون میری نظروں سے نہیں گذرا۔

اکبر پور جب بھی جانا ہوتا ان سے ضرور ملتا ایک بار ان کے ساتھ ٹونس ندی میں بوٹنگ کرنے کا موقع ملا اور دوسرے واقعات اور لطیفوں کے ساتھ ساتھ بعض ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں بڑی پرلطف باتیں معلوم ہوئی۔ کشتی میں ان کے ماتحت کام کرنے والے چند حضرات بھی موجود تھے مگر وہ کسی جھجک اور ہچکچاہٹ کے بغیر لطیفے بھی سناتے رہے اور مذاق بھی کرتے رہے جب قربت کچھ اور بڑھی تو انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی اور تعلیم کے بارے میں تفصیل کے ساتھ ایسی باتیں بتائی جن سے ان کے لئے جذبۂ احترام اور بڑھ گیا وہ مغربی اتر پردیش کے رہنے والے تھے میڈیکل کالج میں تعلیم حاصل کرکے ڈاکٹر بننا چاہتے تھے اس لئے انٹرمیڈیٹ کا امتحان انہوں نے سائنس کے مضامین کے ساتھ پاس کیا تھا آگے چل کر ان کے معاشی حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ میڈیکل کالج میں تعلیم حاصل کرنا تو در کنار وہ اپنے یونیورسٹی کی تعلیم بھی جاری نہ رکھ سکے نامساعد حالات سے مجبور ہو کر انہوں نے نائب تحصیلداری کے مقابلے کا امتحان دیا اور نمایاں کامیابی حاصل کی ملازمت کرتے ہوئے۔ انہوں نے بی۔ اے کی ڈگری بھی حاصل کی ڈاکٹر بننے کا جو شوق ان کو بچپن سے تھا اس نے کبھی بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی ڈگری حاصل کرنے کا تو سوال ہی نہیں تھا لیکن اپنی ذاتی لگن اور مطالعہ سے انہوں نے "ہومیوپیتھک" میں خاص مہارت حاصل کرلی تھی۔ لوگوں کا مفت علاج کیا کرتے تھے اور ان کے بیان کے مطابق فیل پاؤں اور کھیکھا ایک بیماری "[illegible]" میں کچھ غیر معمولی طور پر سوج جاتا ہے کہ بہت سے مریضوں نے ان کے علاج سے شفا پائی۔ اکبر پور سے ان کا تبادلہ ہوگیا۔ اور اب صرف ان کی یاد باقی رہ گئی۔

ایک عرصہ بعد اچانک ایک دن یہ خبر معلوم ہوئی کہ عطا محمد صاحب تحصیلدار ٹانڈہ کے تحصیلدار ہو کر آگئے ہیں

یہ بات مجھے میرے ایک دوست عزیز نے بتائی جن کا عطا محمد کے سلسلے میں تحصیل سے اکثر واسطہ رہتا تھا۔ میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی "ٹانڈہ" اکبر پور سے ۱۰ میل ہے اور میرے آبائی گاؤں سے ۸ میل کے فاصلے پر ہے۔ چنانچہ میں ان سے خاص طور پر ملنے کے لئے "ٹانڈہ" گیا۔ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بہت محبت سے ملے بڑی دیر تک گپ شپ ہوتی رہی۔ لوٹتے وقت انہوں نے مجھے "نقوش" کے شخصیات نمبر کا دوسرا حصہ پڑھنے کو دیا جسے میں اپنے چھٹیوں کے بعد بہار لیتا گیا "ٹانڈہ" میں انہوں نے بڑی محنت اور جدوجہد کر کے ایک کل ہند مشاعرہ کروایا تھا جس کی صدارت اختر انصاری نے کی تھی وہ اختر انصاری کے پرستاروں میں تھے اور یہ محسوس کرتے تھے کہ اردو ادب میں ان کو جو مقام ملنا چاہئے تھا وہ نہیں ملا۔ اس طرح ادب میں اختر انصاری کی جو حق تلفی ہوئی تھی عطا محمد اس کی تلافی کرنا چاہتے تھے مگر یہ سودا انہیں بہت مہنگا پڑا کیونکہ "ٹانڈہ" کے کچھ مفاد پرست سیاسی کارکنوں نے ان کے خلاف پروپیگنڈہ کی ایک مہم چلائی اردو کے ایک جاں نثار خادم اور محبت کرنے والے کی حیثیت سے ان پر فرقہ پرستی کا الزام لگایا گیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ عطا محمد بڑے کھرے اور صاف گو انسان تھے اور اصول کے معاملہ میں بڑے سے بڑے کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ظاہر ہے ایسے افسر کی موجودگی میں تنگ نظر اور موقع پرست نیتاؤں کو غلط اور ناجائز کام کروانے کا موقع نہیں ملتا تھا اس سے وہ برابر ان سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہتے۔ چنانچہ اب وہ گھڑی آ رہی تھی کہ وہ اپنا کھیل کھل کر کھیل سکیں۔ عطا محمد ڈرنے والے آدمی تھے نہیں مگر ملال دینا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ ان کا تبادلہ کر دیا "ٹانڈہ" کی جنتا کو بڑا صدمہ پہنچا لیکن بدنیت نیتاؤں نے اطمینان کی سانس لی۔

میں پچھلے کئی ماہ سے باہر تھا اس لئے مجھے ان سرگرمیوں کا علم نہیں تھا جن میں مفاد پرست حضرات مصروف تھے ایک دن میں خاتمۂ زمینداری کے BONDS لینے کے لئے تحصیل گیا۔ عطا محمد صاحب سے گھر پر ملا مگر ان کو اپنی غرض نہیں بتلائی میں بے حد پریشان اور متفکر تھا کیونکہ سنیچر کا دن تھا جب خزانہ دوپہر میں ہی بند ہو جاتا ہے لگتا تھا کہ دوپہر تک مجھے BONDS نہیں مل سکیں گے کیونکہ ان کے ساتھ نقد رقم ملنے والی تھی۔ جیب میں جتنے پیسے تھے وہ کاغذات کے لئے STAMPS خریدنے میں خرچ ہو گئے اگلے دن اتوار کا دن تھا شام کی گاڑی سے مجھے بہار کے لئے روانہ ہونا تھا چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں اسی کشمکش میں ادھر ادھر ٹہل رہا تھا کہ عطا محمد صاحب کا چپراسی تلاش کرتا ہوا پہنچا وہ دن کے کھانے پر میرا انتظار کر رہے تھے کھانے کے دوران انہوں نے بار بار پوچھا کہ کس بات کی پریشانی ہے میں بار بار ٹالتا رہا لیکن انہوں نے کہا کہ میں کسی نہ کسی سلسلے میں یقیناً کافی متفکر ہوں جب میں نے انہیں اپنی پریشانی کی وجہ بتائی تو بڑے زور سے ہنسے۔ کہنے لگے بس اتنی سی بات ہے انہوں نے قریب ہی ایک میز پر سے ایک مسودہ اٹھایا اور مجھے پڑھنے کے لئے دیا۔ احتشام صاحب کی تنقید نگاری پر ان کا تازہ ترین مقالہ تھا جو بعد میں "نقوش" کے کسی شمارے میں شائع ہوا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ احتشام صاحب پر اس سے بہتر مضمون نہیں لکھا گیا خود احتشام صاحب اس کے معترف تھے نظام صدیقی نے اپنے ایک طویل مقالہ میں جو "احتشام حسین ایک عہد ساز نقاد" کے عنوان سے "آہنگ" کے احتشام حسین نمبر میں شائع ہوا تھا۔ اس بات کا ذکر کیا۔ میں نے کہا جناب والا میری دشواری یہ ہے کہ دوپہر تک خزانہ بند ہو جائے گا۔ کہنے لگے حضرت آپ کے سامنے جو شخص بیٹھا ہوا ہے وہ تحصیل کا بادشاہ ہے خزانہ میرے حکم سے شام تک کھلا رہے گا اور واقعی ایسا ہی ہوا مجھے اپنے

معاوضے کی رقم اور BONDS تقریباً ۹ بجے رات میں ملے۔ رات کافی ہو چکی تھی اس لئے ان کو زحمت نہیں دینا چاہتا تھا انہیں اطلاع دیے بغیر اپنی قیام گاہ پر چلا آیا صبح سویرے اُٹھ کر سیدھے ان کے بنگلے کا رخ کیا وہ ضلع کانگریس کے صدر سے مصروف گفتگو تھے لیکن یہ کہنا درست ہوگا کہ ان کو کھری کھری سنا رہے تھے۔ وزیر صاحبان سرکاری دورے کرتے ہیں اور ان کے کھانے پینے کے اخراجات بچارے حکام کو برداشت کرنے پڑتے ہیں لیکن کوئی نہیں پوچھتا کہ بھیا یہ پیسے کہاں سے آتے ہیں کہنے لگے کہ وزیر اصلی ہو تو نمبودری پد جیسا ہو تم لوگوں کو اس کی زندگی اور اس کے کردار سے سبق لینا چاہئے اپنے دفتر سائیکل پر جاتا ہے اور صرف ۵۰۰ روپیہ تنخواہ لیتا ہے اگر وہ اتنے میں گذر کر سکتا ہے تو تمہارے وزیر کیوں نہیں کر سکتے پھر مجھ سے مخاطب ہوئے اور کہنے لگے کہ میں رات بھر اس خیال سے پریشان رہا کہ پتہ نہیں آپ کو معاوضے کے BONDS ملے یا نہیں میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور فوراً ان کو اطلاع نہ کرنے کی وجہ بتلائی تب انہوں نے کہا بحیثیت تحصیل دار کے ناندیڑ میں یہ ان کا آخری دن تھا وہ تبادلے پر کسی اور ضلع میں جا رہے تھے ایک لمبے عرصہ کے بعد معلوم ہوا کہ وہ ترقی پا کر ڈپٹی کلکٹر ہو گئے ہیں کبھی کبھی ان کی خدمت میں جایا کرتی تھی۔ ایک دن کسی دوست نے بتایا کہ عطا محمد شعلہ کا انتقال ہو گیا ایسا لگا جیسے زندگی میں کوئی کمی واقع ہو گئی۔ بیگم

[سہیل ۵۳ (۱۲) دسمبر ۹۳ء]

جناب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان
حیدرآباد (سندھ)

میرا علی گڑھ

طالب علمی کا زمانہ اور وہ بھی علی گڑھ کا زمانہ کون بھول سکتا ہے، اس زمانے کی باتیں قارئین کے لئے دلچسپ نہ سہی لیکن لکھنے والے کے لئے بہت دلچسپ ہیں۔ یہ اس کی زندگی کی تاریخ ہے اور اس سے اس کے ذہنی ارتقاء کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ میں نے علی گڑھ ۱۹۳۶ء میں چھوڑا تھا۔ بکثرت واقعات فراموش ہو چکے ہیں۔ جو یاد ہیں ان میں اور ان کے سنین میں بھی سہو کا امکان ہے۔ یہ واقعات کچھ بھی ہوں، تاہم قارئین کو راقم الحروف کی خامیوں کے مطالعے سے اجتناب کی راہ ضرور مل سکتی ہے۔

ہیچ کس بے دامنِ تر نیست لیکن پیش خلق
باز می پوشند و ما بر آفتاب افگندہ ایم (سعدی)

دسویں جماعت کا زمانہ

میں جبل پور (سی۔ پی) میں ۱۳۳۰ھ ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوا۔ گھر میں قرآن پاک کا ناظرہ مکمل کیا۔ پھر پرائمری اسکول میں داخل ہوا۔ اس کے آخری سال کے امتحان میں بفضلہ تعالیٰ پورے شہر کے اسکولوں میں اول قرار دیا گیا اور چار سال تک چار روپے ماہانہ وظیفہ پاتا رہا۔ انجمن اسلامیہ ہائی اسکول سے آٹھویں جماعت کا امتحان بورڈ سے پاس کیا اور نمایاں کامیابی حاصل کی۔ پھر ۱۹۲۶ء میں نویں جماعت کے امتحان میں بھی بہت اچھے نمبر حاصل کئے۔ والد صاحب کا انتقال ۱۹۲۳ء میں ہو چکا تھا لیکن بڑے بھائی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے بڑا حوصلہ عطا فرمایا تھا۔ وہ پورے گھر کی کفالت کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی محدود تنخواہ کے باوجود مجھے علی گڑھ بھیج دیا۔ وہاں اُس زمانے میں انٹرمیڈیٹ کالج میں نویں، دسویں، گیارہویں اور بارہویں چار جماعتیں تھیں۔ طلبہ کا قیام منٹو سرکل اور نیو سرکل کے چار چار ہوسٹلوں میں تھا۔ (قریب ہی ایک قبرستان تھا جسے منٹوائی کہا کرتے تھے) صرف منٹوائے میں، دسویں جماعت والوں کی پڑھائی ہوا کرتی تھی اور منٹو ہال میں دوسری کلاسیں ہوا کرتی تھیں اور وہ دو منزلہ عمارت تھی۔ اس کے ایک سرے پر مرحوم پرنسپل عبد المجید قریشی کا دفتر تھا۔ ان کے سیکرٹری بشیر احمد صاحب تھے اور وائس پرنسپل سید ولی محمد صاحب تھے۔ یہ سب کے سب بڑے باوقار بزرگ تھے، بات ذمہ داری کے ساتھ اپنے کام انجام دیا کرتے تھے۔ ایک کلرک رحمت اللہ تھے۔ ان کو لڑکے بہت ستایا کرتے تھے۔ میں وہاں پہنچا اور اپنے سرٹیفکیٹ وغیرہ پیش کئے تو میرا داخلہ دسویں جماعت میں ہو گیا۔ میرا انرولمنٹ نمبر ۳۰۹۲ تھا جو پوری تعلیم تک رہا۔ نیو سرکل جسے اردو سرکل بھی کہتے ہیں، اس کے ایک ہوسٹل

کے کمرہ نمبر ۳۵ میں مجھے قیام کی جگہ دی گئی۔ اس کمرے میں پونا کے محمد اسمٰعیل اور بمبئی کے سیر الدین مین دادی میرے ساتھی تھے میرے کمرے کے ساتھ ہی شمس الہدیٰ صاحب وارڈن کا کمرہ تھا۔ وہ ریاضی پڑھاتے تھے۔ اس ہوسٹل کے دوسرے کمرے میں پنج علی ... صاحب رہتے تھے۔ وہ دینیات پڑھاتے تھے۔ دسویں جماعت کی کلاسیں ہوسٹل ہی میں ہوا کرتی تھیں اس کے سات سیکشن تھے میں ایف سیکشن میں تھا۔ اور سعید الزماں صاحب ہم لوگوں کو انگریزی پڑھاتے تھے۔ بہت نفیس طبیعت والے تھے۔ ولی علی شیدا صاحب فارسی پڑھاتے تھے (ان کے صاحبزادے ممتاز علی کراچی میں ہیں)۔ ان کے عزیز صبیح الدین حیدر صاحب جغرافیہ پڑھاتے تھے۔ ان کو سب لڑکے چچا صبیح الدین کہا کرتے تھے۔ چہرہ رعب دار تھا اور اگر کبھی اتفاق سے وہ مسکرا دیتے تھے تو لڑکے کہتے تھے کہ آج بارش ہو جائے گی۔ جی سیکشن میں معین الحق صاحب انگریزی پڑھاتے تھے۔ وہ بعد میں یونیورسٹی کی جماعتوں میں تاریخ پڑھانے لگے تھے اور پی ایچ ڈی بھی ہو گئے تھے۔ ڈی سیکشن کا ایک شریر طالب علم ناصر تھا۔ وہ بیچارہ کراچی میں معذور سا ہو گیا ہے۔ وکالت کرنے لگا تھا۔

چند ماہ کے قیام کے بعد مجھے یرقان ہو گیا تھا۔ یونیورسٹی ہسپتال کے ڈاکٹر عبداللہ بٹ نے ہوسٹل کا دورہ کیا تو مجھے ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ وہاں رائے پور (سی پی) کے حبیب اللہ صاحب بھی داخل تھے۔ یرقان کی وجہ سے مجھے ترئی کا ساگ اور روٹی دونوں وقت کھلائی گئی۔ ۲-۳ دن تو میں نے برداشت کی۔ پھر قریب ہی مُلّا مٹھائی والے کے یہاں جا کر سیر ہو کر مٹھائی کھائی۔ وہ بہت اچھی مٹھائی بناتا تھا تو اچھی مٹھائی کیوں نہ کھائی جائے۔ بہرحال اس مٹھائی نے مجھ پر بہت اچھا اثر کیا اور میں دوسرے دن واپس اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ میں اپنے وطن سے نویں جماعت پاس کر کے علی گڑھ گیا تھا لیکن وہاں نویں اور دسویں دونوں جماعتوں کا نصاب ایک ہی سال میں پورا کرنا تھا۔ ان دونوں جماعتوں کے نصاب میں انگریزی کے لئے گیارہ کتابیں تھیں (نثر، نظم، سرسری مطالعہ کے لئے) حساب میں چکرورتی مشہور کتاب تھی۔ الجبرا K. B. BASU والا تھا۔ جیومیٹری کے لیے HALL STEVENS کے پانچ حصے۔ تاریخ کے لیے برطانیہ اور ہندوستان سے متعلق کتابیں۔ جغرافیہ پوری دنیا کا۔ اُردو، دینیات اور ایک اختیاری مضمون۔ اور سوائے اُردو اور دینیات کے، ہر مضمون کے لیے جواب انگریزی میں دینا تھا۔ (آج کل کے لڑکے تو اس قدر نصاب کے متحمل نہیں ہو سکتے) نور کل کے جوبلی ہوسٹل کے ہال میں ظہر کے بعد نصاب کی تیاری کے لیے طلبہ کو جمع ہونا پڑتا تھا اور عصر تک وہاں بیٹھنا ضروری تھا۔ بعض اساتذہ مدد کے لیے موجود رہتے تھے۔ اس ہوسٹل سے ملا ہوا نصر اللہ ہوسٹل تھا۔ اس کے ہال میں ڈائننگ کا انتظام تھا۔ اس ہوسٹل میں زیادہ تر سی پی والے طلبہ رہتے تھے جن کو یار لوگ جیٹی والے کہا کرتے تھے۔ کچھ بھوپال کے طلبہ بھی وہاں رہتے تھے کیونکہ وہاں کے نواب نصر اللہ خان مرحوم نے وہ ہوسٹل تعمیر کرایا تھا۔ تیسرا ہوسٹل نواب مزمل اللہ خان مرحوم (رئیس بھیکم پور) نے بنوایا تھا۔ اس کا نام مزمل ہوسٹل تھا۔ اس کے ہال میں پانچوں نمازیں ہوا کرتی تھیں۔ چوتھا ہوسٹل موریسن MARRIS HOSTEL تھا۔ جس کے ہال میں انٹرمیڈیٹ کالج کی تمام تقریبات ہوا کرتی تھیں۔ کُل ہند مشاعرہ بھی وہاں منعقد ہوتا تھا۔

علی گڑھ کی روایات میں سے ایک روایت یہ تھی کہ پرانے طلبا نئے نئے بھائیوں سے ملنے کے لیے ایک رات انٹروڈکشن پارٹی منعقد کرتے تھے۔ تمام ہوسٹلوں کا دورہ کرتے تھے اور نئے طلبہ سے سرسید کی فاتحہ کے لیے چندہ وصول کرتے تھے۔ پھر ایک رات سب پرانے اور نئے طلبہ جمع ہو کر سرسید پر فاتحہ پڑھتے نیز مٹھائیاں کھاتے تھے۔ یہ رات بہت دلچسپ ہوا کرتی تھی۔ اور نئے طلبہ کی بعض خامیوں کا اس طرح مذاق اڑایا جاتا تھا کہ وہ ان خامیوں کو ترک کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ پانچوں نمازوں میں شرکت بھی ضروری تھی اور حاضری بھی لی جاتی تھی۔

شہر جانے کے لیے اِکے کی سواری تھی۔ کالج اور یونیورسٹی کے کسی گوشے سے شہر جانے کا کرایہ صرف تین آنہ تھا۔ اِکے میں تین لڑکے بیٹھ جاتے تھے اور ایک ایک آنہ ہی دینا پڑتا تھا۔

بہت سستا زمانہ تھا۔ ۱۰ آنے میں ایک سیر چھلے ہوئے اخروٹ اور چار آنے سے لے کر چھ آنے تک میں ایک سیر کشمش مل جاتی تھی۔ دس آنے سیر گھی مل جاتا تھا اور چار آنے کی سوا سیر شکر تھی۔ دودھ دو آنے سیر تھا۔ بلکہ دودھ پور میں جو یونیورسٹی کے مشرق میں ایک گاؤں تھا اور اب وہ خود شہر

بنگلوں کا محلہ ہے دو دو چھ پیسے سیر بھی مل جاتا تھا۔ مٹی بہت زرخیز تھی کہ ایک سال میں کئی کئی فصلیں تیار ہو جاتی تھیں۔ ارہر کے پودے ۷-۸ فٹ تک کے ہو جاتے تھے۔ شہر کے مشہور درزی علاؤالدین، تلسی اور پرشادی تھے۔ پھر عبدالغفار اور اُس کا بھائی عبدالستار تھا جو بیانیہ آباد آ کر فوت ہوا۔ ابراہیم بھی اچھا درزی تھا۔ یہ لوگ ٹھنڈی شیروانی کی سلائی کے دو روپے لیتے تھے۔ گرم شیروانی کے تین روپے اور جیب شرٹ کے اعلاج) صرف پانچ روپے لیتے تھے۔ ۶ آنے گز عمدہ لٹھا D-ONE مل جاتا تھا بلکہ ایک سستا کپڑا دو آنے گز بھی تھا۔ ہوسٹل میں رہنے، کھانا اور پڑھائی وغیرہ کی کل فیس ۲۵ روپے ۱۰ آنے تھی۔ دھوبی ایک آنہ فی کپڑا لیتا تھا۔ حجام چار آنے لیتا تھا۔ باغوں کی طرف ہم لوگ چلے جاتے تھے تو امرود اور بیر کی قیمت وہاں کے لوگ نہیں لیتے تھے۔ بڑا عمدہ گنا ایک آنے میں مل جاتا تھا۔ مٹر کی پھلیاں توڑنا "جائز" مشغلہ تھا۔ ہوسٹل میں بسکٹ اور حلوا وغیرہ فروخت کرنے والے وینڈر آتے تھے۔ ایک صوفی صاحب عمدہ بسکٹ بلکہ گھر کی بعض مٹھائیاں وغیرہ بھی ہم لوگوں کے لیے لاتے تھے۔ گرمی کے زمانے کا پان بیچنے والا کھمائی (ہندو) بھی آتا تھا۔ بہت کمزور تھا لیکن پان BETEL کی آواز لگاتا تھا۔ اُسی زمانے کا ممتاز فرنی والا بھی تھا۔ بہت بوڑھا تھا۔ دُبلا پتلا۔ شیروانی اور سفید پگڑی کے ساتھ بہت تیزی سے چلتا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک لڑکا ہوتا تھا جس کے سر پر ایک تھال میں تین قسم کی فرنی کی پیالیاں ہوتی تھیں۔ ایک کا نام انٹرمیڈیٹ، دوسری کا بی اے اور تیسری قسم کا نام ایم اے تھا۔ اُن کی قیمتیں علی الترتیب دو آنے، چار آنے اور چھ آنے ہوا کرتی تھیں۔ بریلی کے بانس والی مضبوط چارپائی صرف دو روپے میں مل جاتی تھی۔ پھل اور مٹھائی بہت سستی تھی۔ علی گڑھ کی گزک۔ صابونی بھی بہت سستی تھی۔ تالے بہت مشہور تھے اور دُور دُور فروخت ہوتے تھے۔ سڑکوں پر مضبوط پتھر سنگ گل (ڈسٹیل) بچھایا جاتا تھا جو ایک قسم کی مشین سے تیار کیا جاتا تھا۔

طلبہ میں ہنسی مذاق، فطری چیز ہے لیکن ایک دوسرے کی مٹھائی غائب کرنا ضروری مشغلہ تھا۔ کہتے تھے کہ چوری کی مٹھائی کھانے سے زیادہ مزہ ملتا ہے۔ لیکن آپس میں ہمدردی بہت تھی۔ کوئی طالب علم بیمار ہو جاتا تو اس کے احباب بڑی خدمت کرتے تھے۔ سر کی مالش کرنا۔ دوا لانا۔ پھل وغیرہ مہیا کرنا اُن کی شرافت کا تقاضا تھا۔ ہنسی مذاق میں کبھی بیہودگی نہیں تھی۔ البتہ بعض طلبہ کی اصلاح کے لیے رات کو اُن پر پانی یا رنگ پھینکنا بھی ایک مشغلہ تھا جسے ACTIVITY کہتے تھے۔ سال میں ایک مرتبہ بارش کے زمانے میں MUD RIOT ہوتا تھا یعنی طلبہ ایک دوسرے پر مٹی اچھالتے تھے۔ فروری میں تھانہ بنا دیوی کے پاس سالانہ نمائش کا انعقاد ہوا کرتا تھا۔ دُور دُور سے مختلف اشیاء کی دکانیں آتی تھیں لیکن طلبہ کی دلچسپی پشاور کی کباب پراٹھے کی دکان ہوتی تھی جہاں عموماً سبھی لڑکے شام کے وقت ایک دوسرے کی ضیافت کیا کرتے تھے۔

سالانہ مشاعرے ہوا کرتے تھے DEBATES وغیرہ بھی بہت دلچسپ مشغلے۔ یونین کے انتخابات ELECTIONS میں امیدواروں کے لیے کارکن حضرات بہت وقت صرف کرتے تھے۔ تمام ہوسٹلوں میں جا جا کر اُن کی حمایت میں تقریر کرتے تھے۔ پھر جو امیدوار ہار جاتا تھا اُس کے حامیوں کا ماتم کیا جاتا تھا اور اُن کا مرثیہ پڑھا جاتا تھا۔ پھر بھی احتیاط کی جاتی تھی کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔

طلبہ میں پڑھنے کا شوق تھا۔ لوگ دیر تک پڑھا کرتے تھے۔ بلکہ تقریباً دس بجے رات تک گپیں لگاتے تھے۔ پھر چائے پی کر نیند بھگائی جاتی تھی۔ لیکن مجھ جیسے بہت کم لوگ تھے جو عشاء کے فوراً بعد سو جاتے تھے اور تین بجے رات سے اُٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔ بعض ایسے رئیس طلبہ بھی تھے جو علی گڑھ میں دیر تک قیام کرنے کو اپنا مقصد حیات جانتے تھے اور پاس ہونا نہیں چاہتے تھے۔

میں دسویں جماعت میں تھا تو مجھے سہ ماہی امتحان میں بہت اچھے نمبر ملے اور جغرافیہ کے پرچے میں سب سے زیادہ نمبر ملے۔ چچا نسیم الدین حیدر صاحب میری کاپی کلاس میں لائے اور پوچھنے لگے کہ WHO'S ANSWER BOOK IS THIS ? میں ڈر گیا کہ شاید کوئی غلطی یا گستاخی مجھ سے سرزد ہو گئی ہے لیکن جب انہوں نے تیسری بار وہی سوال کیا تو میں ادب کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور عرض کیا کہ IT IS MINE چچا نسیم الدین صاحب بہت خوش ہوئے اور بہت تعریف فرمائی۔ بات در اصل یہ تھی کہ جبل پور کے اسکول میں محنت کرائی جاتی تھی۔ کوئی مضمون ایسا نہیں تھا جس میں کمزوری ہو۔ آٹھویں جماعت تک وہاں کے طلبہ انگریزی گرامر میں بہت پختگی پیدا کر لیتے تھے۔ یعنی ANALYSIS اور PARSING بہت کھیل سمجھ لیتے تھے اور شہر کے دوسرے اسکولوں کے مقابلے میں بہت ممتاز تھے۔ تاریخ اور جغرافیہ میں بھی بہت محنت کرائی جاتی تھی۔ نویں جماعت کے اُستاد رفیع الدین صاحب مرحوم نے اس قدر محنت کرائی تھی کہ مجھے علی گڑھ کی دسویں جماعت کے جغرافیہ کے پرچے میں سہولت پیدا ہو گئی تھی۔ گیہوں، چاول

کپاس وغیرہ کی کاشت کے لیے مٹی کیسی ہو؟ درجۂ حرارت کیا ہو؟ بارش کتنے انچ تک مفید ہو سکتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ پھر نقشے بنانے کی مشق کرائی جاتی تھی۔ میں نے سہ ماہی امتحان کی کاپی میں یہ سب باتیں لکھی تھیں اور FERREL'S LAW بھی لکھ دیا تھا۔ یعنی:

WINDS BLOWING IN THE NORTHREN HEMISPHERE ARE DEFLECTED TO THEIR LEFT AND WINDS BLOWING IN THE SOUTHERN HEMISPHERE DEFLECTED TO THEIR RIGHT

جو ایسے جوابات سے بہت خوش ہوئے اور پھر میرا بہت خیال کرنے لگے۔

علی گڑھ میں دسویں جماعت، پھر انٹرمیڈیٹ اور بی اے تک دینیات بھی ایک لازمی مضمون تھا۔ یعنی اگر کوئی طالب علم اس مضمون میں فیل ہو جاتا تھا تو آئندہ سال نہ صرف اس مضمون میں بلکہ تمام مضامین میں اُسے دوبارہ شرکت کرنا لازمی تھا۔ اُس زمانے میں کسی طالب علم کو کوئی رعایت نہیں تھی اور کبھی کوئی SUPPLEMENTRY EXAMINATION نہیں ہوتا تھا بلکہ پاکستان بننے کے چند سالوں تک بھی یہی دستور قاعدہ تھا۔ دینیات کے اُستاد شیخ علی جواد صاحب تھے جو اُس وقت تو داڑھی منڈاتے تھے (بعد میں داڑھی رکھ لی تھی) لیکن اپنے معاملات میں بہت متقی اور خدا ترس تھے۔ طلبہ نے بہت سے فرضی قصے اُن کی ذاتی زندگی سے متعلق بنا لیے تھے۔ شیخ صاحب فقہی مسائل بہت خوبی کے ساتھ سمجھاتے تھے۔ اُن کی دو باتیں اب تک خوب یاد ہیں کہ پوری بخاری شریف میں رفع سبابہ کا کہیں ذکر نہیں ہے اور یہ کہ احناف کے نزدیک جمعہ کا خطبہ غیر زبان عربی میں جائز ہے۔ شیخ صاحب عید بقرعید میں معانقہ نہیں کرتے تھے لیکن ہم لوگ اُن سے زبردستی معانقہ کر لیتے تھے۔ وہ اور دوسرے اساتذہ بہت شفقت کا برتاؤ کرتے تھے اور اُن سے دن رات میں کسی وقت بھی استفادہ کیا جا سکتا تھا۔

دہلی کی سیر
درگاہ نظام الدین کی برکات

دسویں جماعت کے زمانے میں دہلی کی سیر کا ارادہ ہوا۔ میرے ہم جماعت محی الدین جمالی (ٹانڈہ ضلع گورکھپور) نے رہبری کی۔ اُس زمانے میں علی گڑھ سے دہلی کا (واپسی کا) ٹکٹ ایک روپیہ پانچ آنے میں ملتا تھا۔ جمعہ کو جا کر منگل تک واپس آسکتے تھے۔ ہم دونوں غالباً ہفتے کے دن دوپہر کو روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر جامع مسجد، لال قلعہ اور ہمایوں کے مقبرے تک تمام مقامات اور مزارات پیدل ہی دیکھے۔ پھر حضرت نظام الدین اولیاء قدس سرہ کے یہاں حاضر ہوا۔ فاتحہ خوانی کے بعد بیٹھ گیا تو آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ انعامات عطا ہوئے جو تحریر میں نہیں آسکتے۔ میرے وہ دوست کئی مقامات پر حاضری کے بعد آئے تو مجھے زور زور سے ہلا کر اُٹھانے لگے۔ میں نے اُن سے کہا کہ آپ جائیے میں ذرا دیر اور بیٹھوں گا۔ چنانچہ دوبارہ وہی انعامات عطا ہوئے جو پہلے ہوئے تھے۔ زبان میں طاقت نہیں کہ شکر ادا کر سکوں۔ الحمد للہ۔ الحمد للہ

اپریل ۱۹۳۶ء میں دسویں کا امتحان اسٹریچی ہال میں ہوا اور ایک ڈیڑھ ماہ کے بعد نتیجہ آیا۔ بحمد اللہ بہت اچھے نمبروں سے مجھے کامیابی حاصل ہوئی۔ امتحان کے بعد موسم گرما کی تعطیل میں وطن واپس ہوا تو دو لطیفے پیش آئے۔ وطن میں اور دوسرے مقامات میں بھی عموماً یہ خیال تھا کہ جو لڑکے انگریزی پڑھتے ہیں وہ عیسائی ہو جاتے ہیں اور بہت ماڈرن بن جاتے ہیں۔ وطن میں ایک بزرگ سے آدمی ملے۔ از راہِ دین داری فرمانے لگے کہ "اپنے بزرگوں نے جو کچھ قرآن کے اندر سے نکالا ہے وہ غلط نہیں ہو سکتا" یعنی تم قرآن کو مت چھوڑنا جو اپنے بزرگوں نے لکھ دیا ہے۔ میں سوائے خاموش ہو جانے کے اور اُن سے کیا کہتا! ایک اور لطیفہ بعد میں یہ ہوا کہ ایک حاجی صاحب جو میرے بڑے بھائی صاحب کے ساتھ حج کر چکے تھے وہ کسی دوسرے شہر سے ملاقات کے لیے تشریف لے آئے۔ ایک دن فرمانے لگے کہ اس شہر میں کوئی مقام تفریح کے لیے ہو تو مجھے لے چلو۔ لیکن دیکھو، پیدل چلنا پڑے گا۔ (اُن کا خیال تھا کہ انگریزی پڑھنے کی وجہ سے میں نازک ہو گیا ہوں) میں نے عرض کیا کہ ضرور چلیے اور پیدل ہی چلیے۔ میرے مکان سے عدالت محل تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تھا۔ میرا ایک دوست ظہور بڑا مسخرہ تھا۔ اُس سے میں نے کہا کہ حاجی صاحب کو عدالت محل کی سیر کرانا ہے۔ وہ تیار ہوا۔ ظہور نے حاجی صاحب سے کہا کہ لائن میں کھڑے ہو جائیے۔ میں کہوں گا: ایک، دو، تین۔ جب تین کہوں تو آپ چل پڑیے گا۔ چنانچہ تین کہتے ہی حاجی صاحب اور ہم دونوں روانہ ہو گئے۔ ظہور نے مجھ سے کہا کہ ہم دونوں بہت تیزی سے چلیں اور قریب ایک فرلانگ چل کر بیٹھ جائیں۔ حاجی صاحب جب ہمارے قریب پہنچیں گے تو ہم لوگ پھر تیز رفتار سے چل کر آگے بیٹھ جائیں گے۔ بہر حال دو ڈیڑھ میل کا فاصلہ اسی طرح طے ہوا۔ پھر جب پہاڑی علاقہ شروع ہوا تو حاجی صاحب بسم اللہ بسم اللہ کہتے ہوئے قدم بڑھانے لگے۔ ظہور نے ۴۴۰ — ۴۸۶ کہنا شروع کیا۔ حاجی صاحب مجھ سے دریافت کرنے لگے کہ یہ کیا بکتا ہے؟ — ظہور بولا کہ

کہ حاجی صاحب میرا وضو نہیں ہے اس لیے میں بسم اللہ کے بجائے ۷۸۶ کہہ رہا ہوں۔ حاجی صاحب چپ ہو گئے لیکن ہم لوگوں کا ہنسی کے مارے برا حال تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد حاجی صاحب نے دریافت کیا کہ یہاں کوئی مسجد ہے؟ وہاں مسجد کے سامنے بہت سے درخت لگے ہوئے تھے۔ ظہور کہنے لگا کہ یہ کیا جھاڑ فانوس لگے ہوئے ہیں۔ یہیں تو مسجد ہے۔ غرض کہ اس طویل پیدل سفر سے حاجی صاحب کی یہ غلط فہمی دور ہو گئی کہ انگریزی پڑھنے والے مارک ہوتے ہیں۔ حاجی صاحب ایک دن فرمانے لگے کہ فلاں شخص کی لڑکی کی شادی ہوئی تو میں نے بہت سے تحفے دیے۔ لیکن جب میری لڑکی کی شادی ہوئی تو اس نے کچھ نہیں دیا۔ میں نے کہا۔ حاجی صاحب مجھے اس شخص کا پتا بتائیے۔ میں اسے خط لکھوں گا کہ اس نے ایسا کیوں کیا اور اس نے بیچارے حاجی صاحب کو کیا سمجھا ہے! حاجی صاحب کہنے لگے کہ نہیں نہیں ایسا مت کرنا۔ لیکن میں دریافت کرتا ہی رہا اور وہ نہیں نہیں کہتے رہے۔ بہرحال حاجی صاحب جتنے دن رہے ہم لڑکوں کی تفریح کا سامان بنے رہے۔ بلکہ قدر دریافت کرنے کے متعلق ملاقات تھے۔ یہ گیارھویں بارھویں کے زمانے کے حالات عرض ہیں۔

انٹرمیڈیٹ کا زمانہ

میں نے گیارھویں جماعت میں داخلہ لیا تو عزیز ہوسٹل کا انتخاب کیا۔ اس کے کمرہ نمبر ۳۰۴ میں میرا قیام تھا۔ جبل پور کے مشہور کھلاڑی اور میرے ساتھی دوست عبدالحئی بھی اسی کمرے میں آگئے۔ پھر اُن کے عزیز سراج الحق بھی ساتھ ہو گئے۔ عبدالحئی نے ہاکی، والی بال اور اتھلیٹکس میں بڑا نام پیدا کیا۔ سراج الحق کے دوست علی جواد (جو کراچی میں جج ہو گئے تھے) اور اس وقت جو علی ہوسٹل میں تھے اپنی قابلیت کی وجہ سے بہت شہرت رکھتے تھے۔ ان کے ایک دوست بدیع الدین تھے جو سیلون سے آئے ہوئے تھے (اور بعد میں وہاں وزیر تعلیم ہوئے) وہ انگریزی کی قابلیت کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ وہ ایک علمی انگریزی اخبار میں وقتاً فوقتاً شائع کیا کرتے تھے۔ ہمارے اختر امام بھی جو علی ہوسٹل سے عزیز ہوسٹل آگئے تھے۔ وہ عربی اور اردو شعر و شاعری میں نمایاں صلاحیت کے مالک تھے۔ نسخ خط بہت خوبصورت لکھتے تھے۔ میں شرارت سے کوئی مہمل شعر بنا کر ان سے کہتا تھا کہ بھائی اس شعر کا مطلب سمجھا دو۔ وہ بہت غور کرتے اور کچھ نہ کچھ مطلب نکال لیتے۔ سیکنڈ ایر کے زمانے میں وہ الیکشن کے چکر میں پھنس گئے اور لائبریرین کی جگہ کے لیے منتخب ہو گئے لیکن خواہ مخواہ ایک سال ضائع کر دیا۔ ہم سب کو ان کے اس نقصان کا بڑا افسوس ہوا۔ قریب ہی کے کمرے میں ہمارے شفیق الحسن تھے۔ بہت خلوص والے تھے (غالباً ۱۹۵۶ء میں ان کو پٹنہ کے پتے پر میں نے خط لکھا تھا۔ خط بھیجنے سے ایک دو دن پہلے ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے عزیز پروفیسر عبدالمجید صاحب نے جواب دیا تھا) اسی ہوسٹل میں بہار کے ثمین بھی تھے جنہیں بریگیڈیر بننے کا بہت شوق تھا۔ طلبہ ان کو مذاق میں بریگیڈیر ہی کہا کرتے تھے۔ ہمارے ایک دوست شمس الہدیٰ بھی تھے۔ وہ کراچی آگئے تھے۔ اللہ اللہ، کیسے احباب تھے جن کا اب کوئی پتا نہیں۔ البتہ اختر امام ابھی چند سال پہلے تک سیلون میں عربی کے پروفیسر تھے اور انہوں نے باہر سے پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کر لی تھی۔ عزیز ہوسٹل میں دو سال تک نماز کا مانیٹر تھا تو سندھ کے ایک طالب علم کے خاص سندھی نام گھمنو و گلشن خاں وھیکو خاں پر جو نگہ پڑتا تھا۔ سندھ کے عمر خان آفریدی کے اچھے کھلاڑی تھے اور شیخ غلام حسن (جو سندھ میں سیشن جج وغیرہ کے عہدوں پر فائز ہوئے) میرے خاص دوستوں میں تھے۔ وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کی صاحبزادی علاوہ سندھ یونیورسٹی میں استاد ہیں۔ اسی زمانے میں مراد آباد کے سید محمد صاحب، علی گڑھ شہر کے انتظام الدین صاحب اور نجیب کے علاوہ صاحبزادے مخلص دوست رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اچھا رکھے۔ آمین۔

عبدالحئی جن کا ذکر اوپر آچکا ہے (وہ جبل پور میں ۱۹۹۱ء میں فوت ہو گئے) ایک سال کے قیام کے بعد واپس وطن چلے گئے اور ان کے عزیز سراج الحق صاحب دوسرے کمرے میں چلے گئے تو میرے کمرے میں حبیب اللہ (پبلک) آگئے۔ وہ پڑھنے سے کم تعلق رکھتے تھے۔ باتیں بہت کرتے تھے اور بار بار پبلک کا لفظ استعمال کرتے تھے اس لیے ان کا نام ہی پبلک مشہور ہو گیا تھا۔ غالباً ۱۹۷۷ء میں حج کے موقع پر جدہ میں ان سے آخری ملاقات ہوئی تھی۔ وہیں وہ دل کے عارضے میں فوت ہوئے۔

انٹرمیڈیٹ میں ضروری مضامین کے علاوہ میرے اختیاری مضامین فارسی، تاریخ اور منطق تھے۔ فارسی جناب محمد صادق صاحب اور محترم ضیاء احمد بدایونی صاحب پڑھاتے تھے۔ تاریخ جناب ابرار احمد قادری صاحب اور عبدالعزیز زبیری صاحب پڑھاتے تھے اور منطق محمد حنیف صاحب پڑھاتے تھے۔ تاریخ کی نصابی کتابوں کے علاوہ پروفیسر شیخ عبدالرشید صاحب کی تاریخ سیر و حاشیہ، پروفیسر روشن علی صاحب کی تاریخ ترکیہ، مکرجی کی تاریخ ہند اور مسٹر بن لال کا جغرافیہ مجھے زیادہ پسند تھا۔ دینیات جناب شیخ علی جواد صاحب اور مولوی ... پڑھاتے تھے جن کی توند کی وجہ سے ان کا نام ... مشہور تھا۔ وہ کس قدر زور سے پڑھاتے تھے کہ کئی کمروں کی پڑھائی ختم ہو جاتی تھی۔ ابھی چند سال ہوئے ان کے صاحبزادے مجھ سے ملنے آئے تو انہوں

نے اپنی شناخت اسی مشہور نام سے کرائی۔ انگریزی ایک چھوٹے قد والے اُستاد پڑھاتے تھے جن کے نام کا انگریزی ترجمہ یعنی COURAGE ALI زیادہ مشہور تھا۔ لیکن سید ولی محمد صاحب (وائس پرنسپل) اور اشفاق صاحب (نواب وقار الملک کے صاحبزادے) بہت شفقت اور محبت سے انگریزی پڑھاتے تھے عبدالشکور صاحب بھی انگریزی پڑھاتے تھے۔ وہ بعد میں افریقہ چلے گئے تھے۔ (میری عادت تھی کہ اُستادوں کی تقریر کا ہر لفظ لکھ لیتا تھا۔ اس لیے مجھے امتحان کے وقت بڑی آسانی ہو جاتی تھی اور بہت سے طلبا اسی لیے مجھے گھیرے رہتے تھے)۔ اُردو جناب خاور صاحب اور مولانا احسن مارہروی پڑھاتے تھے۔ یہ دونوں بزرگ اپنی قابلیت، الفاظ پسندی اور بذلہ سنجی میں بے مثل تھے۔ اور مولانا احسن ہی کا فیض تھا کہ انٹرمیڈیٹ کالج میں کل ہند مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ اور اس میں پورے مُلک کے مشہور شعرا شرکت کرتے تھے بلکہ بعض کو اسی شرکت کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی تھی۔ مولانا نے رام اید کا ایک تمثیلی مشاعرہ بھی منعقد کیا تھا اور اُن شعرا کے ایسے حالات لکھے تھے جو وہی لکھ سکتے تھے۔ مولانا نے طلبہ میں شعر و شاعری کا ذوق پیدا کرنے کے لیے طرحی مشاعرے بھی شروع کیے تھے، وہ کوئی مصرعِ طرح دے دیتے تھے جس کے مطابق طلبہ غزلیں تیار کرتے تھے۔ اسی زمانے میں مولانا نے ایک مصرع دیا تھا: ع افسانہ وہ سناؤں جو تم نے سنا نہ ہو ایک شریر طالب علم نے ایک غزل ایسی لکھی جس کے ایک شعر میں مجنوں کو لیلیٰ کا شیر خوار بیٹا بنا دیا۔ شعر یہ تھا:-

مجنوں کو لے کے ...... لیلیٰ نے یوں کہا
بے پی لے ...... جو تو نے پیا نہ ہو

مولانا اس شعر پر خاموش رہے، خاموشی ہی کہہ سکتے تھے۔ لیکن پورا ہال قہقہوں سے گونج اُٹھا۔

ایسے مشاعروں کی وجہ سے شعر گوئی کا ذوق عام ہو گیا تھا۔ نیو ہرکل کے دواخانے میں ایک کمپاؤنڈر رہتے تھے۔ اُن کا قد چھوٹا تھا۔ لڑکے ان کو ڈاکٹر ٹنی (TINY) کہا کرتے تھے۔ وہ بھی شاعری فرمانے لگے تھے۔ میرے کمرے میں کبھی کبھی آ کر اپنے کچھ اشعار سنانے لگتے تھے۔ لڑکے انہیں گھیر لیتے تھے بڑی تفریح رہتی تھی۔ میں اُن سے کہتا کہ ڈاکٹر صاحب آپ کے اشعار میں کیا خوب سکتہ ہے۔ وہ خوش ہو جاتے تھے اور سمجھتے تھے کہ سکتہ کوئی خوبی ہوتا ہے۔

مزمل ہوسٹل کے جنوب میں کسی کھنڈر کے کھنڈر تھے۔ پانی بھرا رہتا تھا۔ ترسے دفعہ پرندے وہاں آ بیٹھتے تھے۔ ہمارے دوست سردار خان گنڈا سنگھ اسٹریٹ ہیرا پیچ والے اکثر پرندوں کا شکار کر کے ہم لوگوں کی دعوت کیا کرتے تھے۔ اُس جگہ بعد میں بنگلے بن گئے تھے۔ ہمارے اُستاد ڈاکٹر ہادی حسن صاحب کا بنگلہ بھی وہیں بن گیا تھا۔

اسی ہوسٹل سے مغرب کی جانب (قریب ایک میل پر) دولت راؤ سندھیا کا قلعہ تھا جو ۱۸۰۳ء میں GENERAL LAKE نے فتح کیا تھا۔ ہمارے زمانے میں کھنڈر تھا۔ بڑی بڑی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ ببول کے درختوں میں فاختہ کے گھونسلے تھے۔ ایک مرتبہ وہاں مورنی کے دو انڈے ملے تھے۔ سیاہ سانپ اور دو مُنہ کے سانپ بھی وہاں تھے۔ خار پشت جانور کے بل بھی تھے۔ اس سے کچھ آگے ایک جگہ پانی ابھرا ہوا تھا جہاں سنگھاڑے کی کاشت ہوتی تھی جب اس کا شوق ہوا کہ وہاں چلو۔ سنگھاڑے کھائیں گے۔ سنگھاڑے کھا کر واپس ہوئے تو ایک بہت بڑا سیاہ سانپ اپنے بل سے نکل کر ہماری طرف بڑھا۔ سب لڑکے بھاگ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ہمت دی۔ میں اُسے گھور کر دیکھنے لگا۔ وہ بھی تھوڑی دیر مجھے دیکھتا رہا۔ پھر واپس چلا گیا۔

علی گڑھ میں ۱۹۳۰ء میں بجلی شروع ہوئی۔ لیکن پنکھے وغیرہ نہیں بنے تھے۔ ہم لوگ اس سے پہلے لالٹین استعمال کرتے تھے اور مزمل ہوسٹل کے بڑے بیچ پانی کے اور نخلوں لگے ہوئے تھے۔

اسی زمانے میں مٹھائی کی چوری کا ایک عجیب لطیفہ ہوا۔ ایک طالب علم نے داخلہ لیا اور کمرے میں وہ اپنا سامان سنبھالنے بھی نہ پایا تھا کہ اس کی مٹھائی کی ٹوکری غائب ہو گئی۔ وہ دوڑتا ہوا وارڈن صاحب کے پاس شکایت کرنے گیا۔ انہوں نے فرمایا "لڑکے کتنے نالائق ہیں کہ خود سب مٹھائی کھا گئے اور مجھے بھی شریک نہیں کیا"۔ وہ بیچارہ یہ جواب سُن کر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ اُس وقت یہ معلوم نہیں تھا کہ علی گڑھ کی زندگی میں مٹھائی کا غائب کر دینا یہ ہم وہ تقریب ہے۔ اپریل ۱۹۳۲ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان مرحوم ہوسٹل ہال میں منعقد ہوا۔ ۹ بجے امتحان شروع ہوا اور صرف دس منٹ کے بعد ایک ساتھی بھی آیا۔ میں تاریخ میں تھا اور میرا پاکستان کے گورنر خرحسین کا چھوٹا بھائی عاشق حسین سائنس میں تھا۔ بہت ذہین اور محنتی تھا۔ وہ شاید دوات یا قلم اٹھانے کے لیے جھکا ہی تھا کہ HEAD INVIGILATOR صاحب نے گرفت کر لیا۔ WHAT'S THERE۔ جو تین سال کے لیے یونیورسٹی تعلیم سے خارج کر دیا۔ ہر شخص کو افسوس ہوا لیکن ڈسپلن ایسا تھا کہ کوئی احتجاج نہ ہو سکا۔ یہ HEAD INVIGILATOR اسی طرح کے کارناموں کا انعام دینے میں شہرت رکھتے تھے۔ وہ کوشش پر بیٹھ جاتے تھے اور اپنے چہرے کے سامنے اخبار کھول لیتے تھے اور اخبار میں تھوڑا سا سوراخ کر کے اسی میں سے پورے

بالکو دیکھتے رہتے تھے۔ گویا وہ طلبہ کو موقع دیتے تھے کہ وہ کچھ کریں اور میں اُن کو نکالوں۔ متعدد طلبہ کی زندگیاں انہوں نے تباہ کی تھیں۔ آخر اُن کا اور اُن کی اولاد کا جو انجام ہوا وہ یونیورسٹی والوں سے پوشیدہ نہیں۔

بی اے کا زمانہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ۱۹۳۱ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس کیا اور یونیورسٹی میں بی اے کلاس میں داخلہ لیا۔ سید محمد صاحب[1] میرے کلاس فیلو تھے۔ اُن کے ساتھ S. S. WEST ہوسٹل کے کمرہ نمبر ۶۸ میں میرا قیام تھا۔ وہ میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ ہاکی کے اچھے کھلاڑی تھے اور اکثر باہر میچ کھیلنے کے لیے جایا کرتے تھے۔ دوڑ لگانے میں بھی اُن جیسے لوگ شاذ و نادر ہوں گے۔ ایک بار تو ہم ان کے ساتھ میں نے بھی علی گڑھ سے خورجہ اسٹیشن تک (۹-۱۰ میل) دوڑ لگائی تھی۔ فارسی اور انگریزی کا بہت شوق تھا۔ اس زمانے میں اُستاد مختار حامد علی صاحب کی وجہ سے THOMAS HARDY کے ناولوں اور افسانوں سے طلبہ کو زیادہ دلچسپی تھی۔ سید محمد صاحب ہر ہفتے ہارڈی کی ایک کتاب پڑھ کر اُس کا خلاصہ مجھے سناتے تھے۔ میں بھی اسی طرح اُن کو سناتا تھا۔ WILLIAM LEBUS - A.G. GARDNER - G.K. CHESTERTON - STEVENSON - F.W. BAIN وغیرہ بکثرت مصنفین کی کتابیں ہم دونوں نے پڑھ ڈالی تھیں۔ اسی لیے ہم لوگوں کی انگریزی آج کل کے ایم اے (انگریزی) کے مقابلے میں بہت غنیمت ہے۔

علی گڑھ میں بی اے انگریزی کا نصاب بھی مشکل تھا۔ پہلے سال اُردو، دینیات کے علاوہ انگریزی زبان کا بھی ایک پرچہ لازمی تھا جس میں

---

(1) سید محمد صاحب شعبۂ پولیس کے بہت اعلیٰ افسر تھے۔ ریٹائر ہو کر اب اسلام آباد میں ہیں۔ اُن سے چھوٹے بھائی کرنل سید مصطفیٰ صاحب ہندوستان ہی میں رہ گئے اور سب سے چھوٹے سید علمدار صاحب کمشنر، سیکرٹری اور علی گڑھ کے وائس چانسلر ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو سلامت با کرامت رکھے۔ آمین۔ سید محمد صاحب کی شادی علی گڑھ میں ۱۹۳۲ء کے اواخر میں ہوئی تھی۔ شرم کی وجہ سے مجھ سے اس کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن یار لوگ شاہد صاحب سمجھ گئے تھے اس لیے اندازہ ہو گیا تھا۔ سید محمد صاحب اپنے گھر سے گڑ لا کر کھایا کرتے تھے۔ وہ بھی بہت پکا تھے۔ اُن کی اہلیہ صاحبہ بہت خوش مزاج ہیں۔ ہمیشہ اُن کو چھیڑتی رہتی ہیں۔ پروفیسر وقار عظیم مرحوم، سید محمد صاحب کے ہم زلف تھے۔

تین کتابیں تھیں۔ دوسرے سال شیکسپیئر کے دو ڈرامے، جدید انگریزی شعراء سے متعلق دو کتابیں، نثر کی کئی کتابیں، جدید ڈراما وغیرہ داخل نصاب تھا۔ فارسی نثر و نظم محترم ضیاء احمد بدایونی جیسے فاضل پڑھاتے تھے۔ تاریخ پروفیسر عبدالرشید پڑھاتے تھے۔ بہت تیاری کر کے آتے تھے۔ ہمارے عبدالعلیم صاحب (جو بعد میں ڈاکٹر ہو گئے تھے) تاریخ کی تمام TUTORIAL CLASSES لیا کرتے تھے[1]۔ تاریخ کے نصاب میں A SHORT HISTORY OF MUSLIM RULE IN INDIA ایشوری پرشاد کی تھی جو پہلے کتابوں کے لیے تاریخ لکھا کرتے تھے۔ بعد میں ڈاکٹر ہو گئے تھے۔ اس کتاب میں انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اورنگ زیب چار وقت کی نماز پڑھا کرتے تھے (ایسی غلطیاں اس کتاب میں کئی جگہ ہیں)۔ تاریخ میں ROBERTS کی برٹش پیریڈ، LANE POOL کی OTTOMAN EMPIRE، جسٹس امیر علی کی HISTORY OF SARACENS وغیرہ داخل نصاب تھیں۔ تاریخ کی ان تمام کتابوں کے خلاصے میں نے اور مولانا کے حبیب اللہ نے مل کر تیار کر لیے تھے۔ تاریخ کے لیے دوسری کتابیں بھی تھیں جو غیر نصابی تھیں لیکن بہت مفید تھیں۔ پھر اس موضوع کے لیے مولانا ابوبکر محمد شیث صاحب اور مولانا سید سلیمان اشرف صاحب جیسے بزرگوں سے بھی رجوع کیا جاتا تھا۔

انگریزی میں مختار حامد علی صاحب ہم لوگوں کے ساتھ بڑی محنت کرتے تھے۔ TUTORIAL CLASSES بھی خود لیتے تھے۔ بہت سنجیدہ، باوقار اور دُبلے پتلے تھے اور ہمیشہ شیروانی پہنتے تھے۔ پڑھاتے وقت اُن کے منہ میں ایک طرف جھاگ بھی جمع ہو جاتا تھا۔ لیکن کبھی تھکاوٹ ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ دوسرے اُستاد محمود حسین صاحب تھے۔ وہ بعض حروف حلق سے ادا کرتے تھے تو یار لوگ اُن کو قاری محمود حسین کہتے تھے۔ وہ عموماً GOLDEN TREASURY پڑھاتے تھے۔ ایک اور اُستاد پارسی تھے۔ مُدرّب جی نام تھا۔ بڑے با اخلاق اور محنتی تھے۔ GALSWORTHY کا ڈراما بڑی محنت سے پڑھاتے تھے۔ ناول کی ایک کتاب JOHN BUCHAN کی THE PATH OF THE KING تھی۔ زبان اور انداز بیان کے لحاظ سے بہت مشکل تھی۔ لڑکے پریشان تھے۔ بفضلہ تعالیٰ میں نے اُس کا خلاصہ بنا لیا تھا جس سے طلبہ کو بہت فائدہ ہوا تھا۔

ہوسٹل میں کیا بلکہ سید محمد صاحب کے ساتھ S. S. WEST ہوسٹل کے کمرہ نمبر ۶۸ میں میرا بھی قیام تھا۔ وہ کمرہ ایسا تھا کہ اُس کی پُشت

---

(1) مجھ کو لکھنے کا بہت شوق تھا۔ ایم اے کے استاد حمید احمد صدیقی صاحب کے رسالے پر تمام کر اپنا شوق پورا کیا کرتے تھے۔ بعد میں وہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں اُستاد مقرر ہوئے۔ تاریخ کے ایک مقالے کا اُن کے ساتھ ایک متن پر کام ہوا تھا۔

کی جالی کے دروازے سے کرکٹ اور ہاکی وغیرہ کے میچ بیٹھے بیٹھے ہمارے دیکھے جا سکتے تھے۔ کرکٹ کے اکرام ریاض WICKET KEEPER مشہور اور بھاری بھرکم تھے۔ وہ BURGO MASTER کہلائے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنی دلچسپی کی خاطر، وارڈن صاحب سے کہہ کر ہمارا کمرہ خالی کرا لیا اور ہم لوگوں کو TOWER GATE کے قریب کا ایک کمرہ نمبر ۴۳ دلوا دیا۔ سید محمد صاحب اُس کمرے میں چلے گئے اور میں عثمانیہ ہوسٹل کے کمرہ نمبر ۷ میں منتقل ہو گیا۔ وہاں جبل پور کے ضامن علی اور افضال علی تھے۔ افضال علی چند ماہ کے بعد تعلیم چھوڑ کر ملازمت کے لیے چلے گئے تو فدا حسین اُن کی جگہ آ گئے۔ عثمانیہ ہوسٹل آتے ہی ایک لطیفہ درپیش ہوا۔ ایک صاحب بہت موٹے تھے۔ یار لوگ اُنہیں FILTER کہا کرتے تھے۔ وہ ایک دن فرمانے لگے کہ اس (عثمانیہ ہوسٹل) میں میری اجازت کے بغیر کوئی ACTIVITY نہیں کی جا سکتی۔ میں نے اپنے سید محمد صاحب سے کہا کہ آج ان صاحب کی اجازت کے بغیر انہی پر ACTIVITY کی جائے۔ سید محمد صاحب عمدہ پختہ سُرخ رنگ بازار سے لائے۔ اُسے پانی میں خوب پکاتے رہے۔ پھر رات کو فلٹر صاحب کو اُس رنگ سے غسل دلا دیا۔ سید محمد صاحب رنگ پھینک کر گیا وَنڈ کے مشرقی دروازے سے باہر کود کر چلے گئے۔ ہم لوگ فلٹر صاحب سے ہمدردی کرنے کے لیے جمع ہو گئے کہ اُن کی اجازت کے بغیر کس نے انہیں رنگین غسل دلایا۔ ہم لوگ اس کی خبر لیں گے۔ ایک اور لطیفہ بلا وجہ وجود میں آ گیا۔ ہمارے چند کمروں کے لیے عبدالمجید خدمت گزار تھا۔ رمضان شریف کا زمانہ آیا تو سحری کے وقت فرنی بھی آنے لگی۔ کمرے میں ایک الماری تھی۔ اُس میں کھانا اور فرنی رکھی جاتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ عبدالمجید فرنی کے ساتھ شوق فرما رہے تھے۔ منہ اور ہاتھ دونوں مصروف تھے۔ عبدالمجید کی پیٹھ میری طرف تھی۔ چنانچہ اُس کی پیٹھ کا ڈھول بجایا گیا۔ پھر تو وہ مجھ سے اس قدر خائف رہنے لگا کہ جن طلبہ کا کام وہ ٹال دیا کرتا تھا میرے کہنے پر مجبوراً کرنے لگا۔

عثمانیہ ہوسٹل میں آتے ہی مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دو انعام حاصل ہوئے۔ ایک تو یہ کہ جامع مسجد میں (جو ساتھ ہی تھی) بعد عصر کے، مولانا سلیمان اشرف صاحب کے درسِ تفسیر میں حاضری کی سعادت حاصل ہوئی اور دوسرا انعام یہ ملا کہ اسی زمانے میں (۱۹۳۱ء) اُستاذ الہند قاری ضیاء الدین احمد الٰہ آبادی کا تقرر تجوید و قرأت پڑھانے کے لیے ہوا تو مغرب کے بعد اُن کے درس میں حاضری ہونے لگی۔ اُن کا کمرہ جامع مسجد کے مشرقی حصے میں تھا۔ بفضلہ تعالیٰ جلد ہی تکمیل نصیب ہوئی (گو کہ شاطبی شریف بعد میں اُن سے پڑھی)۔

اسی زمانے میں (یعنی بی اے کلاس میں) دو ساتھی غلام احمد خان نام کے تھے۔ ایک تو نواب محمد اسمٰعیل خان صاحب کے صاحبزادے تھے جنہوں نے کچھ عرصے کے بعد اپنے نام میں "مدنی" کا اضافہ کر لیا تھا۔ دوسرے حیدرآباد (دکن) کے تھے۔ مدنی صاحب شرافت اور دیانت کا مجسمہ تھے اور انہوں نے کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ نواب صاحب کے بیٹے ہیں۔ البتہ عثمانیہ ہوسٹل میں اُن کا کمرہ پوری نوابی شان کا تھا جس کا فرنیچر بعد میں ایک وارڈن صاحب نے اُن سے مانگ لیا تھا۔

عثمانیہ ہوسٹل کے خاص احباب میں محمد ممتاز (گورکھپوری)، نبی احمد (بہاری) اور عبدالقادر تھے۔ عبدالقادر بہت خوش الحان تھے۔ اور یونیورسٹی کی اکثر تقریبات میں وہی تلاوت کرتے تھے۔ لیکن سونے میں بھی بہت مہارت رکھتے تھے۔ مجھ سے کہتے تھے کہ فلاں کتاب میرے ساتھ پڑھو۔ میں کتاب شروع کرتا اور وہ سونا شروع کرتے۔ بار بار اُن کو جگاتا تھا لیکن سونے سے باز نہیں آتے تھے۔ حبیب اللہ بیگ (جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے) مدراس کے رہنے والے تھے۔ بہت ذہین اور محنتی تھے۔ میرے ساتھی ضامن علی اُن کی شان میں کہا کرتے تھے :۔ حبیب اللہ بیگ۔ پکائی دیگ۔ دیگ میں لگا ناگا۔ حبیب اللہ مدراسی کو بھاگا۔

مدراس کے ایک طالب علم Y. MUHAMMAD تھے۔ بہت سیدھے اور بھولے تھے۔ اُردو بہت کم جانتے تھے۔ یار لوگ اُن کو بہت چھیڑتے تھے۔ ایک صاحب اکثر لحاف اوڑھ کر پڑے رہتے تھے۔ اُن کا نام "مولانا لحاف" ہو گیا تھا۔ ایک تسیم بڑا زرتی تھے (جو اکثر یا مرزا صاحب کے عزیز تھے)۔ اُن کو مرزا چھپا (یوپا) کہا جاتا تھا۔ وہ فزکس ایم ایس سی HONS کے واحد صاحب علم تھے۔ بعد میں مجبوراً پاس کیے گئے یعنی "تھرڈ کلاس فرسٹ" ہوئے۔ ایک منظور الامین حیدرآباد (دکن) کے تھے۔ مجھ سے بڑی دوستی تھی۔ بہت پڑھتے تھے کیونکہ "کمبخت کتابیں" بہت مشکل سے انہیں یاد ہوتی تھیں۔ ایک دن مجھ سے فرمانے لگے کہ میری بیوی (وطن میں) مجھ سے ناراض ہے۔ اُس سے میری سفارش کر دو۔ چنانچہ میں نے اُن کی بیوی کو ایک منظوم خط اس طرح لکھا :۔

دوست میرے ہیں جو منظور الامیں — خود کو ظاہر کرتے ہیں اندوہ گیں
خوب کھایا کرتے ہیں زردہ پلاؤ — مجھ سے کہتے ہیں کہ آؤ تم بھی کھاؤ
ناشتے میں پوریاں کھاتے ہیں چار — کھانے میں سب مال لیں گے اُن سے مار
ماش کی دال اُن کو بس مرغوب ہے — خود پکا لینے کی عادت خوب ہے
ہے کسی کا ایک شعر ان کے لیے — سُن لیں بھائی جان اِس من کے لیے

"فراق یار میں گھل گھل کے ہوگئے ہاتھی
ہزار گز کی قبا پاؤں تک نہیں آتی"

معلوم نہیں اس خط کے پہنچنے پر بھائی منظور الامین کو کیا ڈانٹ پڑی۔ وہ مجھ سے کچھ ناخوش ہی رہے اور ہم لوگ اُن کو چھیڑتے ہی رہے۔ چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی — پھر کئی سال کے بعد حیدرآباد (دکن) میں اُن کے در دولت پر بھی حاضر ہوا تھا۔

ایک جگت دوست "مختار جمیل بدایونی" کے رہنے والے تھے۔ ہر محفل میں خوش باش اور حاضر باش تھے۔ بڑی ڈاڑھی تھی۔ نماز کے سخت پابند تھے۔ اچھے کھلاڑی تھے۔ کبھی کبھی کرکٹ میں کھیل لیتے تھے کبھی کوئی گیند روک لیتے تھے تو ہر طرف سے "جمیل میاں فیلڈ" کی آوازیں آتی تھیں۔ گانے کے شوقین تھے۔ داغ کی یہ غزل بل بل کر گنگناتے تھے :- پیامی کام یاب آئے نہ آئے۔ مرے خط کا جواب آئے نہ آئے

اسی زمانے میں مجھ سے ایک کام شیخی کا ہوگیا۔ ہوا یہ کہ بعض احباب کے ساتھ دولت راؤ سندھیا کے قلعے کی طرف جانا ہوا۔ وہ لوگ کہنے لگے کہ اس قلعے کی دیوار سے کون کود سکتا ہے؟ میں نے شیخی میں کہہ دیا کہ میں کود سکتا ہوں۔ میں نے صحیح اندازہ نہیں لگایا تھا اور میں کود گیا۔ شکر ہے کہ ہاتھ پاؤں سلامت رہے لیکن کمر میں اس زور کا جھٹکا لگا کہ میں اُٹھ نہیں سکتا تھا۔ بڑی ہمت کر کے اُٹھا اور سیدھا کھڑا ہوا۔ پھر کسی جگہ دیر تک ٹوٹا ٹوٹا پھرتا رہا اور بعد میں قریب تین میل کی دوڑ لگائی۔ لیکن ۱۵ — ۲۰ دن تک کمر میں درد رہا۔ شرم کی وجہ سے کسی سے ذکر بھی نہیں کیا اور ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں گیا۔ بحمداللہ آرام ہوگیا۔ اسی زمانے میں میری آنکھیں بھی کمزور ہوگئیں تو ایک دوست کے مشورے سے میں نے سونف بہت کھائی جس سے بفضلہ تعالیٰ میری آنکھیں اب تک اچھی ہیں۔

علی گڑھ میں اب سر راس مسعود صاحب وائس چانسلر ہوئے۔ انہوں نے اکثر شعبوں میں مغرب کے اُستادوں کو بھر لیا۔ حتیٰ کہ عربی کے شعبہ میں DR. OTTO SPICE کو لے لیا، حالانکہ اُن سے زیادہ قابل لوگ اس شعبے میں موجود تھے۔ البتہ جغرافیہ کے شعبے میں قاضی جلال صاحب کی جگہ ڈاکٹر عبادالرحمٰن صاحب کو لے لیا۔ اُن کی وجہ سے شعبے کو بہت ترقی ہوئی۔ قاضی جلال صاحب بہت خوش مزاج تھے۔ بہت سے انگریزی الفاظ کو وہ اردو کا رہین منت کہا کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ لکھنؤ میں ایک شخص عصا ٹیک کر چلا جاتا تھا تو اس سے STICK بن گیا۔ DECORATION "دیکھو رے شان" سے بنا ہے۔ TOLERATION "تاؤ رے شان" سے بنا ہے۔ CORPORATION دراصل "کار پریشان" سے ہے۔ غرض کہ ان کو خوب سوجھتی تھی۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

میں ایل ایل بی فائنل میں پہنچا تو مصروفیات بہت بڑھ گئیں۔ میری عادت تھی کہ ہر کلاس میں اُستادوں کا ایک ایک لفظ اپنی کاپی میں لکھ لیتا تھا۔ اس لیے مجھے امتحان کی تیاری میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی اور اکثر طلبہ مجھے گھیرے رہتے تھے۔ چنانچہ جب کلاس سے فارغ ہوتا تھا تو کچھ طلبہ آجاتے تھے۔ اُن سے فارغ ہوتا تھا تو ۸ بجے سے ایک بجے تک یونیورسٹی کی کلاسوں میں مصروف رہتا تھا۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد کھانا کھا کر ظہر کی نماز پڑھتا تھا۔ ظہر کے بعد کچھ احباب (بالخصوص حبیب احمد اور شیخ غلام حسن) امالی پڑھنے آجاتے تھے۔ عصر کی نماز کے بعد عصر کے درس میں شریک ہو جاتا تھا۔ میرے ایک دوست انتظام الدین، ریلوے اسٹیشن کے قریب محلہ شاہ کمال میں رہتے تھے۔ انہوں نے عشرہ تک کی تیاری نہیں کی تھی۔ اس لیے مغرب سے عشاء تک اُن کی تیاری میں مصروف رہتا تھا۔ پھر اپنے گھر واپس آ جاتا تھا۔ [illegible] سے مجھے ان خشک مضامین کا حوصلہ ملا۔ اللہ تعالیٰ کا جس قدر شکر کروں کم ہے۔

۱۹۳۲ء میں کتاب انگارے شائع ہوئی تو علی گڑھ شہر سے ایک ہفت روزہ یا پندرہ روزہ اخبار اُس کے خلاف شائع ہوا۔ مدیر کا نام تو یاد نہیں لیکن اخبار کا نام خشمات یاد ہے جو خان بہادر شمس العلماء مولانا ابوالفدا کے ہر چہلے حرف کا مجموعہ تھا۔ اس میں ایک مستقل باب "انگ کھائیں انگارے ..." ہوا کرتا تھا۔ دہریت کے لیے جو نیا نیا شوق پیدا ہوا تھا اور صرف بیہودہ فقروں کو شائع کرنا REALISM⑦ کیا گیا تھا اُس کے خلاف اس اخبار میں برابر مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ یونیورسٹی میں فلسفے کے صدر ڈاکٹر ظفر الحسن صاحب اس نئے شوق کے سخت خلاف تھے اور طلبہ کو بھی اس کی مخالفت پر آمادہ کیا کرتے تھے۔

اپریل ۱۹۳۳ء میں بی اے (فائنل) کا امتحان ہوا۔ میرا رول نمبر ۱۴ تھا۔ مجھے بھی اچھے نمبر ملے۔ لیکن غلام احمد مدنی سب سے اوّل رہے۔ اُن کا رول نمبر ۱۳ تھا۔ وہ پہلے بھی ہمیشہ ہر کلاس میں اوّل پاس ہوتے رہے۔ میرٹھ سے میٹرک اور انٹر پاس کیا تھا اور دونوں میں اوّل آئے تھے۔

ایم اے کا زمانہ

بی اے پاس کرنے کے بعد محمد ممتاز (کھرگ پور والے) اور چودھری عبدالحمید (جالندھر والے) کے ساتھ میں نے بھی ایم اے (فارسی) کلاس میں داخلہ لے لیا۔ غلام احمد مدنی صاحب نے بھی (غالباً) داخلہ لیا تھا لیکن وہ کلاس میں نہیں آتے تھے اور انڈین سول سروس کے امتحان کی تیاری میں مشغول رہتے تھے۔ شعبۂ فارسی کے صدر جناب ڈاکٹر ہادی حسن صاحب تھے۔ نہایت حسین و جمیل، خوش پوشاک، خوش اخلاق اور خوش مزاج تھے۔ ایرانی ماں کے بیٹے تھے۔ بے حد ذہین اور محنتی تھے۔ فرماتے تھے کہ کیمبرج میں بی اے آنرز اور بی ایس سی آنرز کے زمانے میں جارج پنجم کا بیٹا ایڈورڈ (جو صرف شادی کی خاطر تخت سے دستبردار ہوا اور بعد میں ڈیوک آف ونڈسر DUKE OF WINDSOR کہلایا) میرے ساتھ تھا۔ میں نے ایک سخت مشکل کتاب شروع سے آخر تک رٹ ڈالی تھی لیکن امتحان میں اُس کو اوّل قرار دیا گیا اور مجھے دوم۔

ڈاکٹر صاحب نے بعد میں لندن سے فارسی میں پی ایچ ڈی کیا۔ فارسی اور انگریزی اُن کے قدم چومتی تھی۔ تقریر اس قدر دلپذیر ہوتی تھی کہ ان زبانوں سے نا واقف لوگ بھی ہمہ تن گوش بن جاتے تھے۔ PERSIAN NAVIGATION اُن کی پہلی کتاب تھی جو کئی مقالوں پر جاری کی تھی۔

① اُن کو زمانے میں انگریزی کے ایسے جملے بنانے کا شوق تھا:-

پھر متعدد کتابیں لکھیں۔ انگریزی ایسی لکھتے تھے کہ انگریز بھی شرما جاتے تھے۔ ایک پرنسپل F. W. FAIN (FERGUSON COLLEGE) جو FUGURATIVE STYLE کے لیے مشہور تھے اُن کی کتابوں کے جملے ڈاکٹر صاحب کو ازبر تھے۔ اور اپنی تقریر میں اُن کو اس خوبی سے شامل کر لیتے تھے کہ کسی کو اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ جملے کسی اور کے ہیں۔ انداز بیان میں اس قدر دلکشی تھی کہ اگر کسی مقرر ایک وقت میں بولنے والے ہوتے تھے تو حاضرین کو صرف ڈاکٹر صاحب کی تقریر سننے کا اشتیاق غالب رہتا تھا۔ یوپی کالج کے پرنسپل غلام السیدین صاحب (جو خود بھی بہت ذہین تھے) ڈاکٹر صاحب کو STAGE DRAMATIST کہا کرتے تھے۔ جدید فارسی میں پورے ملک میں اُن کی طرح شاید کوئی ماہر نہ تھا۔ ایک دن مجھ سے فرمانے لگے کہ تم بھی بہت سی تحریریں رٹ لیا کرو۔ میں نے عرض کیا کہ آپ قرآن پاک کیوں حفظ نہیں کر لیتے؟ انہوں نے برجستہ جواب دیا کہ میں ایک تہائی قرآن حفظ کر چکا ہوں (خدا کرے کہ مکمل کر لیا ہو)۔ ایک مرتبہ مجھ سے فرمانے لگے کہ تم تذکرہ دولت شاہ کا انگریزی میں ترجمہ کر ڈالو۔ میں نے اُن کے حکم کی تعمیل میں تقریباً نصف کتاب کا ترجمہ کیا۔ اور جو اشعار اُس میں تھے اُن کا انگریزی اشعار میں ترجمہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب بہت خوش ہوئے اور مدت تک وہ ترجمہ اپنے پاس رکھا۔ اُن کا انگریزی خط اور نستعلیق خاص طرز کا ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب بہت با اخلاق اور بہت با وقت تھے۔ اس کی تہمت اُن کی اہلیہ تھیں جن کے متعلق لوگ عجیب قصے بیان کیا کرتے تھے۔ مگر ہم لوگوں نے اُن کے بنگلے میں یا باہر کبھی نہیں دیکھا۔

شعبے کے دوسرے اُستاد لفٹنٹ حاجی حمید الدین صاحب تھے۔ وقت کے سخت پابند۔ پڑھائی کا گھنٹہ شروع ہوتے ہی فوراً پڑھائی

---

(1) ROUND AND ROUND THE RUGGED ROCKY RAMPARTS THE RIDING RULEVRAN

(2) DOWN DID HE DWELL IN THE DEPTHS OF DESPAIR AND DESPONDENCY

(3) POOR, PRECIOUS POVERTY PREDICTED PERDITION TO THE PUBLIC.

⑦ احمد نے حق کا مظاہرہ علی گڑھ کی بعض طرز پسند اور مسلمان گزشتہ کے خاندان میں جلد ہوا تھا۔

— عام آرہ کا وحید اشاعت اداری تھا (م)

شروع کر دیتے تھے اور گھنٹہ ختم ہوتے ہی فوراً پڑھائی ختم کر دیتے تھے بلکہ جملہ بھی ادھورا چھوڑ دیتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ تم فلاں جملہ (غالباً) نوٹ کر کے دس منٹ پر مجھ سے ملنا۔ مجھے ۲-۳ منٹ کی دیر ہو گئی تو وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ لیکن بہت ہمدرد اور سخت کوش تھے۔ مجھ سے فرماتے تھے کہ تم لیڈر بننا۔ ۱۹۳۶ء میں جب کہ ہم لوگوں کا فائنل کا امتحان ہونے والا تھا وہ ریٹائر ہو گئے اور فرمانے لگے کہ مجھے اپنے مضمون (فارسی) سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بہت محنت اور دیانت کے ساتھ پڑھاتے تھے۔

تیسرے اُستاد فاضل یگانہ ضیاء احمد بدایونی صاحب تھے۔ عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں اور اُن کے ادب پر انہیں عبور حاصل تھا گو دوسرے مضامین کے پڑھانے والے اُن کے فضل و کمال کے معترف تھے۔ بخار کی حالت میں بھی وہ پڑھانے کے لیے تشریف لے آتے تھے اور اس قدر محنت سے پڑھاتے تھے اور ایسے نکات بیان فرماتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ شعر و شاعری اُن کے گھر کی لونڈی تھی اور مخطوطات کی قرأت اُن کے لیے ذرا بھی مشکل نہ تھی۔ اُن کی اس صلاحیت کا اندازہ مجھے بعد میں ہوا جب کہ بعض عربی اشعار (جن کی تصحیح ہمارے ملک کے بعض سب سے بڑے فضلاء نہ کر سکے تھے) قبلہ ضیاء احمد صاحب نے فوراً بتا دیے اور صحیح کر دیے۔ اسی زمانے میں نیویارک (امریکہ) سے بہائیوں کی طرف سے ایک مقالہ لکھنے کی دعوت آئی۔ موضوع تھا :- HOW CAN YOUTH CONTRIBUTE TO THE REALISATION OF A UNIVERSAL RELIGION چند دنوں میں مقالہ لکھا اور بہائیوں کی خوب خبر لی۔ قبلہ ضیاء احمد صاحب نے پسند فرمایا۔ پھر بہائیوں نے بھی میرے مقالے کی بہت تعریف کی۔ لیکن ظاہر ہے کہ میرا مقالہ اُن کے خلاف تھا اس لیے انعام مجھے وہ کب دے سکتے تھے؟

اسی زمانے میں CALIFORNIA یونیورسٹی سے ایک خط آیا کہ اگر کوئی تحقیقی مقالہ پی ایچ ڈی کے طور پر بھی کوئی طالب علم تیار کرے گا تو ہم اُسے ڈگری دے سکتے ہیں۔ میں نے ارادہ کیا کہ فارسی میں مقالہ لکھوں لیکن بعض حضرات نے رائے نہیں دی، کیونکہ اُس زمانے میں [illegible] کے مقابلے [illegible] کی قدر نہیں تھی۔ قبلہ ضیاء احمد صاحب کا نستعلیق اور انگریزی خط بہت پاکیزہ تھا اور جلد جلد لکھنے میں بھی اُن خطوں کے حسن میں کوئی فرق پیدا نہ ہوتا تھا۔

اُس زمانے میں ایم اے کے ساتھ ایل ایل بی کلاس میں بھی داخلہ لیا جا سکتا تھا جو صبح سات کے بعد ہوا کرتی تھی۔ میں نے اس کلاس میں بھی داخلہ لے لیا۔ مولانا سید [illegible] صاحب شعبے کے صدر تھے۔ بیرسٹر اسحٰق خسرو اور بیرسٹر اسحٰق خواجہ بھی استاد تھے۔ میں اکثر نامدار خان[1] صاحب کے ساتھ بالکل اگلی صف میں بیٹھا کرتا تھا۔ ایک دن مجھے کچھ دیر ہو گئی تو میں آخری صف میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں دیکھا کہ ایک فلیٹ کیپ میرے ڈیسک پر آ گئی۔ بات یہ تھی کہ ہندو طلبہ اگر ترکی ٹوپی نہ پہننا چاہتے تو انہیں فلیٹ کیپ پہننے کی اجازت تھی۔ ایک ہندو طالب علم نے اپنی ٹوپی ڈیسک پر رکھ دی تھی تو ایک طالب علم نے شرارت سے اُٹھا کر پیچھے کے ڈیسک پر پہنچا دیا تھا۔ وہاں سے اور پیچھے کے ڈیسک پر آئی اور مختلف ڈیسکوں سے ہوتی ہوئی میرے پاس آ گئی تھی۔ میں اُسے لے کر باہر چلا آیا تو یار لوگوں نے اُس کی فٹ بال کھیل ڈالی اور اُس کے چیتھڑے اُڑ گئے۔ دوسرے دن اُن چیتھڑوں کو لے کر کلاس میں پہنچا اور ایک پرچہ لکھا کہ "پنڈت جی، بہت افسوس ہے کہ آپ کی ٹوپی کا یہ [illegible] لوگوں نے فٹ بال کھیل ڈالی اب جو کچھ بچا ہے آپ کی خدمت میں واپس کرتا ہوں۔" نامدار خان نے وہ رقعہ اور وہ چیتھڑے (اُٹھا کر) بیرسٹر اسحٰق خسرو صاحب کی میز پر رکھ دیا۔ وہ بہت گراں گوش تھے۔ انہوں نے وہ رقعہ دیکھا تو پڑھ کر طلبہ کو سنایا۔ پوری کلاس میں قہقہے گونج گئے۔ وہ پنڈت جی (جن کی ٹوپی تھی) کھڑے ہوئے۔ کہنے لگے کہ وہ ٹوپی میری ہے اور میں وائس چانسلر کو رپورٹ کرنا چاہتا ہوں۔ بیرسٹر صاحب نے کچھ سنا نہیں۔ لیکن فرمایا کہ کلاس سے فارغ ہو کر میرے پاس آؤ۔ کلاس ختم ہوئی تو پنڈت جی نے وہی بات کہی کہ میں وائس چانسلر کو رپورٹ کرنا چاہتا ہوں۔ بیرسٹر صاحب بالکل نہ سن سکے انہوں نے قریب کے طالب علم سے پوچھا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ طالب علم نے کہا کہ یہ فرماتے ہیں کہ میری ٹوپی ایک روپیہ کی تھی، معاوضہ دلوائیے۔ پنڈت جی نے کہا کہ میں نے ایسا نہیں کہا۔ میں تو رپورٹ کرنا چاہتا ہوں۔ بیرسٹر صاحب پھر نہ سن سکے تو قریب والے طالب علم نے کہا کہ آپ فرماتے ہیں کہ روپیہ نہیں تو اٹھنی دلوا دیجیے۔ بیرسٹر صاحب نے پھر بھی کچھ نہ سنا تو اُسی طالب علم نے کہا کہ آپ فرماتے ہیں کہ کم از کم چونی تو دلوا دیجیے۔

---

① نامدار خان صاحب نے [illegible] ایم اے (ریاضیات) پاس کر لیا تھا لیکن [illegible] کالج میں داخلہ [illegible] اس لیے وہاں [illegible] کے لیے [illegible] داخلے [illegible] [illegible] میں بہت نامور وکیل تھے۔ ۱۹۶۲ء میں انتقال ہوا۔ [illegible]

بیرسٹر صاحب نے فرمایا کہ I SHALL PAY YOU FOUR ANNAS ۔ لیکن اندازہ لگائیے کہ اس پورے مکالمے میں طلبہ کا قہقہوں کی وجہ سے کیا حال ہوگا۔ پنڈت جی پریشان ہوکر چلے گئے اور طلبہ بڑی دیر تک قہقہوں سے اُن کی پذیرائی کرتے رہے۔

اسی زمانے میں AEMSBUTHAN پرو وائس چانسلر تھے۔ ایک DEBATE (رام پور حامد ہال میں) اُن کی صدارت میں ہو رہی تھی۔ عنایت اللہ، کاٹول (ناگ پور) کے تھے۔ بحث میں حصہ لیتے ہوئے جوش میں آکر کہنے لگے :-

THESE DOGS OF CHRISTIANS HAVE GOT BIBLE ON THEIR LIPS AND DEVIL IN THEIR HEARTS.

ہم سب لوگ گھبرا گئے کہ کہیں پرو وائس چانسلر ناراض ہوکر کوئی کارروائی نہ کریں۔ لیکن شکر ہے کہ اُن کی ایسی جرأت نہ ہو سکی۔ حالانکہ اسی زمانے میں DISCIPLIN تاریخ کا ایک سخت واقعہ یہ ہوا تھا کہ ایک پروفیسر صاحب کے بنگلے میں بجلی کی چوری کا ثبوت ملنے پر انہیں ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔

اسی زمانے میں قادیانیوں نے (قادیانی اُستادوں اور قادیانی طلبہ نے) مرزا بشیر احمد کو علی گڑھ آنے کی دعوت دے دی۔ کچھ مسلمان طلبہ کو معلوم ہوا تو انہوں نے مولانا ابوبکر محمد شیث جونپوری (ناظم دینیات) کی طرف سے مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ظفر علی خان کو تار دے دیے کہ آپ لوگ جلد تشریف لائیں۔ (پھر مولانا ابوبکر صاحب نے معذرت کر لی۔ لیکن وہ بہت خوش ہوئے)۔ مرزا بشیر احمد علی گڑھ ریلوے اسٹیشن پہنچ چکا تھا لیکن ان دو بزرگوں کی آمد کی خبر سنتے ہی واپس چلا گیا۔ ان دو بزرگوں نے پھر ایسی دھواں دھار تقریریں کیں کہ عرصے تک کے لیے قادیانیوں کی ہمت پست ہو گئی۔

اسی سال دسمبر ۱۹۳۲ء میں جب ALL INDIA ENGLISH DEBATE کا انعقاد ہوا تو رام پور حامد ہال کی گیلری میں ایک حصے میں کالج کی لڑکیوں کے لیے پردہ کر دیا گیا۔ ایک لڑکی بہت شریر تھی۔ پردے کے قریب تھوڑے ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ اُس لڑکی نے بڑی چابک دستی سے اُن کی ٹوپی کھینچ لی۔ دوسرے دن وائس چانسلر صاحب کا عتاب نامہ آیا کہ جن لڑکوں نے ہال میں شرارت کی ہے اُن کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔ یعنی شرارت تو لڑکی نے کی تھی لیکن لڑکیوں کی پرنسپل صاحبہ نے لڑکوں کو غلط ڈانٹ دلوا دی۔ لڑکے بہت چراغ پا ہوئے لیکن قہر درویش بر جان درویش۔ بے چارے صبر کر کے رہ گئے۔ اسی زمانے میں حفیظ جالندھری آئے تھے۔ شاہنامۂ اسلام کے اشعار اپنے مخصوص انداز میں سناتے رہے۔ اساتذہ اور طلبہ بہت محظوظ ہوئے اور اُن کے کمال کا اعتراف عرصے تک کرتے رہے۔

اسی زمانے میں قاہرہ سے KHALID SHELDRAKE آئے تھے۔ انہوں نے آپا حلیم (A. B. A. HALIM کو ہم لوگ آپا حلیم کہتے تھے) کے ذریعے اپنی مالی امداد کے لیے درخواست کرائی۔ آپا حلیم اب پرو وائس چانسلر تھے اور بہت باوقار تھے۔ طلبہ نے حتی الامکان اُن صاحب کی خدمت کی۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ قاہرہ جاکر MINARET اخبار طلبہ کو بھیجا کریں گے۔ لیکن انہوں نے نہیں بھیجا۔ میں نے انہیں قاہرہ بھی خط لکھا تھا۔ لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جس زمانے میں علی گڑھ آئے تھے تو رمضان المبارک کا مہینا تھا۔ وہ دن میں سگریٹ پیا کرتے تھے کہ اُن کے علماء کا اسی طرح کا فتویٰ تھا۔ علی گڑھ میں ذاتی مقاصد کے حصول کے لیے ایسے لوگ آتے رہتے تھے۔ امریکہ سے ایک بازی گر آیا۔ اشتہار تھا A MAN WITH THOUSAND FACES ۔ اسٹریچی ہال میں مظاہرہ ہوا۔ ٹکٹ خرید کر داخلہ ملا۔ وہ شخص مُنہ بنا بنا کر ہنستا تھا۔ اور کچھ نہ تھا۔ امریکہ سے ایک صاحبہ بھی آئی تھیں۔ شکل واجبی سی تھی۔ حامد ہال میں تقریریں کیں اور اپنا ذاتی مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ گویا اپنی سکینت کے لیے ایسی کرامت دکھلائی تھی۔

اپریل ۱۹۳۳ء میں اسٹریچی ہال میں امتحانات شروع ہوئے تو ایک لطیفہ ہو گیا۔ پہلے دن ایم اے (فارسی) کے فاضل کا امتحان تھا اور بی اے کی فارسی کا امتحان بھی اسی دن تھا۔ دونوں کے امتحانی پرچوں میں نظامی عروضی کے چہار مقالہ کے اقتباسات تھے۔ ایم اے کے پرچوں کا کاغذ نیلا ہوتا تھا اور بی اے والوں کا سبز ہوتا تھا۔ منظور حسین شور صاحب (جو بعد میں سی پی میں پروفیسر ہوئے اور مشہور شاعر بھی ہیں) مجھ سے ایک سال سینیئر تھے۔ وہ ایم اے کا امتحان دینے گئے تو تین گھنٹے تک بی اے کا پرچہ حل کرتے رہے۔ امتحان ختم ہوا تو غلام احمد مدنی صاحب کے ساتھ میں بھی کیفیت دریافت کرنے کے لیے گیا تو دیکھا کہ اُن کے ہاتھ میں بی اے کا پرچہ تھا۔ ہم سب کو پریشانی ہوئی۔ مدنی صاحب فوراً اپنے والد نواب محمد اسمٰعیل خان صاحب کے پاس گئے اور سب حال بتایا۔ نواب صاحب بنفس نفیس تشریف لائے اور منظور حسین صاحب کو ہال میں بٹھا کر ایم اے کا پرچہ پہنچایا۔ تسلی دی۔ پھر کھانے

اور شوربات بھیجے۔ اس طرح اُن کا پرچہ کرایا گیا۔

۱۹۳۳-۳۴ء کا تعلیمی سال میں نے اور میرے بعض احباب نے مارلیسن کورٹ میں گزارا۔ وہاں کا وارڈن قادیانی تھا۔ اُس سے ہم لوگوں کی بنتی نہیں تھی۔ مشورہ ہوا کہ اب یعنی ۱۹۳۴ء کے آخر سے مُزمّل ہوسٹل میں رہیں گے۔ غلام علی خاں نے کہا کہ وارڈن صاحب کی کچھ تو خدمت کرتے چلیں۔ چنانچہ سُرخ رنگ پانی میں گھول کر خوب پکایا گیا اور اُن کے کمرے کی کھڑکی دفعتہً کھول کر اُن کو اچھی طرح سے سُرخ غسل دیا گیا۔ پھر ہم لوگ سائیکلوں میں بیٹھ کر فرار ہو گئے۔ مُزمّل ہوسٹل میں بڑا سکون تھا۔ گرمی کے ہال میں سجتی تھی۔ INTRODUCTION PARTY آئی۔ اُس کے سربراہ کلیم الرحمٰن شیروانی تھے۔ میں کمرے کے باہر (گرمی کی وجہ سے) چارپائی ڈال کر سو رہا تھا۔ شیروانی صاحب کچھ چھیڑ کرنا چاہتے تھے لیکن جونہی میری شکل دیکھی بہت ادب اور محبت سے معافی مانگی۔ اُن کے اخلاق سے علی گڑھ میں اور بعد میں کراچی کی ملاقاتوں میں دل بہت متاثر ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے اور اُن کے بچوں پر رحم فرمائے۔ آمین۔

اس ہوسٹل میں ایم اے فارسی اور ایل ایل بی کے امتحانات کی تیاری ہوئی۔ غلام علی خان، بی ایس سی فائنل کی تیاری کرنے لگے۔ مدنی صاحب کی طرح وہ بھی کبھی اوّل پوزیشن سے کم میں پاس نہیں ہوئے۔ بی ایس سی، پھر ایم ایس سی (ریاضیات) میں بھی وہ اوّل آئے۔ بعد میں جب وہ کراچی آئے تو انہوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت سے حبیب بینک کے لیے ایسے قاعدے بنائے کہ اُن کی وفات کے بعد آج بھی وہاں کے دستور العمل میں شامل ہیں۔ بڑی ہمت اور حوصلے والے تھے اور شوٹ میں بھی ماہر تھے۔ اس ہوسٹل کے قیام کے زمانے میں بھائی عبدالحمید صاحب جالندھری کی خصوصی محبت میرے لیے بڑی نعمت تھی۔ وہ خصائیہ ہوسٹل سے باہر وہاں تشریف لاتے تھے۔ RIDING SQUAD میں تھے اور گھوڑے پہ سواری کی حالت میں بھی آجاتے تھے اور آج تک دل کے آئینے میں ہیں۔ فضل حکیم، جمیع اللہ خان (ایجنر یارڈ، اگرولہ، گونڈہ)، رضا علی خاں (اچےپور) اور بھائی انتظام اللہ (علی گڑھ، محلہ شاہ کمال) خصوصی کرم فرما تھے۔ میرے کمرے میں ممتاز علی (حمل پور) تھے اور ساتھ والے کمرے میں عبدالحی (اکٹری، ساگر) اور شوکت حسین انصاری (بھوپال) بہت تعلق رکھتے تھے۔ موسم گرما میں ہم لوگ تھانہ ستاوری کی طرف چلے جاتے تھے۔ وہاں خربوزے کی گاڑیاں آتی تھیں۔ ڈھائی روپے میں ایک گاڑی مل جاتی تھی۔ وہاں کھیت کے لوگ ہمارے لیے چارپائی بچھا دیتے تھے اور خربوزے کے بیچ کے ایک میں ہمارے خربوزے دھو کر اور کاٹ کر ہم کو دیتے جاتے تھے۔ ۶-۷ لڑکے ایک گاڑی کے خربوزے کھا لیتے تھے۔ گاڑی کا اوسط دو بٹے کی ہوتی تھی۔

امتحانات سے فراغت ہوئی تو رضا علی خاں نے مشورہ دیا کہ آپ اُردو میں بھی ایم اے کر لیں۔ چنانچہ موسم گرما کی تعطیل کے بعد جون ۱۹۳۵ء میں وطن سے واپسی ہوئی تو میرے ساتھ ممتاز علی، سراج الحق اور (اس مرتبہ) صالح بھائی بھی تھے۔ جب ٹونڈلا جنکشن آیا تو میں نے سراج الحق سے کہا کہ اسٹیشن پر اپنے کوئی احباب ہوں تو ہمیں بلا لو۔ یہ کہہ کر میں ظہر کی نماز ڈبے میں ہی پڑھنے لگا۔ سراج الحق ڈبے سے باہر گئے تو ایک ہندو کوتوال، اُس کا بیٹا اور ایک مسلح سپاہی ڈبے میں داخل ہوا۔ کوتوال کا بیٹا سراج الحق کی جگہ پر بیٹھ گیا۔ کوتوال اور سپاہی ذرا فاصلے پر بیٹھ گئے۔ سراج الحق واپس آئے اور مجھ سے کہا کہ کوئی احباب نہیں ملے اور پھر انہوں نے کوتوال کے لڑکے سے کہا کہ میری جگہ سے اُٹھو۔ لیکن وہ اپنے باپ کی وجہ سے اکڑ میں تھا اور سوٹ پہننے کی شان میں بھی تھا۔ وہ ایک دم سراج الحق سے گتھم گتھا ہو گیا۔ میں نماز میں تھا۔ جلد سلام پھیرا اور کوتوال کے بیٹے کی پیٹھ پر ایک گھونسہ رسید کیا کہ وہ ڈھیلا پڑ کر بیٹھ گیا۔ لیکن میرا آخری گھونسا اُس کے باپ نے دیکھ لیا تو وہ مجھ پر لپکا۔ میں نے پوری قوت سے ایک گھونسا اُس کے جبڑے پر رسید کیا تو وہ چکر کھا کر گر پڑا۔ خود میرا پنجہ مڑ گیا۔ میں نے جلدی سے دوسرے ہاتھ سے اپنا پنجہ سہلایا۔ اتنے میں سپاہی نے میری طرف اپنی بندوق تان لی۔ میں نے اُس سے بندوق چھڑا لی۔ پھر تو وہ کانپنے لگا۔ ڈبے کے لوگ بھی گھبرا گئے۔ لیکن پھر ریلوے کے لوگ آ گئے اور بیچ بچاؤ کر دیا۔ لیکن کوتوال صاحب کو جو گھونسا رسید ہوا تھا وہ انہیں برسوں یاد آتا رہا ہوگا۔

اسی سال غلام احمد مدنی صاحب کے ی۔ ت۔ ا کے امتحان کا نتیجہ آیا۔ وہ پورے ملک میں دوسری پوزیشن لائے۔ دلی مبارکباد

کا خط میرٹھ کے پتے پر اُن کو لکھا۔① انہوں نے جس شکریہ کا خط مجھے فوراً بھیجا۔ سب احباب بہت خوش ہوئے۔

اس سال دو خاص باتیں ظہور میں آئیں۔ شعبۂ انگریزی کے قریب سے میں جا رہا تھا تو دیکھا کہ انگریزی کے اُستاد غلام سرور صاحب ایک تقریر سوڈا اور SOUTHEY کے تقابلی مطالعے پر کرنا چاہتے تھے۔ لیکن سُننے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ محترم اُستاد مختار حامد علی صاحب مجھے دیکھا تو فرمایا کچھ لڑکوں کو پکڑ لاؤ تاکہ تقریر شروع ہو سکے۔ میں عثمانیہ ہوسٹل کے احباب کے پاس گیا اور بڑی تعداد میں اُن کو وہاں بھیج کر دیا۔ غلام سرور صاحب جب تقریر ختم کر چکے تو صدر شعبہ HARIS HADOW تبصرہ کرنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ مختار حامد علی صاحب اُن کے ہر جملے پر قہقہہ لگاتے تھے اور اس کا مذاق اُڑاتے تھے۔ میں نے مختار حامد علی صاحب کو پہلی بار قہقہہ لگاتے ہوئے دیکھا۔ ورنہ وہ ہمیشہ خاموش رہا کرتے تھے۔

اسی زمانے میں مجنوں گورکھپوری بی اے کے لڑکوں کو انگریزی پڑھانے کے لیے مقرر ہوئے تھے۔ وہ ایک کلاس میں داخل ہوئے تھے کہ میں قریب سے گزرا۔ لڑکوں نے اُن کے تخلص کی وجہ سے جملے کسنے شروع کیے اور وہ شور مچایا کہ اُن کی ایک بات بھی نہ سُنی۔ آخر بیچارے وہاں سے مایوس ہو کر یونیورسٹی کے کسی اور کام پر لگ گئے۔

اسی زمانے میں ایک عجیب چیز دیکھنے میں آئی۔ وہ یہ کہ یونیورسٹی اسکول کے سامنے چوراہے کے قریب نیم کے ایک درخت کی جڑ سے اس قدر پانی بہنا شروع ہوا کہ ایک نالا بن گیا۔ اس پانی کو مصفیٰ خون سمجھ کر دُور دُور سے لوگ آتے تھے اور اپنے برتن بھر کر لے جاتے تھے۔

ایک اور واقعہ یہ ہوا کہ ہمارے ملنے والوں میں ایک صاحب بہت کنجوس تھے۔ ہم لوگوں کے پاس آ کر کھاتے تھے لیکن کبھی کھلانے کے روادار نہیں تھے۔ ایک دن اُن کی زبانِ سخاوت مآب سے بے خیالی میں یہ جملہ نکل گیا کہ اگر کوئی شخص چار روٹیاں ایک ساتھ کھالے تو اُسے ایک روپیہ دوں گا۔ میں نے ممتاز علی سے کہا کہ ہمت کر ڈالو۔ ورنہ کنجوس کا مال پھر نہیں ملے گا۔ ممتاز علی نے چاروں روٹیاں مُنہ میں بھر لیں۔ میں ہمت افزائی کرتا رہا۔ آخر وہ کامیاب ہو گئے اور چاروں روٹیاں کھا ڈالیں۔ اب تو کنجوس صاحب بہت گھبرائے۔ کہنے لگے کہ اس روپیہ کی مٹھائی میں مجھے بھی شریک کرنا پڑے گا۔ میں نے کہا کہ آپ نے پہلے ایسی کوئی شرط نہیں رکھی تھی۔ لیکن وہ بار بار وہی بات کہنے لگے تو میں نے کہا کہ بھائی اس کو شریک کر لو۔ ورنہ روپیہ بھی جائے گا۔ خیر۔ وہ مجبور ہو گئے اور اُن کے روپیہ نے انہیں داغِ مفارقت دیا۔ لیکن مٹھائی آئی اُس میں انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

ایک دن احباب میں مشورہ ہوا کہ ریل سے آگرہ تو کئی بار ہو آئے ہیں اب سائیکلوں پر چلیں۔ چنانچہ شنبہ ۹ نومبر اور ۱۰ نومبر ۱۹۳۵ء کی درمیانی شب میں (ڈیڑھ بجے) میرے ساتھ ممتاز علی اور صادق بھائی (جو بعد میں ڈاکٹر ہو گئے تھے) آگرہ کو روانہ ہوئے۔ ایک ساتھ گپتی اور لاٹھیاں بھی رکھ لی تھیں کیونکہ راستہ ڈاکوؤں کی وجہ سے خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ ہم لوگوں نے ۳۵ میل کا راستہ طے کر کے فجر کی نماز اعتماد الدولہ کے مزار کے قریب ایک مسجد میں ادا کی۔ آگرہ کی جامع مسجد کے سامنے ہندی ستارہ ہوٹل میں قیام کیا۔ ۳½ بجے سکندرہ گئے۔ رات کو تاج محل دیکھا۔ دوسرے دن فتح پور سیکری گئے اور رات کو ۱۲ بجے کے قریب واپس علی گڑھ کو روانہ ہوئے اور فجر میں پہنچ گئے۔

۱۹۳۶ء کے شروع میں کئی واقعات رونما ہوئے۔ بھائی غلام علی خان کے والد صاحب متھرا سے لوٹے مٹھائیاں لاتے رہتے تھے۔ بھائی موصوف مجھے ضرور کھلاتے تھے لیکن سب لوگوں کو کیونکر کھلا سکتے تھے؟ احباب بار بار کھلانے کا تقاضا کرتے رہے۔ لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔ ان احباب نے اندازہ کیا کہ غلام علی خان میرا (راقم الحروف کا) بہت ادب کرتے ہیں تو اس ادب کا فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ ایک دن غلام علی خان اپنے کمرے کے دروازے سے نکل کر کہیں جانا چاہتے تھے کہ یار لوگوں نے مجھے پکڑ کر برآمدے میں کھڑا کر دیا۔ غلام علی خان نے مجھے سلام کیا اور میرے ادب کی وجہ سے انہوں نے دروازے سے پیر نکالنا نہیں لگایا۔ احباب یہی چاہتے تھے۔ غلام علی خان جونہی کہیں کے لیے روانہ ہوئے کہ احباب نے اُن کے

① مبارکباد کا خط دہلی ریلوے اسٹیشن کے لیٹر بکس میں ڈالنے گیا تھا۔ ایک صاحب سائیکل لائے تھے وہ سائیکل وہاں سے کسی نے غائب کر دی لیکن میں نے اُن صاحب کو اس کا بدل پیش کر دیا تھا۔

کمرے میں داخل ہو کر اُن کا صندوق اُٹھایا اور جیش امام صاحب (مزمل ہوسٹل والے) کے کمرے میں رکھ دیا۔ پھر میرے پاس آئے کہ "خاں صاحب چلو، مٹھائی کھائیں گے"۔ میں نے کہا کہ میں نہیں جاؤں گا اور چوری کی مٹھائی نہیں کھاؤں گا۔ وہ لوگ مایوس ہو کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر آئے کہ "خان صاحب چلو، مٹھائی انتظار کر رہی ہے"۔ اُن کے اصرار پر مجھے جانا پڑا۔ جیش امام صاحب اپنے کمرے میں موجود تھے۔ صندوق میں تالا لگا ہوا تھا۔ جیش امام صاحب کہنے لگے کہ میرے پاس ریتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے ریتی نکال کر دی۔ تالا کاٹا گیا۔ مٹھائی نکالی گئی اور جیش امام صاحب نے طلبہ سے زیادہ داد دی۔ خیر۔ وہ صندوق پھر میرے کمرے میں لایا گیا۔ میں بازار سے تالا خرید کر لایا اور صندوق میں تالا لگا کر (چابی اُس کے ساتھ) بھائی غلام علی خاں کے کمرے کے دروازے کے پاس رکھ آیا۔ علی گڑھ کے طلبہ مٹھائی کی چوری محض تفریح کے لیے کیا کرتے تھے لیکن کوئی دوسری چیز چھونا بھی حرام سمجھتے تھے۔ چنانچہ بھائی غلام علی خاں کے پیسے وغیرہ سب چیزیں بالکل محفوظ رہیں۔ یہ واقعہ بھائی موصوف نے نہ کبھی مجھ سے پوچھا اور نہ میں نے کبھی اُن کو بتایا۔

اسی سال کا دوسرا دلچسپ واقعہ یہ ہوا کہ ۲۲ اپریل ۱۹۳۶ء کو سہسرام (بہار) کے ایک نوجوان سید شاہ سبحان احمد صاحب علی گڑھ سے گزر رہے تھے۔ وہ حج کے لیے پیدل جا رہے تھے۔ صرف رات کو سفر کرتے تھے اور ہر پانچ قدم کے بعد دو نفل پڑھتے تھے۔ بھائی عبد الحمید جالندھری کے ساتھ میں بھی اُن سے ملنے کے لیے چلا گیا۔ اُس دن اُن کی طبیعت ناساز تھی اور وہ دوا کے لیے کسی حکیم کے پاس جانے والے تھے۔ ہم لوگوں نے شرفِ ملاقات حاصل کیا۔ انہوں نے میری ڈائری پر علامہ اقبال کا یہ مصرع لکھ دیا :- ع جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

وہ کئی سال میں یہاں تک پہنچے تھے۔ بتاتے تھے کہ میں انٹرمیڈیٹ کے امتحان کی تیاری میں مصروف تھا۔ رات کا وقت تھا۔ میرے مکان کے قریب سے ایک بڑھیا گزری۔ اُس نے کہا کہ بیٹا مجھے راستہ نظر نہیں آ رہا ہے، ذرا میرے ساتھ روشنی کر دو۔ میں لالٹین لے کر اُس کے ساتھ ہو لیا۔ تو میرے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ دنیا کے سفر میں اس بڑھیا کو میری راہبری کی ضرورت ہے تو میرے آخرت کے سفر میں [illegible] چنانچہ حضور [illegible] صلی اللہ علیہ وسلم [illegible] حاصل کرنے کے لیے اُسی وقت [illegible] نہیں ہوا اور چلتا ہی رہا اور چلتے چلتے یہاں تک پہنچ گیا ہوں۔

تیسرا واقعہ یہ تھا کہ ۱۹۳۶ء میں وائسرائے LORD WILLINGDON علی گڑھ آ رہا تھا۔ اُس کی حفاظت کے لیے بڑا اہتمام تھا۔ مجھے بھی [illegible] میں شامل کیا گیا۔ اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں نظام دکن ہماری یونیورسٹی کے چانسلر تھے۔ وہ پہلے تشریف لائے [illegible] ریلوے اسٹیشن گئے [illegible] PASS [illegible] یونیورسٹی [illegible] کے حفاظتی انتظامات [illegible] اور مجھے ایک سرٹیفکیٹ بھی دیا گیا۔

لیکن خوشی کے ساتھ اس سال ایک [illegible] ۱۰۰ میل کا فاصلہ تھا [illegible] احباب کا مشورہ [illegible] بھائی سلطان محمود بھی ساتھ تھے۔ بہت نیک، نمازی اور خوبصورت شخص تھے۔ [illegible] افسوس کہ پھر اُن کا پتا نہ چلا [illegible] ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب [illegible] کے والد حکیم سلطان محمود صاحب [illegible] کسی کو کیا حاصل ہو سکتا تھا! ع ہزار شیخ بگشتند و [illegible] باقی است

علی گڑھ میں میرا قیام [illegible] بھائی انتظام الدین کی وجہ سے [illegible]

اُن کی خدمت میں حاضری دی ہے۔ اور اُن سب کی یاد آج بھی تازہ ہے۔

علی گڑھ کی زندگی میں اچھا بُرا جو کچھ کیا ہے اُس کی مختصر داستان اوپر عرض کر دی گئی۔ اب تو بارگاہِ الٰہی میں یہی دعا ہے کہ :۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝

---

① لالہ جی کے نام سے دو دوستوں کی دوستی یاد آئی۔ وہاں ولایت حسین صاحب نے (جو ہاکی کے کھلاڑی مسعود زیدی کے بزرگ تھے) اپنی کوٹھی کا نام اپنے دوست کے نام پر حبیب اللہ منزل رکھا اور حبیب اللہ صاحب نے اپنی کوٹھی کا نام ولایت منزل رکھا۔ جسے ہم لوگ ENGLAND MANZIL کہا کرتے تھے۔ اسی کے قریب بعد میں PICTUARS GALLERY تعمیر ہوئی تھی۔

② یہ حکیم صاحب بعد میں کراچی آ گئے تھے اور وہاں پرنس روڈ پر مطب کرتے تھے۔

[العلم (کراچی) اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۹۳ء]

وجاہت حسین صدیقی جھنجھانوی

جعفر بلوچ

جناب وجاہت حسین صدیقی جھنجھانوی (متوفی ۱۹۲۳ء) حضرت علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں کے معاصرین میں سے تھے۔ آپ نے صحافت و ادب کے میدان میں یکساں نیک نامی حاصل کی۔ لیکن افسوس کہ ان کے اٹھ جانے کے بعد قوم نے ان سے بھی سنگدلانہ فراموشی کا روّیہ اختیار کیا۔

جناب وجاہت صدیقی جھنجھانہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۷۵ء یا ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد مولوی محمد مخدوم لاہور میں فنانشل کمشنر پنجاب کے دفتر میں محافظ دفتری تھے۔ جناب وجاہت ابھی چار ہی سال کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ والدہ نے تعلیم و تربیت کی ذمہ داری سنبھالی۔ فروری ۱۸۹۳ء میں انھوں نے جھنجھانہ کے اُردو مڈل اسکول سے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ اسی سال ان کی والدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ اب انھوں نے نوکری کرنے کا فیصلہ کیا اور تحصیل دیوبند میں مستقل طور پر نقل نویس ہو گئے۔ لیکن چار سال بعد انھوں نے یہ نوکری بوجوہ چھوڑ دی۔ ۱۸۹۶ء میں ان کی شادی ہوئی۔ ۳ مئی ۱۹۰۳ء کو جھنجھانہ کا خانگی کاروبار اپنے چھوٹے بھائی کے حوالے کر کے وہ لاہور آگئے اور ادارت و تصنیف و تالیف کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ کچھ عرصہ سید ممتاز علی (شمس العلماء) کے ساتھ بطور معاون کام کیا۔ ۱۹۰۷ء میں اپنا ماہنامہ "اصلاح حق" جاری کیا جس میں اکبر الہ آبادی اور حضرت علامہ اقبال کی طرحی غزلیں بھی شائع ہوتی تھیں۔ اکتوبر ۱۹۱۱ء سے آپ روزنامہ "زمیندار" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہو گئے۔ مولانا ظفر علی خاں ولایت تشریف لے گئے تو زمیندار کے ادارت کی فرائض مولانا وجاہت حسین ہی انجام دیتے رہے۔ پھر انھوں نے "ستارۂ صبح" میں بھی کام کیا۔ ۱۹۱۸ء میں انھوں نے اپنا روزنامہ "آفتاب" جاری کیا۔ مولانا سید حبیب مدیر "سیاست" کی قید کے زمانہ میں "سیاست" کا بار ادارت وجاہت صاحب نے اٹھایا۔ لیکن اس دوران میں ان کی صحت خراب ہو گئی۔ وہ اپنے وطن جھنجھانہ چلے گئے اور وہیں ۳ اپریل ۱۹۲۳ء کو واصل بحق ہوئے۔

جناب وجاہت حسین صدیقی کی تصنیفات و تالیفات میں فتوح عبد الحمید خاں (۱۸۹۹ء) اختلاف اللسان (۱۹۰۳ء) انور پاشا (۱۹۲۱ء) مصطفیٰ کمال پاشا (۱۹۲۱ء) جنگ ترکی و یونان (۱۹۲۳ء) سیرت بلالؓ (س ن) اور مقدمہ سید حبیب شامل ہیں۔ ان کے علاوہ سر سید احمد خاں کی وفات پر کہے جانے والے مرثیوں، قطعات اور نظموں وغیرہ کو انھوں نے بہ دعوت جناب عبد اللہ قریشی سرسید کا ماتم کے نام سے مرتب کیا۔ اور سفر نامہ بمبئی میں ان اہل قلم حضرات کے حالات قلم بند کیے جن سے اس سفر بمبئی کے دوران میں ان کی ملاقاتیں ہوئیں۔

جناب وجاہت بہت خوش گو شاعر بھی تھے اور حضرت داغ سے تلمذ رکھتے تھے۔ لیکن ان کا کوئی مجموعۂ کلام ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ اسی طرح تاریخی و ادبی موضوعات پر لکھے ہوئے ان کے متعدد قابلِ قدر مضامین بھی ابھی تک تدوین و اشاعت کے منتظر ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ جناب وجاہت حسین صدیقی اور مولانا ظفر علی خاں میں صحافتی سیاسی اور ادبی حوالے سے قریبی مراسم تھے۔ مثلاً وجاہت صاحب کے ماہنامہ "اصلاحِ سخن" کے جنوری ۱۹۰۹ء کے شمارے میں مولانا ظفر علی خاں کی مشہور نظم "فریادِ ظفر المعروف بہ شورِ محشر" پر وجاہت صاحب کے قلم سے ایک تبصرہ ہمیں ملتا ہے۔ موسیٰ ندی، حیدرآباد دکن کی ایک نہایت خطرناک ندی تھی اس ندی میں وقتوں وقتوں سے بعض نہایت تباہ کن سیلاب آئے جن کی تفصیلات حیدرآباد دکن کی تاریخوں میں محفوظ ہیں۔ مولانا کی نظم میں جس طغیانی کا ذکر ہے وہ غالباً ۱۹۰۸ء میں آئی تھی۔ مولانا کی نظم حیدرآباد کے ایک عظیم الشان جلسۂ عام میں پڑھی گئی تھی اور پھر اسے کتابچے کی شکل میں چھاپا گیا تھا۔ جناب وجاہت نے اس معرکہ آرا نظم پر ذیل کا مختصر تبصرہ کیا۔ موسیٰ ندی کی طغیانی حیدرآباد دکن میں ملفب ڈھاگئی اس کے صدمے سے کم وبیش ہر شخص متاثر ہوا۔ شعرائے حیدرآباد نے خصوصیت سے بحرِ طبع کی روانی دکھائی اور اس حادثہ پر خوب خوب نظمیں موزوں کیں۔ فریادِ ظفر منشی ظفر علی خاں صاحب بی اے ایڈیٹر دکن ریویو کی قابلِ قدر و موثر نظم ہے۔ یعنی اس کی شاعری بھی اچھی ہے اور واقعات بھی وضاحت سے قلم بند کیے ہیں۔

۱۹۱۸ء میں مولانا ظفر علی خاں کا "ستارۂ صبح" خاص اہتمام سے چھپنے لگا تو مولانا نے ۸ اگست ۱۹۱۸ء کے ایک شذرہ میں اپنے حلقۂ ادارت کا تفاخر آمیز ذکر بھی کیا یہ حلقۂ ادارت چھ مددگاروں اور ایک مددگارِ خاص پر مشتمل تھا۔ چھ مددگاروں کے نام ترتیب وار یہ تھے۔

علامہ عبداللہ العمادی، سید وحید الدین سلیم، مولوی وجاہت حسین جھنجھانوی، مولوی خواجہ عبدالحق سابق مدیر اقدام، مرزا امان اللہ خاں اور مرزا سعید بیگ مدیر "پنجاب"۔ مددگارِ خاص جناب اختر علی خاں کو قرار دیا گیا تھا۔ لیکن حالات کی ستم ظریفی سے یہ حلقہ بہت جلد منتشر ہوگیا بلکہ عبداللہ العمادی اور مولانا ظفر علی خاں میں تو نہایت ناگوار قسم کا قلمی محاربہ بھی شروع ہوگیا لیکن ان حالات میں جناب وجاہت کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی وہ مسلسل مولانا کے ساتھ رہے۔ "ستارۂ صبح" کے اجرا پر وجاہت صاحب نے جو نظم کہی تھی وہ حسنِ بیان اور زورِ کلام کے لحاظ سے خود مولانا ظفر علی خاں کے رنگِ سخن کی یاد دلاتی ہے۔ جس اشعار کی یہ نظم ۸ اگست کے "ستارۂ صبح" میں شائع ہوئی تھی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

نئی ادا سے ہوا جلوہ گر ستارۂ صبح
پئے ظفر ہے نشانِ ظفر ستارۂ صبح
چمک دمک ہے کچھ ایسی کہ لوگ کہتے ہیں
بنا ہے روکشِ شمس و قمر ستارۂ صبح
ستارے اور بھی ہیں آسماں پہ لیکن
ہوا طلوع برنگِ دگر ستارۂ صبح
حریمِ ملتِ بیضا کی اس سے رونق ہے

بنا ہے روشنیٔ بام و در ستارۂ صبح
ہے نور رحم و سعادت کی جھلک اس میں
ہے نتیجۂ عمل خیر البشر ستارۂ صبح
ہے جو اُٹھ کے زمیندار شب تو بجھلے پہر
چمک رہا ہے مرے کھیت پر ستارۂ صبح
ہے اشتیاق ترا دیدۂ بصیرت کو
ابھر ابھر ابھی کچھ اور ابھر ستارۂ صبح
جھلک جھلک کر ہے قدسیوں کی جانب سے
ہماری قوم کا تو نامہ بر ستارۂ صبح
خدائے جل و علا سے یہ ہے دُعا اپنی
کہ روز نکلے بصد کرو فر ستارۂ صبح

۳ مئی ۱۹۱۸ء کو پہلی جنگِ عظیم کے سلسلے میں پنجاب سے فوجی بھرتی کرنے کے لیے پنجاب کے لفٹنٹ گور سر مائیکل اوڈوائر کے زیر صدارت ایک جلسہ لاہور یونیورسٹی ہال میں ہوا تھا۔ اس جلسہ میں حضرت علامہ اقبال کو بھی مجبوراً شریک ہونا پڑا تھا اور وہاں انھوں نے وہ نظم پڑھی تھی جس کا ایک شعر یہ ہے۔

ہنگامۂ وغا میں مرا سر قبول ہو
اہل وفا کی نذرِ محقر قبول ہو

حضرت اقبال کی یہ مکمل نظم باقیاتِ اقبال، میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ سر مائیکل اوڈوائر اگرچہ مولانا کے قیام دکن کے زمانہ سے مولانا کا مخالف و معاند چلا آیا تھا لیکن ان دنوں وہ مولانا کے نرم سیاسی رویہ کی وجہ سے مولانا پر کچھ مہربان تھا بلکہ "ستارۂ صبح" کے اجرا کی اجازت بھی اسی کی مرہون منت تھی۔ چنانچہ "ستارۂ صبح" نے ایک نوٹ میں اس تقریر کو سراہا جو سر مائیکل نے مذکرہ بالا جلسہ میں کی تھی۔ اور ۸ مئی ۱۹۱۸ء کے ایک ادارتی نوٹ میں لکھا گیا۔

"ہز آنر لفٹنٹ گورنر پنجاب کی تقریر بہ لحاظ خیالات و معلومات ایک معرکہ آرا تقریر ہے جس نے جنگ کے تمام پہلوؤں پر نہایت عمدگی و صفائی سے پوری روشنی ڈال دی۔ مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم سلطنتِ برطانیہ کی فصاحت و بلاغت کا خاص شہرہ ہے لیکن ہز آنر کی یہ تازہ ترین تقریر بھی غیر معمولی وقعت و اہمیت رکھتی ہے اور ہم بلا خوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہز ایکسیلینسی وائسرائے نے پچھلے دنوں دہلی کانفرنس میں جو تقریر فرمائی تھی اس سے ہز آنر کی تقریر زیادہ مبسوط و مشرح ہے۔"

فوجی بھرتی کے موضوع پر "ستارۂ صبح" کے ۸ مئی کے شمارہ میں جناب وجاہت ل بھی ایک نظم شائع ہوئی تھی اور اس میں بھی سر مائیکل کی مذکرہ بالا تقریر کی طرف تحسین آمیز اشارہ ملتا ہے۔ ممکن ہے سر مائیکل اوڈوائر کی تقریر کے بارے میں "ستارۂ صبح" کا مذکرہ بالا نوٹ بھی خود وجاہت صاحب نے لکھا ہو۔ وجاہت صاحب کی اس نظم کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

اپنے خطے میں نمایاں کئے جوہر اپنے
وائسرائے سے تو لفٹنٹ گورنر اچھے

ظلم سہولے سے کسی پہ نہیں ہوتے پاپا
واقعی بات ہے انگریز ہیں افسر اچھے
برخلاف اس کے ہیں جرمن بڑے وحشی ظالم
ان کے بے رحم دلوں سے تو ہیں پتھر اچھے
روس کی صلح سے دشمن نے یہ موقع پایا
ایشیا میں بھی رہے پاس کے یہ تیور اچھے
ہند نے جنگ میں معقول اعانت کی ہے
ہر جگہ بھیج دیے لڑنے کو لشکر اچھے
ان کی قوت نے بڑا کام بڑا اہم کیا
سب یہ کہتے ہیں کہ ہندی ہیں دلاور اچھے
امتحاں گو شجاعت میں ہوئے دھوم سے پاس
جنگ یورپ میں بھی حاصل کیے نمبر اچھے
اب ہے سرکار کو درکار زیادہ امداد
مثل سابق نہیں حالات برابر اچھے
منتظر ہیں جانب پنجاب نگاہیں سب کی
یہی صوبہ تو جواں رکھتا ہے اکثر اچھے
شیر ان کہتے ہیں پنجاب کے باشندوں کو
زور و قوت کے انھیں میں تو ہیں جوہر اچھے

جناب وجاہت اور مولانا ظفر علی خاں کے مراسم کے ضمن میں یہ واقعہ بھی یادگار ہے کہ ایک بار وجاہت صاحب کی ایک نظم جس سے سرمائیکل اوڈوائر کے بارے میں شاید تعریض کا کوئی پہلو نکلتا تھا، سنسر کی زد میں آگئی اور شائع نہ ہوسکی۔ نظم کے سنسر ہونے کا یہ واقعہ جب وجاہت صاحب نے حضرت مولانا کو سنایا تو انھوں نے اس واقعہ کو وجاہت صاحب کی طرف سے نظم کردیا اور ایک توضیحی نوٹ کے ساتھ ۱۵ اپریل ۱۹۲۰ء کے زمیندار میں بعنوان "آفتاب، بکوریٔ چشم سنسر" شائع کردیا۔ اب یہ نظم مولانا کے مجموعہ کلام "بہارستان" کی زینت ہے۔ مولانا کا نوٹ اور نظم درج ذیل ہیں:

"عزیز مکرم مولوی وجاہت حسین صدیقی صاحب ایڈیٹر "آفتاب" بھی ایک عرصہ تک جناب حضرت سنسر کے ناوک بیداد وجفا کا تختہ مشق رہ چکے ہیں۔ آپ کی جو شامت آئے، آپ نے ہز آنر سر ایڈورڈ میکلیگن کی شان میں ایک بہاریہ قصیدہ لکھا۔ میکلیگن کے ساتھ ایک قافیہ گلشن بھی بندھ گیا تھا۔ نظم جب سنسر کے پاس پہنچی تو ان لال بجھکڑ نے یہ سمجھ کر کہ اس سے سرمائیکل اوڈوائر کا باغ خارستان ہوا جاتا ہے۔ بیچارے ایڈیٹر "آفتاب" کی نظم کی اشاعت روک دی۔ ہم نے ان سے یہ واقعہ سن کر انھیں کی طرف سے اسے نظم کر ڈالا۔ ملاحظہ ہو۔

دل ہو تو ایک اور حکایت نئی سنو

آزادی خیال کے عہدِ عذاب کی
سرمایہ کش سے جائزہ جب لے لیا گیا
جس وقت ختم ہوگئی مدت جناب کی
ہم کیسے آگئی جو علم میں بہار
چھائی ہوئی تھی جس پہ خزاں اضطراب کی
لیکن خمارِ دوش ٹوٹا نہ تھا ہنوز
بوتل میں بند تھی ابھی مستی شراب کی
سنسر کے ہاتھ سے ابھی چھوٹا نہ تھا قلم
جس نے لب کی خوب ہی مٹی خراب کی
پنجاب کی صحافتِ مسکین و کس مپرس
شاکی تھی آپ کے ستمِ بے حساب کی
اک روز میں نے مدح سر ایڈورڈ میں کہی
اک نظم جو ہے جان وفا کی کتاب کی
اس کو بھی کردیا نظری دیکھنے کے ساتھ
کیا بات ہے جناب رقابت مآب کی
گھنٹی کے ساتھ قریب میکلیگن آگیا
سب سے بڑی خطا تھی یہی آفتاب کی
ازبسکہ رتبہ خوار تھے عہدِ قدیم کے
مجھ کو دکھائی شان پرانے عتاب کی
کہنے لگے کہ مجھ کے قصیدہ پہ آپ نے
"پاپوش میں لگائی کرن آفتاب کی"
سرہیٹ کردیا انھیں میں نے بھی یہ جواب
"جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی"

ادارہ "زمیندار" نے جناب وجاہت کی وفات پر اظہار غم کرتے ہوئے ۱۱ اپریل ۱۹۳۳ء کو لکھا:

ہمیں مولانا وجاہت حسن صدیقی صاحب کی وفات حسرت آیات کا دو گونہ رنج ہے۔ ایک تو اس لیے کہ مدت تک ان کا زمیندار کے ساتھ گہرا تعلق رہا۔ دوسرے اس لیے کہ انھوں نے ادبی اور سیاسی دُنیا میں نمایاں خدمات انجام دیں اور ان کے انتقال سے ملک و قوم کے خادموں کی صف میں ایک قابلِ افسوس کمی واقع ہوگئی۔

جناب وجاہت کی نگارشاتِ نظم و نثر ان کے اپنے جاری کردہ جرائد کے علاوہ ملک کے دیگر موقر جرائد مثلاً زمیندار، دہلی پنچ

لاہور، زبان دہلی، ستارۂ صبح وغیرہ میں بھی شائع ہوتی رہیں۔ ان کی نظموں میں اپنے زمانے کے سیاسی و معاشرتی حالات کا رنگ اور قومی و ملی جذبات کا اظہار پایا جاتا ہے۔ فطرت نگاری اور ظریفانہ رنگ سے بھی انھیں دلچسپی تھی۔ غزل میں وہ زیادہ تر اپنے استاد حضرت داغ کے زیر سایہ رہے۔ ان کی زبان میں روزمرہ اور محاورہ کا چٹخارہ ہے اور ان کے مضامین غزل میں شوخی، نکتہ آفرینی اور بانکپن کے عناصر بہار آفرینی کرتے ہیں۔ نمونۂ کلام کے طور پر ان کی چند غزلوں کے منتخب اشعار یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

پھر یاں غیر پاس نہ ہوجائے
وہ اِدھر سے اُدھر نہ ہوجائے
دیکھتا ہوں انھیں تو کہتے ہیں
دیکھ تجھ کو نظر نہ ہوجائے

(زبان دہلی۔ جنوری ۱۸۹۳ء)

سُن کر سوالِ وصل کہو کچھ تو ہاں نہیں
چپ کیوں ہو کیا تمھارے دہن میں زباں نہیں
ایمان کی کہیں گے وجاہت حسین ہم
دہلی سے بڑھ کے اور کہیں کی زباں نہیں

(زبان دہلی مئی ۱۸۹۳ء)

روزِ ازل سے مست ہیں کیفِ شراب میں
پیتے ہیں بھر کے ہم قدحِ آفتاب میں
شیرازہ دل کا عشقِ بتاں میں بکھر گیا
ثابت نہیں ہے ایک ورق اس کتاب میں

(زبان دہلی جولائی ۱۸۹۵ء)

عجب ادا ہے ادا میں ادا نکلتی ہے
ستم میں لطف و کرم میں جفا نکلتی ہے
ہماری آنکھ سے دیکھے تجھے کوئی اے بُت
کہ تجھ میں ہم خدا بات کیا نکلتی ہے
مری تو جان نکلتی ہے تو بتا شبِ غم
نہیں نکلتی ہے کم بخت یا نکلتی ہے
ہماری منزلِ ہستی سے نیستی دراصل
اسی سڑک سے تو راہِ فنا نکلتی ہے
تمھاری چال، قیامت، ہیں دونوں چیزیں ایک
مگر یہ کم ہے وہ اس سے ذرا نکلتی ہے

رہے گا دل میں وجاہت خیالِ زلفِ سیاہ
کہیں نکالے سے لب پہ بلا نکلتی ہے؟

(اصلاحِ سخن، جنوری ۱۹۰۹ء)

یہ خوب جھگڑا چھڑا ہے جب میں نے آہ کی
اس کے جواب میں بتِ کافر نے واہ کی
میں جانتا ہوں اصل ہے جو مہر و ماہ کی
دونوں یہ ٹوپیاں ہیں کسی کج کلاہ کی
محشر میں دل بھی ان کا طرفدار ہوگیا
نیت بدل گئی ہے ہمارے گواہ کی

(کمال ادبی، اکتوبر ۱۹۱۰ء)

جہاں تک جناب وجاہت کی نثری نگارشات کا تعلق ہے، لسانیات کے موضوع پر ان کی تحریریں مرورِ وقت کے ساتھ اپنی اہمیت بہت کچھ کھو چکی ہیں۔ بلکہ ان کی کتاب "اختلاف اللسان" تو ان کے اپنے زمانہ میں بھی متنازعہ ہو گئی تھی۔ چنانچہ ایک صاحب "نثار لکھنوی" نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ماہنامہ "زمانہ" (شمارہ اکتوبر و نومبر ۱۹۱۰ء) میں لکھا تھا:

"دہلی و لکھنؤ کی زبان اب کوئی جداگانہ زبان نہیں ہے اور مدت ہوئی کہ یہ عجیب ناگوار فرق مٹ چکا ہے۔ تاہم منشی وجاہت حسین صاحب صدیقی نے اس بحث کو تازہ کرنا ضروری خیال فرمایا ہے .... صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مولف کتاب دلی والوں کے طرفدار ہیں۔ اور اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ چونکہ مولف صاحب کو زبان لکھنؤ سے اولی واقفیت بھی نہیں لہذا جتنے محاورات لکھنؤ سے منسوب کیے گئے ہیں ان میں بیشتر غلط اور عدیم الوجود ہیں۔ جن محاورات کی شعرائے لکھنؤ کے کلام سے سند دی گئی ہے، انھیں متروک ہوئے مدت ہو چکی۔ اس طرح تو قدیم شعرائے دہلی کے کلام سے بھی بہت مہمل محاورات پیش کیے جا سکتے ہیں۔ مگر بحث صرف زبانِ حال سے ہونا چاہیے۔"

جناب وجاہت کی دیگر نثری تصانیف میں ادب و تاریخ کے طالب علم کے لیے دلچسپی کا کچھ نہ کچھ سامان ضرور موجود ہے اور ان کی کتاب "سیرتِ بلالؓ" تو مستقل اہمیت و افادیت کی حامل ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب وجاہت اپنے مواد کو فنکارانہ سلیقہ مندی کے ساتھ مرتب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ان کی تحریر عموماً سادہ اور موثر ہوتی ہے، ہم کہیں کہیں ان کے یہاں خطیبانہ انداز بھی پیدا ہو جاتا ہے جس سے نثر کے انضباط کو نقصان پہنچتا ہے۔

وجاہت کے اسلوبِ نثر نگاری کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

حضرت عمر فاروقؓ کی سطوت و جلالت مشہور ہے۔ مگر حضرت بلالؓ کے متعلق ان کے کیا خیالات تھے، اس باب میں صاحب اسد الغابہ کا حسب ذیل قول ملاحظہ طلب ہے۔ "حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ ابوبکرؓ ہمارے سردار تھے اور انھوں نے ہمارے سردار

یعنی بلالؓ کو آزاد کیا۔"

جب حضرت عمرؓ جیسا با جبروت خلیفہ حضرت بلالؓ کو سردار کے لفظ سے یاد کرتا ہے تو سمجھ جانا چاہیے کہ بلالؓ صرف ایک کے غلام تھے اور باقی سب کے آقا۔ بلالؓ وہ مسلمان تھے جن کو اسلام میں سب سے پہلے اذان دینے کا فخر حاصل ہوا۔ بلالؓ وہ مسلمان تھے جنھوں نے راہ خدا میں بڑی بڑی کڑیاں اٹھائیں۔ بلالؓ وہ مسلمان تھے جو سفر و حضر میں ہمیشہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ رہے۔ بلالؓ وہ مسلمان تھے جنھوں نے اسلام اور خدا و رسول ﷺ کی خوشنودی کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ بلالؓ وہ مسلمان تھے جن کی صدائے اذان سے صحابہ کرامؓ کے قلوب اور گرد و نواح کی زمین میں زلزلہ آ جاتا تھا۔ بلالؓ وہ موذن تھے جو لطف حجرہ نشینی ہی پر اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ سر بکف اور شمشیر بدست ہو کر طرفے اور ہر معرکہ میں مسلمانوں کا ساتھ دیا کرتے تھے۔ بلالؓ وہ مسلمان تھے جن کو اسلام کی بدولت غلامی سے آزادی حاصل ہوئی اور انجام کار مسلمانوں کے سردار بن گئے۔ سبحان اللہ حضرت بلالؓ رسول ﷺ خدا کی غلامی کس درجہ شرف و اعزاز کا باعث ہے۔

منم غلام غلام تو یا رسول اللہ
دلم فدائے سلام تو یا رسول اللہ

(سیرت بلالؓ، ص ۶-۷)

کم معروف مگر اہم اہل قلم کے حالات حیات اور آثار قلم کی تحقیق و تنقید اور تالیف و تدوین میں ہمارے لیے برکت و سعادت کے متعدد پہلو ہیں۔ اس طرز عمل سے اگر ایک طرف ہمیں مختلف ادوار کے علمی و ادبی ارتقاء کو زیادہ معروضی انداز میں پرکھنے اور سمجھنے میں مدد ملتی ہے تو دوسری طرف ان اکابر کے قیمتی ترکہ کا استفادہ و استحسان قومی سطح پر ہمارے فکری و وجدانی اثاثے میں اضافے کا باعث بھی بنتا ہے۔ اسی نقطہ نظر سے جناب وجاہت حسین صدیقی جھنجھانوی اور ان کے دیگر ممتاز معاصرین کے احوال و آثار بھی اہل نظر سے التفات و اعتناء کے متقاضی ہیں۔

قومی زبان (۵۹) دسمبر ۱۹۹۳ء

کتابیات

(۱) اخبار نویسوں کے حالات مرتبہ منشی محمد الدین فوق
(۲) فرہنگ عامرہ مرتبہ عبداللہ خاں خویشگی
(۳) پنجاب میں اردو اخبار نویسی از مسکین علی حجازی (اردو تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی، پنجاب یونیورسٹی لائبریری)۔
(۴) باقیات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی و محمد عبداللہ قریشی آئینہ ادب ۱۹۷۸ء
(۵) سیرت بلالؓ از وجاہت حسین صدیقی (س ن)
(۶) اختلاف اللسان۔ از وجاہت حسین صدیقی (۱۹۰۳ء)
(۷) ماہنامہ اصلاح سخن لاہور۔ بابت جنوری ۱۹۰۹ء
(۸) ستارۂ صبح۔ لاہور مختلف شمارے
(۹) ماہنامہ زبان دہلی۔ مختلف شمارے
(۱۰) ماہنامہ کمال دہلی بابت اکتوبر ۱۹۱۰ء

عالیہ خان

ڈاکٹر یوسف حسین خاں

وطن

ڈاکٹر یوسف حسین خاں ماہر تاریخ اور اردو کے ممتاز ادیب اور نقاد تھے۔ ان کا آبائی وطن قائم گنج تھا جسے ۱۷۲۳ء میں محمد خاں بنگش نے اپنے بڑے بیٹے قائم خاں کے نام سے بسایا تھا۔ قائم گنج ڈھائی تین سو سال سے ایک منڈی کی حیثیت سے بھی بہت مشہور رہا ہے۔ اسی خاندان کے زمانے میں سرحدی قبائل کی آمد کا سلسلہ جاری رہا اور اس علاقے میں زیادہ تر خٹک اور آفریدی پٹھانوں کے قبائل آئے۔ ان آفریدیوں نے یہ بستیاں اور محلے قائم گنج میں بسائے۔ چنانچہ آج بھی وہ محلے اپنے قبیلوں کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔

خاندان

۱۷۱۵ء کے لگ بھگ دو بھائی حسن خاں اور حسین خاں اپنے خاندانوں کے ساتھ وارد ہندوستان ہوئے۔ ان کی اولاد آج تک اپنے ناموں میں حسن خاں اور حسین خاں کی نسبت سے پہچانی جاتی ہے۔ حسین خاں کا لقب مشغلۂ درس و تدریس کی وجہ سے مدرس آخوند تھا اور ہندوستان آنے سے پہلے ہی یہ لقب انہیں مل چکا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ سو یا ایک سو بیس سال کی عمر کو پہنچے اور آخری عمر تک پڑھنے اور پڑھانے میں مشغول رہے۔ انھوں نے موجودہ پٹھانوں کی کئی پشتوں کو تعلیم دی۔ وہ استاد اور عالم ہونے کے علاوہ صوفی بھی تھے کئی لوگ ان کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔ قائم گنج کے قدیم قبرستان میں آج بھی ان کا مزار مرجع خلائق ہے۔ انہی مدرس آخوند کی اولاد میں یوسف حسین خاں کے دادا غلام حسین خاں ہوئے ہیں جو اپنی حق پسندی، صاف گوئی، شجاعت اور سخاوت میں مشہور رہے۔ وہ دشمنوں کے غضبناک دشمن اور دوستوں کے رحمدل سرپرست۔ ان کے مزاج میں شعلہ و شبنم یک جان ہو گئے تھے۔ وہ سپاہی پیشہ آدمی تھے۔ حیدرآباد کی ریاستی فوج میں ملازم تھے اور افسر الملک کے ساتھیوں میں سے تھے۔ ترک ملازمت کے بعد قائم گنج آ گئے۔ انھیں درویشوں اور اللہ والوں سے بہت محبت تھی۔ ایک طرف انھیں زمانے کے مقبول درویش کرم علی شاہ میاں سے ارادت تھی تو دوسری طرف [illegible] ہنس سپاہی سے بھی عقیدت رکھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ غلام حسین خاں کا خاندان انہی درویش صفت لوگوں کی دعاؤں سے پھولا پھلا۔ یوسف حسین خاں کے نانا بھی دادا خاں پیشہ تو سپہ گیری کا رکھتے تھے لیکن طبیعت میں بے حد انکسار، رکھ رکھاؤ اور بردباری تھی۔ انھوں نے کسی کا نہ دل دکھایا اور نہ کوئی ان کا دشمن تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دادا کی طبیعت کا جلال نانا کے مزاج کا جمال ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور ان کے بھائیوں کی ذات میں ملا۔

والد

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے والد فدا حسین خاں غلام حسین خاں کے بیٹے تھے قائم گنج کے تحصیلی اسکول میں پڑھنے کے بعد ۱۸۹۹ء حیدرآباد چلے آئے۔ ان کو پڑھنے لکھنے کا شوق بھی تھا۔ طبیعت میں خوش ذوقی اور لطافت تھی۔ بہت کم گو اور سنجیدہ انسان

تھے۔ حیدرآباد آ کر مراد آبادی برتنوں کا کاروبار کرنے لگے مگر دل کتابوں میں رہا۔ جہاں بیگم بازار میں ان کے گھر کے قریب شمالی ہند کے ایک وکیل رہتے تھے ان کے کتب خانے سے استفادہ کرنے لگے۔ قانونی امور سے دلچسپی ہوئی تو وکالت کا امتحان دیا۔ بڑی محنت اور دیانت سے وکالت کی۔ وکالت چل نکلی تو اسے اور چمکانے کی خاطر اورنگ آباد چلے گئے۔ جہاں قائم گنج کے چند خاندان آباد تھے۔ انھوں نے "آئین دکن" کے نام سے ایک قانونی رسالہ جاری کیا جس کی جلدیں اب ہر وکیل کے کتب خانے کی زینت ہیں۔ جب شہرت کافی پھیل گئی اور قدم جم گئے تو وہ حیدرآباد آ گئے۔ بیگم بازار میں ایک دو منزلہ مکان بنایا جہاں نیچے دفتر، کتب خانہ اور اوپر رہائش تھی۔ "آئین دکن" کے لیے ایک مطبع بھی قائم کیا۔ قانونی کتابوں کی فروخت سے کافی فائدہ ہونے لگا۔ سولہ سال وکالت کی۔ قائم گنج میں بھی پکا مکان بنوایا تھا اور بڑی کامیاب زندگی گزار رہے تھے کہ ۴۹ سال کی عمر میں دق کے موذی مرض نے آگھیرا۔ آرام اور علاج کی خاطر قائم گنج آ گئے اور وہیں پیوندِ خاک ہوئے۔

بھائی

یوسف حسین خاں کے کل سات بھائی تھے اور ان کی والدہ ست پوتی کہلاتی تھیں۔ ایسی عورتیں بڑی خوش قسمت سمجھی جاتی ہیں مگر ماں تو ماں ہوتی ہے انہیں ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا کہ کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ سات بچے ایک سے ایک خوبصورت دیدارو۔ مگر ہوتا وہی ہے جو خدا کو منظور ہو۔ ان میں سے سوائے تین کے عمر طبعی کو کوئی نہ پہنچا۔ سات بھائیوں کے نام ترتیب وار یہ ہیں۔
مظفر حسین خاں، عابد حسین خاں، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، زاہد حسین خاں، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، جعفر حسین خاں اور ڈاکٹر محمود حسین خاں۔ ان میں سے جعفر حسین خاں ماں کے ساتھ طاعون کی نذر ہو گئے۔ عابد حسین خاں عین جوانی میں رخصت ہو گئے۔ زاہد حسین خاں جو سب سے خوبصورت و تندرست تھے اٹھارہ سال کی عمر میں چل بسے۔ مظفر حسین خاں چالیس تک پہنچ کر پیچھے اپنی اولاد چھوڑ گئے۔ جن کی پانچ اولادوں میں سے تین نے زندگی پائی۔ ان کے بڑے بیٹے اعجاز حسین خاں میرے والد تھے۔ جو عثمانیہ یونیورسٹی میں معاشیات کے استاد اور شعبہ کامرس کے بانی تھے۔ وظیفے پر سبکدوش ہونے سے پہلے ہی چل بسے۔ ۱۸ مارچ ۱۹۶۶ء کو جب وہ سکندرآباد کالج کے پرنسپل تھے کالج ہی میں دل کا دورہ پڑا اور انتقال ہو گیا۔ چھوٹی خدیجہ زوجہ احمد شاہ خاں وہ بھی اب مرحوم ہو گئی ہیں۔ صرف چچا ڈاکٹر مسعود حسین خاں پروفیسر اردو لسانیات اور سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ دہلی بقید حیات ہیں۔ جو اپنی تصانیف اور تحقیق کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ ۷۲ سال تک پہنچے۔ ۱۹۶۹ء میں وفات پائی۔ ڈاکٹر محمود حسین خاں وائس چانسلر ڈھاکہ یونیورسٹی نے تقریباً ۷۰ سال کی عمر پائی اور ان کا انتقال ۱۹۷۵ء میں ہوا۔ اور فدا حسین خاں کی آخری یادگار ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے ۷۷ سال کی عمر پائی۔ ان کا انتقال ۱۹۷۹ء میں ہوا۔ فخر خاندان ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنی تعلیمی اور سیاسی خدمات کی وجہ سے بہت نام کمایا اور صدر جمہوریہ ہند بنے اور قصرِ جمہوریت میں ہی داعی اجل کو لبیک کہا۔

والدہ

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی والدہ کا نام نازنین بیگم تھا جو ننھو کہلاتی تھیں۔ ان کا کوئی بھائی نہ تھا۔ بس تین بہنیں تھیں۔ والدہ کی طبیعت میں بے حد نرمی تھی۔ بچوں سے غیر معمولی محبت رکھتی تھیں۔ والدہ کے انتقال کے بعد تو ان کی ساری محبت اور توجہ کا مرکز صرف بچے رہ گئے تھے۔ انہیں اپنے بیٹوں پر ناز بھی تھا اور ٹوٹ کر محبت بھی کرتی تھیں مگر بچوں کی تربیت سے غافل بھی نہ تھیں۔ چھٹیوں میں جب بچے گھر آتے تو انہیں خاندان کے بزرگوں کے پاس اصرار سے بھیجتیں کہ انہیں سلام کر آؤ اور کہتیں کہ بزرگوں کی دعا سے بچوں پر برکتیں نازل ہوتی ہیں۔

بچپن

یوسف حسین خاں ۱۸ ستمبر ۱۹۰۲ء کو حیدرآباد کے بیگم بازار والے مکان میں پیدا ہوئے۔ یہ اپنے ماں باپ کی پانچویں اولاد تھے۔ والد کی علالت کی وجہ سے چار پانچ سال کی عمر ہی میں قائم گنج آ گئے۔ مولوی صاحب سے گھر پر قرآن شریف اور اردو پڑھنے لگے اور نو سال کی عمر ہی میں اٹاوے کے اسلامیہ ہائی اسکول میں داخل ہو گئے۔ بچپن میں فٹبال بھی کھیلا، پتنگ

بھی اڑاتا اور گلی ڈنڈے سے بھی دل بہلایا مگر دماغ میں علم کی جستجو بھی تھی اور دل شاعرانہ پایا تھا۔ گھر کے چاروں طرف آموں کے باغ ہی باغ تھے۔ جہاں یہ گھنٹوں نے خالص خاموشی، سناٹے کی سنسناہٹ، روشنی اور تاریکی کی طلسمی فضا کو محسوس کیا تھا۔ خود لکھتے ہیں:

"میں کبھی مغرب کے کچھ دیر بعد کوٹھی کے باہر چبوترے پر ٹہلنے نکلتا۔ سناٹا اور تاریکی مل کر طلسمی فضا پیدا کر دیتے جس میں میری طبیعت گھبراتی نہیں تھی۔ بلکہ اس میں دل لگتا تھا۔ قائم گنج کے اس مکمل سکوت اور مکمل تاریکی کا احساس پھر کبھی نہیں ہوا۔ بعد میں جہاں کہیں رہنا ہوا وہاں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ دور سے آنے والی کوئی آواز نہ سنائی دیتی ہو یا کچھ فاصلے پر ٹمٹماتی ہوئی روشنی نظر نہ آتی ہو۔" (۱)

یہ ابھی اٹاوے کے اسکول میں داخل ہوئے ہی تھے اور بچپن پوری طرح لڑکپن میں نہ بدلا تھا کہ ایک دن ہیڈ ماسٹر الطاف حسین نے بلا کر ادھر ادھر کی کچھ باتیں کیں اور پھر ماں سے محرومی کی روح فرسا خبر سنائی۔ وہ سن کر رونے لگے یہاں تک کہ ہچکی بندھ گئی اور پھر بورڈنگ ہاؤس جا کر لیٹ گئے اور چادر میں منہ چھپائے دیر تک روتے رہے۔ والدہ کے انتقال کے بعد تنہائی کے احساس نے ان کے دل میں درد مندی پیدا کر دی۔ گو گھر والوں سے ہوتا ہے۔ جب گھر میں مجبور کا عالم ہو تو دل دوسرے مشغلوں میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ یہ ایک اچھی بات تھی یوسف صاحب نے کتابوں میں پناہ ڈھونڈی اور سیر و سیاحت سے دل بہلایا۔ لڑکپن کے یہ چھوٹے چھوٹے سفر بھی ان کے مشاہدے کی حس کو سان پر چڑھاتے رہے۔

تعلیم

اٹاوے سے جب بڑے بھائی آگے تعلیم کے لیے علی گڑھ آگئے تو یوسف صاحب بھی وہیں منتقل ہو گئے۔ یہ علی گڑھ کے اسکول میں داخل ہو گئے۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر مسٹر ایف۔ اے۔ کرپر وظیفہ یاب فوجی تھے اس لیے اسکول کا نظم و ضبط عمدہ تھا اور کھیلوں کا بھی خاص اہتمام تھا۔ بورڈنگ ہاؤس میں رہتے تھے۔ بھائیوں کی نگرانی بھی تھی۔ جہاں چند دنوں کے قیام سے فیض ہی اٹھائے ہیں۔ بورڈنگ ہاؤس میں رہ کر آدمی سب کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اپنی تنہائی کی حفاظت کرنا سیکھ جاتا ہے۔ ۱۹۲۸ء میں یوسف صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی محمود صاحب علی گڑھ سے دوبارہ اٹاوہ آگئے۔ وہ علی گڑھ اور اٹاوے کے استادوں میں شاید سب سے زیادہ سید الطاف حسین صاحب سے متاثر ہوئے چنانچہ لکھتے ہیں:

"سید الطاف حسین ایک نیک سرشت انسان تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ان کی شخصیت کے اندر سے نیکی کی شعاعیں باہر نکل رہی ہوں اور ان بچوں کے دل و دماغ کو روشن کر رہی ہوں جو کسی حیثیت سے بھی ان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی نیکی اور شرافت ان کے سب شاگردوں کو یاد ہے۔" (۲)

ایک سال بعد یوسف صاحب کی صحت خراب ہو گئی۔ انھیں واپس قائم گنج آرام اور علاج کے لیے آنا پڑا۔ کہنے کو تو دو سال بیکاری میں گزرے مگر قائم گنج اور قائم گنج والوں کو دیکھنے سمجھنے اور پرکھنے کا موقع ملا۔ ڈاکٹروں، حکیموں کے علاج کے ساتھ ساتھ اپنے ایک بزرگ عزیز محمد یحییٰ خاں سے ورزش سیکھی جس سے بہت فائدہ ہوا اور اس سے کہیں زیادہ فیض اس نیک انسان کی صحبت سے پہنچا۔ اس کا اثر ان کی شخصیت پر ہمیشہ باقی رہا۔ قائم گنج ہی کے زمانے میں انھیں عام مطالعے کا چسکا لگا، چنانچہ خود اعتراف کرتے ہیں: "اس عرصہ میں جتنا پڑھنا چاہیے کبھی نہیں پڑھا تھا۔" (۳)

جب صحت ٹھیک ہوئی تو وہ اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین کے ایما پر جولائی ۱۹۳۱ء میں جامعہ میں داخل ہوئے جہاں ذاکر صاحب پہلے سے موجود تھے۔ جامعہ کا داخلہ گویا ان کی زندگی کا ایک اہم موڑ تھا۔ گنج کی ہوا خوری اور ہلکی کسرت یہاں بھی جاری رہی لیکن قائم گنج کی سی صحت اور صحت بخش غذا یہاں کہاں تھی۔ صحت پھر خراب ہو گئی ویسے ہی بڑے بھائیوں کے یکے بعد دیگرے دق میں انتقال ہو چکا تھا اس لیے گھر بھر ڈرا ہوا تھا۔ ذاکر صاحب نے ڈاکٹر انصاری کے پاس تشخیص کے لیے بھیجا۔ ڈاکٹر انصاری سمجھ گئے

۱۔ یوسف حسین خاں ڈاکٹر "یادوں کی دنیا" ص ۵۰۔۵۱

۲۔ یوسف حسین خاں ڈاکٹر یادوں کی دنیا ص ۹۲ ۳۔ یوسف حسین خاں ڈاکٹر یادوں کی دنیا ص ۶۷

وقت سمجھے جاتے تھے۔ انھوں نے طاقت کی کچھ دوائیں دیں اور اطمینان دلایا کہ صحت بالکل ٹھیک ہو جائے گی جس کا نفسیاتی اثر بہت اچھا ہوا۔ جامعہ کے دورانِ تعلیم مختلف اساتذہ اور ساتھی طالب علم سے رابطہ ضبط بڑھا جس کا یوسف صاحب کی شخصیت کو بنانے میں نمایاں رول رہا ہے۔

یوسف صاحب جامعہ میں تقریباً پانچ سال رہے۔ ذاکر صاحب جرمنی گئے تھے جب ۱۹۲۶ء میں وہ جرمنی سے لوٹے تو یوسف صاحب اعلیٰ تعلیم کے لیے فرانس روانہ ہو گئے۔ ہندوستان سے روانہ ہونے سے پہلے انھوں نے فرانسیسی سیکھ لی تھی۔ لیکن پیرس جا کر اور زیادہ محنت کرنی پڑی۔ جامعہ کی طالب علمی کے دوران وہ اس قابل ہو چکے تھے کہ یورپ کے کسی بھی ملک میں جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔

اکتوبر ۱۹۲۶ء میں ہی ان کو داخلہ پیرس یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کے لیے ہوا اور یونیورسٹی کے قریب ہی ایک کمرہ کرائے پر لے کر رہنے لگے۔ وہ ڈاکٹریٹ تو کر رہے تھے تاریخ میں مگر کبھی کبھی ادب، تنقید اور فلسفے کے لکچر میں بھی شریک ہو جایا کرتے تھے۔ نشاۃ ثانیہ کے بعد سوربون یونیورسٹی انسان دوستی کا زبردست مرکز بن گئی تھی۔ اس لیے سارے یورپ سے طالب علم یہاں کھنچے چلے آتے۔ اس ماحول کا بھی ان کی شخصیت پر بہت اچھا اثر ہوا۔ ۱۹۲۹ء میں انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی اور جنوری ۱۹۳۰ء میں ہندوستان واپس آ گئے۔ دورانِ قیام فرانس کو اچھی طرح سے دیکھا۔ فرانسیسی ادب کا غائر نظر سے مطالعہ کیا۔ وہاں کے قابل پروفیسروں سے استفادہ کیا۔ فطری اور انسانی حسن کے نظارے دیکھے، وہاں کی روشن خیالی سے متاثر ہوئے۔ وہاں کی تہذیبی اور ادبی تحریکوں کی سوجھ بوجھ حاصل کی۔ ان کے نئے نئے ادبی اور سیاسی تجربوں کو اچھی طرح سمجھا اور پرکھا اور بہت سی دلچسپ شخصیتوں سے ملاقات رہی۔ موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو اور سری نواس آئنگر سے ان کی ملاقات یہیں ہوئی۔ وہ اٹلی دیکھنے بھی گئے۔ ایک تاریخ کے طالب علم کے لیے وہاں کشش بہت تھی۔

ملازمت

یورپ کے دورانِ قیام ہی میں ان کی ملاقات مہاراجہ بڑودہ سے ہوئی اور انھوں نے اپنی ریاست میں ملازمت کی ترغیب بھی دی۔ ۱۹۳۰ء میں جب وہ ہندوستان آئے تو ذاکر صاحب نے رائے دی کہ وہ حیدرآباد جائیں۔ ایک تو یہ کہ تین پشتوں... اس خاندان کا تعلق حیدرآباد سے رہا ہے اور یوسف صاحب کی پیدائش خود حیدرآباد کی ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کا ذریعۂ تعلیم اردو تھا اور ذاکر صاحب کی جوہر شناس نظر نے بھانپ لیا تھا کہ یوسف صاحب کا مزاج اردو ادب اور شاعری سے ہم آہنگ ہے اس لیے انھوں نے یہ رائے دی تھی۔

"ذاکر صاحب کی یہی رائے تھی کہ یہ ایک نیا تجربہ ہے عثمانیہ یونیورسٹی کا۔ اردو زبان میں تعلیم کا" اور تمھیں اردو ادب سے دلچسپی ہے۔ [1]

یوسف صاحب حیدرآباد آ گئے۔ اتفاق سے پروفیسر ابن حسن صاحب جو تاریخ سے تعلق رکھتے تھے ان دنوں لندن گئے ہوئے تھے ان کی جگہ عارضی طور پر یوسف صاحب کا تقرر ہو گیا لیکن جب وہ واپس آئے تو بیمار ہو گئے اور پھر ان کا انتقال ہو گیا۔ پس اس طرح یوسف صاحب کی عارضی ملازمت مستقل ہو گئی۔ اس زمانے میں جامعہ عثمانیہ کے ہر شعبے میں بڑے قد آور اساتذہ جمع تھے۔ یوسف صاحب نے ان کے درمیان اپنے آپ کو بہت اچھی طرح سمو لیا۔ درس و تدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف کا بھی شوق پورا کرتے رہے۔ تقریباً ۲۸ سال گزارنے کے بعد ۱۹۵۷ء میں وظیفۂ حسنِ خدمت پر سبکدوش ہو گئے۔ انھوں نے حیدرآباد کے شاندار محلے بنجارہ ہلز میں اپنا عالی شان ذاتی مکان بھی بنوا لیا تھا۔ حیدرآباد میں وہ شاہی خاندان کے اتالیق بھی رہے۔ وظیفے کے بعد کچھ مہینے تصنیف و تالیف میں لگے رہے۔ ان سے مِلا دیکھا جاتا تھا۔ یہاں تک جب پبلک سروس کمیشن نے انڈین نیشنل آرکائیوز کی ڈائرکٹری کے لیے درخواستیں طلب کیں تو انھوں نے بھی درخواست دے دی۔ حسنِ اتفاق سے اسی زمانے میں بشیر حسین زیدی نے ان سے رائے مانگی کہ مسلم یونیورسٹی کی اکزیکیٹیو کونسل میں ان کا نام پرو وائس چانسلری کے لیے پیش کیا جائے۔ کیوں کہ سید نوراللہ کی پرو وائس چانسلری کی مدت ختم ہو رہی تھی۔ ان کے لیے تصنیف

لے گوپی چند نارنگ پروفیسر۔ "ڈاکٹر یوسف حسین خاں سے انٹرویو" مطبوعہ "ہماری زبان" دہلی

کرنا مشکل تھا کیونکہ دونوں جگہیں ان کی قابلیت کے مناسب تھیں۔ مگر آخر دل نے یہی فیصلہ کیا کہ تعلیم ہی کو ترجیح دینی چاہیے اور انھوں نے علی گڑھ کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ ۱۹۵۷ء میں وہ پرو وائس چانسلر ہو کر وہاں چلے گئے اور تین وائس چانسلروں یعنی بشیر حسین زیدی، بدرالدین طیب جی اور نواب علی یاور جنگ کے ساتھ کام کیا۔ لیکن آخری دور میں ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ وہ ۱۹۶۵ء میں علی گڑھ کو خیرباد کہہ کر دہلی چلے آئے۔ دو سال گھر میں بیٹھے اپنے مطالعے اور تصنیف و تالیف کا شوق پورا کرتے رہے۔ اس کے بعد ۱۹۶۷ء میں چار سال کے لیے انسٹیٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز میں کام کرتے رہے۔ جہاں انھوں نے INDO MUSLIM POLICY کے نام سے ایک تحقیقی تصنیف مکمل کی۔

شملے سے واپس آکر دہلی میں غالب کی اردو اور فارسی غزلوں کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔
غرض آخری دم تک ان کے لکھنے پڑھنے کا شغف جاری رہا۔

شادی

عثمانیہ یونیورسٹی میں تقرر کے چند ماہ بعد یوسف صاحب کی شادی ۱۴ دسمبر ۱۹۳۰ء کو قائم گنج کے رئیس جان عالم خاں کی صاحبزادی اور بڑی بھاوج کی بہن راحت بیگم سے ہوئی۔

اولاد

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے پانچ بچے ہوئے۔ ایک لڑکا اور چار لڑکیاں۔ دو لڑکیاں کم سنی میں ہی فوت ہوگئیں۔ ان کے لڑکے اجمل حسین خاں کی شادی اعجاز حسین خاں (ان کے بھتیجے) کی صاحبزادی ڈاکٹر حامدہ سے ہوئی۔ ڈاکٹر حامدہ آج کل جامعہ ملیہ میں میڈیکل آفیسر ہیں اور دہلی میں سکونت پذیر ہیں۔ ان کی بڑی لڑکی راشدہ بیگم کی شادی سلیم الدین حیدر سے اور دوسری لڑکی ماہ رو بیگم کی شادی انور حسین خاں (ڈاکٹر محمود حسین خاں کے لڑکے) کے ساتھ ہوئی۔

تصنیف و تالیف

ڈاکٹر یوسف حسین خاں بنیادی طور پر تاریخ کے طالب علم اور محقق تھے اور پیشے کے لحاظ سے بھی آپ کا موضوع تاریخ ہی تھا۔ لیکن فطری رجحان ادب کی طرف تھا لہٰذا دونوں میدانوں میں اپنا شہب فکر کو دوڑایا اور بڑی مہارت کا ثبوت دیا۔ ان کی ہندوستانی تاریخ پر جو کتابیں ہیں وہ بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کو انگریزی، فرانسیسی، فارسی اور اردو زبانوں پر یکساں دسترس حاصل تھی۔ اردو اور انگریزی زبان میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت تھی اپنی تصنیف میں انھوں نے وسیع علم، عمیق مطالعے اور ہمہ جہتی کے ثبوت دیے ہیں۔

اردو تصانیف

(۱) روح اقبال (۲) غالب اور آہنگ غالب (۳) حسرت کی شاعری (۴) حافظ اور اقبال (۵) [illegible]
(۶) غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات (۷) اردو غزل (۸) فرانسیسی ادب (۹) کاروان فکر (۱۰) تاریخ دستور ہند (مقالات)
(۱۱) تاریخ دکن (عہد حالیہ) (۱۲) یادوں کی دنیا (۱۳) گارساں دتاسی کے چند خطبات کا ترجمہ

فرانسیسی

L'Inde mystique an moen age

(۲) انگریزی کتب

The life and time of Nizamul Mulk Asif Jah I

1. The first Nizam
2. Glimses of Medieval Indian Culture
3. Indo-Muslim Policy (Turko, Afgan Period)
4. Two studies in early Mughal History

5. Diplomatic Correspondence between The Nizam Ali Khan and E India Campany (Ed)
6. News letters 1767-1799, Nawab Mir Nizam Ali Khan's reign (Ed)
7. Selected documents from The Aligarh archieves (Ed)
8. Selected documents of Aurangzeb's reign 1659 (Ed)
9. Ghalib Persian and Urdu Ghazals of Ghalib (Tr)
10. Mughal Documents with Persian text and notes translated in English (Six Volumes) (Ed)[1]

اعزاز اور انعامات

ان کی علمی اور ادبی خدمات کو اہلِ بصیرت نے سراہا اور ملک و قوم کی طرف سے بطور قدردانی مختلف اعزازات و انعامات سے نوازا گیا۔

ان کی تحقیق حافظ اور اقبال پر انھیں ملک کا سب سے بڑا ادبی انعام ساہتیہ اکیڈمی کی طرف سے ۱۹۶۸ء میں عطا کیا گیا۔ اردو اکیڈمی لکھنؤ اور ساہتیہ کلا پریشد دہلی کی طرف سے بھی انعامات دیے گئے۔

ان کی ادبی خدمات کے سلسلے میں حکومت ہند کی طرف سے پدم بھوشن کا اعزاز عطا کیا گیا۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں علمی اداروں میں غیر معمولی دلچسپی رکھتے تھے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) سے ان کا بہت پرانا تعلق تھا۔ انتقال کے وقت وہ انجمن کے نائب صدر تھے اور غالب اکیڈمی کے بھی نائب صدر اور غالب انسٹی ٹیوٹ (نئی دہلی) کے جنرل سکریٹری بھی تھے۔

انتقال

ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب بہار شخصیت کے مالک تھے جو علمی و ادبی کاموں کو عبادت سمجھ کر کرتے تھے۔ ان کا یہ جوہر جوانی ہی میں نہیں بلکہ ضعیفی میں بھی اسی رفتار سے چلتا رہا۔ انتقال سے پندرہ دن قبل تک یہ شغل جاری رہا۔ فروری ۱۹۷۹ء کو ان کی طبیعت خراب ہوئی۔ ہولی فیملی اسپتال دہلی میں شریک کروایا گیا۔ جہاں ۲۱ فروری ۱۹۷۹ء کو ان کا انتقال ہوا۔ ان کی موت خون میں زہریلا مادہ مل جانے سے واقع ہوئی۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے ان کے انتقال کی خبر نشر کی۔ ۲۲ فروری کو ظہر کی نماز کے وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے مزار کے قریب شفیق الرحمٰن قدوائی، بریگیڈیئر عثمان، خواجہ غلام السیدین اور سید سجاد ظہیر کے مزارات کے قریب ان کے جسدِ خاکی کو سپردِ خاک کیا گیا۔ اسی خاک سے آدم کا خمیر تیار ہوا تھا اور اولادِ آدم کی قسمت بھی ہے کہ آخر میں اسی خاک میں مل جائے۔ کیوں کہ سفرِ حیات کی بھی آخری منزل ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

ان کے انتقال پر اس وقت کے صدر جمہوریہ ڈاکٹر نیلم سنجیوا ریڈی، نائب صدر بی۔ ڈی۔ جتی اور وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے تعزیتی پیغامات بھیجے۔ ہندوستان کے مختلف اداروں نے بھی تعزیتی جلسے کرکے اردو کے اس مشہور محقق، ماہرِ لسانیات اور ماہرِ اقبالیات کے انتقال کو اردو ادب کے لیے ایک ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیا اور بے شمار قلم کاروں نے فرداً فرداً اظہارِ تعزیت کیا۔ منظوم اور نثری کلام روانہ کیے۔

۱۔ یوسف صاحب نے اپنی کتابوں کی فہرست اور Bio-Data خود اپنے ہاتھ سے خاکسار کی خواہش پر عنایت فرمایا تھا۔ کی درخواست پر ان کی بہو ڈاکٹر فاطمہ حسین نے عنایت کی۔

[سب رس (حیدرآباد) ستمبر ۹۳ء]

وفیات

"فنون" نمبر ۳۹ کی اشاعت کے بعد اس شمارے (نمبر ۴۰) کی اشاعت تک کے دوران میں ادب و ثقافت کو چند اہم شخصیات سے محروم ہونا پڑا جن کے انتقال سے تہذیبی بحران کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

پروفیسر احمد علی کا شمار علم و ادب کی نہایت درجہ اہم شخصیات میں ہوتا ہے۔ وہ ترقی پسند ادب کی تحریک کے بانیوں میں شامل تھے۔ اردو مختصر افسانہ نگاری اور ناول نویسی میں ان کا مرتبہ و مقام مسلّم ہے۔ بعد میں انھوں نے قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ و تفسیر کا کام کیا جسے عالمی شہرت کے بڑے بڑے علما نے سراہا۔ ان کی رحلت سے پاکستانی علم و ادب سے ایک اہم شخصیت چھن گئی ہے۔

ڈاکٹر محمد اجمل عالموں اور دانشوروں کے اس عہد و طبقے سے تعلق رکھتے تھے جن کے علمی تبحر کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ ان کا مخصوص موضوع نفسیات اور فلسفہ تھے لیکن [illegible] ان میں اتنی جامعیت تھی کہ ہر کوئی ان سے ملتا تھا ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا ساتھ ہی وہ ایک مستند ماہر تعلیم تھے۔

امیر حمزہ شنواری پشتو کے ایک اہم اور مقبول شاعر تھے۔ پشتو شاعری کے موضوعات میں انھوں نے متعدد اضافے کیے اور ان موضوعات کو استادانہ مہارت سے اپنی شاعری میں برتا۔

تنویر سپرا دورِ حاضر کے چند اہم شعرا میں سے تھے۔ انھوں نے عام روش سے ہٹ کر ایسی غزل کہی جس میں محنت کش کے تمام جذبے، سب نشاط اور محرومیاں، بولتی ہوئی سنائی دیں۔ انھوں نے اپنی زور دار شاعری کو کہیں بھی نعرے کی سطح پر اترنے نہ دیا اور جو کچھ کہا، پوری حقیقت پسندی اور فن شعر کے حسن و احترام کے ساتھ کہا۔ وہ اپنے اسلوب کے خود ہی موجد اور خود ہی خاتم تھے۔

صوفی محمد افضل فقیر سیالکوٹ کی ایک دل آویز شخصیت اور ایک ہمہ گیر شاعر کا نام ہے۔ ان کا پنجابی کلام منتخب ہے اور پنجابی کے علاوہ عربی اور اردو زبانوں میں بھی کہی گئی ہیں۔ ان کی قلندرانہ اور بے نیازانہ طرز زندگی میں اتنی کشش تھی کہ پڑھے لکھے نوجوانوں کا ایک بڑا طبقہ ان کے ارادت مندوں میں شامل تھا۔ سید علی محمود نے مسلمانوں کے متوسط طبقے کے گھرانوں اور کرداروں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ بعد میں انھوں نے پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام [illegible] اردو ادب کی تاریخ مرتب کی۔ محمد ارشاد پنجابی نے پنجابی زبان و ادب کی بے بہا خدمات انجام دیں۔ ارشاد احمد نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا مگر بعد میں انھوں نے صحافت کا رخ کر لیا۔

محسن احمد شفیق بنگلہ دیش کے تھے اور بنگلہ اور اردو شاعری دونوں میں جانے جاتے تھے۔ مولانا کوثر نیازی سیاسی رہنما اور مذہبی دانشور کے علاوہ شاعر بھی تھے۔ اردو کی خطابت میں بھی بے مثال تھے۔ کرم حیدری نے بحیثیت [illegible] شعر و ادب کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی تھی۔ احسن علیم دور کے ایک خوبصورت ترقی پسند شاعر تھے۔ سید عابد علی بخاری نے [illegible] کو اردو شاعری کا ایک شاداب حصہ بنا دیا تھا۔ محمد ناصر زیدی نے [illegible] کو اردو میں منتقل کرنے کا فریضہ نہایت نفاست کے ساتھ انجام دیا۔ ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی نے مولانا ظفر علی خاں کی شخصیت و شاعری پر یادگار کام کیا۔ ڈاکٹر احسن زیدی ایک مقبول استاد اور شاعر تھے۔ شاہد زیدی نے سیاسی اور طنزیہ کالم نگاری میں نام پیدا کیا۔ علامہ حیدر عباس عابدی [illegible] قرآن کے انداز خطابت [illegible] حصہ ادا کیا۔

محمد شفیع ملک ایک سیاسی کارکن کے علاوہ معروف ادیب بھی تھے۔ ندائے اسلام [illegible] انھوں کی [illegible] میں بڑی اہمیت [illegible] "فنون" نے بھی اس شعبے میں ان کے مضامین کو [illegible] کیا۔ ناصر عدیل ایک ماہر موسیقار تھے۔ غلام فرید صابری قوال نے اپنے فن سے برصغیر پاکستان اور ہندوستان کی محفلوں کو زینت دی۔ محبوب عالم نے ٹی وی، ریڈیو اور اسٹیج پر اداکاری کو [illegible] معیار تک پہنچایا۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنی رحمت کرے۔

(فنون، جولائی، دسمبر ۹۳ء)

ڈاکٹر فواد سیزگین
ترجمہ: ڈاکٹر خورشید رضوی

عربی و اسلامی علوم کا یورپ کی تحریک احیائے علوم پر اثر

یہ موضوع جو میں آج کے خطبے میں آپ کے سامنے رکھوں گا' بہت سی تحقیقات کا موضوع بن چکا ہے اور اس پر آراء میں زبردست اختلاف پایا جاتا ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں بعض یورپین علماء نے جب مختلف میدانوں میں علوم کی تاریخ قلم بند کرنی شروع کی تو اس موضوع پر توجہ دی۔ عربی و اسلامی علوم کے بارے میں اولین تبصرے منفی نوعیت کے تھے۔ یورپین علماء کا یہ دستور رہا ہے کہ وہ ان کو اپنی اپنی زبانوں میں "عربی علوم" کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ اور یہ اصطلاح ان کے ہاں آج تک مستعمل ہے۔ پھر انیسویں صدی کے وسط میں عربی و اسلامی علوم کے بارے میں ایک نئے زاویہ نگاہ کا آغاز ہوا جس میں ان کا دفاع' ان کی اہمیت کا اظہار نیز مغربی دنیا میں جدید علوم کی نشوونما پر ان کے اثر کی قدر و قیمت کا احساس شامل تھا۔ اس طرز فکر کا امام جرمن مستشرق Jakob Reiske تھا پھر انیسویں صدی کے وسط سے لے کر آج تک بہت سے منصف مزاج علماء نے اس کی حمایت کی۔ ان انصاف پسندوں میں ایک نہایت مشہور شخصیت شہرہ آفاق جرمن ادیب گوئٹے (J. W. V. Goethe) کی ہے جس کی طرف سے علوم اسلامیہ کا قابل تعریف دفاع کیا گیا۔ پھر عربی سے متعلق تحقیقات میں اہل یورپ کے متخصصین نے عربی کی بہت سی علمی کتابوں کی تحقیق' اشاعت' ان کے مشمولات پر بحث' تاریخ علوم میں ان کی اہمیت اور مغربی دنیا پر ان کا اثر بیان کرنے کا کام کیا۔ اس لائق ستائش دفاع اور ان علمی کوششوں کے علی الرغم یہ آواز اتنی قوی ثابت نہ ہو سکی کہ تاریخ علوم کے ماہرین خصوصی کی نگاہ کو اس مقام کی طرف ملتفت کر سکتی جو از روئے حقیقت تہذیب انسانی میں علوم کی تاریخ عام

کے تناظر میں عربی و اسلامی علوم کو حاصل ہے۔ اس مسئلے کی وضاحت کے سلسلے میں افادیت سے خالی نہ ہو گا اگر یہاں --- بر سبیل تذکرہ --- گزشتہ سال کے ایک علمی اجلاس کا واقعہ آپ کو سناتا چلوں۔ مذکورہ بالا تحقیقات کی تمام تر وضاحتوں کے علی الرغم میرے ایک جرمن رفیق کار نے، جو علم طب کے مورخ ہیں، اس بات پر شک کا اظہار کیا کہ یورپ کی تحریک احیاء کے زمانے میں طب کی اٹھان پر عربوں کے علم طب کا کوئی اثر ہو سکتا ہے۔ لازم ہے کہ یہاں میں یہ ذکر بھی کروں کہ ایک اور جرمن ساتھی نے ---- جو یہ لیکچر سن رہے تھے --- مناسب علمی جواب بھی دیا۔

بعض لوگوں کو اس پر تعجب ہو گا کہ یہ مسئلہ پیش ہی کیوں کیا جا رہا ہے جبکہ سبھی کو معلوم ہے کہ مسلمانوں نے بہت کچھ دریافت کیا اور اس کے بارے میں آپ نے پڑھ بھی رکھا ہو گا۔ لیکن یہ معاملہ بہت گہرا ہے۔ وہ ماخذ کیا ہیں جن پر ان معلومات کا انحصار ہے جو آپ کو عرب اور مسلمان علماء کے کاموں نیز یورپ کی تحریک احیاء پر ان کے اثر سے متعلق حاصل ہیں؟ کیا آپ نے ان سب مسائل یا ان میں سے بعض کا بذات خود مطالعہ کیا ہے؟ کیا یہ معلومات آپ تک ایک یا ایک سے زائد عربی تحقیقات کے ذریعے پہنچی ہیں۔ یا یہ معلومات آپ کو مستشرقین کی تحقیقات سے بالواسطہ یا بلا واسطہ واقفیت کے ذریعے حاصل ہوئی ہیں۔ ان تحقیقات کی نوعیت ایسی ہے کہ یہ --- لازماً --- مثبت نتائج پیدا نہیں کرتیں۔ اور ان کے بعض احکام سلبی و حتمی نوعیت کے ہیں کیونکہ وہ اسی پرانے حتمی طرز خیال کے پابند ہیں۔

<u>سامعین کرام</u>

امید ہے آپ یہ خیال دل میں نہ لائیں گے کہ میں اس مسئلے پر قومیت کا شکار ہو رہا ہوں۔ یہاں اسی قدر کافی ہو گا کہ --- آگے چلنے سے پیشتر --- میں دو ٹوک انداز میں آپ کی خدمت میں یہ عرض کر دوں کہ علوم کی عام تاریخ میں عربی و اسلامی علوم کا حقیقی مقام اس سے کہیں بڑھ کر ہے جو آج تک کی تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے اور اس مقام میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی اگر ہم اپنے پیشروؤں یا اپنے علاوہ دوسروں کی مساعی کا اعتراف بھی کریں۔ کیونکہ تاریخ علوم میں عربی و اسلامی علوم کا مقام دیگر اقوام کے ہاں علوم کے مقام سے --- جن کی اہمیت

کو تسلیم کیا جا چکا ہے -- کسی طرح کم نہیں اور یورپ کی تحریک احیاء کے دور پر عربی و اسلامی علوم کا اثر اس قدر وسیع اور عمیق ہے کہ اس کا تصور کرنا بھی آسان نہیں - یہ رائے محض ایک خیال یا تاثر پر مبنی نہیں بلکہ ان علوم پر تیس برس کے مسلسل مطالعے اور تحقیق کا نتیجہ ہے جن میں میری کوشش یہ بھی رہی ہے کہ مختلف میدانوں میں عربی و اسلامی علوم کے مغرب پر اثرات کے مسئلے کا جائزہ لوں۔

لیکن مورخین علوم پر یہ حقائق بیشتر واضح نہیں ہو سکے اور ان کی کتابوں میں ان کے اظہار کے لئے ابھی بہت وقت چاہئے کیونکہ انہیں کیا پڑی ہے کہ وہ یہ سب مطالعہ خود کریں اور جب علوم کی تاریخ عام پیش کریں تو اس میں اس کا اظہار ہو - چنانچہ جو اہل علم' زبان اور دین کے حوالے سے اس ورثے سے وابستہ ہیں ان پر اس مسئلے کی وضاحت لازم ہے - ضروری سمجھتا ہوں کہ میں اس امر کی طرف بھی اشارہ کرتا چلوں کہ یہ علمی فریضہ ادا کرنے کے لئے ایک طرف عربی ورثے سے وسیع اور گہری واقفیت درکار ہے اور دوسری طرف جدید علوم اور ان کے مناہج سے ضروری مناسبت - ایک اہم نقطہ جس پر زور دینا ضروری ہے یہ ہے کہ مسلمان اور عرب علماء کے کاموں پر سنجیدہ تحقیق پہلے مکمل ہونی چاہئے اور یورپ کی تحریک احیاء کے دور پر ان کے اثرات کی بحث بعد میں اٹھائی جانی چاہیے- بالفاظ دیگر دوسرا موضوع پہلے پر منحصر ہے - اور یہ فطری سی بات ہے - کیونکہ ہم مسلمان علماء کی تصانیف اور ان کی دریافتوں پر دقیق تحقیقات انجام دیئے بغیر تاثیر و تاثر کے مسئلے کا جائزہ ہی نہیں لے سکتے - ہاں ان تحقیقات کے بعد یہ درست ہو گا کہ ایک طرف ان تصانیف اور دریافتوں کو رکھا جائے اور دوسری طرف وہ چیزیں پیش نظر ہوں جن کے بارے میں یہ تصور کیا جاتا ہے کہ وہ تحریک احیاء کے دور کے یورپین علماء کے ہاں عموی طور پر معروف تھیں - اور پھر دونوں کا موازنہ کیا جائے - مزید برآں عربی و اسلامی علوم اور زمانہ تحریک احیاء کے علوم کے نتائج میں ہم آہنگی اور مشابہت کی صورتیں ثابت کر دینا بھی اس امر کے ثبوت کے لئے کافی نہ ہو گا کہ جس کا زمانہ بعد کا ہے اس نے لازماً اس سے اخذ کیا ہے جس کا زمانہ قدیم تر ہے - کیونکہ یہاں اس معترضانہ رائے کی گنجائش باقی رہتی ہے کہ تاریخ میں ایک متوازی عمل کا وجود ممکن ہے یا ' بالفاظ دیگر' یہ کہ مسلمان اور مغربی علماء ایک ہی جیسے نتائج تک ایک دوسرے سے کچھ اخذ کئے بغیر ہی اپنے طور پر پہنچ گئے - یہ وضاحت بعض

صورتوں میں درست بھی ہو سکتی ہے۔ تاریخ علوم میں اسے بہت برتا گیا ہے۔ یہ استعمال بیشتر تو زیادتی و بے انصافی کا موجب ہوا ہے ہاں کہیں کہیں صائب و برحق بھی رہا ہے۔ محقق اگر کوئی نظریہ یا کسی مسئلے کا حل کسی مسلمان عالم کے ہاں دریافت کر بھی لے اور یہی نظریہ تاریخ علوم کی کتابوں میں کسی مغربی عالم سے منسوب کیا جا چکا ہو تو ضروری نہیں کہ وہ اس عموی ثابت شدہ حقیقت کا [دوسروں کو بھی] قائل کر سکے جس کی رو سے متمدن لاطینی حلقوں میں سائنس نے عربی و اسلامی علوم سے اثر قبول کیا اور مطلقاً اس اثر کے تابع ہوئی۔ نیز کسی حد تک شعر موسیقی اور فن نے بھی اثر قبول کیا۔ میرا خیال ہے کہ اس اثر کا جائزہ لینے اور اسے واضح کرنے کا مثالی طریقہ وہ ہو گا جس کا اہتمام اسلامی ثقافت سے منسوب لوگوں کو کرنا چاہئے۔ یہ موازنے کا طریقہ ہے۔ وہ اس طرح کہ وہ مسلمان علماء کے نکالے ہوئے نتائج کا موازنہ دسویں صدی عیسوی سے لے کر سولھویں صدی تک کی مغربی دنیا کی کتابوں سے کریں یعنی علم کی تمام فروع سے متعلق کتابیں جو لاطینی' ہسپانوی' اطالوی یا دیگر زبانوں میں لکھی گئیں۔ یہاں میں یہ کہہ گزرنے کی جسارت میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا کہ نتائج بہت عظیم اور حیرت انگیز ہوں گے۔ یہ رائے محض قیاس نہیں بلکہ ایک ایسا تصور ہے جس کی تشکیل محققین کے نکالے ہوئے نتائج نیز اس موازنے کی روشنی میں ہوئی ہے جو دونوں طرف کی کتابوں کے درمیان ذاتی طور پر میرے لئے ممکن ہو سکا ہے۔

اب میں اس سلسلے میں ایک عام تصور پیش کرنا چاہوں گا کہ یورپ کی تحریک احیائے علوم پر عربی و اسلامی علوم نے کس حد تک اثر چھوڑا اور اس اثر کی نوعیت کیا تھی۔

مسلمانوں نے پہلی صدی ہجری کے زمانے سے ان علوم کو اخذ کرنا شروع کر دیا تھا جو اسلامی سلطنت کے دائرے میں داخل ہو جانے والی غیر اقوام کے متمدن حلقوں میں معروف تھے۔ ان کے اولین اساتذہ یہی غیر اقوام کے لوگ تھے۔ اور مسلمانوں نے ان اقوام کے علوم و معارف کو کسی قسم کی نفسیاتی الجھن یا کسی بھی دینی رکاوٹ کے بغیر قبول کیا۔ پہلی صدی ہجری میں فلکیات کا بطلیوسی نظام ان تک پہنچا۔ اس نظام کے مطابق زمین کی شکل کروی تھی اور یہ بات قبل از اسلام' عربوں کے اس تصور کے خلاف تھی کہ زمین چپٹی ہے اور آسمان اس پر ایک گنبد کی طرح دھرا ہے۔ انہوں نے بطلیوس کی پیش کردہ صورت قبول کر لی اور اس میں اور دین اور

عقیدے میں کوئی تعارض محسوس نہیں کیا۔ اخذ و اکتساب کے اس مرحلے کو مسلمانوں نے نسبتہً مختصر سے وقت میں طے کر لیا۔ چنانچہ جونہی ہم تیسری صدی ہجری کے اواسط میں پہنچتے ہیں کہ مسلمان خاص ابعزاد نتائج پیش کرنے کے مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں۔ ابعزادگی کی یہ چھاپ تیزی سے' اور گہرائی تک' تمام علوم میں سرایت کر گئی اور میری رائے میں تسلسل کے ساتھ آٹھویں صدی ہجری تک چلتی رہی جبکہ اسلامی علوم اور ثقافت میں جمود کا آغاز ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تیسری صدی ہجری کے اواسط میں مسلمان اس قابل ہو گئے کہ اہل یونان' اہل بابل' اہل ہند اور اہل ایران سے جو ورثہ انہیں ملا تھا اسے ترقی دیں اور اس میں اصلاح کریں۔ نئے قوانین اور نئے طریقوں کو جنم دیں' اپنے تجربات اور پیمائشوں میں نئے آلات کو استعمال کریں اور نئے علوم وضع کریں جو اگلوں کے علم میں نہ تھے۔

یہ علوم جو اسلامی تمدن کے دائرے میں پھلے پھولے' دیگر اقوام کی طرف ان کے منتقل ہونے کا آغاز ہمیں تیسری صدی ہجری کے اواخر میں ملتا ہے۔ چنانچہ کیمیاء' طب اور احکام النجوم کی بعض کتابوں کا سلطنت بیزنطیہ [Byzantine Empire] کے پایہ تخت قسطنطنیہ میں عربی سے یونانی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ لیکن سلطنت بیزنطیہ کی علمی سطح اس امر کے لئے سازگار نہ تھی کہ یہ ترجمے مطلوبہ نتائج پیدا کر سکیں۔ اسلامی علوم کے مغربی عیسائی دنیا میں منتقل ہونے کا دوسرا راستہ اندلس سے ہو کر گزرا۔ یہاں باہمی میل جول کا تسلسل پیدا ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مغرب کی مسیحی دنیا نے مسلمانوں سے علم صرف ترجمے کے ذریعے اخذ نہیں کیا بلکہ یہ ایک مضبوط اور براہ راست انسانی رابطے کی صورت تھی۔

عربی سے لاطینی زبان میں قدیم ترین تراجم جو ہمارے علم میں ہیں چوتھی صدی ہجری کے نصف ثانی میں کئے گئے۔ اور سب سے قدیم چیز جس کا وہاں ترجمہ ہوا' علم الفلک کی ایک کتاب تھی۔ فطری سی بات ہے کہ اس ابتدائی مرحلے میں ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ان کتابوں کا ترجمہ کر لیں جن کی نوعیت نظری تھی اور جو پیچیدہ مسائل پر مشتمل تھیں۔ چنانچہ ان کے قدیم ترین تراجم اصطرلاب اور عملی ہندسہ سے متعلق تھے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اکثر حالات میں مترجمین کو عربی اصطلاحات کے مقابلے میں لاطینی اصطلاحات نہیں مل سکیں چنانچہ وہ عربی اصطلاحات کو جوں کا توں مستعار لینے پر مجبور ہوئے۔

اس سلسلے میں ایک اہم منظر اور ہے وہ یہ کہ ان موضوعات پر اولین لاطینی تالیفات ترجمے کے چند ہی سال بعد کے زمانے میں سامنے آئیں۔ اور ان لاطینی کتابوں پر علمی تحقیق سے، خصوصاً ان تحقیقات سے جو بیسویں صدی میں ہوئیں، یہ ثابت ہو گیا ہے کہ یہ لاطینی کتابیں عربی کتابوں کی نقل محض ہیں۔ اس اعتبار سے یہ کتابیں درحقیقت لاطینی تصنیفات نہیں ہیں بلکہ لاطینی زبان میں ایسے اقتباسات پر مشتمل ہیں جن کی اصل عربی زبان میں ہے۔ یونانی وغیرہ سے عربی میں ہونے والے اولین تراجم اور عربی سے لاطینی میں ترجمہ کی جانے والی کتابوں کے مابین مشابہت کے بہت سے پہلو نکلتے ہیں۔ چنانچہ دونوں صورتوں میں ہمیں فن ترجمہ کی عدم مہارت نیز اصطلاحات ایجاد کرنے کی عدم استطاعت کا احساس ہوتا ہے۔ ہاں فرق یہ ہے کہ لاطینیوں نے آغاز سرقے سے کیا ان کے ہاں یہ اصول موجود نہ تھا کہ تصانیف کو ان کے اصل لکھنے والوں سے منسوب کرنا ضروری سمجھا جائے جبکہ اسلامی تمدن میں یہ اصول واضح تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اقوال کی سند اصحاب اقوال سے ملانے کا اسلامی رویہ، جس کی حیثیت دینی تھی، اس رجحان کا باعث بنا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ لاطینیوں کے اس احساس نے کہ وہ اپنے دینی و سیاسی حریفوں سے علم اخذ کرنے پر مجبور ہیں، انھیں بیشتر صورتوں میں سرقے کی راہ پر ڈال دیا ہو، تاکہ اصل مصنفین پر پردہ ڈالا جا سکے۔ مسلمانوں کی روش اس کے برخلاف تھی چنانچہ وہ اپنے ہم مذہبوں نیز دولت اسلامیہ میں رہنے والے غیر مذہب لوگوں سے بغیر کسی ذہنی تحفظ کے استفادہ کرتے تھے۔

پانچویں صدی ہجری میں، یعنی اولین تراجم پر نصف صدی گزر جانے کے بعد، اسطرلابوں کے بارے میں بعض کتابیں تالیف کی گئیں جن میں سابقہ تراجم اور مسروقہ کتب کی واضح تقلید ملتی ہے۔ اس طرح عربی اسلامی علوم کے اکتساب کا سلسلہ چوتھی صدی ہجری کے اواسط سے لے کر پانچویں صدی ہجری کے اواخر تک جاری رہا۔ اس دور میں طلیطلہ کو علمی تحریک میں سب سے بڑے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔

چھٹی صدی ہجری میں اکتساب کا عمل پیرس، تور (Tours) اور تولوز (Toulouse) جیسے دیگر شہروں تک پھیل گیا۔ اور اس صدی میں ایسے مترجمین کا ظہور ہوا جنھوں نے بھرپور دسترس اور قدرت کے ساتھ ایسی ضخیم عربی کتابوں کا ترجمہ کر لیا جن کے ترجمے کے لئے متمسانہ علمی

معلومات کا احاطہ درکار تھا۔ یہاں سے ہمیں مرحلہ اکتساب کا آغاز دکھائی دیتا ہے کیونکہ لاطینیوں نے چھٹی صدی ہجری کے دوران جو کتابیں تالیف کیں وہ عربی کی اصل کتابوں کی تقلید تھیں۔ تاہم ان سے مرحلہ اکتساب کے آغاز کا سراغ ضرور ملتا ہے۔ ان لاطینی مولفین کو ارسطو اور بطلیوس جیسے یونانی علماء کے نام ضرور معلوم تھے۔ مگر یہ معمولی سی واقفیت بھی انہیں عربی ماخذ کے وسیلے کے بغیر حاصل نہ ہو سکتی تھی۔ چھٹی صدی ہجری ہی میں فلکیات' ریاضیات' فلسفہ' موسیقی اور کیمیاء کی بہت سی عربی کتابوں کا ترجمہ ہوا۔ یہ ہسپانیہ کے راستے منتقل ہوئیں اور ان میں ہمیں عربی سے لاطینی ترجمے کے علاوہ کئی ایک تراجم عربی سے عبرانی میں بھی ملتے ہیں۔

فن ترجمہ کا بھرپور ریلا چھٹی صدی عیسوی کے اواخر میں رونما ہوا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جیرارڈ کرمونی (Gerhard Van Cremona) عربی کتب کا ماہر ترین اور مشہور ترین مترجم تھا۔ جیرارڈ نے نوے سے زائد کتابوں کا عربی سے ترجمہ کیا' ان میں سے بعض اہل یونان کی تالیف تھیں جو عربی میں ترجمہ ہو چکی تھیں اور اس نے عربی سے انہیں لاطینی میں منتقل کیا۔ جیرارڈ نے ـــ جو اپنے زمانے کا ماہر ترین مترجم تھا اور اپنے ہم وطنوں میں عربی علوم کا سب سے بڑا ماہر تھا ـــ صرف ترجمے پر اکتفا نہ کیا بلکہ یہ بھی چاہا کہ خود مولف کے طور پر امتیاز پائے۔ چنانچہ اس نے ' ہمارے علم کی حد تک ' لاطینی زبان میں نظری فلکیات پر اولین کتاب ترتیب دی۔ اور یہ کتاب وہ ہے جس کے بارے میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہ الفرغانی اور البتانی کی کتابوں کے اقتباسات سے عبارت ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مولف نے جو فلکی حسابات عربی ماخذ سے لئے ہیں انہیں ٹھیک ٹھیک پیش کرنے سے قاصر رہا ہے۔ بہر حال یہ کتاب ـــ عربی سے ہونے والے تراجم کے پہلو بہ پہلو ـــ علماء کی کئی نسلوں کے لئے حوالے کی حیثیت اختیار کئے رہی اور بعض علماء نے اس کی تقلید میں کچھ اور کتابیں بھی لکھیں۔

چھٹی صدی ہجری کے آخر اور ساتویں صدی کے اوائل میں عربی علوم کے اخذ و اکتساب کے مراکز تبدیل ہو کر انگلستان اور شمالی اٹلی کی جانب منتقل ہو گئے۔ ایک اور رو وہ تھی جو اٹلی کے جنوب سے شمال کی طرف جاری ہوئی۔

آپ کو معلوم ہے کہ سسلی تیسری صدی کے اوائل سے لے کر پانچویں صدی کے

اواسط تک مسلمانوں کے زیر نگیں رہا۔ چنانچہ شہر پالرمو [Palermo] میں ایک اونچی سطح کا علمی حلقہ وجود میں آیا۔ آج جو کچھ ہمیں معلوم ہے اس کے مطابق سسلی کے اس علمی حلقے نے اٹلی پر کچھ زیادہ اثر نہیں چھوڑا۔ چنانچہ اٹلی میں عربی علوم اخذ کرنے کا مرحلہ ایک اور صورت میں اور ایک عجیب طریقے سے طے ہوا۔

۱۰۶۵ء میں ایک عرب تاجر الجزائر سے جنوبی اٹلی کے شہر سالرنو [Salerno] آیا اور وہاں پر طب اور دواسازی کے پست معیار کو دیکھ کر یہ عہد کیا کہ وہ اپنے وطن جا کر طب کی تعلیم حاصل کرے گا اور پھر اٹلی والوں کو فائدہ پہنچانے کے لئے واپس آئے گا۔ یہ وہی طبیب ہے جو اہل یورپ کے ہاں قسطنطین افریقی [Constantine the African] کے نام سے مشہور ہے اور اس کے حالات محققین کو معلوم ہیں۔ ہمیں یہ ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں کہ وہ عیسائی گھرانے میں پیدا ہوا تھا یا اس نے خود عیسائیت اختیار کر لی تھی تاہم ہمیں یہ ضرور معلوم ہے کہ اس نے تین برس تک علم طب سیکھا اور پھر بہت سی کتابیں ساتھ لے کر سالرنو واپس آیا۔ پھر ایک خانقاہ میں بعض راہبوں کے ساتھ گوشہ نشین ہو گیا۔ اس محنتی اور فعال شخص نے ستر سے زائد عربی کتابوں کے مشمولات کا ترجمہ کیا اور اس کی مدد کچھ اور ساتھیوں نے کی جو لاطینی زبان پر اچھی دسترس رکھتے تھے۔ قسطنطین نے خود کو علم کے ایک اونچے مرتبے پر فائز پایا جبکہ اس کے آس پاس لوگوں کا معیار بہت پست تھا۔ چنانچہ اس نے عربی کی بہت سی اہم طبی کتابوں کو اپنی طرف منسوب کر لیا۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ چھوٹے موٹے رسالے خود سے منسوب کر لیتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اہم مواد پر مشتمل ضخیم کتب کو اپنی ذات سے منسوب کر لیتا تھا۔ میں اس کی ایک واضح مثال پیش کرتا ہوں۔ علی بن موسی المجوسی کی کتاب "کامل الصناعۃ الطبیہ" لاطینی اطباء کے ہاں تقریباً دو سو سال تک اس حیثیت سے متداول رہی کہ وہ قسطنطین کی تصنیف ہے۔ تاآنکہ کسی مترجم نے اصل کتاب کا ترجمہ کیا تو لوگوں کی نگاہیں حقیقت کی طرف ملتفت ہوئیں (یہاں ---- برسبیل تذکرہ ---- مجھے ایک افسوس ناک حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کی اجازت دیجئے۔ گزشتہ کچھ سالوں سے یہ کوئی عجیب بات نہیں رہی کہ ہمارے بعض طالب علم یورپ یا امریکہ میں تعلیم پانے کے بعد جب واپس آتے ہیں تو بعض کتابوں کا عربی ترجمہ کتاب کے اصل مؤلف کا ذکر کئے بغیر پیش کر دیتے ہیں۔ ان لوگوں کو "جدید قسطنطین" کہا جا سکتا ہے)۔ بہرحال قسطنطین

افریقی کے تراجم نے یورپ میں علم طب کے دروازے کھول دیئے۔ جبکہ اس سے قبل وہاں عوامی ٹوٹکوں کا دور دورہ تھا جو خرافات کا مجموعہ تھے اور طب یونانی کو یکسر فراموش کیا جا چکا تھا۔ اٹلی میں ترجمے کی رو جنوب سے داخل ہوئی اور عرب کے کچھ علمی عناصر شمال کی جانب سے بھی آئے۔ اس طرح اٹلی میں علم کے مختلف شعبوں میں عربی کتابوں کے ترجمے کے لئے سازگار فضا پیدا ہو گئی اور سسلی کا عربی کتب فکر پہلے سے بڑھ کر اثر ڈالنے کے لائق ہو سکا۔

اس طرح عربی و اسلامی علوم بیزنطہ، اندلس اور اطالیہ کے راستے مغرب میں منتقل ہوئے۔ علوم کے بعض مورخین یورپ میں آغاز تحریک احیاء پر اسلامی علوم کے تھوڑے بہت اثرات کا اعتراف کرنے کا میلان رکھتے ہیں مگر وہ ان علوم کے منتقل ہونے کے راستوں پر توجہ نہیں دیتے۔ وہ صلیبی جنگوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ان جنگوں میں فریقین کو ایک دوسرے کے قریب آنے کا جو موقع ملا اس کی بدولت لاطینی دنیا کو مسلمانوں کے کچھ علمی کارناموں سے تعارف حاصل ہوا۔ اس نظریے کو تاریخ علوم میں "نظریہ مصائب" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ بعض اوقات جنگوں جیسے مصائب بھی کچھ فوائد کا باعث بن جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے جواب میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ بھی معروف ہے کیونکہ ایک تمدنی فضا کے دوسری تمدنی فضا سے متاثر ہونے کے لئے طویل وقت اور خاص توجہ درکار ہے۔

ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی کی طرف آئیں تو یورپ میں سب سے اہم علمی منظر جو سامنے آتا ہے وہ یونیورسٹیوں کا قیام ہے۔ یورپ کے جو جو شہر عربی و اسلامی علوم سے اخذ و اکتساب کے مرکز تھے انہی میں یونیورسٹیاں قائم ہوئیں۔ مورخین نے بار ہا ان جامعات کے قیام کی توجیہ کرنے کی کوشش کی ہے کیونکہ یہ جس انداز میں قائم ہوئیں اس کی کوئی مثال یورپ میں موجود نہ تھی۔ ان کا تصور نہ یونانیوں کے ہاں معروف تھا نہ یورپ کی قرون وسطیٰ میں موجود تھا اور اسی زمانے میں [اسلامی دنیا کی] صورت حال آج سب کے علم میں ہے۔ یہ یونیورسٹیاں اپنے اصول و فروع نیز منصوبوں میں صرف اور صرف اسلامی یونیورسٹیوں کی تقلید پر قائم تھیں۔ یہ خیال محض ایک گمان نہیں بلکہ ایک ایسا (علمی) نتیجہ ہے جس تک ایک جرمن ساتھی نے رسائی حاصل کی ہے اور تقریباً دس سال قبل وہ اپنی تحقیق شائع کر چکا ہے۔

اب ہم عربی و اسلامی علوم اور ان پر مشتمل کتب سے اخذ و اکتساب کے مسئلے کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی میں ترجمہ کتب کی تحریک جاری رہی۔ چنانچہ کچھ اور اہم کتابوں کا ترجمہ ہوا نیز بعض کتب کا از سرنو ترجمہ کیا گیا۔ اسی زمانے میں علمی فضا بہت سے لوگوں کے لئے مختلف علوم کے فروغ پر خود کتابیں تالیف کرنے کے لئے بھی سازگار ہوئی۔ ان تالیفات کا عربی کتب سے موازنہ کیا جائے تو ان کے مولفین گاہ بگاہ عربوں کی تقلید اور شاگردی پر اظہار فخر کرتے نظر آتے ہیں۔ عربی کتب کے حوالے سے دیکھا جائے تو ان کتابوں میں کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ اور اہل تحقیق سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ ان کا معیار اصل عربی ماخذ سے کم تر ہے۔ میرا اشارہ موضوع کے فہم، بیان کے اسلوب، مضمون کی ترتیب، اختصار اور دیانت کے معیار کی طرف ہے یہی حکم چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی کی تحریک علمی پر صادق آتا ہے۔

یہاں اس صدی کے ایک واضح امتیاز کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ بہت سی یونانی کتابیں، عربی سے لاطینی میں ترجمہ ہوئیں اور ان میں سے بیشتر کا ان کی عربی شروح سمیت ترجمہ کیا گیا۔ اس صدی کی کتابوں میں ہمیں بطلیوس کا نام کثرت سے ملتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ ان علماء کو اس کی کتب سے واقفیت تھی اور انہوں نے اس کتاب سے علم حاصل کر کے اسی کی اساس پر بات کو آگے بڑھایا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ انہوں نے بطلیوس کے کلام سے واقفیت عربی کتابوں کے ذریعے حاصل کی تھی جن میں علم الفلک بطلیوس کی کتب سے برتر سطح تک پہنچ چکا تھا۔ اسی صدی میں میں نے ارسطو کے پیروؤں کا ایک علمی مکتب فکر بھی پایا جن میں مشہور ترین شخصیت ۔ عظیم البرٹس" (Albertus Magnus) کی ہے۔ لیکن اب ہمیں یقینی طور پر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ وہ یونانی زبان سے ناواقف تھا اور ارسطو کی کتابوں سے اس کی واقفیت محض ابن سینا اور ابن رشد کی شروح کے واسطے سے تھی۔ یہ البرٹس یورپ کی تحریک احیاء کے زمانے میں بہت سے علوم مثلاً حیوانیات، نباتیات، حجریات، آثار علویہ اور کیمیا کا بانی سمجھا جاتا ہے اور یہ تصور کیا جاتا ہے کہ اس ضمن میں اس کا انحصار یونانی ماخذ پر رہا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے اس نے یہ اور ایسے ہی دوسرے خیالات، ابن سینا، ابن رشد اور جابر بن حیان کی کتابوں میں پائے جانے والے مواد سے اخذ کئے تھے۔

راجر بیکن (Roger Bacon) اور رابرٹ گروسٹٹے (Robert Grossetests) کا بھی یہی حال ہے۔ گروسٹٹے کا انحصار الکندی' ابن سینا' ابن رشد اور بعض اور عرب مولفین پر رہا۔ اور بیکن کو تو عربوں کا شاگرد کہنا چاہئے۔ اسکی شہرت بعض ایسی اہم دریافتوں کے حوالے سے ہوئی جو سب کی سب اس نے عربوں سے اخذ کیں۔ اس کی یہ شہرت کہ وہ پہلا عالم ہے جس نے خدمت علم کے لئے تجربے سے استفادہ کیا' بے سوچے سمجھے قبول نہ کر لینی چاہئے کیونکہ بیسویں صدی کے اوائل سے ہونے والی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ البیرونی اور ابن الہیثم جیسے علماء کو [اس سلسلے میں] سبقت زمانی حاصل ہے اور بیکن گویا ان کا شاگرد تھا جو اپنے اساتذہ کی سطح تک پہنچنے سے قاصر رہا۔

اسی صدی کا ایک منظر اور ہے۔ اور وہ ہے عربی کتب کے سرقے میں اضافہ۔ مستزاد یہ کہ ان کتابوں کو یونانی علماء سے منسوب کر دیا گیا۔ تصور کیجئے کہ اس صدی کے ایک مشہور مترجم' مائیکل سکاٹ (Michael Scot) نے فلکیات پر نور الدین البطروجی کی ایک کتاب نیز ارسطو کی کتاب "مابعد الطبیعۃ" [Metaphysics] اور کتاب السماء [On the Heavens] پر ابن رشد کی شروح کا ترجمہ کیا اور البطروجی اور ابن رشد کے افکار ـــ جو بارہویں صدی عیسوی سے قبل معروف نہ تھے ـــ اخذ کر کے ایک نئی کتاب مرتب کی جس میں ان افکار کے سوا کچھ بھی نہ تھا اور پھر اس کتاب کو اس نے نیکو لاوس دمشقی (Nicolaus Damascenus) سے منسوب کر دیا جو پہلی صدی قبل مسیح میں ارسطو کی کتاب کا شارح ہو گزرا ہے۔ غلط طور پر منسوب شدہ یہ کتاب علماء کے ہاں اسی حیثیت سے متداول رہی کہ یہ نیکولاوس دمشقی کی کتاب ہے اور کسی نے اس بات پر توجہ نہ دی کہ یہ افکار بہت جدید ہیں اور نیکو لاوس دمشقی کے عہد میں ان کا معروف ہونا ممکن نہیں۔

اسی قبیل سے آنکھ سے متعلق حنین بن اسحاق کی کتاب ہے جسے جالینوس یونانی سے منسوب کر دیا گیا۔ اور بیسویں صدی کے آغاز میں آ کر کہیں یہ حقیقت منکشف ہوئی۔ ایسا ہی معاملہ مالیخولیا پر اسحاق بن عمران کی کتاب کے ساتھ ہوا۔ اسے روفس یونانی (Rufus of Ephesus) سے منسوب کر دیا گیا۔ ابن سینا کی کتاب الاعجار ارسطو سے منسوب ہو گئی

وغیرہ' اور ایسی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔

فلکیات پر البطروجی کی کتاب کا ترجمہ ایک ہمہ گیر علمی تحریک کا نقطہ آغاز ثابت ہوا' جس نے تحریک احیاء کے زمانے میں جدید علوم کے قیام پر بہت اثر ڈالا۔ البطروجی نے بطلیموسی نظام سے مختلف ایک جدید نظام پیش کیا تھا۔ یہاں ہم اس نئے نظام کی تفصیلات میں جانے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ بس اتنا اشارہ کافی ہے کہ لاطینی دنیا میں اس نئے نظام کے پہنچنے سے علم الفلک' علم طبیعیات نیز فلسفیانہ افکار کے معیار کو بلند کرنے کے سلسلے میں بہت اثر پڑا۔ یہ مسئلہ مکمل ایک صدی تک مغربی یورپ کے علمی حلقوں میں زیر بحث رہا۔ ایک گروہ نے بطلیموس کی رائے کا دفاع کیا اور دوسرے نے البطروجی کے نظریے کی حمایت کی۔ جبکہ ایک اور گروہ دونوں نظریوں کے درمیان متردد رہا۔ چودھویں صدی عیسوی کے اوائل تک صورت حال اسی طرح چلتی رہی جبکہ ابن الہیثم کا نظریہ سامنے آیا جس میں بطلیموسی نظام کو درست قرار دیا گیا تھا۔ چنانچہ غیر بطلیموسی یعنی بطروجی نظام کو ترک کرنا ممکن ہوا۔ یہ بحث مغربی یورپ سے ختم ہوئی تھی کہ اٹلی میں چھڑ گئی اور سولہویں صدی عیسوی کے اواسط تک جاری رہی۔

چودھویں صدی عیسوی میں ایسے علماء کی تعداد میں اضافہ ہوا جو عربی سے ترجمہ شدہ علوم میں مشغول ہوئے۔ ان میں سے بہت سوں کے ہاں حوالے کی ایسی ضخیم کتب ترتیب دینے کا رجحان پیدا ہو گیا جن میں عربی سے ترجمہ شدہ کتابوں کی تلخیص ہوتی تھی۔ تاہم ان مرتبوں اور تلخیص نگاروں کا دستور یہ رہا کہ وہ عرب علماء کے نام حذف کر کے ان کی جگہ ایسے یونانی علماء کے نام درج کر دیتے تھے جن کا ذکر عربی ماخذ میں آیا ہوتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے بطلیموس اور فلکیات پر اس کی کتاب کا تذکرہ کیا۔ حالانکہ ان کا ماخذ البتانی کی کتاب تھی۔ یہ درست ہے کہ البتانی نے بطلیموسی نظام کو اخذ کیا لیکن اس کی کتاب میں بہت سے اہم انکشافات ایسے بھی تھے جو بطلیموس سے موازنہ و مقابلہ کے بعد ہی سامنے آ سکتے تھے۔ تصنیف و تالیف کا یہ انداز پندرہویں صدی عیسوی میں بھی غالب رہا اور عربی کے تراجم سے براہ راست استفادہ ایک عام بات ہو گئی۔ تاہم عرب علماء کا تذکرہ بہت کم نظر آتا تھا۔ چودھویں صدی عیسوی سے عرب علماء کو فراموش کرنے کا یہ رواج دو اور اہم عوامل پر مبنی ہے:

پہلا عامل عربی کی مخالفت کی وہ رو تھی جو تیرہویں صدی عیسوی کے آخر اور چودہویں صدی کے اوائل میں بڑی خونخوار شدت کے ساتھ سامنے آئی عرب علماء کے نام لینے کے سلسلے میں نفسیاتی گرہ پڑ گئی تھی ۔ عربی کے خلاف اس رو کا اولین علم بردار رائمنڈس لولوس (Raymundus Lullus) تھا۔ اس کی بیس سے زائد کتابیں ہم تک پہنچی ہیں جن پر تحقیق سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ وہ سب کی سب عربی تالیفات ہیں۔ عربی کے خلاف یہ رو سولہویں صدی عیسوی کے اواسط تک چلتی رہی اور اس دور تک آتے آتے تاریخ علوم میں عرب علماء کا ذکر یکسر فراموش ہو چکا تھا۔

دوسرا عامل تہذیبی برتری کا ذوق و شوق تھا۔ چنانچہ مسلمان علماء کی اہم ایجادات ہمارے زمانے تک تیرہویں، چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی کے یورپین علماء سے منسوب چلتی رہی تھیں۔ مثلاً بصریات کے میدان میں حجرہ تاریک [Camera Obscura] کی ایجاد، مثلثات کرویہ [Spherical Triangles] نیز فلکیات کے میدان میں عصائے یعقوب [Jacob's Staff] کے نام سے موسوم آلے کی دریافت اور تجربی طریق کار کی داغ بیل، ایسے انکشافات ہیں جنہیں تاریخ لیوی بن گرسون (Levi Ben Gerson) سے منسوب کر دیا گیا اور یہ اسی کے نام سے مشہور ہو گئے۔ کسی محقق نے خود سے یہ سوال نہیں کیا کہ ایک شخص کے لئے یہ کیونکر ممکن ہے کہ یہ سب اہم دریافتیں تنہا اسی نے کر لی ہوں۔ آج ہمیں عرب اور مسلمان علماء میں ان ایجادات کے حقیقی موجدوں کے نام معلوم ہو چکے ہیں۔

معروف ترجمہ شدہ کتابوں کے علاوہ عالم اسلام کے علمی کارناموں پر پردہ ڈالنے کے لئے بعض اور وسائل بھی بروئے کار لائے گئے۔ اہل یورپ میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہوئے کہ جب انہیں مسلمانوں کے علوم کی اہمیت کا احساس ہوا تو انہوں نے مشرق کی طرف رخت سفر باندھا، سالہا سال وہاں قیام کیا، عربی زبان سیکھی، علوم کا مطالعہ کیا اور پھر کتابیں اور علم ساتھ لے کر واپس گئے۔ اطالوی عالم لیونا رڈو فیبوناچی (Leonardo Fibonacci) نے جو لاطینی دنیا میں پہلا ماہر ریاضیات تھا، عربی سیکھی اور شام اور تونس میں ریاضی کا مطالعہ کیا۔ تاریخ ریاضیات میں کئی اہم انکشافات اس سے منسوب ہیں مگر ان کی حقیقت یہ ہے کہ وہ عربی کتابوں کے اقتباسات ہیں۔ عربی علوم اخذ کرنے کا ایک ذریعہ اور بھی تھا۔ یہ زبانی نقل کرنے کا طریقہ تھا۔ بارہویں صدی عیسوی سے لاطینی علماء جو عربی نہیں سمجھتے تھے مسلمان علماء کے نتائج علمی سے زبانی ترجمے کے ذریعے واقفیت حاصل کرتے چلے آ رہے تھے۔ وہ ان کتابوں کے یورپ میں ترجمے کے بغیر ہی ان

سے استفادہ کرتے تھے یا ایسی کتب سے مستفید ہوتے تھے جن کا ترجمہ تو ہو چکا تھا لیکن عام لوگوں سے مخفی تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اس صورت حال کا علم تھا چنانچہ احتساب کی کتابوں کی رو سے ان پر قانوناً یہ لازم تھا کہ وہ علمی کتب کو یہود و نصاریٰ کے ہاتھ فروخت کرنے سے احتراز کریں۔ بجز ایسی کتابوں کے جو ان کی شریعت سے تعلق رکھتی ہوں۔ کیونکہ وہ علمی کتابوں کا ترجمہ کر کے انہیں اپنے لوگوں اور اپنے پادریوں سے منسوب کر لیتے ہیں حالانکہ وہ مسلمانوں کی تالیف ہوتی ہیں"۔

اور آخر میں میں انتہائی اختصار کے ساتھ اس چوتھے راستے کا ذکر کروں گا جس پر سے ـــ مغربی دنیا کی طرف جاتے ہوئے ـــ مسلمانوں کے علوم کو گزرنا پڑا۔ ۱۹۵۶ء سے اب تک میں نے کئی ایسی تحقیقات کا اعادہ کیا ہے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کوپرنیکس نے سیاروں کی گردش سے متعلق اپنے نظریات ان مسلمان فلک شناسوں سے اخذ کئے تھے جو تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں ہو گزرے ہیں۔ محققین کے لئے اس امر کی وضاحت میں بڑی دشواری رہی کہ ان فلک شناسوں کی کتابیں کوپرنیکس تک کیونکر پہنچیں۔ لیکن اب ہمیں قطعی دلیل کی بنیاد پر یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ عربی فارسی سے کتابوں کے یونانی ترجمے کے لئے بحر اسود کے ساحل پر ایک مدرسہ تو طرابزون [Trebzon] میں قائم ہوا تھا اور دوسرا چودھویں صدی میں قسطنطنیہ میں قائم ہوا۔ ان دونوں مدرسوں کے لوگ ان کتابوں کی اہمیت کو سمجھتے تھے اور تازہ ترین کتب کا یونانی میں ترجمہ کر کے اپنی مغربی برادری کو بھجواتے رہتے تھے۔

میں نے کوشش کی ہے کہ اس مسئلے کا ایک عام تصور مہیا کر سکوں کہ قرون وسطیٰ سے قرون جدیدہ کی طرف آتے ہوئے عربی علوم نے ارتقائے علوم پر کیا اثر ڈالا یہ عرصہ اس مرحلے سے عبارت ہے جسے اہل یورپ نے یورپ میں تحریک احیاء کا دور یا یونانی علوم کے نئے جنم کا دور قرار دیا۔ لیکن کیا ہنوز وہ وقت نہیں آیا کہ ہم یہ سمجھ سکیں کہ یہ اصطلاح کس قدر باطل ہے اور یہ تعریف کس حد تک من گھڑت ہے۔ یہ کام یورپ کے بہتر رہنما مورخین علوم کا ہے۔ اب وہ وقت آپہنچا ہے کہ عربوں اور مسلمانوں کے علوم پر تخصص رکھنے والے محققین امر واقع کی وضاحت میں حصہ لیں۔ یہ کام بہت بڑا ہے اور ڈوف بھی "صبر و استقلال اور جہد مسلسل کا تقاضا کرتا ہے۔

(فکر و نظر (پاک) جولائی۔ستمبر ۱۹۸۳ء)

ترجمہ:- ذوالفقار علی فلاحی

کتاب الفہرست

ایک مختصر تعارف

تاریخ علوم کے اولین مصادر و مراجع میں ابن ندیم کی کتاب الفہرست کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں مختلف علوم و فنون کی کتابوں اور ان کے مؤلفین کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے اس کی حیثیت ببلیوگرافی کی بھی ہے اور بایوگرافی کی بھی۔

ابن ندیم سے نقل کرنے والوں اور اس کے سوانح نگاروں کا تقریباً اس پر اتفاق ہے کہ اس کا نام محمد بن اسحاق تھا۔ البتہ بعض لوگ اس کا نام محمد بن الندیم بتاتے ہیں۔ سوانح نگاروں نے اس کی کنیت کے سلسلے میں بھی اختلاف کیا ہے۔ بعض کے نزدیک اس کی کنیت ابوالفتح تھی اور بعض کے نزدیک ابوالفرج۔ اس کی زندگی کے بارے میں زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں۔ نہ جائے پیدائش اور انتقال کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔ صرف اندازے سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ چوتھی صدی ہجری کے ربع اول میں اس کی پیدائش ہوئی کیونکہ خود اس نے ذکر کیا ہے کہ ۳۴۰ھ میں اس کی ملاقات ایک عالم سے ہوئی جس کی کنیت ابوبکر البردعی تھی۔ ابن حجر عسقلانی نے لسان المیزان میں لکھا ہے کہ اس کی وفات ۳۸۸ھ میں ہوئی۔ اور ابن النجار نے ذیل تاریخ بغداد میں لکھا ہے کہ اس کا انتقال شعبان ۳۸۵ھ میں ہوا۔ دوسری طرف الفہرست میں ان مؤلفین کا نام بھی شامل ہے جن کی وفات اس تاریخ کے بعد ہوئی ہے جس سے شبہ ہوتا ہے کہ ابن ندیم کی وفات مابعد زمانے میں ہوئی ہے۔ لیکن ایک رائے یہ بھی ہے کہ ان مؤلفین کی سنین وفات کا اضافہ بعد کا ہے۔ ابن ندیم نے خالی جگہ چھوڑ دی تھی جسے بعد میں پُر کر دیا گیا۔

ابن ندیم کو بغدادی کہا جاتا ہے۔ یہ نہیں معلوم کہ بغداد میں پیدا ہونے کی وجہ سے یا وہاں طول اقامت کی وجہ سے۔ البتہ اس میں شبہ نہیں کہ وہ طویل عرصہ تک بغداد میں مقیم رہا۔ جہاں ابو عبداللہ بن محمد بن عمران بن موسیٰ بن سعید مرزبانی اور قاضی معافی نہروانی جو ابوجعفر طبری کے مسلک کے ایک بہت بڑے فقیہ تھے کی خدمت میں حاضری دی۔ سلیمان المنطقی سے درس لیا۔ وہ ابوالخیر خمار جو اپنے وقت کے ایک بڑے فلسفی تھے اور یحییٰ بن عدی کے دوستوں میں سے تھا۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ اپنے زمانہ میں ایک اہم ترین خدمت انجام دینے کے باوجود، جس کی وجہ سے مابعد زمانوں میں اسے بہت شہرت ملی کتب سوانح میں اس کو نظر انداز کیا گیا ہے

مثلاً ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ یہی حال دیگر کتب کا ہے۔ یاقوت الحموی نے اپنی کتاب معجم الادباء میں اس کا ذکر کیا بھی ہے تو نہایت مختصر انداز میں، جس سے مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ شاید اس کا سبب یہ ہے کہ اس کے شیعہ اور معتزلی ہونے کی وجہ سے اکثر سوانح نگاروں نے اسے نظر انداز کر دیا ہے۔

ابن ندیم اپنے والد کی طرح کاغذ سازی اور کتاب سازی کرتا تھا۔ الفہرست کے ذریعہ اس کے اس پیشے کے بارے میں معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ وہ اس کتاب میں اپنے وقت کے بہت سے کاتبوں اور کتب خانوں کے نگرانوں سے نقل کرتا ہے۔ مثلاً ابو علی بن سوار کے بارے میں لکھتا ہے کہ بصرہ میں اس نے ایک طویل عرصے تک کتب خانۂ وقف میں کام کیا ہے۔ بعض کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ ابن ندیم کاتب بھی تھا۔ ان دونوں پیشوں نے وسعتِ معلومات اور کتابوں سے محبت میں کافی اضافہ کیا۔

ابن ندیم کا تعلق تیسرے عباسی دور یا عباسی حکومت کی تیسری صدی سے تھا۔ مورخین اس دور کو اسلام کا سنہری عہد قرار دیتے ہیں۔ اس زمانے میں مختلف علوم و فنون میں خوب ترقی ہوئی اور بہت سی کتابیں وجود میں آئیں خاص طور سے لغت، تاریخ، جغرافیہ، ادب، طب اور فلسفہ میں کافی پختگی اور ترقی ہوئی۔ بغداد اس زمانے میں علم کا کعبہ اور اہل علم کے لئے زیارت گاہ بنا ہوا تھا۔

ابن ندیم کی کتاب الفہرست کے نام سے شائع ہوئی ہے لیکن مورخین نے اس کا ذکر مختلف ناموں سے کیا ہے۔ مثلاً یاقوت الحموی نے اس کا نام فہرست الکتب ابن حجر عسقلانی نے فہرست العلماء صاحب کشف الظنون نے فہرس العلوم اور اسماعیل بغدادی نے نور العلوم بتایا ہے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اسماعیل بغدادی سے کشف الظنون میں درج نام میں تحریف ہو گئی ہے۔ اور وہ فہرس العلوم سے نور العلوم ہو گیا ہے۔

ابن ندیم نے اصل کتاب میں مختلف مواقع پر ذکر کیا ہے کہ اس نے اس کی تالیف ۳۷۷ھ / ۹۸۸ء میں کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اس کی عمر تقریباً پچاس سال تھی۔ کتاب کی ابتدا ایک مختصر مقدمے سے ہوتی ہے جس میں مؤلف نے کتاب کے دائرۂ کار اور حدود کی تعیین کی ہے۔ اس کے بیان کے مطابق اس میں ان کتابوں کا تذکرہ ہے جو زمانۂ قدیم سے لے کر اس کے زمانے یعنی دسویں صدی عیسوی تک تصنیف کی گئیں۔ اس میں ان تمام کتابوں کا احاطہ کر لیا گیا ہے جو مشرقی مسلم ممالک اور عراق اور خاص طور سے بغداد میں جہاں ابن ندیم مقیم تھا، پائی جاتی تھیں۔ نیز اس میں عرب و غیر عرب مؤلفین کی ان تمام کتابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو روم، چین اور دوسرے ممالک میں پائی جاتی تھیں مگر ان کا عربی میں ترجمہ ہو گیا تھا۔ اس کتاب میں ان تمام موضوعات کا احاطہ کر لیا گیا ہے جو مؤلف کے دور میں رائج تھے خواہ وہ دینی ہوں یا غیر دینی۔ گویا اس سے ابن ندیم کا مقصود صرف ایک ببلیوگرافی تیار کرنا تھا جس میں مختلف علوم و فنون کی وہ تمام کتابیں شامل ہوں جو ۳۷۷ھ تک عربی میں لکھی گئیں تھیں یا ان کا عربی میں ترجمہ کیا گیا تھا۔

کتاب کا موضوع متعین کرنے کے بعد وہ اس کے مشتملات اور اس کی ترتیب کا ذکر کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی ترتیب اچھی نہیں ہے۔ اس کتاب کو ابن ندیم نے دس مقالات (یا ابواب) میں تقسیم کیا ہے۔ جن میں لغات اور علمائے نحو و لغت، اخبار و سیر، اشعر و شعراء، علم کلام اور متکلمین، فقہ اور فقہاء، محدثین، فلسفہ اور قدیم علوم، اسمار، خرافات، ٹونے ٹوٹکے منتر اور سحر، مذاہب و اعتقادات، ماہرین کیمیا و صنعت شامل ہیں۔

ہر باب یا مقالہ کو متعدد فنون میں اور ہر فن کو متعدد موضوعات میں تقسیم کیا ہے۔ پھر ہر موضوع کے تحت مؤلفین کا تذکرہ کیا ہے اور ہر مؤلف کے نام کے تحت اس کی تصانیف کو درج کیا ہے۔ مولفین یا ان کی تصانیف ذکر کرنے میں کوئی ترتیب ملحوظ نہیں رکھی ہے۔

ہر مقالہ کے شروع میں وہ اس موضوع کی تاریخ کا مختصر جائزہ لیتا ہے اور اس پر سب سے پہلے کتاب تصنیف کرنے والے شخص کا تذکرہ کرتا ہے۔ اس کا نام ذکر کرتا ہے۔ اس نے جن موضوعات پر کام کیا ہے اس کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ اور اس کے حالات زندگی پر روشنی ڈالتا ہے جس سے اس کی علمی صلاحیت، تاریخ پیدائش، تاریخ وفات وغیرہ کا علم ہوتا ہے۔ پھر اس مولف کی تالیفات کو سلسلہ وار ذکر کرتا ہے۔ کبھی صرف نام اور کبھی اس کے مشتملات کا اجمالی ذکر کرتا ہے۔ بسا اوقات وہ کتاب کا اصل نام ذکر کرنے کے بجائے مشہور نام کے ذکر پر ہی اکتفا کرتا ہے۔

ابن ندیم ان تمام کتابوں کا احاطہ کرتا ہے جنھیں اس نے خود دیکھا یا جن کے بارے میں پڑھا یا سنا۔ جن کتابوں کو اس نے خود دیکھا ان کے حجم اور نمایاں خصوصیات کو بیان کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کے مقام و مرتبہ پر بھی روشنی ڈالتا ہے اور ان مصادر کا بھی ذکر کرتا ہے جن سے اس کتاب میں استفادہ کیا گیا ہے۔ اگر وہ کسی شخص کے بارے میں دو جگہ تذکرہ کرتا ہے تو ایک جگہ یہ درج کر دیتا ہے کہ اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے یا آئندہ آنے والا ہے۔ ایک قابل لحاظ بات یہ ہے کہ وہ کسی رائے کو دوسری رائے پر بغیر دلیل کے ترجیح نہیں دیتا۔ اس طرح ببلیوگرافی نوعیت کے اس عمل میں اس کی دقت نظر، بیدار مغزی اور ذہانت نظر آتی ہے۔ البتہ کتاب میں بعض خامیاں بھی ہیں مثلاً اس نے بعض ایسے اشخاص کا بھی تذکرہ کیا ہے جو اصحاب تصانیف نہیں ہیں۔ اسی طرح اس نے بعض کتابوں کا نام ذکر کرنے کے بجائے انھیں ان کے مولفین کی طرف منسوب کر کے ذکر کیا ہے۔ ابن ندیم نے اپنے کتاب میں مولفین کے حالات زندگی بھی بیان کئے ہیں۔ اسی بنا پر اس کی اس کتاب کے موضوع کے بارے میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ بعض لوگ اسے ببلیوگرافی مانتے ہیں اور بعض اسے سوانح کی کتاب قرار دیتے ہیں۔

کتاب الفہرست سب سے قدیم دستاویز ہے جو اسلامی عہد زریں یعنی عہد عباسی میں اسلامی علمی ترقی کو آشکارا کرتی ہے۔ اگر یہ کتاب نہ ہوتی تو اسلامی علمی ورثہ کی بہت سی کتابوں کے نام ضائع ہو جاتے جس طرح کہ خود وہ کتابیں بیرونی حملوں کے نتیجے میں ضائع ہو گئیں۔ اور اسلامی فکر و تہذیب کی تاریخ پر کام کرنے والا ایک اطمینان بخش اور دستاویزی کتاب

سے محروم ہو جاتا۔ بلکہ کتاب الفہرست وہ بنیادی کتاب ہے جس کا بعد کے تمام فہرست سازوں نے سہارا لیا ہے۔ یقیناً یہ کتاب انسانی تاریخ میں اولین ببلیوگرافی ہے۔

مغرب کو سترہویں صدی عیسوی کے اواخر میں اس کتاب سے واقفیت ہوئی جب اس کے مخطوطات مصر سے پیرس اور قسطنطنیہ سے لیدن منتقل ہوئے۔ جرمن مستشرق گوستاف فلوجل Gustav Flugel نے اس پر تحقیق کا بیڑا اٹھایا۔ ویانا، پیرس اور لیدن سے اس کے مخطوطات جمع کرنے کے بعد اس کی اشاعت میں اسے پچیس سال لگے۔ لیکن اس کی طباعت مکمل ہونے سے قبل ہی ۱۸۷۰ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس کام کو Roedig اور Mueller نے انجام دیا۔ اور ۱۸۷۱-۷۲ء میں یہ کتاب درج ذیل نام سے شائع ہوئی

Kitab Al-Fihrist. wit AnmerKungen herg
von Gustav Flugel. nach dessen Tode besorget
von Johannes Roedins and August Mueller.
Leiphig. F.C.W. Vogel 1871-72 2u. in 1.

بلاشبہ انیسویں صدی میں یہ بہت ہی عظیم کام تھا۔ لیکن مستشرق H.Ritter کو مکتبہ کوپریلی آستانہ میں وہ اصل مخطوطات مل گئے جن سے وہ مخطوطات نقل کیے گئے تھے جن پر Flugel نے اس کتاب کی تحقیق میں اعتماد کیا تھا۔ اور اس نے یہ ثابت کیا کہ وہ مخطوطات جن پر فلوجل نے اعتماد کیا تھا، اس کتاب کی اشاعت کے لئے کمزور بنیاد فراہم کرتے ہیں اور ان اصل مخطوطات سے جن کا اس نے پتہ لگایا ہے رجوع کرنا ضروری ہے۔ فلوجل نے جن مخطوطات پر اعتماد کیا تھا ان میں سے اہم درج ذیل تھے۔

۱۔ مخطوطہ ویانا مـ ۳۳ (Wien 33) ۳۔ مخطوطہ پیرس مـ ۱۴۰۰ (Paris 1400)
۲۔ مخطوطہ ویانا مـ ۳۴ (Wien 34) ۴۔ مخطوطہ لیڈن مـ ۲۰ (Leyden XX)

Ritter نے ثابت کیا کہ مخطوطہ ویانا مـ ۳۳، مخطوطہ کوپریلی مـ ۱۱۳۴ سے منقول ہے۔ مخطوطہ ویانا مـ ۳۴ مخطوطہ کوپریلی مـ ۱۱۳۵ کے ایک جزء سے منقول ہے اور مخطوطہ لیدن مـ ۲۰ ویانا کے مخطوطہ مـ ۳۴ کی فوٹو کاپی ہے جیسا کہ فلوجل نے بھی اس کی وضاحت کی ہے۔ مخطوطہ کوپریلی مـ ۱۱۳۵ کی کتابت یوسف بن منصور نے ربیع الثانی ۶۰۰ھ میں کی تھی۔ یہ مخطوطہ الفہرست کے صرف آخری چار مقالات پر مشتمل ہے۔

رائٹر Ritter نے مخطوطہ شہید علی پاشا مـ ۱۹۳۴ کا پتہ لگایا اور مخطوطہ کوپریلی مـ ۱۱۳۴ سے جو مخطوطہ ویانا مـ ۳۳ کی بنیاد ہے، اس کا موازنہ کر کے بتایا کہ مخطوطہ کوپریلی مخطوطہ شہید علی پاشا مـ ۱۹۳۴ کی ہی نقل ہے۔ گویا مخطوطہ شہید علی اصل ہے۔ اور چونکہ مخطوطہ ویانا مـ ۳۳ بھی مخطوطہ کوپریلی مـ ۱۱۳۴ کی نقل ہے اس سے معلوم ہوا کہ اصل مخطوطے صرف دو ہیں۔ ایک مخطوطہ شہید علی پاشا مـ ۱۹۳۴ اور دوسرا مخطوطہ کوپریلی مـ ۱۱۳۵ ہے۔ ان دونوں کی روشنی میں رائٹر نے فلوجل کے محقق ایڈیشن کا موازنہ کیا تو بہت سی غلطیاں پائیں۔

مصر سے اس کتاب کا ایک ایڈیشن ۱۳۴۸ھ میں المکتبہ التجاریہ الکبری نے شائع کیا۔

اس کے شروع میں جامعۂ مصر کے ایک استاد کے قلم سے ابن ندیم کی سوانح حیات اور الفہرست کی اہمیت پر ایک فاضلانہ مقالہ بھی شامل ہے لیکن ناشر نے یہ نہیں بتلایا ہے کہ اس نے کن مخطوطات کو تحقیق کے لئے بنیاد بنایا ہے؟ کتاب کے آخر میں اس حصہ کا اضافہ ہے جسے ہوتسما Houtsma نے شائع کیا تھا جبکہ اسے پانچویں مقالہ کے شروع میں ہونا چاہئے تھا۔

المکتبۃ التجاریہ سے شائع شدہ ایڈیشن کے مقدمہ میں تذکرہ ہے کہ فلوجل نے الفہرست کی تحقیق میں مخطوطۂ پیرس، مخطوطہ کوپریلی، ویانا کے دو مخطوطوں اور مخطوطۂ لیڈن پر اعتماد کیا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ فلوجل نے مخطوطۂ کوپریلی سے مطلق استفادہ نہیں کیا ہے۔ مکتبہ خیاط بیروت نے فلوجل کے محقق ایڈیشن کو ۱۹۶۴ء میں شائع کیا۔ اس کی دوسری طباعت ۱۹۷۱ء میں تہران میں ہوئی جس کی تحقیق رضا تجدد نے کی تھی اس سلسلے میں اس نے چسٹر بیتی کے مخطوطہ ۳۳۱۵ جو جنوبی آئرلینڈ کے صدر مقام ڈبلن میں محفوظ ہے اور مخطوطہ شہید علی پاشا ۱۹۳۳ جو کتب خانہ سلیمانیہ استنبول میں ہے، کو بنیاد بنایا ہے۔ یہ دونوں نسخے سائز، تحریر اور دیگر اوصاف میں یکساں ہیں اور دونوں کو ملا کر کتاب مکمل ہوتی ہے۔ چسٹر بیتی کے مخطوطہ میں چار مکمل مقالے اور پانچویں مقالے کا ابتدائی حصہ ہے جو اب تک نہیں چھپ سکا ہے۔

شہید علی پاشا کا مخطوطہ ابو عبداللہ محمد بن زید الواسطی کی سوانح سے شروع ہوتا ہے (یعنی پانچویں مقالہ کے فن اول سے) اور اس کا خاتمہ دسویں مقالہ کے اختتام پر ہوتا ہے۔ رضا تجدد نے فلوجل کے ایڈیشن کو مقابلہ کرنے اور غلطیوں کی اصلاح کے لئے بنیاد بنایا پھر ۱۹۷۳ء میں رضا تجدد نے خود ہی اس ایڈیشن کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

ڈاکٹر بایارد دودج پرنسپل امریکن کالج بیروت نے اس کتاب کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا ہے جو دو جلدوں میں شائع ہوچکا ہے۔ موصوف نے اس نسخے کی تحقیق بھی کی ہے اور اس میں چسٹر بیتی کے مخطوطہ ۳۳۱۰ اور شہید علی پاشا کے مخطوطہ ۱۹۳۴ سے مدد لی ہے۔ یہ ایڈیشن اب علماء مغرب کا بنیادی ماخذ ہے۔ اس کو امریکہ کی کولمبیا یونیورسٹی نے شائع کیا ہے۔

●●

ماخذ:-

مجلہ المسلم المعاصر کویت

جلد ۱۴۔ شمارہ ۵۵-۵۶

جنوری تا جون ۱۹۹۰ء

آیات جلد چہارم شمارہ سوم

ستمبر تا دسمبر ۱۹۹۳ء

مولانا ظفر احمد اعظمی (ایم اے، فاضل دیوبند)

علوم قرآن منزل بہ منزل

علوم قرآن سے مراد وہ تمام علوم ہیں جن کا تعلق قرآن کریم سے ہے جیسے علم تفسیر علم قرأت، اسباب نزول و شانِ نزول کی معرفت، ناسخ و منسوخ کا علم، مکی و مدنی سورتیں، نزولِ قرآن میں سورتوں و آیتوں کی ترتیب، جمع قرآن اور اس کی کتابت اعجازِ قرآن وغیرہ وغیرہ، امور موجودہ زمانہ میں مستشرقین کے اعتراضات جو دمی اور قرآن پر ہیں ان کے جوابات، یہ سب بھی علوم قرآن کے اندر داخل ہوں گے، اس طرح علوم قرآن کا دائرہ بہت وسیع ہو جائے گا۔

لیکن یہ علم کب وجود میں آیا اور کن مراحل سے گذرتا ہوا ہم تک پہنچا اس کو جاننے کے لیے نزولِ قرآن کے وقت سے اب تک کے تمام ادوار کا مطالعہ بہت ضروری ہے، اس پورے زمانے کو پہلے ہم دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں (۱) دورِ تمہید (۲) دورِ تدوین اور اس کے مختلف مراحل۔

دورِ تمہید قرآن کریم رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا رہا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے جمع کرنے اور بیان کرنے کی ذمہ داری لے لی گئی۔

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ
فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ
(قیامہ پ ۲۹)

بے شک ہمارے ذمہ ہے اس کا جمع کر دینا اور اس کا پڑھوانا، تو جب ہم اسے پڑھنے لگیں تو آپ اس کے تابع ہو جایا کیجیے پھر اس کا بیان کر دینا بھی ہمارے ذمہ ہے۔

صحابہ کرام صحیح عربیت کا ذوق رکھنے کی وجہ سے قرآن کے مطلب، اوامر و نواہی کو اچھی طرح سمجھتے تھے، وہ یہ بھی جانتے تھے کہ آیت کا شان نزول کیا ہے اور کس واقعہ پر قرآن کی کون سی آیت نازل ہوئی، انہیں جب کسی آیت کے سمجھنے میں دشواری ہوتی تو وہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرتے اور آپ سے اس کی تفسیر معلوم کرتے چنانچہ جب قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی۔

الذین آمنوا ولم یلبسوا ایمانهم بظلم
اولئک لهم الامن وهم مهتدون (انعام ۷)

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے مخلوط نہیں کیا ایسوں ہی کے لیے تو امن ہے

تو صحابۂ کرامؓ کو تشویش ہوئی اور کہا ایسا نہیں یظلم نفسہ ہم میں کون ہے جس نے اپنے اوپر ظلم نہیں کیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ظلم سے مراد شرک باللہ ہے، چنانچہ قرآن کی دوسری آیت میں ہے اِنَّ الشرک لظلمٌ عظیمٌ بلاشبہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

اس طرح عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں علوم قرآن کی تدوین کی کوئی حاجت نہیں تھی، پھر یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی اکثریت ناخواندہ تھی، کہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے اور ان کے علم کا سارا دار و مدار قوتِ حافظہ پر تھا، نیز یہ بات بھی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کو قرآن کے علاوہ دوسری چیزوں کے لکھنے سے منع کر دیا تھا کہ مبادا قرآن کے ساتھ کسی دوسری چیز کا اختلاط ہو جائے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

لا تکتبوا عنی ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ وحدثوا عنی ولا حرج ومن کذب علیّ متعمدا فلیتبوا مقعدہ فی النار۔ میری طرف سے قرآن کے علاوہ دوسری چیزوں کو مت لکھو جس نے قرآن کے علاوہ مجھ سے کچھ لکھا ہے تو اس کو مٹا دے، میری طرف سے بیان کرو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور جس نے قصداً میری طرف سے جھوٹ کہا تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔

اس طرح عہدِ رسالت میں علوم قرآن کا دار و مدار ایک دوسرے سے تلقی اور سماع پر رہا، ابتدائی تدوین قرآن عہدِ صدیقی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے ہوا، پھر جب حضرت عثمانؓ کے زمانۂ خلافت میں عرب عجم کا اختلاط زیادہ ہوا تو انہوں نے اسی مصحف صدیقی کی مختلف نقلیں کرا کر مختلف ملکوں کو روانہ کر دیں، اور یہ حکم بھی جاری فرما دیا کہ اس کے علاوہ جو قرآن کے نسخے ہوں انہیں جلا دیا جائے، مبادا امت میں اس کی وجہ سے اختلاف پیدا ہو، یہ حضرت عثمانؓ کی فراست ایمانی تھی جو کہ انہوں نے یہ حکم دیا۔

ہمارے موضوع سے متعلق یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کتابت کے سلسلے میں بعض بنیادی چیزیں بتائیں، جنہیں بعد میں چل کر علم رسم قرآن یا علم رسم عثمانی کے نام سے موسوم کیا گیا، اسی طرح پر حضرت عثمانؓ کو علم رسم قرآن کا موسس یا واضع کہا جا سکتا ہے۔ نیز حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ابو الاسود الدولی (متوفی ۶۹ھ) کو عربی زبان کی سلامت و صحت کے لیے بعض قواعد کو مرتب کرنے کو کہا تو اس بناء پر حضرت علیؓ کو علم اعراب قرآن کا موسس کہا جا سکتا ہے۔

اسی طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ علوم قرآن کے واضعین اور موسسین میں مندرجہ ذیل حضرات ہیں۔

(۱) خلفائے اربعہ، ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ، زید بن ثابتؓ، ابی بن کعبؓ، ابو موسیٰ اشعریؓ اور عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم صحابۂ کرام میں سے۔

(۲) مجاہد، عطاء بن یسار، عکرمہ، قتادہ، حسن بصری، سعید بن جبیر، اور زید بن اسلم رحمہم اللہ یہ سب تابعین میں سے ہیں۔
(۳) اور تبع تابعین میں سے حضرت مالک بن انس کو کہا جا سکتا ہے، جنہوں نے حضرت زید بن اسلم سے یہ علم حاصل کیا۔

یہ تمام حضرات ان علوم کے بانی اور مؤسس ہیں جنہیں اب ہم علم تفسیر، علم اسباب نزول، علم مکی و مدنی، علم ناسخ و منسوخ، علم غریب القرآن کے نام سے موسوم کرتے ہیں، یا مجموعی طور پر علوم قرآن کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

۲۔ دور تدوین

دور تدوین کو ہم نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور دوسری صدی ہجری پر ختم ہوتا ہے اس دور میں علم تفسیر کے علاوہ دوسرے علوم قرآن شروع نہیں ہوئے تھے۔ دوسرا دور: تیسری صدی ہجری سے شروع ہوتا ہے، جب تفسیر کے علاوہ دوسرے علوم قرآن کی بھی تدوین شروع ہوئی، یہ دور آٹھویں صدی ہجری پر ختم ہوتا ہے، اس میں ہر صدی کی مشہور کتابوں کا ذکر ہے جو اس موضوع پر لکھی گئیں۔ تیسرا دور: آٹھویں صدی ہجری سے شروع ہو کر نویں صدی ہجری پر ختم ہوتا ہے، اس دور میں علوم قرآن میں بہت سے جدید علوم داخل ہوئے جیسے امثال القرآن اور جدل القرآن وغیرہ۔ چوتھا دور: دسویں صدی ہجری سے شروع ہوتا ہے اور موجودہ زمانہ کو بھی شامل ہے، یہ دور اخیر ہے۔

الف: پہلا دور

جب علوم کی تدوین کا دور شروع ہوا تو سب سے پہلے علم تفسیر کو مدون کیا گیا کہ وہ تمام علوم قرآنیہ کی اصل اور بنیاد ہے، دوسری صدی ہجری کے جن علماء کرام نے اس فن کی طرف توجہ کی اور اس میں کتابیں تصنیف کیں، ان میں سر فہرست شعبہ بن الحجاج، محدث بصرہ، سفیان بن عیینہ جو اہل حجاز کے تفسیر و حدیث میں امام کہلاتے ہیں، اور وکیع بن الجراح جو عبد اللہ بن المبارکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے استاد ہیں۔ ان حضرات نے علم تفسیر سے شغف رکھا، ان کی تفسیرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے اقوال و آراء کی جامع ہیں، پھر انہیں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ابن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ) نے اپنی تفسیر لکھی، جس میں احادیث صحیحہ، اعراب، استنباط و مسائل کا ذکر کیا وہ نہج جس کو ابن جریر طبری اور اس سے پہلے کے مفسرین نے اختیار کیا یعنی صحابہ کرام اور تابعین کے اقوال و آراء اکتفا کیا تفسیر کے اس طرز کو تفسیر بالماثور کہا جاتا ہے، اسی دور میں تفسیر کا دوسرا نہج بھی شروع ہوا جس کو تفسیر بالرائے کہا جاتا ہے، پھر قرآن کی مختلف تفسیریں لکھی گئیں کسی نے مکمل قرآن کی تفسیر لکھی کسی نے ایک جزء ایک سورہ کی اور کسی نے خاص خاص آیتوں کی مثلاً تفسیر آیات الاحکام جس کو تفسیر موضوعی بھی کہا جاتا ہے۔

ب: دوسرا دور

اس دور میں تفسیر کے علاوہ دوسرے علوم قرآن کی تصنیف و تالیف ہوئی اور علماء کرام نے خاص طور پر اس کی طرف توجہ کی۔

(۱) چنانچہ تیسری صدی ہجری میں علی بن المدینی جو امام بخاری کے شیخ ہیں انہوں نے اسباب نزول پر، اور ابو عبید القاسم بن سلام نے ناسخ و منسوخ اور قرأت و فضائل قرآن پر لکھا اور محمد بن ایوب الضریس (۲۹۴ھ) نے مکی و مدنی سورتوں کے بارے میں لکھا، اور محمد بن خلف بن المرزبان (۳۰۹ھ) نے اپنی کتاب الحاوی فی علوم القرآن تصنیف کی، ابن ندیم نے الفہرست میں اس کا ذکر کیا ہے کہ یہ ۲۷ اجزاء پر مشتمل ہے۔

واضح رہے کہ قرآن کے متعلق سارے علوم کے لیے "علوم القرآن" کا لفظ بطور اصطلاح کے سب سے پہلے محمد بن خلف بن المرزبان نے اپنی کتاب، الحاوی فی علوم القرآن میں استعمال کیا ہے۔

(۲) چوتھی صدی ہجری میں ابو بکر محمد بن القاسم الانباری (۳۲۸ھ) نے "عجائب علوم القرآن" تالیف کی جس میں فضائل قرآن، قرآن کا سات حرفوں پر نزول، مصاحف کی کتابت سورتوں اور آیتوں کی تعداد نیز کلمات قرآنی کی تعداد پر بحث لکھی، ابو الحسن اشعری نے ایک عمدہ کتاب المختزن فی علوم القرآن کے نام سے لکھی، ابو بکر السجستانی نے فی غریب القرآن اور ابو محمد القصاب محمد بن علی الکرخی نے نکت القرآن الدالۃ علی البیان فی انواع العلوم والاحکام المنبئۃ عن اختلاف الانام۔ لکھی اور محمد بن علی الادفوی (۳۸۸ھ) نے الاستغناء یا الاستغناء فی علوم القرآن" بیس جلدوں میں لکھی۔

(۳) پانچویں صدی ہجری میں علی بن ابراہیم بن سعید الحوفی نے البرھان فی علوم القرآن" اور اعراب القرآن" دو کتابیں تصنیف کی ہیں، ابو عمر الدانی (۴۴۴ھ) نے التیسیر فی القراءات السبع" اور المحکم فی النقط لکھی۔

(۴) چھٹی صدی ہجری میں ابو القاسم عبد الرحمن جو السہیلی کے نام سے مشہور ہیں، انہوں نے ایک کتاب "مبہمات القرآن" لکھی، حاجی خلیفہ نے اپنی کتاب کشف الظنون میں اس کا نام التعریف والاعلام بما ابھم فی القرآن من الاسماء والاعلام بتایا ہے، نام سے کتاب کی غرض و غایت بھی معلوم ہو جاتی ہے، علامہ ابن الجوزی نے بھی دو کتابیں فنون الافنان فی عجائب القرآن، اور المجتبیٰ فی علوم متعلق بالقرآن لکھیں۔

(۵) ساتویں صدی ہجری میں ابن عبد السلام المعز (۶۶۰ھ) نے مجاز القرآن کے متعلق ایک کتاب لکھی اور علم الدین سخاوی (۶۴۳ھ) نے جمال القراء و کمال الاقراء، ابو شامہ (۶۶۵ھ) نے المرشد الوجیز فیما یتعلق بالقرآن العزیز لکھی۔

(ج) تیسرا دور

اس دور میں سابقہ علوم قرآن کے ساتھ ساتھ علوم قرآن سے متعلق کچھ نئے گوشے رونما ہوئے جیسے بدائع القرآن، حجج القرآن اقسام القرآن اور امثال القرآن وغیرہ بدیع کے جو انواع قرآن کریم میں وارد ہوئے ہیں اس موضوع پر ابن ابی الاصبع نے ایک مستقل کتاب لکھی۔ حجج القرآن یا علم جدل القرآن یعنی قرآن میں براہین اور دلائل کے جو انواع مذکور ہیں اس موضوع پر نجم الدین طوفی (۷۱۶ھ) نے ایک کتاب لکھی۔ اقسام القرآن پر متقدمین علماء میں سے ابن القیم نے اور متاخرین علماء میں سے مولانا حمید الدین فراہی نے اپنی کتاب امعان فی اقسام

القرآن لکھی، امثال القرآن کی بہت سی مثالیں الاتقان فی علوم القرآن جو علامہ سیوطی کی ہے اس کی ۶۰ ویں نوع میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

آٹھویں صدی ہجری میں بدرالدین زرکشی (۷۹۴ھ) نے البرہان فی علوم القرآن لکھی جو استاذ محمد ابو الفضل ابراہیم کی تحقیق کے ساتھ چار جلدوں میں شائع ہوئی۔

نویں صدی ہجری میں جلال الدین البلقینی نے مواقع العلوم فی مواقع النجوم تصنیف کی، پھر جلال الدین سیوطی (۹۱۱ھ) نے التحبیر فی علوم التفسیر اور الاتقان فی علوم القرآن لکھی، مؤخر الذکر کتاب میں البرہان فی علوم القرآن علامہ زرکشی سے بڑی حد تک مدد لی گئی ہے۔

(د) چوتھا دور

نویں صدی ہجری کے بعد سے شروع ہوتا ہے، پھر بہت سے علماء نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور مختلف تصنیفات اس موضوع پر دنیا کے سامنے آئیں، کسی نے تاریخ قرآن پر لکھا اور کسی نے علوم القرآن اور متعلقات قرآن پر، شیخ طاہر الجزائری نے البیان لبعض المباحث المتعلقة بالقرآن، شیخ محمد جمال الدین القاسمی نے محاسن التاویل، شیخ محمد عبد العظیم زرقانی نے مناہل العرفان فی علوم القرآن، اور شیخ محمد علی سلامہ نے منہج الفرقان فی علوم القرآن اور عربی زبان و ادب کے استاذ کبیر مصطفےٰ صادق الرافعی نے اعجاز القرآن اور استاذ سید قطب نے التصویر الفنی فی القرآن، استاذ مالک بن نبی نے الظاہرۃ القرآنیۃ لکھی جس میں مسئلہ وحی پر بہت عمدہ بحث کی ہے۔

علامہ رشید رضا مصری تفسیر القرآن الحکیم جو تفسیر منار کے نام سے جانی جاتی ہے اس میں بھی علوم قرآن پر بہت کچھ مواد موجود ہے، جدید کتابوں میں ڈاکٹر محمد عبد اللہ دراز کی دو کتابیں النبأ العظیم اور نظرات جدیدۃ فی القرآن محمد الغزالی کی کتاب نظرات فی القرآن اور استاذ محمد المبارک عمید کلیۃ الشریعہ جامعہ دمشق کی کتاب المنہل الخالد، ڈاکٹر مناع القطان کی کتاب مباحث فی علوم القرآن، ڈاکٹر صبحی الصالح کی کتاب مباحث فی علوم القرآن، شیخ محمد علی الصابونی کی کتاب التبیان فی علوم القرآن قابل ذکر ہیں۔

امت اسلامیہ کا دائرہ وسیع ہونے کی وجہ سے عربی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی اس موضوع پر کتابیں وجود میں آئیں، ہمارے ہندوستانی علماء میں سے شاہ ولی اللہ دہلوی کی کتاب الفوز الکبیر جو اصلاً فارسی زبان میں لکھی گئی ہے وہ علوم قرآن ہی کے موضوع پر ہے، ابھی چند سال ہوئے اس کی عربی زبان میں مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری استاذ دار العلوم دیوبند نے العون الکبیر کے نام سے بہت عمدہ شرح لکھی ہے۔

موجودہ زمانہ میں علوم قرآن کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے، سائنس و ٹکنالوجی کی وجہ سے بہت سی چیزوں کا انکشاف اور مختلف چیزوں کی تسخیر دنیا کے سامنے آئی تو بہت سے لوگوں نے قرآن اور تسخیر کائنات کے

موضوع پر قلم اٹھایا۔ ان ساری بحثوں کو علوم قرآن ہی کے دامن میں جگہ ملنی چاہیئے۔ ایسے ہی اعدائے اسلام نے جو قرآن کے اوپر اعتراضات کئے ہیں اور علمائے اسلام نے ان کے مختلف زبانوں میں جوابات دیئے ہیں۔ یہ ساری بحثیں بھی علوم قرآن سے متعلق سمجھی جائیں گی۔ اس طرح علوم قرآن کا دامن وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جائے گا۔

یہ علوم قرآن کے متعلق چند سطریں ہیں۔ اس کا مقصود اس موضوع پر لکھی گئی ساری کتابوں کا استقصاء یا احاطہ نہیں ہے، اور یہ اس جیسے چھوٹے مضمون میں ممکن بھی نہیں۔ مقصد صرف یہ ہے کہ ہمیں معلوم ہو کہ یہ علم ہم تک کن مراحل سے گذرتا ہوا پہنچا ہے اور علمائے اسلام نے اس ایک موضوع پر کس طرح کتابیں لکھی ہیں۔ اور امت اسلامیہ کبھی بھی ایسے علماء کرام سے خالی نہیں رہی ہے۔

(الحق، اکتوبر ۹۳ء)

انگلستان اور عربی علوم وفنون-۱

پروفیسر برنارڈ لوئیس بزرگ مستشرق ہیں۔ وہ کافی عرصہ یونیورسٹی آف لندن میں "مشرقِ وسطیٰ کی تاریخ" کے استاد رہنے کے بعد ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی پرنسٹن یونیورسٹی سے منسلک رہے ہیں۔ انھوں نے اسلام، اسلامی تاریخ اور اسماعیلی شیعیت کے ساتھ ترکی اور مشرقِ وسطیٰ پر متعدد کتب اور مقالات لکھے ہیں۔ "کیمبرج ہسٹری آف اسلام" کے مرتبین میں شامل ہیں، تاہم وہ مستشرقین کے اُس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو اسلام اور مشرق کے بارے میں وسیع القلبی پیدا نہیں کر سکا۔ ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ انھوں نے بی۔ بی۔ سی (لندن) کے عربی پروگرام میں "انگلستان اور عربی علوم وفنون" کے موضوع پر چھ تقریریں نشر کی تھیں۔ اسی زمانے میں انگریزی متن British Contributions to Arabic Studies [لندن: لانگ مینز (۱۹۴۱ء)] اور عربی ترجمہ شائع ہو گیا تھا۔ شعبۂ اطلاعات حکومتِ ہند نے اردو ترجمہ جید برقی پریس (دہلی) سے شائع کیا تھا جو اب شاذ ہی نظر آتا ہے۔ یہ کمیاب کتابچہ جہاں اس لحاظ سے اہم ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے دوران میں برطانوی ذرائع ابلاغ اور اُن کی پالیسیوں کو سمجھنے میں اس سے مدد ملتی ہے، وہیں اس سے مؤلف پروفیسر لوئیس کی علمی دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ ۱۹۴۰ء میں انھوں نے جس موضوع پر نشری تقاریر لکھیں، وہی ۱۹۸۲ء میں زیادہ تفصیل کے ساتھ اُن کی تالیف The Muslim Discovery of Europe [نیویارک: ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ نارٹن] میں زیرِ بحث آیا ہے۔

"عالم اسلام اور عیسائیت" کی ضخامت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ کتابچہ — "انگلستان اور عربی علوم وفنون" — ایک ہی اشاعت میں پیش کر دیا جائے، لہٰذا زیرِ نظر شمارے میں اس کا ابتدائی نصف حصہ پیش کیا جاتا ہے۔ مدیر

قرونِ وسطیٰ

ایک مدت تک محققین کا یہ خیال رہا کہ اسلامی اور فرنگی تہذیبیں پہلے پہل ایک دوسرے سے خاص طور پر صلیبی لڑائیوں کے سلسلہ میں روشناس ہوئیں۔ یہ واقعہ ہے کہ یہی پہلا موقع تھا جب عربی مشرق اور عیسائی مغرب میں گہرا تعلق پیدا ہوا اور یقیناً دونوں ایک دوسرے کی تہذیب سے مستفید بھی

ہوئے، مگر زمانۂ حال کی تاریخی تحقیقات سے یہ بات ظاہر ہو گئی ہے کہ یہ باہمی استفادہ اثر و وسعت کے لحاظ سے بہت محدود تھا جیسا کہ اس واقعہ کی نمایاں فوجی نوعیت پر نظر کرتے ہوئے اسے ہونا بھی چاہیے تھا۔ مغرب میں عموماً اور انگلستان میں خصوصاً عربی علوم و افکار کے پہنچنے کا ایک دوسرا ہی ذریعہ تھا۔

شمالی افریقہ کو فتح کرنے کے بعد فاتح عرب نصرت و کامرانی کے پرچم اڑاتے ہوئے یورپ تک نکل آئے اور ایک عرصہ تک ان کی نو آبادیاں بحیرۂ روم کے خطہ کے دو اہم علاقوں میں قائم رہیں۔ عربوں نے اسپین اور صقلیہ (سسلی) میں ایک ایسی شاندار تہذیب کی بنیاد رکھی جو اس وقت کے تمام عیسائی ممالک کی تہذیب سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھی۔ یہ تہذیب اپنی ہم عصر عیسائی تہذیبوں پر اثر انداز ہو کر رہی۔ اس وقت بھی جب کہ یہ علاقے پھر عیسائیوں کے ہاتھ آ گئے، کچھ عرصہ تک وہاں عربی علوم و فنون کا ویسا ہی چرچا رہا۔ عیسائی بادشاہ خود عربی زبان بولتے اور عرب علماء کی امداد کرتے رہتے تھے۔ ابتدا ہی سے عربوں کی برتر و اعلیٰ تہذیب کے اثرات فرنگی ممالک میں پہنچنے لگے۔ اسپین کے عربی بولنے والے عیسائی اس اثر کو آگے بڑھانے کا اہم ذریعہ ثابت ہوئے اور اسپین اور سسلی کے عربی بولنے والے یہودیوں نے بھی جن کی زبان ان کے ہم مذہب فرنگیوں کی طرح عبرانی تھی، مغرب میں عربی علوم و فنون کو پھیلانے میں بہت مدد دی۔ ہم اس سلسلہ میں ایک ہسپانوی یہودی فلسفی اور عالم ابراہیم بن عزرا کا خاص طور پر ذکر کریں گے۔ یہ شہر طولیدو کا رہنے والا تھا۔ اس نے ۵۹-۱۱۵۸ء میں لندن کا سفر کیا اور کچھ دنوں وہاں تعلیم و تدریس کا کام بھی انجام دیا۔ اسی طرح ایک انگریز ٹامس براؤن (Thomas Brown) کا ذکر بھی کر سکتے ہیں جو سسلی میں قاضی تھا اور عربی دستاویزات میں اسے "قاضی برون" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

بارہویں صدی میں شمالی ممالک خصوصاً انگلستان کے علماء طلبِ علم کی غرض سے اسپین کی عرب یونیورسٹیوں میں آنے لگے۔ ان علماء میں پہلا اور بزرگ ترین عالم شہر باتھ (Bath) کا رہنے والا انگریز ایڈیلارڈ (Adclard) تھا۔ یہی شخص تھا جس نے مغرب میں عربی علوم و فنون کے پھیلانے میں پہل کی۔ بارہویں صدی کے ربع اوّل میں ایڈیلارڈ نے عربی زبان اور عربی علوم حاصل کرنے کی غرض سے طول طویل سفر کیے۔ اس نے اپنے ہم عصر عیسائیوں کے لیے بہت سی عربی کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا اور واپسی پر انگلستان کے ہونے والے بادشاہ ہنری ثانی کے اتالیق کی حیثیت سے خدمت انجام دی بلکہ اس نے اپنی ایک کتاب بھی شاہ ہنری کے نام معنون کی۔ اس کی اہم ترین تصنیف Natural Questions (مسائل طبیعیہ) ایڈیلارڈ اور اس کے بھتیجے کے درمیان ایک مکالمہ کی صورت میں ہے۔ بھتیجے نے فرنگیوں کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی تھی اور ایڈیلارڈ نے عربوں کے یہاں۔ اس مکالمہ کے ذریعہ انھیں دو مختلف اصولوں اور نظریوں میں باہم مقابلہ کیا گیا ہے۔ ایڈیلارڈ اس کتاب کے مقدمہ میں لکھتا ہے کہ "میں عربوں کے نظریہ کی حمایت کروں گا۔ خود اپنی شخصی رائے

پیش نہ کروں گا۔ پھر اُس نے نہایت تفصیل کے ساتھ "عرب طریقہ" کی برتری بیان کی اور اپنے اثر کو کام میں لا کر مغرب میں اسی طریقہ کے پھیلانے میں بہت مدد دی۔ اس نے علم ہیئت اور ریاضی کی بہت سی عربی کتابوں کا ترجمہ کیا اور اس طرح یورپ میں اِن علوم کو ترقی دی۔

ایڈیلارڈ کے بعد بہت سے دوسرے انگریز علماء اسپین گئے۔ شہر چسٹر (Chester) کے ایک شخص رابرٹ (Robert) نے بھی بارہویں صدی میں علم ریاضی حاصل کیا اور عربی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ ڈینیل آف مورلے (Daniel of Morley) بھی اُس زمانہ کی قابلِ ذکر شخصیتوں میں سے تھا جیسا کہ وہ خود اپنے متعلق بیان کرتا ہے۔ اسے فرنگی یونیورسٹیاں پسند نہ تھیں اس لیے وہ "دنیا کے زیادہ بالغ نظر حکماء کی تلاش میں" اسپین گیا۔ یہاں سے وہ کتابوں کا ایک ذخیرہ ساتھ لے کر واپس آیا جسے پڑھنے والوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ تیرہویں صدی میں میکائیل اسکاٹ (Michael Scot) نے سسلی میں تعلیم پائی اور عربی اور عبرانی زبانوں میں دستگاہ حاصل کی۔ اُس نے ارسطو کی تصنیفات کا عربی سے ترجمہ کیا اور اس طرح ان میں سے بہت سی کتابوں سے مغرب پہلے پہل روشناس ہوا۔ اُس نے ارسطو کی تصنیفات کی عربی شرحوں کا بھی ترجمہ کیا اور خود علم ہیئت اور علم کیمیا پر بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔

ان علماء اور اِن کے علاوہ ان دوسرے حوصلہ مند انگریزوں کی تصنیفات کا جنھوں نے تحصیلِ علم کی خاطر مصائب برداشت کر کے عربی ممالک کا سفر اختیار کیا، تہذیب پر بہت اثر پڑا۔ یہ انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ انگلستان ہی نہیں بلکہ سارا مغرب علوم و فنون کے ان کارناموں سے واقف ہوا جو عربوں نے انجام دیے۔ یہ ایک اہم قدم تھا جس نے یورپ کی تہذیب کو آگے بڑھایا۔ ان تراجم اور تصانیف کا بہت زیادہ اثر ہوا۔ عربی علوم سے جو لوگ بہت زیادہ متاثر ہوئے، ان میں انگلستان کے بلند پایہ فلسفی راجر بیکن (Roger Bacon) اور مشہور شعراء چاسر (Chaucer) اور لڈگیٹ (Lydgate) بھی تھے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ (Dicts And Sayings of the Philosophers) جو اس سلسلے میں انگلستان میں شائع ہونے والی پہلی کتاب ہے اور ۱۴۷۷ء میں طبع ہوئی تھی، ایک عربی تالیف "کتاب مختار الحکم و محاسن الکلم" سے ماخوذ تھی جسے مصر کے امیر مبشر بن فاتک نے ۱۰۵۳ء میں تالیف کیا تھا۔ یہ عربی کتاب ہنوز غیر مطبوعہ ہے مگر اس کا قلمی نسخہ ہالینڈ میں موجود ہے۔ یہ کتاب فلسفیانہ اقوال و امثال پر مشتمل ہے اور ایک زمانہ میں مشرق میں بہت مقبول تھی۔ اس کا ترجمہ یورپ کی بہت سی زبانوں میں ہوا۔

قرونِ وسطیٰ کے یورپ پر عرب ہم عصروں اور ان کے مغربی ترجمانوں کا دو گونہ احسان ہے۔ پہلا احسان تو یہ کہ یورپ کو یونانی علوم و افکار کے اس گراں مایہ ترکہ کا بڑا حصّہ عربوں ہی کے ہاتھوں پہنچا جسے مغرب تو گنوا چکا تھا مگر عربوں نے محفوظ رکھا اور بڑھایا۔ دوسرا احسان یہ ہے کہ یورپ نے عربوں سے تحقیق کا ایک نیا طریقہ سیکھا جس نے عقل (Reason) کو سند (Authority) پر ترجیح دے کر

آزادانہ تحقیق و تجربہ کی اہمیت پر زور دیا۔ یہی وہ دو سبق تھے جنھیں سیکھ لینے کی وجہ سے بہت بڑی حد تک قرونِ وسطیٰ کے دور کا خاتمہ ہو گیا اور دورِ احیاءِ علوم (Renaissance) کا آغاز ہوا اور جدید یورپ عالمِ وجود میں آیا۔ انگریز علماء نے ان سبقوں کو دوسروں تک پہنچانے کے سلسلے میں اہم خدمات انجام دیں۔ یہ ایک تاریخی حادثہ ہے کہ ٹھیک اس زمانہ میں عربوں نے وہ باتیں جو انھوں نے یورپ کو سکھائی تھیں، خود بھلانی شروع کر دیں اور کئی صدیوں بعد انھیں پھر سیکھنی پڑیں۔

آیئے اس تقریر کے خاتمہ پر شہر باتھ کے ایڈیلارڈ سے سنیں کہ وہ اپنے بھتیجے سے اس نئے طریق کے متعلق جو اس نے اسپین میں سیکھا تھا، کیا کہتا ہے۔ یہ واضح رہے کہ یہ تحریر آٹھ سو برس پرانی ہے۔

> "میں نے عقل کو اپنا رہبر بنا کر اپنے عرب اُستادوں سے کچھ اور سیکھا ہے مگر تمھیں کچھ اور سکھایا گیا ہے۔ تمھاری آنکھیں سند کی ظاہری عظمت سے خیرہ ہو جاتی ہیں اور تم اپنے منہ پر دہانہ چڑھا لیتے ہو۔ آخر سند کو دہانہ نہ کہیں تو اور کیا کہیں؟ جس طرح وحشی درندوں کے منہ پر دہانہ چڑھا کر جہاں چاہتے ہیں، لے جاتے ہیں اور وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ انھیں کہاں اور کیوں لے جایا جا رہا ہے کیونکہ وہ تو اپنی اُس ڈوری سے جس میں وہ بندھے ہوتے ہیں، کھنچے چلے جاتے ہیں۔ ٹھیک اُسی طرح تم میں سے بہت سے ضعیف الاعتقاد لوگ اپنے بھولے پن اور اندھی تقلید کی وجہ سے مصنفین کی سند سے مرعوب ہو کر ٹھوکریں کھاتے ہیں --- افراد کو اسی لیے تو عقل عطا کی گئی ہے کہ وہ اسے حکم قرار دے کر حق و باطل میں امتیاز کر سکیں --- ہمیں سب سے پہلے عقل و خرد کی تلاش کرنی چاہیے اور جس وقت وہ دستیاب ہو جائے (صرف اسی وقت اس سے پہلے نہیں) اس کی تائید میں اگر مل جائے تو سند بھی قبول کر لینی چاہیے۔ سند بذات خود فلسفی کے اعتماد کے لیے کافی نہیں اور نہ اسے اس غرض سے استعمال کرنا چاہیے۔"

جو لوگ عربوں کی تحریروں سے واقف ہیں اور ایڈیلارڈ کے اس سبق کے ماخذوں کو اور جو لوگ مغربی علوم کا کچھ علم رکھتے ہیں وہ اس کی اہمیت کو فوراً تاڑ لیں گے۔

استشراق کی ابتداء

پہلی تقریر میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ کس طرح قرونِ وسطیٰ میں انگریز علماء عربوں سے علم حاصل کرنے اسپین اور سسلی گئے اور کس طرح انھوں نے اپنے حاصل کردہ علم کو انگلستان واپس آ کر پھیلایا۔ اب ہم ایک نئی ترقی کا ذکر کرتے ہیں جو تحصیل علومِ عربیہ کے سلسلے میں رونما ہوئی یعنی اُن علماء کا ظہور

جنھیں حال کی اصطلاح کے مطابق اوّلین مستشرقین کہا جا سکتا ہے۔ جس دور کا ہم نے پچھلی صحبت میں مطالعہ کیا ہے اور جس دور سے اس وقت بحث ہے ان دونوں کے درمیان جو عرصہ گزرا، اس میں بہت سے تغیرات پیش آئے۔ اس عرصہ میں یورپ نے تو علوم و فنون میں بہت ترقی کر لی مگر عرب اپنا پچھلا تفوق بھی کھو بیٹھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب یورپ کے طلباء کو اس کی ضرورت نہ رہی کہ وہ عربی علوم و فنون کی تحصیل کے لیے عرب اساتذہ کی جستجو کریں۔ اس طرح استشراق کی ایک نئی قسم ظاہر ہوئی جس نے علوم شرقیہ کی جدید تحقیقات کا دروازہ کھولا۔ آج انگریز طلبہ اس غرض سے عربی نہیں پڑھتے کہ وہ عربی علماء سے علوم و فلسفہ میں سبق لیں بلکہ محض عربی زبان حاصل کرنے کی غرض سے پڑھتے ہیں۔ چنانچہ اب انگریزوں نے پہلے پہل سنجیدگی کے ساتھ عربی زبان و ادب کا مطالعہ شروع کیا۔ انھوں نے اس سلسلہ میں جو خدمات انجام دیں وہ عربوں اور فرنگیوں دونوں کے لیے اسی طرح سود مند ثابت ہوئیں جس طرح حال کے مستشرقین کی خدمات۔ عربی لغات اور کتب صرف و نحو تالیف کی گئیں۔ عربی کتابوں کے قلمی نسخے مشرق میں طبع ہونے سے بہت پہلے آراستہ و پیراستہ کر کے طبع کیے گئے۔ عرب کی تاریخ اور عربی ادب کے متعلق تحقیقات کا سلسلہ شروع ہوا اور اسی طرح کے دوسرے کام انجام دیے گئے۔ یہ تحریک سترہویں صدی عیسوی سے شروع ہوئی۔ اسی صدی میں انگلستان کی دو بڑی یونیورسٹیوں یعنی کیمبرج اور آکسفورڈ میں عربی پڑھانے کا خاص انتظام کیا گیا اور اس غرض سے انگریز پروفیسر مقرر ہوئے کہ وہ شوقین طلبہ کو عربی زبان سکھائیں۔ اس زمانہ میں پہلے پہل انگلستان میں عربی کتابیں طبع ہوئیں۔ ہم اس موقع پر ان شخصیتوں کا ذرا زیادہ تفصیل سے ذکر کریں گے جنھوں نے سب سے پہلے اس کام میں حصہ لیا۔

وہ شخص جسے عام طور پر انگلستان میں "تحصیل علوم شرقیہ کا باوا آدم" مانا جاتا ہے، ولیم بیڈویل (William Bedwell) تھا۔ یہ ۱۵۶۱ء سے ۱۶۳۲ء تک زندہ رہا۔ اس کا ایک دلچسپ مقالہ آج بھی موجود ہے جس میں اس نے عربی زبان کی اہمیت اور اس کے حاصل کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ اس نے عربی زبان کے متعلق لکھا ہے۔ "یہی ایک زبان ہے جسے دینی تقدس حاصل ہے اور جو جزائر کینیری (الجزائر السعیدہ) سے ملک چین تک سیاسی معاملات اور کاروبار کی خاص زبان سمجھی جاتی ہے۔" بیڈویل کو اپنے زمانے میں کافی شہرت حاصل تھی اور وہ تمام یورپ میں علوم عربیہ کے ماہر کی حیثیت سے مشہور تھا۔ اس کی خاص تالیف ایک ضخیم عربی لغت ہے جو سات جلدوں میں ہے اور بدقسمتی سے ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ اس کی مطبوعہ کتابوں میں بعض عربی نسخے ہیں جو لندن میں طبع ہوئے اور بعض علوم قرآنی کے متعلق تحقیقی رسالے ہیں۔ اس نے ان عربی الفاظ کی ایک لغت بھی تیار کی جو بیزنطینی زمانہ سے خود اس کے زمانے تک مغربی زبانوں میں مستعمل چلے آ رہے تھے۔

اس زمانے کی ایک اور نمایاں شخصیت اڈمنڈ کیسٹل (Edmund Castell) ہے جو کیمبرج

یونیورسٹی کے اولین عربی اساتذہ میں سے تھا اور ۱۶۰۶ء سے ۱۶۸۵ء تک زندہ رہا۔ اس کی زندگی کا اہم ترین کارنامہ سامی زبانوں کی ایک مشترکہ لغت ہے جس کی تالیف میں اس نے اپنی زندگی کے اٹھارہ سال صرف کیے۔ یہ لغت پہلے پہل ۱۶۶۹ء میں شائع ہوئی۔ مؤلف نے اس لغت کے دیباچہ میں خود اپنے متعلق لکھا ہے۔ "کم از کم ۱۶ یا ۱۸ گھنٹے روزانہ کام کر کے اور جسمانی تکالیف اور مالی نقصانات اٹھا کر کوئی اٹھارہ سال کی شبانہ روز محنت کے بعد" اس نے یہ لغت تالیف کی۔ یہ لغت جو اپنی نوعیت کی پہلی لغت تھی، بہت اہمیت رکھتی تھی اور انگلستان اور یورپ میں متعدد بار طبع ہوئی۔ اس کے علاوہ کیسٹل کی دوسری کتابوں میں تحصیل علوم عربیہ کی قدر و قیمت کے متعلق ایک رسالہ، ابن سینا کی شرح اور عربی طبع زاد نظموں کا ایک مجموعہ ہے جو انگلستان کے شاہ چارلس ثانی کے نام معنون ہے۔

جان گریوز (John Greaves) جو ۱۶۰۲ء سے ۱۶۵۲ء تک زندہ رہا، ایک مشہور ریاضی دان تھا اور ایک زمانے میں آکسفورڈ میں علم ہیئت کا پروفیسر تھا۔ اس نے مشرق قریب اور خاص کر مصر کی کافی سیاحت کی تھی اور عربی اور فارسی زبانوں کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اس نے عربی اور فارسی کی بہت سی قلمی کتابوں، سکّوں اور جواہرات کا ایک بڑا ذخیرہ فراہم کیا اور فارسی صرف و نحو پر ایک مختصر سی کتاب شائع کی۔ اسے فنِ ریاضی کے متعلق مسلمانوں کی تصنیفات سے خاص دلچسپی تھی اور اس نے اس موضوع پر بہت سے پُرانے نسخے اور تحقیقی رسالے شائع کیے۔ اس کا بھائی ٹامس گریوز (Thomas Greaves) بھی عربی و فارسی جانتا تھا۔ اس نے بھی چند مضامین شائع کیے۔ سترہویں صدی میں علوم عربیہ کے ماہرین کی فہرست میں حسب ذیل علماء کا نام لیا جاسکتا ہے۔

ابراہیم وہیلاک (Abraham Wheelock) کیمبرج یونیورسٹی میں عربی کا پہلا پروفیسر تھا۔ سیموئل کلارک (Samual Clarke) جس نے عربی عروض پر ایک مقالہ لکھا اور مشہور مقامات کے عربی ناموں کی ایک لغت تالیف کی۔ برائن والٹن (Brian Walton) جس نے بہت سی مشرقی زبانوں میں تورات شائع کی۔ ڈوڈلی لوفٹس (Dudley Loftus) جو آئرستانی عالم اور مقنن تھا۔ جان سلڈن (John Selden) جو ۱۵۸۴ء سے ۱۶۵۴ء تک زندہ رہا۔ اس نے ایک مقنن اور مدبر کی حیثیت سے اس دور کے انگلستان کی زندگی میں بہت اہم اور نمایاں حصہ لیا۔ جان سلڈن دوسرے علوم کے علاوہ عربی اور دوسری بہت سی مشرقی زبانوں سے واقف تھا۔ اُس نے عربی کی ایک تاریخی کتاب کے نسخے کو مرتب کر کے ترجمہ کے ساتھ شائع کیا اور مرنے کے وقت مشرقی زبانوں کی کتابوں کے قلمی نسخوں کا ایک بڑا ذخیرہ چھوڑا۔

علومِ عربیہ کے جو ماہرین سترہویں صدی میں گزرے ہیں، اُن میں سب سے بلند مرتبہ شخص ایڈورڈ پوکاک (Edward Pococke) تھا جو ۱۶۰۴ء سے ۱۶۹۱ء تک زندہ رہا۔ یہ پہلا شخص تھا جسے آکسفورڈ میں عربی کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔ یہی یورپ کا وہ پہلا مستشرق ہے جس نے حقیقتاً نہایت اعلیٰ

درجہ کی خدمات انجام دیں۔ پوکاک نے بچپن ہی میں عربی پڑھنا شروع کردی تھی۔ اے ولیم بڈویل جیسے شخص کی شاگردی کا فخر حاصل تھا۔ اس نے کچھ دنوں آکسفورڈ میں میتھو پیسر Mathew Pasor سے بھی تعلیم حاصل کی جو مظالم سے تنگ آکر جرمنی سے بھاگ آیا تھا۔ ۱۶۳۰ء میں وہ حلب گیا اور وہاں پانچ برس رہا۔ اس عرصہ میں اس نے عربی تحریر اور روزمرہ میں کافی مہارت حاصل کرلی۔ وہ عربی کتابوں کے قلمی نسخوں کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ اپنے ساتھ آکسفورڈ لایا اور اسی طرح ان نسخوں کو تلف ہونے سے بچایا۔ اس نے حلب کے بہت سے لوگوں سے دوستی پیدا کرلی تھی جن میں خاص کر ایک شیخ فتح اللہ نامی عالم و فاضل تھا جس نے اسے عربی پڑھائی تھی۔ شیخ فتح اللہ کے ساتھ تمام عمر اس کے دوستانہ تعلقات رہے۔

۱۶۳۶ء میں انگلستان واپس آنے کے بعد پوکاک کو آکسفورڈ یونیورسٹی میں عربی پروفیسر کی نئی جگہ پر مقرر کردیا گیا جہاں وہ عربی ادب اور صرف و نحو کی تعلیم دیتا رہا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی تقریروں کو سننے کے لیے تمام طلبہ کو شرکت پر مجبور کیا گیا۔ نئے پروفیسر نے ابتدائی تقریر میں عربی زبان اور ادب کی اہمیت پر بحث کی اور اس کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہ کے اقوال پر تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کیا۔

۱۶۳۷ء میں اس نے دوبارہ مشرق کا سفر کیا تاکہ نئی معلومات اور کچھ اور قلمی نسخے حاصل کرے۔ اس نے اپنے پرانے دوست فتح اللہ سے ایک بار پھر ملاقات کی۔ وہ ۱۶۴۱ء میں آکسفورڈ واپس آیا اور باقی عمر انگلستان ہی میں علمی کاموں میں صرف کردی اور دوسرے سفر میں مشہور ریاضی دان جان گریوز John Greaves بھی اس کا ہم سفر تھا۔

اس طویل مدت میں جو اس نے آکسفورڈ میں گزاری جہاں انجیر کے مشہور درخت کے نیچے بیٹھ کر جسے وہ ملک شام سے لایا تھا اور جواب بھی موجود ہے اور غالباً انگلستان میں سب سے پرانا انجیر کا درخت ہے، پوکاک نے بہت قابلِ ذکر کتابیں لکھیں جن میں سے چند کے نام ذیل میں دیے جاتے ہیں۔

۱۔ "عربوں کی تاریخ کا نمونہ" جو ابوالفرج کی تاریخ کا خلاصہ ہے۔ اس کے آخر میں عربی تاریخ، علوم و فنون، ادب اور مذہب پر مختلف حیثیتوں سے نہایت تحقیق کے ساتھ سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب مستشرقین کی ادبیات میں بہت اہمیت رکھتی ہے اور ایک زمانے تک اس کی بلند پایہ حیثیت کو عام طور پر تسلیم بھی کیا گیا۔ یہ آکسفورڈ میں پہلے پہل ۱۶۴۹ء میں اور پھر ۱۸۰۶ء میں طبع ہوئی۔

۲۔ لامیۃ العجم، یہ طغرائی کی مشہور عربی نظم ہے جسے ترجمہ، نقد و تبصرہ اور مفصل تحریرات کے ساتھ شائع کیا گیا۔ یہ ۱۶۶۱ء میں آکسفورڈ میں طبع ہوئی۔

۳۔ المختصر فی الدول، ابوالفرج کی تاریخ کا عربی متن ترجمہ کے ساتھ

پوکاک کی علمی زندگی اور اُس کے کارناموں نے یورپ میں علوم مشرقیہ کی تحقیقات کا نیا باب کھولا۔ اپنے زمانہ ہی میں اسے کافی شہرت حاصل تھی اور بعد کے مغربی علماء تو سب کے سب اس کے مرہون احسان ہیں۔ یورپ کے گوشہ گوشہ سے اہل علم اس سے امداد و مشورہ طلب کرتے تھے اور بہت سے ملکوں حتیٰ کہ رومانیہ تک کے طلبہ یورپ کے اس مسلم الثبوت استاد سے عربی پڑھنے آکسفورڈ آیا کرتے تھے۔ یورپ میں علوم عربیہ کا دوسرا قریب قریب اسی پایہ کا ماہر ایک ڈچ تھا جس کا نام گولیس (Golius) تھا اور جو لیڈن (Leyden) یونیورسٹی میں عربی کا پروفیسر تھا۔ پوکاک کے متعلق اس کا بیان ہے کہ جہاں تک علوم مشرقیہ کا تعلق ہے، پوکاک کے پایہ کا دوسرا عالم نہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ جن کے نام اوپر دیے گئے ہیں، اُس نے بہت سے تحقیقی رسالے اور قلمی نسخے چھوڑے جو اس کے مرنے کے بعد آکسفورڈ کی باڈلین (Bodleian) لائبریری نے حاصل کر لیے اور آج تک موجود ہیں۔ یہ اس کتب خانہ کے شعبۂ عربی کا قابل قدر جزو ہے۔

اس نے اپنے بعد چھ لڑکے چھوڑے جن میں سے سب سے بڑے لڑکے کا نام بھی ایڈورڈ پوکاک تھا یہ ۱۶۴۸ء سے ۱۷۲۷ء تک زندہ رہا اور اپنے باپ کے نقش قدم پر چل کر تحصیلِ علوم مشرقیہ میں معروف رہا۔ اس کی شائع شدہ کتابوں میں عبداللطیف کی "تاریخ مصر" کا ناتمام نسخہ اور اس کا ترجمہ اور ابنِ طفیل کی ایک مشہور فلسفیانہ تالیف کا ترجمہ ہے۔

اسی طرح سترہویں صدی عیسوی میں انگلستان میں تحصیلِ علوم عربیہ کے سلسلے میں بہت نمایاں ترقی ہوئی۔ علومِ مشرقیہ کے اس تازہ ذوق و شوق کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مذہبی سبب بھی ایک اہم سبب تھا۔ اس زمانہ میں یہ احساس پیدا ہو چکا تھا کہ عربی اور عبرانی میں بہت قریبی تعلق ہے، اس لیے یہ توقع تھی کہ عربی زبان حاصل کر لینے سے عہد نامہ قدیم (توریت) کے متعلق مزید تحقیقات میں مدد ملے گی۔ اس سے بھی زیادہ اہم سبب عربی زبان اور عربی تاریخ کی عام تمدنی اہمیت کا روز افزوں احساس تھا۔ ایک صدی پہلے یورپ میں احیائے علوم کا وسیع معنوں میں دور دورہ تھا۔ اس سلسلے میں قدیم زبانوں اور ان کے متعلق تحقیقات سے نئی دلچسپی پیدا ہوئی۔ یہ ایک فطری امر تھا کہ بنی نوع انسان کی تاریخ اور تمدن کا مطالعہ کرنے والوں کو عربی دنیا کی اس غیر معمولی اہمیت و حیثیت کا احساس ہوا جو اسے تاریخ انسانی میں حاصل ہے اور انھوں نے اس تاریخی ذخیرے سے اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کی۔ بڈول (Bedwell)، کیسٹل (Castell) اور پوکاک (Pococke) ان سب نے عربی زبان کی عام اہمیت پر مضامین لکھے جن میں یہ بتایا کہ محققین کے لیے اس زبان کا حاصل کرنا کس قدر ضروری ہے۔

آخر میں ہمیں ان تجارتی اور سیاسی تعلقات کا جو انگلستان اور مشرقِ قریب کے درمیان از سر نو قائم

ہوئے اور ان نئے مفادات اور مواقع کا جو اس طرح پیدا ہوئے ذکر کرنا چاہیے۔ یہی اسباب تو تھے جن کی وجہ سے پوکاک دو مرتبہ مشرق کے پُر نتائج سفر کامیابی کے ساتھ انجام دے سکا۔ علوم مشرقیہ سے یہ نئی دلچسپی عام اور ہمہ گیر تھی۔ آرچ بشپ لاڈ (Archbishop Laud) جیسی بلند مرتبہ شخصیت نے بھی انگلستان میں تحصیلِ علوم عربیہ کی توسیع و ترقی میں بہت کوشش کی اور آکسفورڈ میں عربی تعلیمات کی پہلی کرسی قائم کرنے کے لیے مالی امداد بھی دی۔

اس طرح سترہویں صدی میں اس انتشار کے باوجود جو خانہ جنگی کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا نمایاں علمی کارنامے انجام پائے۔ آکسفورڈ اور کیمبرج میں تحصیلِ علوم عربیہ کے مرکز قائم کیے گئے۔ بہت سی کتابیں شائع ہوئیں اور ایک نیا علم پیدا ہوا جس کے جاننے والے بہت سے نامور علماء نے جو بعد کی صدی میں ظاہر ہوئے، عربوں اور یورپ دونوں کے تمدنی ترکہ کو اپنی تحقیقات سے مالامال کر دیا۔ ان کے متعلق ہم اگلی تقریر میں بحث کریں گے۔

اٹھارہویں صدی

انگلستان میں مشرقی علوم کا جو بیج سترہویں صدی میں بویا گیا تھا وہ چار سال بعد بار آور ہوا۔ اٹھارہویں صدی کے اوائل میں آکسفورڈ اور کیمبرج میں پروفیسری کی دو نئی اسامیاں قائم کی گئیں اور اس طرح اب انگلستان کی ان دونوں یونیورسٹیوں کو عربی کی دو دو کرسیوں کی موجودگی پر فخر کرنے کا موقع حاصل ہو گیا۔ اس زمانہ کے نامور ماہرین علوم عربیہ کی تعداد اتنی زائد ہے کہ ہر ایک کا جدا جدا ذکر نہیں کیا جا سکتا۔ ہم صرف یہی کر سکتے ہیں کہ ہنٹ (Hunt)، وھائٹ (White)، ہائڈ (Hyde)، گیگنیئر (Gagnier)، براؤن (Brown)، والس (Wallis) اور فورڈ (Ford) جیسے اٹھارہویں صدی کے چند علماء کا ذکر کر دیں۔ یہ سب کے سب اپنے زمانے کے مشہور اساتذہ اور محققین شمار کیے جاتے تھے۔ اس سلسلہ میں چند علماء کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ پریدو (Prideaux) نے جو ۱۶۳۸ء سے ۱۷۶۸ء تک زندہ رہا، سیرت محمد ﷺ پر ایک کتاب تالیف کی۔ چاپلو (Chappelow) نے جو ۱۶۸۳ء سے ۱۷۶۸ء تک زندہ رہا، عربی صرف و نحو کی ایک کتاب تالیف کی۔ البتہ انجم اور عربی ادب کی سب سے زیادہ دقیق کتاب "مقاماتِ حریری" کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ کارلائل (Carlyle) نے ایک بغدادی سیاح سے کیمبرج میں عربی پڑھی اور بہت سی عربی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ انگلستان میں اٹھارہویں صدی کے ماہرین علوم عربیہ میں سے چار علماء کی علمی خدمات خاص اہمیت رکھتی ہیں کیونکہ وہ انگریزی تمدن کے ترکہ کا وہ خاص حصہ ہے جس نے انگریزی ادیبوں کو عام طور بہت متاثر کیا۔

ان میں کا پہلا شخص سائمن اوکلے (Simon Oakley) تھا جو ۱۶۷۸ء سے ۱۷۳۰ء تک زندہ

رہا۔ اس نے کیمبرج اور آکسفورڈ دونوں جگہ عربی کی تعلیم حاصل کی اور نوجوانی ہی میں غیر معمولی ذہانت رکھنے والے طالب علم کی حیثیت سے مشہور ہو گیا تھا۔ یہ آکسفورڈ کے مشہور ماہرِ علوم عربیہ ایڈورڈ پوکاک کا شاگرد تھا جس کا ذکر پچھلی تقریر میں کیا جا چکا ہے۔

اوکلے اپنی ایک کتاب کے دیباچہ میں نہایت عزت و احترام کے ساتھ اپنے اُستاد کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔ "فاضل و محترم ڈاکٹر پوکاک جن کی ذاتِ گرامی اس عہد اور اس قوم کے لیے باعثِ فخر و زینت ہے اور جن کی یاد میرے لیے قابلِ احترام ہے۔" اوکلے جو بالآخر کیمبرج میں عربی کا پروفیسر ہو گیا تھا، علوم عربیہ سے والہانہ شغف رکھتا تھا بلکہ اس نے مادی چیزوں سے غفلت برتنے کی وجہ سے اپنے اور اپنے بہت سے بچوں کو سخت غربت میں مبتلا کر دیا تھا۔ بہت سے مصائب اور ذاتی مشکلات کے باوجود اوکلے نے اپنا کام جاری رکھا اور اپنی کوششوں میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ تحصیل السنہ مشرقیہ کے لیے ایک عام مقدمہ اور ابنِ طفیل کی کتاب حی بن یقظان کے انگریزی ترجمہ کے علاوہ اوکلے کا خاص کارنامہ اسلام کی سیاسی و تمدنی تاریخ ہے جو اُس نے تین جلدوں میں انگریزی زبان میں تالیف کی۔ اس کتاب کے ذریعہ پہلے پہل اس امر کی کوشش کی گئی کہ انگریزوں کو عام پسند اور عام فہم زبان میں عربی تہذیب کے کارناموں سے روشناس کیا جائے۔ اس سے پہلے زمانے میں جو چند خاص ماہرین علوم عربیہ گزرے تھے، ان کی تالیفات سے صرف مخصوص ماہرین ہی واقف ہوتے تھے لیکن اوکلے نے پہلی بار علومِ مشرقیہ کے سلسلے میں اپنی تحقیقات کے ثمرات انگلستان کے پڑھے لکھے لوگوں کے زیادہ وسیع حلقے کے سامنے پیش کیے جسے اس طرح اسلامی دنیا کے شاندار کارناموں سے کچھ نہ کچھ واقفیت حاصل ہو گئی۔ گو اوکلے کی یہ تاریخ حال کی تحقیقات کے پیشِ نظر بعض حیثیتوں سے غلط اور فرسودہ ہے، تاہم اُسے اپنے زمانہ میں ایک قابلِ قدر کارنامہ شمار کیا جاتا تھا اور یورپ کے اہلِ علم اور مؤرخین جن میں انگلستان کا مؤرخ اعظم گبن (Gibbon) بھی شامل ہے جس کی تاریخ "سلطنت روما کا زوال و خاتمہ" (Decline and fall of the Roman Empire) عالمگیر شہرت حاصل کر چکی ہے، اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس تالیف کی وجہ سے مؤلف کو انگریزی ادب میں مرتبہ دوام حاصل ہو گیا۔

اس زمانے کی ایک اور بڑی شخصیت جارج سیل (George Sale) کی ہے جو ۱۶۹۷ء سے ۱۷۳۶ء تک زندہ رہا۔ اسلام سے اُسے اس قدر دلچسپی تھی کہ گبن نے جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے اُسے "نیم مسلم" بتایا ہے۔ گو یہ بیان شاید مبالغہ آمیز ہے، تاہم اس سے کسی حد تک یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ سیل کے بارے میں اُس کے معاصرین کی کیا رائے تھی۔ سیل کا پیشہ وکالت تھا۔ اُس نے فرصت کے اوقات میں عربی پڑھی اور عربی کتابوں کے قلمی نسخوں کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کیا۔ اس کا خاص علمی کارنامہ جو اس کی سب سے بڑی یادگار ہے، قرآن پاک کا انگریزی ترجمہ ہے جو ۱۷۳۴ء میں شائع ہوا۔ یہ تمام یورپی زبانوں میں قرآن کا سب سے پہلا مکمل ترجمہ ہے۔ مسلمان اس کام کی عظمت کو اچھی

طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اس سخت اور دشوار کام میں سیل کو اس حد تک کامیابی ہوئی کہ بہت سے ماہرین کا آج بھی یہ خیال ہے کہ قرآن کا اس سے بہتر ترجمہ موجود نہیں۔ یہ اب تک لاتعداد بار طبع ہو چکا ہے اور آج بھی کثرت سے مستعمل ہے۔ فرانسیسی، جرمن اور پولستانی زبانوں میں قرآن پاک کے جو ترجمے ہوئے وہ سیل ہی کے انگریزی ترجمہ پر مبنی ہیں۔

سیل نے محض ترجمہ ہی پر اکتفا نہیں کی حالانکہ صرف اس کام کے لیے بھی بڑی علمی قابلیت کی ضرورت تھی۔ اس نے انگریزوں کے استفادہ کے لیے اپنے ترجمہ کے ساتھ ساتھ مفصل حاشیے اور شرحیں اضافہ کر دیں تاکہ بعض مشکل عبارتیں اُن کی مدد سے صاف اور آسان ہو جائیں۔ اس ترجمہ کے ساتھ جو مفصل دیباچہ شامل ہے وہ اصل مذہب اسلام پر ایک مقالہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اٹھارہویں صدی کے ادیبوں نے سیل کے ترجمے سے بہت کام لیا ہے کیونکہ ان کے پاس اسلام کی اس مقدس کتاب اور پیغمبر اسلام کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا ایک یہی ذریعہ تھا۔ یورپ میں بھی اس کا بہت وسیع مطالعہ کیا گیا۔

والٹیر نے اپنی لغت فلسفہ (Philosophic Dictionary) میں اس کا حوالہ دیا ہے۔

سیل کی دوسری تصنیفات کے سلسلے میں بیل (Bayle) کی انسائیکلوپیڈیا کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے جو دورِ جدید میں یورپ کی پہلی انسائیکلوپیڈیا خیال کی جاتی ہے اور جس کی تالیف میں سیل نے بھی ہاتھ بٹایا تھا۔ وہ تمام مضامین جو اس کتاب میں عربوں کے متعلق ہیں اُسی کے لکھے ہوئے ہیں۔

تیسرا اہل علم سر ولیم جونس (Sir William Jones) ہے جو ۱۷۴۶ء سے ۱۷۹۴ء تک زندہ رہا۔ جونس علوم عربیہ کے مقابلے میں ہندوستانی علوم کے ماہر کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جہاں تک یورپ میں ہندوستانی علوم کی تحصیل کا تعلق ہے، اسے اولیت کا شرف حاصل ہے۔ جیسے جیسے یورپی ممالک کے قدم مشرق میں آگے بڑھتے گئے۔ انگلستان اور فرانس میں روز بروز ہندوستانی چیزوں سے دلچسپی بڑھتی گئی اور یک بہ یک علمی سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔ ہندوستان اور انگلستان میں انگریز اہل علم نے سنسکرت کی پُرانی کتابوں کا مطالعہ کیا اور سنسکرت زبان کے قواعد مدون کیے۔ اسی طرح انھوں نے علوم مشرقیہ کی ایک جدید شاخ کی بنا ڈالی جس نے ایک صدی بعد جرمنی اور دوسرے مقامات میں بہت فروغ پایا۔ اگرچہ سر ولیم جونس کا خاص کام ہندوستان سے متعلق تھا، وہ علوم عربیہ میں خاص قابلیت رکھتا تھا بلکہ سنسکرت سے بہت پہلے اس نے عربی شروع کی تھی۔ شاید اس کا ہندوستان کا سفر بھی کسی حد تک اسی دلچسپی کی بنا پر تھا جو اسے عربی زبان اور اسلام سے تھی۔ اسے بچپن ہی میں عربی سے لگاؤ پیدا ہو گیا تھا اور وہ اپنے طور پر اسے سیکھتا رہا۔ اُس نے آکسفورڈ آ کر عربی اور فارسی کا گہرا مطالعہ کیا اور وہ ایک شامی مسلمان کو اپنی تعلیم کے لیے لایا۔ عربی زبان کے متعلق اُس کی خاص تالیف معلقات کا انگریزی میں کامل ترجمہ ہے جو زمانۂ جاہلیت کے سات مشہور عربی قصائد پر مشتمل ہے

۔ اس طرح جونس نے انگلستان کے اہلِ علم کی بڑی خدمت انجام دی کہ انھیں قدیم عربی ادب کے ان جواہر ریزوں سے روشناس کیا۔ ہندوستان کے قیام کے زمانے میں یہی نہیں کہ اُسے شرعِ اسلامی پر متعدد کتابیں شائع کرنے کا موقع ملا بلکہ اُس نے ہندوستان کے متعلق بھی بہت سے تحقیقی رسالے شائع کیے۔

آخر میں ہم بہت اختصار کے ساتھ جے۔ ایل۔ برک ہارٹ (J. L. Burckhardt) کی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں جو ۱۷۸۴ء سے ۱۸۱۷ء تک زندہ رہا۔ برک ہارٹ اصلاً سوئٹزر لینڈ کا باشندہ تھا۔ مگر اس نے انگلستان میں تعلیم پائی اور پھر یہیں سکونت اختیار کر لی۔ چند سال یورپ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کر کے وہ حلب گیا جہاں رہ کر اُس نے عربی زبان میں کافی ملکہ حاصل کر لیا۔ اُس نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ شام، مصر اور عرب کی سیاحت میں گزارا۔ وہ محمد علی پاشا کی خاص حمایت میں مکہ مکرمہ کی زیارت کا شرف حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس کی خاص تالیفات وہ سفرنامے ہیں جو مشرقِ قریب میں اس کی سیاحت کے متعلق ہیں۔ اس کی کتاب "بدوی عرب اور وہابی" (Beduins And Wahabis) جو ذاتی تجربات پر مبنی ہے، اُس اہم ترین تحریک کا صحیح اور مفصل بیان ہے جو کچھ ہی پہلے اپنی طاقت و وسعت کے پہلے دور میں اوجِ کمال کو پہنچ چکی تھی۔ اس نے ان عربی ضرب الامثال کا ایک بڑا ذخیرہ مدوّن کیا جو اس نے اپنی سیاحت کے دوران میں جمع کی تھیں اور عربی متن کے ساتھ ساتھ ان کا انگریزی ترجمہ مع شرح کے شائع کیا۔ اس کی کتابیں دور دور پڑھی اور قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ ان کتابوں کا ترجمہ انگریزی سے یورپ کی بہت سی زبانوں میں ہوا۔ ۱۸۱۷ء میں مصر میں اس کا انتقال ہو گیا۔

اٹھارہویں صدی کا آخری حصہ وہ دور ہے جس میں مشرقی تہذیب کے متعلق مغرب میں بہت دلچسپی پائی جاتی تھی۔ ایشیا میں روز بروز یورپی اثر کے بڑھنے اور ان ترجموں کی وجہ سے جو ان علماء کے علاوہ جن کا ہم نے ذکر کیا ہے، بہت سے دوسرے علماء نے عربی اور فارسی زبانوں سے کیے۔ انگلستان کے اکثر ادیب عربی ادبیات سے واقف ہو گئے۔ الف لیلے کے اس ترجمہ کا بھی کافی اثر پڑا جو یورپی زبان میں پہلے پہل ہوا اور اس صدی کے آغاز میں شائع ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپی ادب میں مستشرقیت (Orientalism) کی ایک لہر دوڑ گئی۔ انگریز شاعر اور مصنفین نے عربی و فارسی ماخذوں کو پیشِ نظر رکھ کر مشرقی موضوع پر قصے کہانیاں تیار کرنی شروع کر دیں۔ یہ تحریک انگلستان کے علاوہ یورپ کے دوسرے ممالک میں بھی پھیل گئی اور وہاں اس کی وجہ سے رومانیت کا احیاء (Romantic Revival) عمل میں آیا۔ جرمن شاعرِ اعظم گیٹے (Goethe) مشرقی کتابوں کے انگریزی اور فرانسیسی ترجموں سے بہت متاثر ہوا۔

اٹھارہویں صدی کے آخر میں فرانسیسیوں نے نپولین کی سرکردگی میں مصر پر حملہ کیا تھا اور اس طرح عربی تمدن رکھنے والے ایک ملک سے اُن کا براہِ راست تعلق ہو گیا۔ اس کے علاوہ تحصیل علوم عربی کی تحریک میں اس وجہ سے بھی نیا زور پیدا ہو گیا کہ چند سال بعد محمد علی پاشا کی قیادت میں مصر ایک طاقتور اور عملاً مستقل حکومت کی حیثیت سے نمودار ہوا اور یورپی سیاسیات میں اہم حصہ لینے لگا۔ اس طرح ہم انیسویں صدی میں پہنچ جاتے ہیں جو ہماری آئندہ تقریر کا موضوع ہوگا۔

(عالم اسلام اور عیسائیت، ستمبر ۹۲ء)

(۲)

انیسویں صدی عیسوی میں یورپ کے تمام بڑے بڑے ممالک میں تحصیل علوم عربیہ کے سلسلے میں نمایاں ترقیاں ہوئیں۔ مصر پر نپولین کے حملے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ مشرق قریب کے عرب ممالک یورپی سیاسیات میں پیش پیش رہنے لگے اور کئی صدیوں کے بعد عربوں اور فرنگیوں میں پھر براہِ راست رابطہ قائم ہو گیا۔ بہت سے یورپی سیاح مشرق کا سفر اختیار کرنے لگے اور مصری طلبہ کی روز افزوں تعداد مغربی یورپ کی یونیورسٹیوں میں داخل ہونے لگی۔ انھوں نے مغربی تمدن اور طریقہ کا مطالعہ کیا اور اہل مغرب میں عربی تمدن کے متعلق نیا ذوق و شوق پیدا کر دیا۔ یورپ کے استشراق میں جو نئی علمی تحریک پیدا ہوئی اُس کا سہرا اُن فرانسیسی اہل علم کے سر ہے جو نپولین کے ہم رکاب تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنیسویں صدی کے اوائل میں ماہرین علوم عربیہ کی حیثیت سے فرانسیسی اہل علم سب سے زیادہ نمایاں نظر آتے تھے۔ سلوستر دی ساسی (Silvestre de Sacy) نے جو فرانس کے ماہرین علوم عربیہ میں سب سے زیادہ بلند مرتبہ ہے، اپنے زمانہ میں قریب قریب ہر ملک و قوم کے اہل علم کو تعلیم دی۔

انگلستان میں بھی علوم عربیہ کے ماہرین کی ایک خاصی بڑی تعداد نظر آتی ہے۔ نئی قائم شدہ لندن یونیورسٹی میں عربی کی ایک نئی کرسی قائم کی گئی۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے قیام سے (جو انگریز مستشرقین کی ایک انجمن ہے) علوم شرقیہ کے لیے نیا جوش وولولہ پیدا ہو گیا۔ انگلستان کے اُن اہل علم نے جو ہندوستان میں ہندی مسلمانوں کی زبانوں اور ان کی تہذیب کا مطالعہ کر رہے تھے یہ محسوس کیا کہ اس قسم کی علمی تحقیقات کے لیے ضروری ہے کہ عربی زبان سیکھی جائے جو تمام اسلامی تمدن کا خواہ وہ کسی زبان میں ہو سرچشمہ ہے۔ خود عربوں میں جو ترقیاں رونما ہوئیں ان کی بنا پر انیسویں صدی کے ماہرین علوم عربیہ کی خدمات کو نئی قدر و قیمت اور اہمیت حاصل ہو گئی۔ انیسویں صدی میں عربی زبان بولنے والی اقوام کے قومی اور تمدنی احیاء کا نیا دور شروع ہوا۔ ابتداء میں انھیں عربی زبان میں مطبوعہ کتابوں کے نہ ملنے بلکہ سرے سے چھاپہ خانوں ہی کے نہ ہونے کی وجہ سے بہت دقتیں اور رکاوٹیں پیش آئیں۔ اس طرح عربی کی پرانی مشہور کتابوں کے وہ متعدد عمدہ نسخے جو یورپ میں شائع ہوئے اور

جن میں سے بہت سے انگلستان ہی میں طبع ہوئے، عرب قارئین کی نئی نسل کے لیے بہت مفید ثابت ہوئے اور ان کے ذریعے ان کو وہ مواد فراہم ہو گیا جو کہیں اور دستیاب نہ ہو سکتا تھا۔ کچھ دنوں بعد جب مشرق میں بھی مطابع قائم ہو گئے اور کتابوں کے نسخے مقامی طور پر طبع ہونے لگے تو یہ نسخے زیادہ تر یورپ کے مطبوعہ نسخوں پر مبنی ہوتے تھے۔ اس طرح مستشرقین نے عربوں کو خود ان کی اپنی تہذیب سے دوبارہ روشناس کرانے اور اُسے زندہ رکھنے میں اہم خدمات انجام دیں اور اب وہ احسان جو قرونِ وسطیٰ کے عربوں نے کتبِ یونانی کو مغرب میں پہنچا کر کیا تھا، یوں ادا ہو رہا تھا۔

اس تھوڑے سے وقت میں ہم صرف اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ اس دور کے متعدد انگریز ماہرین علوم عربیہ میں سے صرف چند بہت ہی نمایاں شخصیتوں کا ذکر کر دیں۔ عربی، فارسی کے عالم معتبر جے۔ ایچ ۔ ہنڈلے (J. H. Hindley) (جن کی تالیفات میں زبان انگریزی میں مشہور عرب شاعر ابوطیب المتنبی کی تاریخ حیات اور اس پر بحث و نظر شامل ہے) اور ایم۔ لمسڈن (M. Lumsden) (جو ہندوستان میں فورٹ ولیم کالج میں عربی و فارسی کا پروفیسر تھا اور جس نے عربی صرف و نحو پر ایک کتاب تالیف کی جو انیسویں صدی میں یورپ اور ہندوستان میں بہت مستعمل تھی) کے پایہ کے علماء کا بھی اس سلسلے میں محض نام ہی لیا جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ ہندوستان میں انگریزوں نے تعلیم کی تنظیم کے سلسلے میں ابتداءً جو کوششیں کیں اُن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے عربی تعلیم کا انتظام کیا۔ ان بہت سے انگریزوں میں سے جنھوں نے اس کام میں مدد دی ایک لمسڈن بھی تھا۔ فورٹ ولیم میں جو ہندوستان میں پہلا انگریزی کالج تھا، عربی و فارسی کی دو کرسیاں تھیں۔

انیسویں صدی کے اوائل میں انگلستان ہی نہیں بلکہ یورپ میں سب سے بڑی شخصیت جو اپنے معاصرین سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھی، ای۔ ڈبلیو۔ لین (E. W. Lane) کی تھی جو ۱۸۰۱ء سے ۱۸۷۶ء تک زندہ رہا۔ کم سنی ہی میں لین (Lane) کو علوم مشرقیہ اور خصوصاً مصر سے والہانہ شوق پیدا ہو گیا تھا۔ جولائی ۱۸۲۵ء میں وہ اسکندریہ روانہ ہوا۔ یہ اس کا مصر کا پہلا سفر تھا۔ چونکہ اس زمانہ میں بحیرۂ روم کا سفر یوں ہی پُر خطر ہوتا تھا اس کا یہ سفر بھی خطرات سے خالی نہ تھا۔ ایک موقع پر اُس کا جہاز طوفانی ہوا میں گھر گیا اور کپتان کے کیے دھرے کچھ نہ ہو سکا۔ وہاں کوئی دوسرا ایسا موجود نہ تھا جو جہاز رانی کے متعلق کچھ بھی جانتا ہو۔ باوجود اس کے کہ لین (Lane) نے کبھی جہاز نہیں چلایا تھا وہ اسے خود ہی کھینے لگا اور محض ریاضی کی معلومات کی بناء پر اُس نے جہاز کو تباہی سے بچا لیا۔ اسی سفر میں بعد کو بغاوت کی وجہ سے بھی اُس کی جان خطرے میں پڑ گئی۔ غرض دو مہینے کے سفر کے بعد لین (Lane) مصر پہنچا جہاں اُس نے ۱۸۲۸ء کے موسم سرما تک قیام کیا۔ اس نے زیادہ وقت قاہرہ میں گزارا مگر دوسرے مقامات کا بھی سفر کیا۔ گو اس کی اصل غرض یہ تھی کہ وہ قدیم مصریوں کے بارے میں معلومات حاصل کرے مگر اُس نے فوراً ہی یہ محسوس کیا کہ ان کے موجودہ اخلاف کہیں زیادہ قابلِ التفات ہیں۔ اپنے قیام

کی ابتدا ہی سے اس نے عربی زبان کا گہرا مطالعہ شروع کر دیا اور بہت جلد ادبی اور روزمرہ دونوں زبانوں میں دستگاہ حاصل کر لی۔ مشرق کے اس پہلے سفر میں جس کا وہ ایک عرصہ سے مشتاق تھا معنوی حیثیت سے اسے بہت اہم تجربات حاصل ہوئے۔ اس نے اپنے روزنامچوں میں لکھا ہے۔ "جب میں نے پہلے پہل اس سرزمین میں قدم رکھا تو میں اس طرح جذبات سے بھرا ہوا تھا جس طرح کہ ایک مشرقی شوہر جو اپنی نادیدہ عروس کے منہ سے نقاب اُلٹ رہا ہو۔" لین (Lane) نے جو کچھ دیکھا اس سے وہ بہت متاثر ہوا اور اسلامی چیزوں کا شیدائی بن گیا۔

انگلستان واپس آنے تک اس نے مصر، اس کے باشندوں اور ان کی زبان کا گہرا مطالعہ کر لیا تھا اور مصری زندگی کے متعلق تفصیلی معلومات قلم بند کر لی تھیں۔ انگلستان واپس آنے پر اس سے خواہش کی گئی کہ جو کچھ اس نے وہاں دیکھا تھا، اسے شائع کرے مگر چونکہ اسے علمی صحت و دقتِ نظر کا غیر معمولی پاس و لحاظ تھا جو اس کی تمام تالیفات کی خصوصیت ہے اُس نے اس کتاب کے شائع کرنے سے پہلے مصر کا دوسرا سفر اختیار کرنا ضروری خیال کیا۔ وہ ۱۸۳۳ء سے ۱۸۳۵ء تک مصر میں رہا اور قاہرہ کی زندگی کا بہت گہری نظر سے مطالعہ کرتا رہا۔ جب تک وہ مصر میں رہا اس نے مصریوں ہی کا لباس پہنا اور مصری مسلمانوں کے سوا اُس نے کسی سے میل جول نہیں رکھا۔ اُس نے مصر میں اپنا ایک ذاتی مکان لے رکھا تھا اور وہ ہر حیثیت سے ایک مصری ادیب کی طرح رہتا تھا۔ ان باتوں کے علاوہ وہ صحت و روانی کے ساتھ عربی بول سکتا تھا اور اس کے خدوخال میں عربوں کی سی جھلک پائی جاتی تھی جس کی وجہ سے وہ بآسانی مصریوں کی طرح رہ سکا اور قاہرہ کے مختلف مصری حلقوں کے ساتھ دوستانہ اور مساوی حیثیت سے میل جول رکھ سکا۔ اُس کے اکثر مصری دوست اُسے منصور آفندی کہا کرتے تھے۔

دوسری بار انگلستان واپس آنے پر اُس نے ۱۸۳۶ء میں اپنی کتاب "عہد حاضر کے مصریوں کے عادات و اخلاق" (An Account of the Manners and Customs of the Modern Egyptians) دو جلدوں میں شائع کی جس نے بہت شہرت پائی۔ یہ کتاب ایک شاہکار کی حیثیت سے ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ چنانچہ پہلی اشاعت دو ہی ہفتوں میں ختم ہو گئی۔ یہ کتاب متعدد بار شائع ہوئی۔ کئی بار جرمنی اور امریکہ میں بھی طبع ہوئی۔ انگریزی ادب میں اسے ایک سرمایہ خیال کیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں قاہرہ کی زندگی اور وہ رسم و رواج تفصیل کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں جو قاہرہ میں ان تبدیلیوں سے پہلے پائے جاتے تھے جنھوں نے اسے جدید طرز کا ایک شہر بنا دیا۔ اس بنا پر اسے عہد رفتہ کی ایک سچی اور جیتی جاگتی تصویر کہہ سکتے ہیں۔ یہ تاریخی لحاظ سے بہت اہمیت رکھتی ہے اور آج بھی اُن لوگوں کے لیے جو مصر کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں اُس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

انگلستان واپس آنے کے تھوڑے ہی عرصے بعد لین (Lane) الف لیلے کا انگریزی ترجمہ کرنے میں لگ گیا۔ اس سے پہلے بھی اس کتاب کے ترجمے ہو چکے تھے جو بہت مقبول ہوئے تھے۔ لیکن وہ

علمی اور فنی حیثیت سے صحیح نہ تھے۔ لین (Lane) نے اس امر کی کوشش کی کہ وہ اپنے ترجمہ میں اصل مفہوم اور ماحول کا پورا پورا لحاظ رکھے۔ اُس نے ترجمہ کے ساتھ ساتھ قرونِ وسطیٰ کے اسلامی رسم و رواج کے متعلق تفصیل کے ساتھ تشریحی حواشی کا اضافہ کیا جو بعد میں "قرونِ وسطیٰ میں عربوں کی زندگی" (Arabian Life in the Middle Ages) کے نام سے علیحدہ کتابی شکل میں شائع ہوئے۔

اس اثناء میں لین (Lane) کو ایک عرصہ تک ایک مبسوط عربی انگریزی لغت کی تیاری کا خیال رہا۔ اس سے پہلے یورپی زبانوں میں عربی کی جو لغتیں گولیس (Golius)، فریتاخ (Freytag) وغیرہ نے تالیف کی تھیں۔ وہ اگرچہ اپنے اپنے مقام پر کچھ نہ کچھ مفید ضرور تھیں مگر چونکہ ان کے لیے کافی مواد مہیا نہ ہو سکا تھا اس لیے متعدد حیثیتوں سے ناقص و تشنہ تھیں۔ لین کا خیال یہ تھا کہ وہ عربی کی مستند پرانی لغتوں مثلاً تاج العروس وغیرہ کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد خود ایک مبسوط لغت مرتب کرے۔ جولائی ۱۸۴۲ء میں وہ اس خیال سے تیسری بار مصر گیا۔ وہ ۱۸۴۲ء سے ۱۸۴۴ء تک قاہرہ میں بارہ چودہ گھنٹے روزانہ کام کرتا رہا اور اپنے گھر سے بہت کم باہر نکلتا تھا۔ آخر کار جب اُس نے عربی لغات سے تمام ضروری مواد فراہم کر لیا تو اس نے انگلستان واپس آکر اپنی زندگی کے باقی پچیس سال اس لغت کی تکمیل میں صرف کر دیے۔ یہ واضح رہے کہ جو مواد اس نے جمع کیا تھا وہ مطبوعہ یا بآسانی دستیاب ہونے والا نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ کام کس قدر دشوار تھا۔ عربی لغتوں کا مطالعہ جو بذاتِ خود کچھ کم دشوار کام نہ تھا اس سلسلے کا پہلا قدم تھا کیونکہ ابھی چھان بین نظم و ترتیب اور وہ بھی منتشر مواد کو یورپی طرز پر منظم و مرتب کر کے ایک مبسوط لغت کی شکل میں پیش کرنے کا کام باقی تھا۔ ۱۸۷۶ء میں اس کے انتقال کے وقت تک یہ کام پورا نہیں ہو پایا تھا لیکن وہ متعدد جلدیں جو اس وقت تک شائع ہو چکی تھیں علومِ شرقیہ میں ایک مفید اور قابلِ قدر اضافہ تھیں۔ آج بھی دنیا کو تسلیم ہے کہ ہر اس شخص کے لیے جو عربی زبان کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے یہ لغت ایک ناگزیر چیز ہے۔ اُس وقت سے آج تک بھی وہ بہترین لغت ہے جو دستیاب ہو سکتی ہے اور اسی سے یورپی زبانوں کی وہ بہت سی عربی لغتیں جو بعد میں شائع ہوئیں، ماخوذ ہیں۔

لین (Lane) اپنی آخری عمر میں ہر جگہ علومِ عربیہ کا استادِ اعظم مانا جاتا تھا جیسا کہ جرمنی کے ایک مشہور ماہرِ علومِ عربیہ نے اپنے ایک خط میں اُسے لکھا بھی تھا۔ یورپی ممالک کے صدر مقامات کی اکثر علمی انجمنوں نے اس کو اعزاز دے کر اس کے نام کو غیر فانی بنا دیا۔

اس عہد کا سب سے زیادہ ممتاز انگریز اہلِ علم ایڈورڈ ہنری پامر (Edward Henry Palmer) ہے جو مشرق میں شاید شیخ عبداللہ کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔ پامر ۱۸۴۰ء میں کیمبرج میں پیدا ہوا اور ۱۸۸۲ء میں مصر میں فوت ہوا۔ یہ وہی سال ہے جس میں عرابی پاشا کی تحریک اُٹھی تھی۔

پامر میں بچپن ہی سے دوسری زبانوں کے سیکھنے کی غیر معمولی صلاحیت پائی جاتی تھی اور اس نے اسی زمانے میں فرانسیسی اور اطالوی زبانوں میں اتنی مہارت حاصل کرلی تھی کہ ان زبانوں کو روانی کے ساتھ استعمال کرسکتا تھا۔ بیس برس کی عمر میں اس کی ملاقات ایک ہندوستانی مسلمان سید عبداللہ سے ہوئی جو کیمبرج یونیورسٹی میں ہندوستانی زبان کا لکچرر تھا۔ اسے سید عبداللہ ہی کی وجہ سے علوم مشرقیہ سے پہلے پہل دلچسپی پیدا ہوئی۔ پامر نے اس غیر معمولی عزم و ہمت کی بنا پر جو اس کی خصوصیت تھی بیک وقت عربی، فارسی اور اُردو تینوں زبانیں سیکھنا شروع کردیں اور تھوڑے ہی دنوں میں یہی نہیں کہ وہ انگریزی اشعار کا اپنی محبوب عربی زبان میں ترجمہ کرنے لگا بلکہ خود بھی عربی زبان میں شعر کہنے لگا۔ آخر پامر نے یہ طے کرلیا کہ عربی میں مہارت حاصل کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ یہ زبان براہ راست عربوں ہی سے سیکھی جائے چنانچہ اس نے اُن عربوں سے جو اس وقت انگلستان میں موجود تھے گہرے تعلقات پیدا کیے ان میں سے ایک طلب کا رہنے والا شامی تھا جس کا نام رزق اللہ حسن حلبی تھا۔ اس سے پامر کے پینگ بہت بڑھ گئے اور پامر کی شخصیت اور تحریر پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا۔ پامر نے رزق اللہ سے بہت کچھ تعلیم حاصل کی اور اس کا بہت مداح تھا۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد پامر کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہوگیا اور زیادہ باضابطہ طور پر علوم عربیہ کی تعلیم حاصل کرنے لگا۔ ایک عرصہ سے اس کی یہ خواہش تھی کہ عربی ممالک کی سیاحت کرے اور اس قوم سے بذات خود تعارف حاصل کرے جس کی زبان اور ادبی سرمایہ کو وہ اتنا پسند کرتا تھا۔ ۱۸۶۹ء میں حسنِ اتفاق سے اسے اس کا موقع مل گیا۔ اس نے اسی سال اور اس کے ایک سال بعد فلسطین کے آثارِ قدیمہ کی تحقیقات کرنے والی ایک انجمن کی جانب سے دو مرتبہ مشرق قریب کا سفر کیا۔ اس طرح اسے مختلف مقامات کے عربی روز مرہ اور عربی تمدن کے متعلق زیادہ تفصیل کے ساتھ مطالعہ کرنے کا پہلا موقع ملا اور اس نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ انگلستان واپس آنے کے کچھ عرصہ بعد وہ کیمبرج میں عربی کا پروفیسر مقرر ہوگیا۔ اب چند سال تک اس کا کچھ وقت تعلیم و تدریس میں اور کچھ صحافتی کاموں میں صرف ہونے لگا۔ اس نے اس زمانے میں بہت سی اہم کتابیں تیار کیں۔ ۱۸۸۲ء میں اس نے پھر مصر کا سفر کیا۔ اور گھوڑے پر سوار ہوکر جزیرہ نما سینا کی پُرخطر سیاحت اختیار کی۔ وہ اپنے پہلے تحقیقاتی دورے کے سلسلے میں اس علاقہ سے اچھی طرح واقف ہوچکا تھا۔ شیخ عبداللہ کی صحرا نوردی کی داستان آج تک زبانوں پر ہے۔ اس کی موت بھی ایک دردناک واقعہ ہے۔ مشرق قریب میں یہ زمانہ شورشوں اور ہنگاموں کا تھا اس لیے اس زمانے میں سفر غیر معمولی طور پر پُرخطر ہوتے تھے۔ پامر صحرا سے واپس آرہا تھا کہ اسے چند لٹیرے بدوؤں نے قتل کرڈالا اور اس طرح ۴۲ برس کی ابتدائی عمر میں ایک شاندار زندگی ختم ہوگئی۔

یورپ کے مستشرقین میں پامر اس حیثیت سے شاید انفرادی حیثیت رکھتا ہے کہ اس نے اسی پر اکتفا نہیں کی کہ عربی زبان کو علمی حیثیت سے حاصل کرے بلکہ اس نے عرب قوم اور عربی زبان کی

روح کی گہرائیوں تک پہنچنے کی کوشش کی۔ اس کا شمار یورپ کے ان چند انے گنے اہل علم میں ہے جو مشرقی زبانوں کو صحت وروانی کے ساتھ لکھ سکتے تھے۔ اس کی اردو کی کچھ تحریریں بھی شائع ہو کر ہندوستان میں بہت مقبول ہوئیں۔ اس نے انگلستان میں شاہ ایران کی سیاحت پر مضمون اردو زبان میں لکھا، وہ اردو ادب میں غیر فانی خیال کیا جاتا ہے۔ پامر عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ اس سلسلے میں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ وہ اکثر دوسرے ماہرین علوم عربیہ کو انگریزی میں نجی خطوط لکھتے وقت یہ محسوس کر کے کہ وہ انگریزی میں اپنے خیالات کو پوری طرح ادا نہیں کر سکتا یک بیک عربی زبان میں لکھنے لگتا تھا۔ اس کے ایک دوست اور رفیق کار جی۔ایف۔ نکل (G. F. Nicholl) نے جو آکسفورڈ میں عربی کا پروفیسر تھا اس کے متعلق لکھا ہے "اس کے ان خطوں سے جو اس نے مجھے انگریزی میں لکھے، اکثر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے انگریزی میں اظہار خیال کرنے میں کچھ الجھن سی محسوس ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وہ فوری جذبات سے متاثر ہو کر یا نقد و تبصرہ کے وقت یک بیک عربی یا فارسی نظم یا نثر پر اتر آتا تھا۔" مثال کے طور پر پامر کے حسبِ ذیل طبع زاد اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں۔

لیت شعری ھل کفیٰ ماقد جریٰ — مُذ جریٰ ماقد کفیٰ من مقلتی
قد بریٰ اعظم حُزنٍ اعظمی — وفنی جسمی حاشا اصغری

[کاش! مجھے یہ معلوم ہوتا کہ وہ آنسو جو اب تک بہہ چکے ہیں، نیز جن کی اس وقت جھڑی لگی ہوئی ہے، اب کافی ہوں گے۔ اس بھاری غم نے میری ہڈیاں گھلا دی ہیں اور میرے جسم کو مٹا کر رکھ دیا ہے۔ ہاں! ایک چھوٹی سی شے دل (یا زبان؟) باقی رہ گئی ہے۔]

پامر نے اپنی اس مختصر سی زندگی میں اپنی مطبوعہ کتابوں کی ایک بڑی تعداد چھوڑی ان میں سے شاید اہم ترین کتابیں حسب ذیل ہیں۔

اپنی موت سے کچھ پہلے اس نے بہاءالدین زہیر مشہور مصری شاعر کا پورا کلام عربی متن اور انگریزی منظوم ترجمہ کے ساتھ شائع کیا اور اس میں حواشی اور مقدمہ کا اضافہ کیا۔ اس کتاب کی اشاعت عربوں کے تمدنی ترکہ کو نئی زندگی بخشنے کے سلسلہ میں ایک اہم اقدام تھا۔ اس کے ایک سال بعد اس نے انگریزی میں عربی صرف و نحو پر ایک کتاب شائع کی جو دوسری کتابوں کے برخلاف عرب علمائے صرف و نحو کے قدیم روایتی طرز پر ترتیب دی گئی تھی۔ اس طرح اس نے یہ کوشش کی کہ انگریز طلبہ کے سامنے عربی صرف و نحو اسی شکل میں پیش کی جائے جس شکل میں خود عرب طلبہ اسے پڑھا کرتے تھے۔

اس کی موت سے ایک سال پہلے یہ کتاب اضافہ کے ساتھ دوسری بار شائع ہوئی۔ موضوع کے

اعتبار سے حیات ہارون الرشید اس سے کسی حد تک بہتی ہے۔ اس میں پامر نے اس وقت کے بغداد کی ایک رنگین تصویر کھینچی ہے جب کہ وہ خلفائے عباسیہ میں سب سے بڑے خلیفہ کا پایہ تخت تھا۔ اس نے فارسی اور عربی کی اکثر نظموں کے منظوم ترجمے شائع کیے۔ ایک فارسی کی لغت تالیف کی۔ مشرقی علوم کے ان قلمی نسخوں کی ایک فہرست نہایت تحقیق کے ساتھ مرتب کی جو کیمبرج یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود تھے اور جزیرہ نمائے سینا کی سیاحت کے حالات بطور سفرنامہ شائع کیے۔ پامر کی موت کی خبر نے اس کے بے شمار دوستوں اور قدردانوں کو جو تمام دنیا میں پھیلے ہوئے تھے سوگوار بنا دیا۔ اس کے مرثیے تقریباً ۱۵ مختلف زبانوں میں جن میں عربی بھی شامل ہے شائع ہوئے۔

ایک دوسرا اہل علم جو اول درجہ کی اہمیت رکھتا ہے ولیم رائٹ (William Wright) تھا جو ۱۸۳۰ء سے ۱۸۸۹ء تک زندہ رہا۔ رائٹ (Wright) ہندوستان کے ایک برطانوی افسر کا لڑکا تھا اور ہندوستان ہی میں پیدا ہوا۔ اس کی ماں نے جو خود متعدد مشرقی زبانوں میں مہارت رکھتی تھی اپنے لڑکے کو بچپن ہی میں علوم مشرقیہ کی تعلیم حاصل کرنے پر آمادہ کر دیا۔ اس نے عربی زبان کی تعلیم انگریزی اور یورپی یونیورسٹیوں میں حاصل کی اور کچھ دنوں لیڈن (Leyden) یونیورسٹی میں ہالینڈ کے بلند پایہ مستشرق رین ہارٹ ڈوزی (Reinhart Dozy) کے تحت کام کیا۔ وہ یکے بعد دیگرے لندن، ڈبلن اور کیمبرج یونیورسٹی میں پروفیسر رہا۔ وہ ابھی ۲۲ ہی برس کا تھا کہ اس نے اپنے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے نہایت شرح و بسط کے ساتھ اپنی آئندہ زندگی کا جو اس نے عربی زبان و ادب کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھی ایک نہایت حوصلہ مندانہ خاکہ پیش کیا تھا۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ اس نے باقی عمر اس خاکہ پر عمل کرنے میں کس حد تک کامیابی حاصل کرلی۔ اس کی دو کتابوں یعنی سفرنامہ ابن جبیر اور الکامل للمبرد کی اشاعت نے عربی ادب میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ اس نے المقری کی تاریخ الاندلس کی اشاعت میں ڈوزی کا ہاتھ بٹایا اور دوسری بہت سی پرانی عربی کتابیں شائع کیں۔ عربی صرف و نحو پر اس کی وہ کتاب جو دو جلدوں میں ہے آج بھی اپنی نوعیت کی بہترین کتاب خیال کی جاتی ہے اور اس سے انگریزی زبان بولنے والے ملکوں کے منتہی طلبہ استفادہ کرتے ہیں۔

عربی زبان کے پروفیسر کی حیثیت سے کیمبرج میں رائٹ (William Wright) کا جانشین رابرٹسن اسمتھ (Robertson Smith) تھا جو ۱۸۳۶ء سے ۱۸۹۳ء تک زندہ رہا۔ یہ اسکاٹ لینڈ کے شہر ابرڈین (Aberdeen) کا رہنے والا تھا۔ پہلے پہل وہیں کی یونیورسٹی میں پھر یورپ کی دوسری یونیورسٹیوں میں اس نے عربی زبان کی تعلیم حاصل کی۔ اس نے ابتداء ہی میں شہرت حاصل کرلی، یہاں تک کہ اڈنبرا میں اس کے قدردانوں کی ایک جماعت نے ۱۸۸۱ء میں ایک عام جلسہ میں اس کی علمی خدمات کو سراہتے ہوئے عربی کتابوں اور قلمی مسودوں کا ایک ذخیرہ اس کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کیا۔ ۱۸۷۹ء سے ۱۸۸۱ء تک اس نے متعدد بار مشرق قریب کا سفر کیا۔ اس اثنا میں اس نے

مصر، فلسطین اور شام کی سیاحت کی بلکہ عرب میں جدہ اور طائف تک پہنچ گیا۔ اس کی مطبوعات میں قدیم زمانے کے عربوں میں شادی و قرابت داری (Kinship and Marriage in Early Arabia) اور زمانہ جاہلیت کے تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر محققانہ کتابیں ہیں۔ یہ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا (Encyclopaedia Britannica) کا مدیر اعلیٰ (رئیس مجلس واضعین) تھا اور غالباً یہی ایک شخص تھا جو اس کا دعوی کر سکتا تھا کہ اس نے ابتداء سے آخر تک یہ کتاب پڑھی ہے۔ اس کے علم و مطالعہ کی وسعت پر تعجب ہوتا تھا اور خود اس کے دوست و رفیق ہر موضوع پر اس کی وسیع اور عمیق معلومات سن کر دنگ رہ جاتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے بستر مرگ پر نیم بے ہوشی کی حالت میں قرون وسطیٰ کے انگلستان کی تاریخ پر ایک مبسوط تقریر کر ڈالی۔

آخر میں ہمیں سر ولیم میور (Sir William Muir) کا ذکر کرنا چاہیے جو ۱۸۱۹ء سے ۱۹۰۵ء تک زندہ رہا۔ یہ اسکاٹ لینڈ کا باشندہ تھا۔ علوم عربیہ کے ماہر ہونے کے علاوہ اس نے ہندوستان میں ایک حاکم کی حیثیت سے بھی نام پیدا کیا۔ وہ ایڈنبرا یونیورسٹی کا ایک نامور اہل علم (اسکالر) تھا۔ اس نے انگریزی میں پیغمبر اسلام اور اسلامی تاریخ پر بہت سی کتابیں شائع کیں۔ ان میں سے اکثر کتابیں آج بھی انگلستان اور یورپ کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہیں۔ سیرت رسول پر اس نے جو مبسوط کتاب تالیف کی وہ خاص اہمیت رکھتی ہے اور نمایاں طور پر تعصب سے پاک ہے۔ اس کی "تاریخ خلافت" جو ان عربی ماخذوں پر مبنی ہے جن میں سے اکثر اس وقت تک غیر مطبوعہ حالت میں تھے، اپنے موضوع پر آج بھی انگریزی زبان میں بہترین کتاب خیال کی جاتی ہے۔

(عالم اسلام اور عیسائیت، اکتوبر ۹۳ء)

مسیحی اہلِ قلم کے اردو تراجم و تفاسیرِ قرآن

اردو زبان میں قرآن مجید کے تراجم اور تفاسیر کا وسیع ذخیرہ ہے جس میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کے سب ہی فقہی و کلامی مکاتبِ فکر نے اپنی اپنی استعدادِ کار اور دلچسپیوں کے تحت اس ذخیرے کی ثروت میں اضافہ کیا ہے، تاہم کم ہی تراجم و تفاسیرِ قرآن ایسی ہیں جو امتدادِ زمانہ کے باوجود مسلسل شائع ہو رہی ہیں اور ان کے قارئین میں کمی نہیں آئی۔ بہت سے تراجم اور تفاسیر صرف ایک دو بار شائع ہوئیں اور قصۂ ماضی بن گئیں۔ آج ان کا حصول جوئے شیر لانے کے مترادف ہے اور کسی ایک آدھ کتب خانے میں بھی یہ نایاب تراجم و تفاسیر یک جا نہیں۔ اس طرز کے تراجم و تفاسیر قرآن میں مسیحی اہلِ قلم کی کاوشوں کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔

مسیحی اہلِ قلم کو قرآن مجید کے تراجم اور تفاسیر کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ کیا یہ اسلام سے ان کی محبت کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے ترجمہ و تفسیرِ قرآن کے لیے اپنا وقت صرف کیا؟ یا محض اشتیاقِ علم تھا اور غیر جانب دارانہ طور پر اسلامی تعلیمات کو سمجھنے اور سمجھانے کی خواہش رکھتے تھے؟ یا یہ سب کچھ ان کی تبشیری سرگرمیوں کا حصہ تھا؟ ان سوالات کا جواب مسیحی اہلِ قلم کے تراجم و تفاسیر کے تفصیلی تجزیے کے بعد ہی دیا جا سکتا ہے اور اب تک ہمارے سامنے کوئی ایسا خصوصی مطالعہ نہیں آیا جس میں ایک ایک کر کے ہر مسیحی مترجم و مفسر کے کام کا جائزہ لیا گیا ہو۔ قرآن مجید کے اردو تراجم کے عمومی جائزے میں البتہ بطور تکملہ مسیحی مترجمین کا ذکر کیا گیا ہے اور بحیثیت مجموعی رائے دی گئی ہے۔ ڈاکٹر انصار اللہ نے ایک مضمون — "ابتدائی دور کے ہندوستانی مسلمان اور قرآنِ پاک کے تراجم" — کے آخر میں لکھا ہے۔[1]

> قرآن کریم کے مطالعہ، ترجمہ اور تفسیر کا کام صرف مسلمانوں نے ہی نہیں کیا ہے۔ اس نیک کام میں غیر مسلموں نے بھی حصہ لیا ہے۔ جن عیسائی پادریوں اور عالموں نے ترجمہ مکمل کیا، ان میں ریورنڈ احمد شاہ پادری، علی بخش پادری وغیرہ کے نام قابلِ توجہ ہیں۔ عیسائی پادریوں کا شائع کردہ پہلا قرآن کریم مع ترجمہ و تفسیر غالباً وہ ہے جو مطبع پیغام، دہلی سے ۱۸۸۳ء میں چھپا تھا۔ جو پادری اس کام کو مکمل نہیں کر سکے یا جنھوں

نے محض کسی جزو کا ترجمہ کیا، ان میں سے علی بخش پادری اور سلطان محمد خان پادری کا نام آتا ہے۔

ڈاکٹر انصار اللہ کے مذکورہ مقالے پر جناب نور الحسن راشد نے محاکمہ لکھتے ہوئے ان کی متعدد اغلاط کی نشاندہی کی ہے۔ مسیحی مترجمین و مفسرین کے حوالے سے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، من و عن نقل کیا جاتا ہے۔[٢]

> انصار اللہ صاحب کے مضمون میں عیسائیوں کے شائع کیے ہوئے تراجم کے تحت ایک ترجمہ کا مطبع پیغام دہلی کی اشاعت ١٨٨٣ء کے حوالے سے ذکر کیا گیا ہے۔ یہ اطلاع بھی شایانِ قبول نہیں ہے۔[٣] یہ ترجمہ الہ آباد سے چھپا تھا۔[٤] اس ترجمہ کے متعلق قدیم ترین دریافت و اطلاع گارساں دتاسی کی ہے، وہ اپنے پہلے خطبے میں کہتا ہے۔
>
> اس قسم کی مطبوعات میں سب سے دلچسپ قرآن کا ایک ایڈیشن ہے جسے ایک پر سبی ٹیرین امریکن نے ١٨٤٤ء میں الہ آباد میں طبع کرایا، اس کے شروع میں ایک دیباچہ ہے جس میں مسلمانوں کی غلطیوں اور عیسائی مذہب کے خلاف ان کے اعتراضوں کی تردید کی گئی ہے۔—[٥]

یہ صحیح ہے کہ ہندوستان میں پادریوں نے قرآن کریم کے متعدد ترجمے کیے ہیں، شاہ عبد القادر کی موضح قرآن کو رومن میں چھاپا ہے۔ ان ترجموں اور اشاعتوں کا تاریخی معلومات کی تکمیل کے لیے تذکرہ کرنا ضروری ہے مگر ان کی اس کارگزاری کو نیک کام کہنا کسی طرح بھی موزوں نہیں۔ عیسائیوں نے قرآنِ کریم کے حوالے سے جو قلمی تحریری کام کیا ہے، اس کا مقصد قرآن پاک کے صحیح مترجمین و مفسرین کے مقاصد سے بہت مختلف تھا اور خاصی حد تک نازیبا اور پست مقصد تھا۔ پادریوں کی ان کاوشوں کا مرکزی نقطہ یہی تھا کہ قرآنِ کریم کے منزل من اللہ، کتابِ ہدایت اور خدا کے آخری پیغام ہونے کی بہر صورت (معاذ اللہ!) تردید کی جائے، اس کی صداقت و تعلیمات پر یقین و عقیدہ کو مسلسل کمزور کیا جائے اور اس کوشش کے نتیجے میں مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کرنے کی جدوجہد عام ہو سکے۔ یہ حقیقت ہے کہ مشنریوں کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوا اور ان کے چھاپے ہوئے ترجموں اور تفاسیر قرآن کو مسلمانوں میں کبھی بھی پذیرائی اور قبولِ عام حاصل نہیں ہوا، تاہم اس میں شک نہیں کہ قرآنِ پاک کے ان تراجم و تفاسیر کی تالیف و طباعت میں جو ہندوستان میں مشنریز اور پادریوں کے ذریعہ شائع ہوئے، مسلمانوں کی بھلائی اور خدمتِ قرآن کا کوئی پہلو نہیں تھا۔ اس لیے ان تراجم و تفاسیر کو نیک کام یا خدمتِ قرآن کریم لکھنا، قرآن

پاک کے صحیح تراجم اور تفاسیر کی گویا توہین اور حق تلفی ہے، جس کو کسی صورت گوارا نہیں کیا جاسکتا۔

اگر میرے محترم ڈاکٹر انصار اللہ صاحب، پادری سلطان محمد پال یا پادری جے علی بخش کے تراجم قرآن خصوصاً موخرالذکر کی صرف تمہید ملاحظہ فرمالیتے تو شاید ان کا تذکرہ بھی مناسب خیال نہ کرتے، ان کو نیک خدمات قرار دینا تو بہت دور ہے۔

مسیحی اہلِ قلم کے تراجم و تفاسیرِ قرآن کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ پادری عمادالدین لاہز (م اگست ۱۹۰۰ء) اور پادری ریورنڈ احمد شاہ نے پورے قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ پادری عمادالدین کا "ترجمۃ القرآن بزبان اردو" نیشنل پریس امرتسر سے ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا اور پادری احمد شاہ کا ترجمہ "القرآن" ۱۹۱۵ء میں زمانہ پریس کانپور سے طبع ہوا۔

متذکرہ صدر پادریوں کے بعد پادری سلطان محمد پال نے مسیحی جریدہ "المائدہ" (لاہور) میں تفسیرِ قرآن کا سلسلہ "سلطان التفاسیر" کے نام سے شروع کیا، بعد میں یہ سلسلۂ تفسیر ایک دوسرے مسیحی ہفت روزہ "النجات" (لاہور) میں جاری رہا، تاہم پادری سلطان محمد پال صرف پہلے پارے کی تفسیر لکھ سکے۔[۷] (تالیف مابین ۱۹۳۲ء-۱۹۳۳ء)

جب پادری سلطان محمد پال تفسیر لکھ رہے تھے، ان کے ساتھ ساتھ پادری جے۔علی بخش ترتیب نزولی کے مطابق قرآن کی تفسیر شروع کر چکے تھے، ان کی تفسیر کا ایک حصہ جو صرف مکی سورتوں پر مشتمل ہے۔ ۱۹۳۵ء میں متنِ قرآن کے ساتھ شائع ہوا۔[۷]

مولانا ثناء اللہ امرتسری (م ۱۹۴۸ء)[۸] اسلام کے بڑے مجاہد سپاہی تھے، زبان اور قلم سے اسلام پر جس نے بھی حملہ کیا، اس کی مدافعت میں جو سپاہی سب سے [پہلے] آگے بڑھتا وہ وہی تھے۔ "چنانچہ انہوں نے پادری سلطان محمد پال کی "سلطان التفاسیر" کا محاکمہ ہفت روزہ اہل حدیث (امرتسر) میں "برہان التفاسیر" کے نام سے شروع کیا [۶ مئی ۱۹۳۲ء] جو تین برس تک چلتا رہا۔

پادری جے۔علی بخش کی تفسیر پر بھی مولانا امرتسری نے قلم اٹھایا۔ ان کے تبصرے کا اقتباس دیکھیے۔

> عیسائیوں کی طرف سے قرآن شریف کے متعلق جتنی تصانیف ہندوستان میں پادری فنڈر کے زمانہ سے کچھ عرصہ پہلے تک شائع ہوئیں، سب صورتاً و معناً مخالف تھیں۔ چند روز سے عیسائی پادریوں (جو اسلام چھوڑ کر ادھر گئے ہیں۔) کی طرف سے جو تصنیف نکلتی ہے، وہ صورتاً موافق و معناً مخالفت ہوتی ہے۔ پہلی روش کی مثال میں بصورت آخری حملہ کے ہم وہ کتاب پیش کرتے ہیں جس کا نام ہے "عدم ضرورتِ قرآن" اس

کے مصنف پادری ٹھاکر داس تھے۔ اس کا جواب ہم نے کتاب "تقابل ثلاثہ (تورات، انجیل اور قرآن کا مقابلہ)" کی صورت میں دیا۔ اس کتاب میں قرآن کی کھلی مخالفت اور واضح تردید تھی۔ اس کے بعد دوسرا دور شروع ہوا جو صورتاً مخالف نہیں مگر معناً سخت مضر ہے۔ اس کی مثال پادری سلطان محمد خان کی تصانیف "ہمارا قرآن" وغیرہ ہیں۔ جن میں اپنا بن کر دکھایا گیا ہے کہ قرآن شریف کے سارے مضامین کتبِ سابقہ سے ماخوذ ہیں، اس لیے اس کی ضرورت نہیں —

آج جس کتاب کا نام زیبِ عنوان ہے، یہ بھی قسم دوم سے ہے جو پادری سے علی بخش صاحب نے لکھی ہے۔ اس میں قرآن شریف کی سورتوں کی تقسیم مکی اور مدنی میں کر کے ساری مکی سورتوں کو ایک جلد میں جمع کر کے یکجا کیا گیا ہے۔ دوسرے حصہ میں شاید مدنی ہوں گی۔ ان میں سے ایک ایک سورۃ کو لے کر کتبِ سابقہ کے حوالوں سے موافق بتایا ہے۔ اس سے بھی یہی غرض ہے کہ قرآن شریف ان کتب سے ماخوذ ہے۔ مگر جو مسئلہ قرآن اور انجیل (بلکہ بقول مسیحیاں ساری بائبل) میں اختلافی ہے، جہاں اس کا ذکر آیا ہے، وہاں سے پادری صاحب بڑی عقل مندی سے خاموش نکل گئے ہیں۔ ہم پادری صاحب کی اس عقل مندی کی داد دیتے ہیں۔ مثلاً سورہ مریم میں حضرت مسیح کی پیدائش اور تعلیم کا مختصر مگر دوسری جگہ اس کی نسبت مفصل ذکر آیا ہے۔ — پارہ ۱۶، رکوع ۵

— ان آیات میں حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش کا ذکر کرنا محض اس غرض سے ہے کہ مسیح کی الوہیت کا ابطال ہو اور مسیحیوں کے عقیدہ متضمن بہ الوہیتِ مسیح کی اصلاح ہو۔ پادری سے علی بخش صاحب اپنی تفسیر میں ان آیات کے پاس بعزت و احترام گزر گئے ہیں۔ نہ مسیحی عقیدے کی تائید کی اور نہ قرآنی فرمان کی تصدیق۔

رموزِ عاشقاں عاشق بداند

اسی طرح اور بھی کئی جگہ ایسا ہی کیا ہے۔ پادری صاحب کی نیت تو عیاں ہے کہ قرآن شریف کو کتبِ سابقہ سے ماخوذ ثابت کر کے ان کا رہینِ منت بتایا جائے، تاہم ہم اس کو بھی قرآنی خدمت جانتے ہیں اور پادری صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ اس کی دوسری جلد بھی شائع کریں —"

مولانا ثناء اللہ امرتسری نے پادری سے علی بخش کے کام کو "قرآنی خدمت" سے تعبیر کیا ہے اور ان سے درخواست کی ہے کہ وہ مدنی سورتوں کی تفسیر بھی شائع کر دیں، جو کبھی شائع نہیں ہو سکی۔ اس کا سبب تفسیر میں پادری صاحب کا اختیار کردہ مناسب لہجہ اور حسین اندازِ بیان ہے۔ پادری صاحب

نے قرآن مجید کے بارے میں دوسرے مسیحی اہلِ قلم سے مختلف اندازِ فکر اختیار کیا ہے۔ گو وہ قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا اقرار تو نہیں کرتے تاہم وہ اسے حضرت نبی اکرم ﷺ کی تصنیف بھی نہیں سمجھتے بلکہ قرآن کو اس انداز کا مکاشفہ خیال کرتے ہیں جیسا انبیائے بنی اسرئیل کو حاصل ہوتا رہا ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی (م ۱۹۷۹ء) نے اپنے تبصرے میں لکھا تھا کہ "

> اگر عیسائی علماء اسی طرح کھلے دل کے ساتھ نیک نیتی سے قرآن کا مطالعہ کریں تو شاید اس حقیقت کے اعتراف میں کوئی امر مانع نہ ہوگا کہ قرآن مجید تمام پچھلی کتبِ آسمانی کا مصدق اور مہیمن ہے اور اسی پیغام کو باطل کی تمام آمیزشوں سے پاک کر کے پیش کر رہا ہے جسے اللہ کے نبی ہر زمانے میں پیش کرتے رہے ہیں۔

پادری عماد الدین سے لے کر پادری سلطان محمد پال تک نے جو تراجم و تفاسیرِ قرآن لکھی ہیں، حقیقتاً یہ مسلمانوں کے لیے نہیں لکھی گئیں بلکہ مسیحی منادوں اور مبشروں کو ان کے ذریعے مسلمانوں کے درمیان بہتر طور پر کام کرنے کے قابل بنانا تھا۔ اگر مسیحی مناد مسلمانوں کے تراجم و تفاسیر کا مطالعہ کرتے تو یقیناً یہ تبشیری مقصد حاصل نہ ہو پاتا۔ البتہ پادری احمد علی بخش نے نسبتاً بہتر رویہ اختیار کیا اور بعض مناظرانہ موضوعات پر خاموشی اختیار کی۔ اس سے احساس ہوتا ہے کہ شاید ان کی خواہش تھی کہ ان کی تفسیر مسلمانوں کے علمی حلقوں میں پڑھی جائے مگر انھوں نے تفسیر کے لیے ترتیبِ رسولی ترک کر کے ترتیبِ نزولی کا راستہ اختیار کیا جو قطعاً ناقابلِ اعتبار تھا۔

مستشرقین نے ترتیبِ نزولی طے کرنے کی کوششیں کی تھیں اور ان کے زیرِ اثر برصغیر میں ۱۹۱۱ء میں مرزا ابوالفضل نے اس ترتیب کے ساتھ متنِ قرآن مع انگریزی ترجمہ شائع کیا تھا جس پر سخت احتجاج ہوا اور اس کے بعد کم از کم کسی مسلمان کو ترتیبِ نزولی کے مطابق قرآن مجید شائع کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ مسلمانوں کے درمیان احمد علی بخش کی تفسیر کو کیا مقبولیت حاصل ہوتا تھا، خود مسیحی برادری میں چنداں بار نہ پا سکی اور شاید یہی سبب ہے کہ مدنی سورتوں پر پادری صاحب کچھ شائع نہ کر سکے تھے۔

تبشیری مقاصد کے تحت قرآن کے ترجمہ و تفسیر کے جو اکا دکا حصے شائع کیے گئے ہیں، ان میں سے ایک "سورہ فاتحہ" [لودیانہ: کرسچن لٹریچر سوسائٹی (۱۹۰۰ء)] پیشِ نظر ہے۔ اس میں سورہ فاتحہ کا لفظی ترجمہ اور عام فہم تشریح کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ سورہ فاتحہ کی تعلیم بہت خوب ہے۔ جب آپ دعا میں اس کو دہراتے ہیں تو اس کے معنوں کو سمجھ کر دعا مانگیں تاکہ وہ آپ کو راہِ مستقیم پر چلا دے۔ آخر میں "مالک یوم الدین" کے تحت حضرت مسیح کی تصلیب بطور کفارہ اور مسیحی نقطۂ نظر کے مطابق بخشش کا تصور پیش کیا گیا ہے۔

آج انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے نصف اوّل کا مناظرانہ دور ختم ہو چکا ہے اور ان تلخ بحثوں کو تازہ کرنے سے چنداں کچھ حاصل نہیں ہوتا مگر بیسی۔ مسلم تعلقات کے متخصصین کو اس سے صرفِ نظر نہ کرنا چاہیے کہ وہ اس دور کے مباحث سے پورے طور پر واقف ہوں۔ مسیحی اہلِ قلم میں اس کا احساس شدت سے موجود ہے۔ حال ہی میں شائع ہونے والی متعدد کتابوں میں سے ایک، اورپل این پوویل کی تالیف Muslim and Missionaries in Pre-Mutiny India اسی سلسلے کی کوشش ہے۔

حواشی

زیرِ نظر حواشی "ادارہ" کی جانب سے ہیں البتہ حواشی ۴ اور ۵ جو جناب نور الحسن راشد کے مضمون سے لیے گئے اقتباس سے متعلق ہیں، ان ہی کے لکھے ہوئے ہیں۔ ان میں ضرورت کے مطابق جو اضافہ ناگزیر تھا، [ ] میں درج کیا گیا ہے۔

۱۔ سہ ماہی "خدا بخش لائبریری جرنل" (پٹنہ)، جنوری تا جون ۱۹۹۱ء، ص ۲۱۱

۲۔ ایضاً، اشاعت ۱۹۹۲ء، ص ۱۷۳-۲۷۴

۳۔ عیسائی پادریوں کا شائع کردہ زیرِ بحث ترجمہ شاید ڈاکٹر انصار اللہ کی نظر سے نہیں گزرا۔ انھوں نے "جائزہ تراجم قرآنی" کی بیان کردہ معلومات نقل کر دی ہیں۔ دیکھیے: محمد سالم قاسمی، سید عبدالرؤف عالی، سید محبوب رضوی (مرتبین)، جائزہ تراجم قرآنی، دیوبند: مجلس معارف القرآن (۱۹۶۸)، ص ۷۶

۴۔ ڈاکٹر احمد خان نے الٰہ آباد کے مطبوعہ اس ترجمہ کا تین الگ الگ جگہوں پر ذکر کیا ہے۔ [دیکھیے: قرآن کریم کے اردو تراجم (کتابیات)، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان (۱۹۸۷ء)]، ص ۱۳۴، اندراج ۳۳۵، ص ۱۶۳، اندراج ۵۶۲، ص ۱۹۰، اندراج ۶۶۵، ان میں سب سے پہلا درست ہے مگر اسی کو انصار اللہ صاحب نے نظر انداز کیا ہے۔ [یعنی جناب نور الحسن راشد کی تحقیق کے مطابق درست کتابیاتی معلومات یہ ہیں۔

قرآن (ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی)، الٰہ آباد: پریسبی ٹیرین مشن پریس، ۱۸۴۴ء/۱۲۶۰ھ، ۳۵۶۰۳ ص۔]

۵۔ گارساں دتاسی، خطبات گارساں دتاسی، اورنگ آباد (۱۹۳۵ء)

۶۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: اختر راہی، مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مطالعہ عیسائیت، ماہنامہ "عالم اسلام اور عیسائیت" (اسلام آباد)، مارچ ۱۹۹۴ء، ص ۵-۱۶، مئی ۱۹۹۴ء، ص ۱۰-۱۳

٧۔ ڈاکٹر احمد خان نے یادری ہے۔ "علی بخش کی "تفسیر قرآن" کو ایک جگہ قرآن مجید کی "جزوی" اور دوسری جگہ "مکمل" تفسیر قرار دیا ہے۔ دیکھیے: حوالہ مذکورہ، ص ٦٩ اور ص ١٦٢، اول الذکر اطلاع درست ہے۔

٨۔ سید سلیمان ندوی، یادِ رفتگاں، کراچی، مکتبۃ الشرق (١٩٥٥ء)، ص ٣٣١

٩۔ دیکھیے: اختر راہی، حوالہ مذکورہ، مئی ١٩٩٢ء، ص ١٢-١٣

١٠۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، ادبیاتِ مودودی [مرتبہ: خورشید احمد]، لاہور، اسلامک پبلی کیشنز (١٩٧٣ء)، ص ٣٧٣

(عالم اسلام اور عیسائیت، دسمبر ٩٣ء)

عہد اکبر کے مغربی زبان دان

[پروفیسر سید محمد سلیم صاحب ان دنوں "مغربی زبانوں اور مغربی علوم کے فاضل ـــــ قیام علی گڑھ سے قبل" کے زیر عنوان ایک کتاب ترتیب دے رہے ہیں۔ "عالم اسلام اور عیسائیت" کے شمارہ جون ۱۹۹۳ء میں جناب سلیم الدین قریشی کی تحریر پڑھ کر انہوں نے اپنی کتاب کا وہ حصہ مرحمت فرمایا ہے جس میں جلال الدین اکبر کے عہد کے مغربی زبان دانوں کا تذکرہ ہے۔ "مراۃ القدس" کے مترجم عبدالستار بن قاسم لاہوری کی تالیف "ثمرۃ الفلاسفہ" کے نسخوں کے بارے میں مزید معلومات سامنے آتی ہیں۔ ذیل میں پروفیسر صاحب کی غیر مطبوعہ کتاب کا محولہ بالا حصہ نقل کیا جاتا ہے۔ مدیر]

پرتگال کے جو لوگ ہندوستان میں آئے، ان کے اندر یسوعی (JESUIT) فرقے کے لوگ زیادہ سرگرم عمل تھے۔ تحریک اصلاحِ دین (Reformation) کے جواب میں پوپ نے ردِ تحریکِ اصلاح (Counter-Reformation Movement) جاری کی تھی۔ اس کی سرگرم شاخ یہ یسوعی فرقہ تھا۔ اس کے مبلغین یورپ اور ایشیا میں سب جگہ پھیل گئے۔ گوا میں یہ فرقہ طاقت ور تھا۔

جس زمانے میں اکبر بادشاہ مذہبی امور کی تحقیقات میں دلچسپی لے رہا تھا اور اس نے مختلف مذاہب کے لوگوں کو جمع کر رکھا تھا، اس نے گوا کے مسیحی پادریوں کو بھی بلایا تھا۔ اس کی دعوت پر دو پادری لاہور میں اس کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ فادر ایڈورڈ لیٹن اور کرسٹوفر ڈی ویگا[1]۔ بادشاہ نے ان کے ساتھ بڑی مہربانی کا برتاؤ کیا اور ان کے قیام و طعام کا معقول بندوبست کیا۔[2]

فرنگی اسکول

اکبر بادشاہ کی ترغیب پر انہوں نے لاہور میں فرنگی زبان کی تعلیم کا اسکول قائم کیا جس میں امراء اور نوابین کے بچوں کو داخلہ دلایا گیا۔ بادشاہ نے اپنے لڑکے مراد کو بھی اس میں داخل کرایا تھا۔ ان طلبہ کو لاطینی اور پرتگالی زبانوں میں لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا تھا۔ لیکن پادریوں کو مسیحیت کی اشاعت، خاص طور پر بادشاہ کو مسیحی بنانے سے اصل دلچسپی تھی، اس لیے اسکول کے معاملے میں انہوں نے زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ بہرکیف مغربی زبان سکھانے والا یہ پہلا مدرسہ تھا جو ہندوستان کی سرزمین پر قائم ہوا اور ایک

مسلمان بادشاہ کی ترغیب سے قائم ہوا۔

ابوالفضل

ابوالفضل اکبر بادشاہ کا وزیرِ اعظم تھا۔ بادشاہ کے حکم پر اس نے انجیل مقدس کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ (٩٨٦ھ/١٥٧٨ء)۔ ترجمہ اس نے پادریوں سے پوچھ پوچھ کر کیا تھا۔[٣] اس نے خود فرنگی زبان نہیں سیکھی تھی۔ ترجمہ کے آغاز پر بسم اللہ کی بجائے ابوالفضل نے یہ شعر لکھا تھا

ای نامے، وے ژوژو کرستو   سبحانک ماسواک یاہو

ژوژو کرستو Jesus Christ کی تفریس ہے۔

ملا عبدالقادر بدایونی کا بیان ہے کہ پہلا مصرعہ ابوالفضل کا ہے اور دوسرا فیضی کا ہے۔

عبدالرحیم خان، خاناں

اکبر بادشاہ نے خانِ خاناں کو مامور کیا کہ وہ فرنگیوں کی زبان سیکھے۔ اس نے کئی فرنگی زبانیں سیکھ لیں۔ جن میں وہ بے تکلف لکھتا پڑھتا تھا۔ گوا کے پادریوں نے خانِ خاناں کو XANACANE لکھا ہے۔ اس کی زبان دانی کی سب نے تعریف کی ہے۔ فرید بھکری لکھتا ہے۔[٤]

در ہر زبان کہ در عالم رائج است ماہر بود، حرف می زد (دنیا میں جو بھی زبان رائج ہے، وہ سب جانتا تھا اور سب میں گفتگو کرتا تھا۔)

"مآثرِ رحیمی" کے مصنف عبدالباقی نہاوندی نے زیادہ تفصیل سے لکھا ہے۔[٥]

چونکہ ہندوستان کے اکثر ساحل عیسائیوں کے تصرف میں ہیں، اور فرنگی سلاطین اور فرماں روایانِ ہند کے درمیان اکثر خط و کتابت کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ ظل اللہ اکبر بادشاہ نے اس سپہ سالار (خانِ خاناں) کو حکم دیا کہ عیسائیوں کی زبان اور اس کا رسم الخط سیکھے۔ چنانچہ پائے تخت شاہی میں مقیم کئی روساء، تاجروں اور سیاحوں سے تھوڑا سا ربط و ضبط پیدا کیا۔ اور باقاعدہ عیسائیوں کی زبان اور رسم الخط کی مشق کر لی۔ اور اب بلا جھجک کہا جا سکتا ہے کہ خانِ خاناں عیسائیوں سے زیادہ عیسائیوں کی زبان کا ماہر ہے۔

اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ عبدالرحیم خانِ خاناں پہلا ہندوستانی مسلمان تھا جو مغربی زبان - پرتگالی زبان - جانتا تھا اور بلا تکلف بولتا تھا۔

عبدالستار بن قاسم

عبدالستار مشہور مؤرخ محمد قاسم فرشتہ کا فرزند تھا۔ وہ اکبر کے دربار کا ایک امیر تھا۔ اکبر کے حکم

پر اس نے پرتگالی اور لاطینی زبانیں سیکھی تھیں۔ عبدالستار نے چھ ماہ کی مدت میں پادری جیرونمو شویرے یہ زبانیں سیکھ لیں تھی۔ وہ آسانی سے یہ زبانیں پڑھتا تھا۔ اس نے "مشاہیر یونان و روما" کے حالات پر ایک کتاب کا ترجمہ "ثمرۃ الفلاسفہ" کے نام سے کیا تھا۔ اس میں یونان اور روما کے فلسفیوں کے حالات تھے۔ ١٨٥٧ء کے ہنگامے کے بعد محمد حسین آزاد حکومت کی دارو گیر سے چھپتے پھرتے تھے۔ کچھ زمانہ انھوں نے اپنے ہم درس خلیفہ محمد حسین وزیر اعظم پٹیالہ کے پاس گزارا تھا۔ ان کے کتب خانے میں انھوں نے "ثمرۃ الفلاسفہ" دیکھی تھی، "دربار اکبری" میں انھوں نے کتاب کے دیباچے سے چند سطریں نقل کی ہیں اور لکھا ہے کہ یہ کتاب ٣٨ جلوسِ اکبری (١٠١١ھ/١٦٠٣ء) میں ترجمہ کی گئی۔[6]

"دربارِ اکبری" کے بیان پر مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں۔[7] "کاش پنجاب کے کوئی بزرگ خلیفہ محمد حسین کے کتب خانہ کی اس پہلی مغربی زبانوں سے ترجمہ شدہ کتاب کا سراغ لگائیں اور اس کے مضامین سے آگاہی بخشیں۔"

سہ روزہ اخبار Radiance (دہلی) کی اشاعت ٢٦-٣٠ مئی ١٩٩٠ء میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ ثمرۃ الفلاسفہ از عبدالستار بن قاسم کا قلمی نسخہ National Archives Of India, Delhi نے حاصل کیا ہے۔

عبدالستار بن قاسم نے ایک اور کتاب "داستانِ احوالِ حواریاں" کا بھی فارسی میں ترجمہ کیا۔ مزید ایک اور کتاب "داستانِ مسیح" کا پرتگالی سے فارسی ترجمہ پادری زیرو نمو زیویر کی اعانت سے کیا تھا۔ زیویر نے اس کے مقدمہ میں لکھا ہے۔

مولانا عبدالستار بن قاسم لاہوری باتفاق ایں بندہ در جہاں دارالخلافہ آگرہ ترجمہ کرد سن ہزار و شش و صد ودو (١٦٠٢ء) از ولادت حضرت ایشوع چہل و ہفت الہی از جلوس مقدس شاہنشاہی (٤٧ جلوس) انجام یافت[8]

اس کا ایک باتصویر نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن میں موجود ہے۔[9] اس کتاب کے چار حصے ہیں (١) پیدائش و طفولیت (٢) تعلیمات و معجزات (٣) موت و تعذیب (٤) احیاء و رحلت

اسی انداز پر شہنشاہ جہانگیر اور شاہجہان کے واقعات بھی جمع کیے ہیں۔

حواشی

1. Rev. Father Flex, Mughal Farmans, Parwanahs and Sanads, Agra (1913) p.11
2. V.D. Mahajan, History of India after 1526, Vol. II, Delhi (1962), p. 2.

پادری برکت اللہ، مغلیہ سلطنت اور مسیحیت، لاہور (۱۹۷۰ء)، ص ۱۶۵

۳۔ عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، کلکتہ (۱۸۶۹ء)، جلد ۲، ص ۲۶۰، عبدالحی رائے بریلوی، نزہتہ الخواطر، حیدر آباد دکن (۱۹۵۷ء)، جلد ۶، ص ۳۶

۴۔ فرید بھکری، ذخیرۃ الخوانین، کراچی (۱۹۶۱ء)، جلد ۱، ص ۶۰

۵۔ شبلی نعمانی، مقالات شبلی، بحوالہ ماثر رحیمی، ص ۱۳۱

۶۔ محمد حسین آزاد، دربار اکبری، لاہور (۱۹۱۰ء)، ص ۱۱۸

۷۔ مناظر احسن گیلانی، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، دہلی (۱۹۴۴ء)، جلد ۱، ص ۵۰ (حاشیہ)

۸۔ سلیم الدین قریشی، فارسی کی پہلی کتاب، ماہنامہ "کتاب" (لاہور)، نومبر ۱۹۸۵ء

۹۔ ذکاء اللہ دہلوی، تاریخ ہندوستان، عہد اکبر بادشاہ، ص ۸۶

(عالم اسلام اور عیسائیت، اگست ۹۳ء)

سفینۃ النیل فرعون

ڈاکٹر اے ۔ بی اشرف

میں اور نیاز احمد صاحب دوسرے مسافروں کے ساتھ استنبول ائیرپورٹ کے لاؤنج ۲۰۱ میں بیٹھے جہاز میں داخل ہونے کے اعلان کے منتظر تھے ۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ایک دلکش نسوانی آواز میں اعلان سنائی دیا ، پہلے ترکی زبان میں اور پھر انگریزی میں ، کہ مسافر گیٹ ۲۰۸ کے ذریعے جہاز کی طرف بڑھیں ۔ دروازے پر حسین و جمیل نیلی آنکھوں والی ترکی دوشیزہ دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ مسافروں کا استقبال کر رہی تھی اور ٹکٹ کا ایک ایک حصہ بڑی نزاکت سے کتر کر دوسرا مسافروں کے ہاتھ میں دیتی جاتی تھی ۔ مسافر ایک ایک کر کے لمبی گیلری میں سے ہوتے ہوئے مصری ائیرلائن کے چھوٹے سے جہاز میں داخل ہو رہے تھے ۔ جہاز کے دروازے پر سانولی سلونی مصری ہوائی میزبان مسافروں کو اہلاً و سہلاً کہہ رہی تھی ۔ ہماری نشستیں جہاز کی دم میں تھیں سب سے پیچھے --- باقی نشستیں تو تین تین تھیں لیکن ہماری صرف دو تھیں ۔ کھڑکی کی طرف نیاز صاحب براجمان ہوئے اور کوری ڈور والی سیٹ میں نے سنبھالی ۔ جہاز میں مصری بھی تھے ۔ زیادہ تر کالے اور گھنگریالے بالوں والے ۔ ترکی بھی تھے --- سرخ و سفید اور خوبصورت ، جاپانی بھی تھے ---- چپٹی ہوئی ناکوں اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں والے لیکن چاک و چوبند -- چٹی چمڑی والے جرمن اور انگریز بھی تھے دلکشی سے کوسوں دور --- اور ہم دو پاکستانی بھی -- سانولے اور سال خوردہ --- جہاز چھوٹا سا تھا جس میں سو سوا سو مسافروں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی ۔ کچھ نشستیں خالی بھی پڑی تھیں ۔ قاہرہ کی فلائیٹ کا اعلان سنتے ہی ایک دم پی آئی اے کی پہلی بوئنگ فلائیٹ کا خیال آیا جو قاہرہ پہنچنے سے پہلے ہی حادثے کا شکار ہو گئی تھی ۔ دل میں ایک ہول سا اٹھا لیکن پائلٹ کی گمبھیر اور باوقار آواز تلی " بسم اللہ الرحمن الرحیم " --- تو دل کو فوراً تقویت حاصل ہوئی ۔ جہاز مائل پرواز ہوا اور ہم بہت جلد بحیرے پہ تیرنے لگے ۔

نیاز صاحب کو ترکی آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا ۔ یہ ان کا ترکی کا تیسرا پھیرا تھا ۔ پہلی بار ۱۹۸۸ کی سردیوں میں آئے جب میں خود بھی ترکی میں نووارد تھا ۔ اس وقت ان کے ساتھ ان کے چھوٹے صاحبزادے افضال احمد تھے ۔ دوسری بار ۱۹۹۱ کی گرمیوں میں بیگم مہر و طلعت کے ساتھ آئے اور ان ہمراہی ہم وطنوں میں اصغر ندیم سید ، ڈاکٹر سعادت سعید ، مرزا یاسین اور افتخار محمود شامل تھے ۔ لیکن اب کے جتنا آئے تھے بلا شرکت غیرے ۔ آنے سے پہلے ان کا خط بھی آیا اور تاکیدی فون بھی کہ میں مصر کا ویزہ لگوا کر رکھوں ۔ نیاز احمد صاحب

سنگ میل پبلی کیشنز کے بانی مبانی اور روح رواں ہی نہیں پاکستان بھر کے ادیبوں اور شاعروں کے مرکز نگاہ اور مربی و سرپرست بھی ہیں۔ وہ واحد پبلشر ہیں جو ادیبوں کی نگارشات کو نہ صرف خوبصورت اور دیدہ زیب انداز میں شائع کرتے ہیں بلکہ ان کو باقاعدہ رائلٹی بھی ادا کرتے ہیں۔ کاش کہ منٹو کو ان کی زندگی میں نیاز احمد جیسا پبلشر ہاتھ آجاتا تو کچھ دن اور جی لیتے۔ نیاز صاحب کی اخلاقی خوبیوں میں ان کی سادگی، راست گوئی، اخلاص اور دوستوں سے دوستی نبھانا ہے۔ دنیا بھر کے ملکوں سے کوئی ادیب لاہور پہنچے ایک دعوت نیاز صاحب کے ہاں ضرور ہوتی ہے۔ ان کے ڈرائنگ روم میں دوپہر کے کھانے پر خاص رونق رہتی ہے۔ اکیلے کھانے کے وہ عادی نہیں۔ خود کم کھاتے ہیں لیکن دوستوں کو کھلا کر خوش ہوتے ہیں۔ قسم قسم کے لذیذ کھانے پکوا کر میز کو سجانے اور دوستوں کو کھلا کر خوشی محسوس کرنا ان کا مشغلہ ہے۔ ان کے ہاں کا ناشتہ تو بہت مشہور ہے جس میں سری پائے اور نہاری سے لیکر تلی ہوئی مچھلی، حلوے مانڈے، قیمہ بھرے پراٹھے، گاجر کا حلوہ اور نہ جانے کیا کیا نعمتیں موجود ہوتی ہیں۔ یہ ناشتہ سال میں ایک دو بار ہوتا ہے جس میں لاہور کے کم و بیش تمام ادیب و شاعر شرکت کرتے ہیں اور اس ناشتے کا انتظار اور تصور سال بھر باندھتے ہیں۔

نیاز صاحب انقرہ پہنچے تو قدرت نے ان کو زبردست برف باری کے ذریعے نوازا اور ان کے ساتھ ساتھ انقرہ والوں کو بھی نہال کیا کیونکہ بارش اور برف ترکی کے لئے باعث زحمت نہیں رحمت کا سبب بنتے ہیں۔ اگر کچھ عرصہ برف نہ پڑے یا بارش نہ ہو تو پانی کا قحط پڑنے لگتا ہے۔ اس دفعہ برف اتنی پڑی کہ میرے تین سالہ قیام کے دوران پہلے کبھی نہیں پڑی تھی۔۔ میری اہلیہ، چھوٹا بھائی احمد نواز اور دو بیٹیاں ثمرین اور ہما بھی میرے پاس انقرہ میں ہیں۔ ہم سب نیاز صاحب کی معیت میں برف باری کا لطف اٹھانے باہر نکلے۔ پارک میں چاروں طرف برف کے ڈھیر لگے تھے۔ درختوں کی ٹہنیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں اور برف کی سلاخیں شاخوں سے لٹک رہی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے پودوں اور گھاس پر بھی برف جمی تھی۔ گویا پورا منظر برف آلود تھا۔ برف کے گولے ایک دوسرے پر پھینکے گئے۔ ترکوں کا بھی یہ پسندیدہ مشغلہ ہے۔ جونہی برف پڑے بچے باہر نکل کر ایک دوسرے پر برف باری شروع کر دیتے ہیں۔

نیاز صاحب مصر کا ویزہ لگوا کر اور ٹکٹ بنوا کر آئے تھے۔ مجھے مصر کے سفارت خانے سے ایک دن میں ویزہ مل گیا۔ فلائیٹ استنبول سے تھی۔ ہم ایک روز پہلے انقرہ ایکسپریس کے ذریعے استنبول روانہ ہوئے۔ اس ٹرین کو Yatakli Tren یعنی بستر والی گاڑی کہتے ہیں۔ ہر ایک کے لئے الگ الگ چھوٹا سا کمرہ ہوتا ہے جس میں صاف ستھرا بچھا ہوا بستر لگا ہوتا ہے۔ کپڑے ٹانگنے کے لئے الماری اور اس میں ہینگر، ٹھنڈے پانی کی بوتلیں اور گلاس، ہاتھ منہ دھونے کے لئے باسن اور صاف ستھرا تولیہ موجود ہوتا ہے۔ جہاں تک کہ سفید پلاسٹک کے پیکٹ پیکٹ بلاک سے سلیپر تک رکھے ہوتے ہیں۔ خدمتگار کے لئے "خدمت چی" یعنی خدمتگار حاضر ہوتا ہے۔ جونہی گھنٹی بجائیں چراغ الہ دین کے جن کی مانند حاضر۔۔۔ لیکن جن کی طرح قوی ہیکل اور کالی مخلوق نہیں بلکہ سرخ و سفید اور خوبصورت ترک، پتلون کوٹ میں ملبوس ٹائی لگی ہوئی۔۔ جبلت مئودب اور چاک و چوبند۔۔۔۔۔ رات کو آرام کی نیند سوئے۔۔۔ صبح سات بجے گھنٹی کی آواز نے جگایا۔۔۔ استنبول کا اسٹیشن قریب آنے والا تھا اور گارڈ گھنٹی بجا بجا کر لوگوں کو خبردار کر رہا تھا۔ ہم نے جلدی جلدی شیو کی۔ ہاتھ منہ دھویا کپڑے تبدیل کئے اور ناشتے کے لئے کھانے والے ڈبے میں پہنچے۔۔ بڑی سجائی صاف ستھری میزوں کے ارد گرد مرد، عورتیں، لڑکے لڑکیاں،

ابھی ناشتہ کر رہی تھیں ۔ ناشتے میں ڈبل روٹی اور چائے ، کافی کے ساتھ پنیر ، زیتون ، مکھن ، انڈا ، جام اور جوس ہر شے موجود ۔ خرچہ بارہ ہزار لیرے فی کس یعنی ساٹھ روپے پاکستانی ۔

حیدر پاشا سے کاراکوئی تک واپور (بحری جہاز) کے ذریعے بھور پار کیا اور وہیں سے ٹیکسی لے کر م ۔ کمال اوکے سے ملنے برقی نیونت روانہ ہوئے ۔ م ۔ کمال اوکے پہلے استنبول یونیورسٹی میں تھے اب بوزاچی یونیورسٹی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں ۔ ہمارے مشہور ترکی ہیں ۔ پندرہ کتابوں کے مصنف ہیں ۔ ترکی ٹی وی اور ریڈیو کے مشیر بھی ہیں ۔ تحریک خلافت پر انہوں نے ایک تحقیقی کتاب لکھی ہے جس کا اردو ترجمہ پاکستان سفارت خانے کے ترجمان ڈاکٹر احمد اسرار نے کیا ہے اور ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار صاحب نے اس پر نظر ثانی کی ہے ، اور یہ کتاب نیاز صاحب نے شائع کی ہے ۔ م ۔ کمال اوکے نوجوان اور چاک و چوبند ترکی ہیں ۔ ایک سٹوڈیو بنا رکھا ہے جس میں ڈاکومنٹری تیار کرتے اور ٹی وی وغیرہ کو بیچتے ہیں ان کے ساتھ ان کے سٹوڈیو میں کافی پی اور اپنا سامان وہاں چھوڑ کر "دولما باہچے محل" دیکھنے ساحل سمندر پر گئے ۔

دولما باہچے محل استنبول میں سلطانوں کا مسکن رہا ہے ۔ مصطفیٰ کمال اتاترک نے اپنی زندگی کے آخری ایام یہیں پر گزارے اور اس محل میں فوت ہوئے ۔ یہ محل ہر وقت مرجع خاص و عام بنا رہتا ہے کہ نہ صرف اپنی وسعت اور سمندری فضا کے لحاظ سے بلکہ حسن و زیبائش کے اعتبار سے بھی قابل دید ہے ۔ اس تاریخی عمارت میں نقاشی ، کاشی گری ، ظروف سازی اور خطاطی وغیرہ کے بے مثل نمونے موجود ہیں ۔ میں نے یہ محل پہلے بھی دیکھ رکھا تھا ۔ لیکن اس بار ترک گائیڈ کی وجہ سے زیادہ معلومات حاصل ہوئیں ۔ لڑکی نے رواں دواں انگریزی میں محل کے مختلف حصوں کا تعارف کرایا اور چیزوں کی تشریح کی ۔ محل کے جھاڑ و فانوس ، ظروف و لباس ، قالین ، فرنیچر ، ساز و سامان اور شان و عظمت دیکھ کر انسان حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ عثمانی سلاطین ، جن کی سلطنت تقریباً دنیا بھر کی عظیم ترین اور وسیع ترین سلطنت رہی ہے ۔ کس شان و شکوہ کے مالک تھے ۔ فرانس ، اطالیہ ، یورپ ، جرمنی ، آسٹریا ، روس اور نہ جانے کہاں کہاں سے بادشاہ اور حکمران ان کو تحفے تحائف بھجواتے اور خوش نودی حاصل کرتے تھے ۔ کتنے حکمرانوں نے یہاں سلاطین کی دعوت کھانے کا اعزاز حاصل کیا ۔ قسم قسم کے جواہرات اس محل میں جمع ہیں ۔ حرم اور خوابگاہیں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں ۔ مرمریں غسل خانے اور ان کے لوازمات دیکھ کر میں سوچ رہا تھا کہ دنیا جہاں سے آئی ہوئی حسین ترین نازک اندام دوشیزاؤں کو لونڈیاں اور کنیزیں جب نہلا دھلا کر لباس مکلف پہنا کر ، عطر و خوشبویات میں بسا کر سلطان کی خوابگاہ میں بھجواتی ہوں گی تو اس وقت یہ نازنینیں اور دوشیزائیں سلطان کا دل بہلانے کی خاطر کیا کیا ادائیں نہ دکھاتی ہوں گی ۔ (بادل نخواستہ ہی) اس محل کی تعمیر پر کس قدر محنت اور کس قدر روپیہ خرچ آیا ہو گا یہ سوچ کر انسان گھبرا جاتا ہے ۔ خلیج کی جنگ کے بعد جارج بش یہاں آیا تو اسی محل میں اسے ضیافت دی گئی ۔ دولما باہچے کی سیر کے بعد م ۔ کمال اوکے کے سٹوڈیو سے سامان لیا اور سیدھے ایئر پورٹ پہنچے ۔

تین گھنٹے کی فلائیٹ تھی اور مصری ہوائی میزبانوں کی تعداد بھی تین تھی ۔ دو لڑکیاں تھیں اور ایک لڑکا ۔ تینوں کے رنگ سانولے اور جسم بھرے بھرے تھے ۔ ہوائی میزبان لڑکیاں معمولی شکل و صورت کی تھیں ۔ لیکن تھیں دونوں بہت کم سن ۔ پی آئی اے کی ہوائی میزبانوں کے برعکس جو خود پی آئی اے کی ہم عصر ہیں اور پی آئی اے کے جہازوں کی طرح پرانی لیکن پائیدار ہیں ۔ ہنسنے کھیلنے کے دن گزر چکے ہیں اس لئے بے حد سنجیدہ اور باوقار

ہیں ۔ مصری میزبانوں نے میزبانی کا حق ادا کرنے کی پوری کوشش کی لیکن حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا اور اس کا ہی سبب یہ تھا کہ کھانا مقدار اور معیار دونوں اعتبار سے گھٹیا درجے کا تھا ۔ جرمنوں اور جاپانیوں کی تشفی کے لئے تو شاید کافی ثابت ہوا کہ وہ خود زیادہ تر سنیکس پر گزارا کرتے ہیں ۔ لیکن ترکوں اور پاکستانیوں کے لئے اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر تھا ۔

کھانے کے بعد قہوے کے چند گھونٹ پیئے تو تازگی کا احساس ہوا اور دل میں خیالات کا ہجوم ہلچل اور ہیجان برپا کرنے لگا ۔ مصر کی سرزمین کیسی پراسرار اور طلسمی سرزمین ہے ۔ مصر کا نام آتے ہی قدیم ترین تہذیب کی جھلکیاں دل و دماغ میں کھلنے لگتی ہیں ۔ ہزاروں سال سے یہ تہذیب اپنی تمام تر شان و شکوہ اور آثار و عجائبات کے ساتھ درخشاں اور تابندہ ہے ۔ سیاحوں کے لئے اس کے آثار عجیب کشش رکھتے ہیں جس زمانے میں ابھی دنیا دوسری جنتروں سے بلد بھی تھی مصر کی سرزمین میں زوسر ، خوفو ، خافرے ، منکاورع اور رعمسیس اعظم جیسے فراعنہ ایسی ایسی یادگاریں تعمیر کرا رہے تھے جو آج بھی دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتی ہیں ۔ مصر کا سب سے حسین تحفہ اساطیری دریا نیل ہے جو افریقی جھیلوں سے نکل کر بحیرہ روم تک چھ ہزار کلومیٹر سے زیادہ کا فاصلہ طے کرتا ہے اور سرزمین مصر کو شاد و آباد کرتا ہے ۔ یہ وہ سرزمین ہے جہاں پیغمبروں نے حکومت کی ۔ جہاں اوسرس دیوتا کی قدیم ترین اسطورہ وجود میں آئی ۔ جہاں فرعونوں اور بڑے بڑے شہنشاہوں نے ہمیشگی کے حصول کی خاطر دیوتاؤں کا روپ اختیار کیا اور اہرام کے علاوہ دیوی دیوتاؤں کے مجسمے اور عظیم مندروں کی صورت میں عبادت گاہیں تعمیر کرائیں ۔ سکندر اعظم جیسے ہیرو نے اس سرزمین کو نہ صرف فتح کیا بلکہ اپنے دفن کے لئے بھی منتخب کیا ۔ سکندریہ شہر اسی کی یادگار ہے ۔ جہاں دلکش نسوانی کردار قلو پطرہ نے اپنی ذہانت اور حسن کے بل بوتے پر پہلے سیزر اور پھر مارک انتھونی کو مسحور کر کے بیس سال تک حکومت کی ۔ کبھی یہ سرزمین رومیوں اور بازنطینیوں کے زیر نگیں رہی ۔ اور پھر حضرت عمر ابن الخطاب کے دور خلافت میں حضرت عمرو بن العاص نے کفر و باطل کا نشان مٹا کر اسلام کا ایسا نقش اس سرزمین پر بٹھایا کہ جسے آج تک مٹایا نہیں جا سکا ۔ جہاں فاطمیوں ، مملوک اور عثمانیوں نے صدیوں تک اپنی اپنی حکومتیں قائم رکھیں ۔ نپولین بونا پارٹ فرانسیسی فوجوں کے ساتھ اس سرزمین میں داخل ہوا ۔ پھر برطانیہ نے جہاں ایک تسلط قائم کیا اور آخر جنگ عظیم دوم کے خاتمے پر مصر آزاد ہوا لیکن اپنے سابقہ شاہی نظام کے ساتھ ۔ شاہ فاروق کی کوتاہیوں کی بدولت ۱۹۵۲ء میں جہاں فوجی انقلاب آیا اور صدارتی نظام کا آغاز ہوا ۔ جمال عبدالناصر جیسے قوم پرست لیڈر نے مصر کا تشخص ابھارا اور سادات نے ڈیوڈ کیمپ معاہدہ کر کے مصر کو عربوں میں متنازعہ فی ملک بنایا موجودہ صدر حسنی مبارک کے عہد میں عراق کے خلاف مصر نے امریکی افواج کے شانہ بشانہ جنگ کر کے امریکہ سے اسرائیل کے بعد سب سے زیادہ امداد حاصل کی ۔ میں انہیں خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ اعلان ہوا جہاز قاہرہ کے ایرپورٹ پر اترنے والا ہے ۔

قاہرہ ایرپورٹ اچھا خاصا ہے ۔ یورپ کے ایرپورٹوں کے مقابلے کا تو نہیں پھر بھی ماڈرن اور وسیع ہے ۔ اس کے چار ٹرمنل ہیں ۔ ایک مقامی اور تین بین الاقوامی ... جن میں کیفے ، ریسٹورنٹ ، سنیکس بار ، بینک ، ڈیوٹی فری شاپس اور گفٹ سنٹر وغیرہ موجود ہیں ۔ پہلے ایک بیرونی حصہ ہے جس میں مختلف ایرلائنز کے دفاتر ہیں ۔ اندر داخل ہوں تو بریفنگ کاؤنٹرز ہیں ۔ بریفنگ کے بعد اندر جائیں تو ایک بہت بڑی ہال نما نشست گاہ ہے جس کے دونوں طرف ڈیوٹی فری شاپس اور ان میں قسم قسم کی شرابیں اور سگریٹ رکھے ہیں ۔ کیفے اور بار ہیں ۔ جہاں

سے مختلف پروازوں کے لئے الگ الگ دروازے ہیں ۔ ہر دروازے کے قریب مسافروں کے بیٹھنے کے لئے کرسیاں رکھی ہیں ۔ ٹیلی ویژن جگہ جگہ نصب ہیں جو مختلف پروازوں کے اوقات دکھاتے رہتے ہیں ۔ ہم پاسپورٹوں پر "داخول" مہریں لگوا کر سوٹ کیس لینے کے لئے لاؤنج میں پہنچے ہی تھے کہ کُک ٹور ازم کمپنی کا کارندہ مسٹر حامدی ہمارے پاس آیا اور آتے ہی باتوں میں ایسا الجھایا کہ کچھ سوچنے کا موقع ہی نہ دیا ۔ نیاز صاحب تو اس سے مرعوب نہ ہوئے کیونکہ وہ عموماً اس مقولے پر عمل کرتے ہیں کہ "ہر وقت کہ آہستہ و پیوستہ رود" ... اس لئے ہر معاملے میں آہستہ و پیوستہ روی ، غور و فکر ، چیزوں کے علاوہ ناپ تول اور جانچ پڑتال میں انہماک اور لوگوں کے بارے میں رائے قائم کرنے میں خاصے محتاط ہوتے ہیں لیکن میرا معاملہ الٹ ہے ۔ میں جلدی متاثر ہو جاتا ہوں اس لئے میں اس کی چستی پھرتی اور تیزی طراری سے خاصا متاثر ہوا ۔ سب سے پہلے تو اس نے ہمیں تسلی دی کہ ہم کسی قسم کی کوئی فکر نہ کریں وہ سب سنبھال لے گا (حالانکہ ہمارے چہروں سے کوئی فکر یا وحشت نہیں ٹپک رہی تھی) اور جب اس نے ہمارا سوٹ کیس بغیر کھلوائے کسٹم سے پار کرا دیا تو نیاز صاحب بھی کچھ کچھ متاثر دکھائی دینے کیونکہ دوسرے ملکوں کی طرح مصر میں بھی پاکستانیوں کی خاص طور پر اچھی تلاشی کی جاتی ہے ۔ اس کے بعد وہ ہمیں اپنے بچھونے سے دفتر میں لے گیا اور ایک کاغذ پر ہمارے ایک ہفتے کا پروگرام بنانے میں مشغول ہو گیا ۔ جب ایک روز کی سیر کا خرچ ۳۰۰ سے ۴۰۰ ڈالر کے قریب بیان کیا تو ہمارے ہوش اڑ گئے ۔ ہم نے بڑی لجاجت سے کہا کہ آپ سب سے پہلے ہماری رہائش کے لئے فون پر پاکستان سفارت خانے کے جنس آپریٹر مسٹر زاہد علی سے فون پر رابطہ کرا دیں کیونکہ قاہرہ کے سفارت خانے سے ہمارے دوست اکرام اللہ صاحب نے انہیں اس بندوبست کے لئے کہہ رکھا ہے ۔ ان کے گھر کا نمبر ہمارے پاس تھا ۔ اس نے ہماری درخواست کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے زاہد علی صاحب سے رابطہ کرا دیا ۔ ان سے جب فون پر بات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ ہم سیدھے "فندق الامان" چلے جائیں وہاں کمرے کی بکنگ کرا دی گئی ہے ۔ کرایہ ڈبل بیڈ کا ۵۰ ڈالر روزانہ ہے ۔ اب کچھ حوصلہ ہوا ۔ ہم نے حامدی سے کہا کہ از راہ کرم صرف ایک دن بلکہ آدھے دن کا پروگرام بنا کر ہمیں اہرام دکھا دیں باقی پروگرام بعد میں طے کر لیا جائے گا ۔ چنانچہ اس نے اہرام کی سیر اور رہائش کے ۲۵ ڈالر فی کس مانگے جو ہم نے غنیمت کہہ کر فوراً ادا کر دیے ۔ دوسرے دن سیر کے بعد اندازہ لگایا کہ اگر ہم خود ٹیکسی کرائے پر لے کر اہرام وغیرہ دیکھنے اور گھومتے کرتے تو ۱۵ ڈالر فی کس سے زیادہ بل نہ آتا ۔ خیر پہلا تجربہ تھا ۔ ہفتے بھر کے پروگرام سے محفوظ رہنے اور مسٹر حامدی کے چنگل سے صرف ۲۰ ڈالر میں چھٹکارا پانے کے بعد اطمینان کا سانس لیا اور ٹیکسی لے کر ہوٹل پہنچے ۔ کمرہ اچھا خاصا تھا ۔ باتھ بھی ٹھیک ٹھاک ۔ ٹی وی اور ٹیلیفون کی سہولت بھی میسر تھی ۔ رات آرام کی نیند سونے کے بعد نیاز صاحب بہت سویرے اٹھنے کے عادی ہیں ۔ غسل کر کے فوراً "لاؤنج" پہنچتے ہیں ۔ میری بھی کچھ ایسی ہی عادت ہے کہ سویرے اٹھ کر کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکا تو سامنے شیریٹن ہوٹل کی بلند و بالا اور خوبصورت عمارت نظر آئی اس کے عقب میں دریائے نیل خراماں خراماں بہہ رہا تھا ۔ اور اس کے پرسکون سینے پر چند کشتیاں رواں دواں تھیں ۔ کھجور اور پام کے درخت ، ہلکی ہلکی دھند میں عجیب پراسرار منظر پیش کر رہے تھے ۔ یہ قاہرہ جیسے پر ہجوم شہر میں بسیں اور کاریں اور بھانت بھانت کی گاڑیاں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر دوڑنے میں مصروف ہو چکی تھیں ۔

ناشتہ کرائے میں شامل تھا ۔ مصر کی مخصوص ڈبل روٹی پھولے گول کیک کی طرح کی جو بہت نرم ہوتی ہے مکھن ، جام ، پنیر اور انڈوں کے ساتھ چائے یا کافی جو آپ چاہیں لے سکتے ہیں ۔ ناشتہ اوپر ہال میں جا کر کیا اور پھر

کاؤنٹر کے پاس رکھے صوفوں پر آکر ٹور والوں کا انتظار کرنے لگے ۔ ہم نے سوچا تھا کہ کوئی خوبصورت کوچ ہوگی اور اس میں کئی ملکوں کے سیاح ہوں گے لیکن دس بجے کے قریب ایک ٹیکسی نما کار ہوٹل کے سامنے آکر رکی ۔ ایک بھلا سا آدمی ہمارے پاس آیا اور ساتھ چلنے کی دعوت دی ۔ یہ ہمارا گائیڈ محمد علی تھا ۔ جو بہت باتونی لیکن بحیثیت مجموعی اچھا آدمی ثابت ہوا ۔ ٹیکسی کافی بڑی تھی لیکن سیاح ہم صرف دو ہی تھے ۔ ایک ڈرائیور اور ایک گائیڈ ہمارے علاوہ ۔ نتیجے یہ بھی اچھا ہوا کہ اپنی مرضی سے جہاں جتنی دیر ٹھہرے پھر آگے بڑھ گئے ۔ کوچ میں ہوتے تو پھر سب کے ساتھ چلنا پڑتا ۔

قاہرہ سے ۱۹ کلو میٹر کے فاصلے پر دنیا کے سات عجائبات میں شمار ہونے والے ہرم موجود ہے ۔ اس شہر کو جیزہ کہتے ہیں جو قاہرہ کے مضافات میں واقع ہے ۔ جیزہ گویا ایک گاؤں ہے اور اس کے قریب ہرم موجود ہیں ۔ یہ سارا علاقہ صحرائی ہے اور ہرم کے ارد گرد گرد اڑتی ہے ۔ ایک مصری قول کے مطابق "ہر شے وقت سے ڈرتی ہے لیکن وقت ہرم سے ڈرتا ہے ..." ہزاروں سال سے ہرم کی موجودگی اس قول کی صداقت کا یقین تو دلاتی ہے لیکن پھر بھی یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ وقت کی سعی مسلسل کارگر ضرور ہوتی ہے اور سطح ہستی کی ہر چیز پر زوال کی کیفیت ضروری طاری ہوتی ہے ۔ آج یہ ہرم عبرت کا نمونہ ہیں ۔ کئی ایک چھوٹے چھوٹے ہرم تو اب مٹی کے تودے بن کر رہ گئے ہیں ۔ البتہ فرعون خوفو ، خافری اور منکاؤرع کے تین ہرم آج بھی سیاحوں کے لئے دلکشی اور دلچسپی کا باعث بنے ہوئے ہیں ۔ خوفو کا ہرم تینوں میں بڑا ہے ۔ اس قوی الجثہ ہرم کی اصل بلندی تو ۱۴۶ میٹر تھی لیکن اب ۱۳۷ میٹر رہ گئی ہے ۔ اس ہرم کا بیرونی حصہ اب اپنا حسن کھو چکا ہے کیونکہ اس کا رنگ روغن اکھڑ چکا ہے ۔ دوسرا ہرم یعنی ہرم الثانی خوفو کے بیٹے فرعون خافری کا ہے جو ۲۶۳۰ ق م میں تعمیر ہوا ۔ اس میں اندر جانے کے لئے ایک سرنگ بنائی گئی ہے جس میں سر جھکا کر بلکہ دو تہہ ہو کر جانا پڑتا ہے ۔ آگے آگے گائیڈ تھا ۔ بیچ میں اور میرے پیچھے نیاز صاحب ۔ غار میں کافی روشنی کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں تھا بلکہ ٹمٹماتے چراغ کی طرح کا ایک قمقمہ روشن تھا جس کی روشنی ناکافی تھی ۔ سیڑھیاں بھی باقاعدہ نہیں تھیں ۔ بس یونہی قدم رکھنے کے لئے لکڑی کے تختے رکھے تھے ۔ غار بہت تنگ و تاریک تھا اور خاصا لمبا تھا ۔ شروع میں یہ ڈھلوان کی طرف جاتا ہے تقریباً آدھے راستے کے بعد فراز شروع ہوتا ہے ۔ ہم کچھ راستہ طے تو کر گئے لیکن بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہوا ۔ ایک دم خوف سا آنے لگا اور یوں محسوس ہوا جیسے ہم زندہ درگور ہونے جا رہے ہیں ۔ اتنے میں نیاز صاحب کی آواز آئی کہ وہ تو واپس جا رہے ہیں کیونکہ ان کا دم گھٹنے لگا تھا ۔ میرا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا ۔ وہ مڑے تو میں بھی فوراً لوٹا ۔ باہر نکل کر جان میں جان آئی ۔ چاہیے تھا کہ اندر جانے کے لئے کوئی مناسب سا راستہ بنایا جاتا ۔ جیسے الاقصر (Luxor) میں "وادی ملوک" کے مقبروں کے لئے بنایا گیا ہے ۔ لگتا ہے ہرم کی حفاظت کے لئے کوئی خاص مساعی نہیں کی جا رہی ۔ مجھے عراق میں بابل کے مقام پر آثار دیکھنے کا موقع ملا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ صدام حسین نے کروڑوں خرچ کر کے ان آثار کو مزید دلکش بنانے کے لئے جو کوششیں کی ہیں وہ قابل تحسین ہیں ۔ جیزہ اور سقارہ کے اہراموں کو محفوظ کرنے کے لئے زیادہ محنت نہیں کی جا رہی ۔ البتہ وہاں تک رسائی کے لئے سڑکیں ضرور تعمیر کی گئی ہیں ۔ منکاؤرع کے ہرم کے سامنے تین چھوٹے چھوٹے ہرم ہیں ۔ مشرق کی طرف والا شاید فرعون خرمرنحت (Kharmer Nehty) کی بیوی کے لئے بنایا گیا تھا ۔

خوفو کے ہرم سے ۳۵۰ میٹر کے فاصلے پر ابوالہول کا عظیم مجسمہ ہے ۔ ابوالہول یعنی "خوف کا باپ" جس کا

دھڑ شیر کا ہے اور سر انسان کا۔ بعض روایات کے مطابق یہ فرعون خافرع کی شبیہ ہے جو اپنے مقبرے کا پہرہ خود دے رہی ہے۔ بعض کے نزدیک یہ مصری تہذیب کا سب سے بڑا چیستان ہے کہ انسان واقعی انسان ہے یا حیوان انسان اور حیوان کی کشمکش جاری ہے اور یہ فیصلہ نہیں ہو سکا کہ حیوان اور انسان میں سے کون غالب آیا۔ شروع میں اسے Horem Akhat کہتے تھے جس کا مطلب ہے "ہورس بر افق پر ہے" وقت کے ساتھ ساتھ اس پر ریت جمتی گئی اور یہ صرف پانچ فٹ رہ گیا۔ باقی حصہ دب گیا۔ پھر لوگوں نے ریت کھود کھود کر اسے نکالنے کی کوشش جاری رکھی۔ اس کا چہرہ بھدا اور ناک ٹوٹی ہوئی ہے۔ اس کا سبب کچھ تو فطرت کی ستم ظریفی یعنی ہواؤں کی شدت اور کچھ سلوک کی توپوں کی نشانہ بازی کی مشق ہے۔ اس کے بالکل سامنے ایک کیفے ہے جس کے لان میں بیٹھ کر غیر ملکی سیاح گھنٹوں "خوف کے باپ" کا مشاہدہ اور مطالعہ کرتے ہیں۔ ان اہراموں کو دنیا کے سات عجائبات میں شمار کرنے والا سسلی کا مورخ ڈایو ڈورس تھا جو ایک صدی قبل از مسیح مصر میں آیا تھا۔ ہیرو ڈوٹس کے بعد یہ دوسرا بڑا سیاح تھا جو مصر کی سرزمین میں اہرام دیکھنے آیا۔ مشہور یونانی سیاح، صحافی اور فلسفی ہیروڈوٹس نے کہا تھا "فرعون خوفو نے اپنے پیچھے عظیم اہرام چھوڑا جو فن کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے" اور اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے۔ ہمارا گائیڈ محمد علی انگریزی زبان میں ان اہرام کی تاریخ تعمیر، مدت تعمیر اور مصارف تعمیر وغیرہ کے بارے میں بہت سی معلومات دینے کی کوشش کرتا رہا لیکن یہ معلومات ہمیں پہلے ہی سے حاصل تھیں۔ اس لئے ہم نے زیادہ توجہ اس کی ان باتوں کی طرف دی جو مصر کے موجودہ سیاسی حالات اور انفرادی اور اجتماعی روز مرہ زندگی کے بارے میں تھیں۔ محمد علی کے مطابق صدر سادات اور حسنی مبارک کی امن پالیسی ٹھیک تھی۔ لوگ خوش ہیں کہ جو رقم جنگ پر خرچ ہوتی تھی وہ لوگوں کی بہبود پر خرچ ہوتی ہے (اگرچہ ہمیں سوائے سڑکوں کے کہیں یہ رقم خرچ ہوتی نظر نہ آئی) اس کے خیال میں اسرائیل سے جنگ کرنے کا کیا فائدہ۔ خواہ مخواہ امریکہ کی مخالفت لینے میں کوئی عقلمندی نہیں ہے۔

(تجدید نو، نومبر ۹۳ء)

صومالیہ کی بگڑتی صورتِ حال

نوآبادیاتی نظام کی دین !

عادل صدیقی

صومالیہ کی حالیہ تباہی وبربادی کے خوفناک مناظر بیان سے باہر ہیں، صرف گذشتہ ایک سال میں جنگ اور بھوک سے ساڑھے تین لاکھ بے گناہ انسان جاں بحق ہو چکے ہیں، یہ ملک قحط سالی کا شکار ہے، اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق دو ہزار افراد جن میں زیادہ تر خواتین اور بچے شامل ہیں، روزانہ بھوک سے مر رہے ہیں۔ بین الاقوامی برادری کے لیے یہ ایک زبردست چیلنج ہے، صومالیہ کے عوام نے "آپریشن ریسٹور ہوپ" کے نام سے اس امریکی اسکیم کا خیر مقدم کیا ہے جو اس نے وہاں کے لوگوں کی امداد کے لیے شروع کی ہے۔

صومالیہ کی تازہ ترین صورت حال سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شاید حالات میں بہتری آئے اب لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا سلسلہ کچھ کم ہے، امریکی فوجوں کی واپسی کا عمل شروع ہو چکا ہے اور اقوام متحدہ کی افواج کی موجودگی کے لیے راستہ ہموار ہوا ہے، صومالیہ میں جنگ بندی پر رضامندی ہو گئی ہے۔ مارچ ۱۹۹۳ء میں عدیس آبابا میں اقوام متحدہ کے زیر نگرانی مصالحتی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آئے گا، لیکن صومالیہ کا بحران ابھی حل نہیں ہو پایا ہے۔

پس منظر: صومالیہ کا جائے وقوع ایسا ہے کہ یہاں سے عرب ممالک کی طرف جایا جا سکتا ہے، بحر قلزم میں آنے کے لیے بھی اس سے راستہ مل جاتا ہے۔ عرب ممالک جو اپنی تیل کی پیداوار کے لیے مشہور ہیں اور خلیجی ممالک جو تیل اور قدرتی وسائل کی یافت کا ذریعہ ہیں، ان سے صومالیہ کا قریبی تعلق ہے، ۱۸۶۹ء میں نہر سویز کے کھل جانے کے بعد صومالیہ یوروپی طاقتوں کے لیے بے حد اہمیت اختیار کر گیا، ۱۸۸۵ء اور ۱۹۰۸ء کے درمیانی عرصے میں برطانیہ، فرانس اور اٹلی نے صومالیہ کے طویل ساحل کو آپس میں بانٹ لیا اور اپنی اپنی نوآبادیاں قائم کر ڈالیں، اس کے ساتھ ہی ایتھوپیا (حبش) کا شہنشاہ اپنی سرحدوں کی توسیع کا خواہشمند تھا، ان حالات میں ان یوروپی مملکتوں کی سرحدیں آپس میں وجہ نزاع بن گئیں اور ان کی وجہ سے آپس میں رنجش پیدا ہو گیا، چنانچہ ۱۹۳۵ء میں اٹلی نے ایتھوپیا پر حملہ کر دیا، ۱۹۳۶ء میں دوسری

جنگ عظیم کے بعد برطانیہ نے ایک تجویز رکھی کہ صومالیہ کا تمام تر رقبہ اقوام متحدہ کی ٹرسٹی شپ میں دے دیا جائے لیکن روس اور امریکہ نے اس تجویز کو مسترد کر دیا، صرف اٹلی کے زیر نگیں صومالی رقبہ اقوام متحدہ کی ٹرسٹی شپ میں رہا۔ یکم جولائی ۱۹۶۰ء کو ری پبلک آف صومالیہ آزاد ہوئی مگر اس میں صومالیہ کے پانچ حصوں میں سے صرف دو حصے شامل رہے، ان دو کے نام ہیں برطانیہ کے زیر نگیں صومالیہ اور اطالوی ٹرسٹ کے ماتحت صومالیہ کا علاقہ باقی تین حصے یہ ہیں۔ فرانس کے زیر نگیں صومالی رقبہ (جبوتی)، ایتھوپیا کا اوگادن خطہ اور کینیا میں شمال سرحدی ضلع (این ایف ڈی) یہ تینوں غیر ملکی نگرانی میں رہے، صومالی باشندوں کا کہنا ہے کہ صومالی قوم نوآبادیاتی نظام سے بھی پہلے کی ہے، یہ سچ بھی ہے۔ صومالی قوم ایک سے طرز کے عوام پر مشتمل ہے یہ سب کے سب کھیتی باڑی کرتے ہیں، مویشی چراتے ہیں ایک ہی زبان بولتے ہیں اور سب کے سب مسلمان ہیں، ان کے رسم و رواج اور ثقافتی انداز ایک ہی سے ہیں، ۱۹۸۰ء میں ایک انٹرویو دیتے ہوئے ایک اہم سیاسی شخصیت سید باری نے بجا طور پر کہا تھا کہ صومالیہ کی تباہی کی تمامتر ذمہ داری نوآبادیاتی نظام پر ہے کیونکہ اس کی وجہ سے ملک پانچ حصوں میں تقسیم ہوا، دو حصے برطانیہ کے پاس ہیں ایک حصہ اٹلی کے پاس، ایک فرانس کے پاس اور ایک ایتھوپیا کے پاس ہے، صومالیہ کے نقطۂ نظر سے نئی جمہوریہ نے آزادی ضرور حاصل کر لی مگر یہ آزادی کی نصف لڑائی تھی جس پر فتح حاصل کر لی گئی ہے۔ اس لیے قدرتی طور پر آزاد صومالیہ کی خارجہ پالیسی نے ملحقہ خطوں کو آزاد کرانے پر زور دیا ہے یہ سب مل کر متحدہ ریاست بنانے کی کوشش کر رہے ہیں، صومالیہ کے جھنڈے پر پانچ کونے والا ستارہ اس ملک کے پانچ حصوں کی نشاندہی کرتا ہے، اور اس بات کی علامت ہے کہ یہ سب متحد ہونا چاہتے ہیں۔

تباہی کا پس منظر: آزادی کے بعد صومالیہ میں ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۹ء تک جمہوری نظام رہا اور ۱۹۶۹ء سے ۱۹۹۱ء تک مطلق العنانہ نظام تھا، ان دونوں نظاموں کے تحت ایتھوپیا کے اوگادن اور کینیا کے شمال سرحدی ضلع میں چل رہی علیحدگی پسندانہ تحریکوں کی حمایت کی جاتی رہی، صومالیہ کو ایک بنا دینے کی تحریک نے جنگ جویانہ صورت اختیار کر لی، صومالیہ کو ایتھوپیا کے ساتھ ۱۹۶۱ء، ۱۹۶۴ء اور ۷۸-۱۹۷۷ء میں جنگ کرنی پڑی، ۱۹۷۸ء کے بعد تقریباً دس سال تک بھی ان دونوں ملکوں کے درمیان جنگ کی سی صورت حال چلتی رہی، ۱۹۶۳ء اور ۱۹۶۷ء کے درمیان صومالیہ کو کینیا سے بھی جنگ کرنی پڑی، اس کے بعد دونوں میں عارضی طور پر صلح ہو گئی، صومالیہ کو سب سے زیادہ نقصان اوگادن کی جنگ سے پہونچا، اوگادن سے تقریباً دس لاکھ پناہ گزیں ۱۹۸۰ء تک صومالیہ میں داخل ہو گئے، اس سے صومالیہ کی شکست خوردہ معیشت پر اور اقتصادی بوجھ پڑ گیا، ۱۹۸۱ء صومالی قومی تحریک (ایس این ایم) نامی ایک تنظیم قائم ہوئی اس نے ۱۹۸۸ء کے بعد فوجی کارروائیاں تیز کر دیں، ان فوجی کارروائیوں کی وجہ سے ہزارہا شہری مارے گئے۔

گاؤں جل کر راکھ ہوگئے، مویشی ہلاک ہوگئے اور پینے کے پانی کے ذخیروں میں زہر کا اثر آگیا۔ ۱۹۸۸ء میں شدید خانہ جنگی شروع ہوئی اس سے ہرگیشیا نامی شہر تباہ ہوگیا۔

مابعد سرد جنگ : صومالیہ کا جائے وقوع ایسا ہے کہ اس پر بڑی طاقتوں کی ہمیشہ سے نظر رہی ہے، صومالیہ کا ملحقہ خطوں سے جھگڑا بڑی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا سبب بنا، ہر خطان کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتا رہا، صومالیہ کو دونوں بڑی طاقتیں بڑے پیمانے پر اسلحہ فراہم کرتی رہیں ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۵ء تک گویا کہ آزادی ملنے کے پہلے پندرہ برسوں میں روس سے ہتھیار آئے، ۱۹۶۹ء میں سیدباری نے صومالیہ کو سوشلسٹ ملک بنا دیا، لیکن ۱۹۷۷ء میں ایتھوپیا کے انقلاب نے صورت حال بدل دی، امریکہ نے ایتھوپیا کو چھوڑ دیا اور صومالیہ کی سرپرستی شروع کردی، اس طرح یہ ملک اسلحہ کی ذخیرہ گاہ بن گیا، صومالیہ سرکار نے بڑے پیمانے پر یہ اسلحہ تقسیم کیا اس طرح سے وہ پڑوسی خطوں سے برد آزما ہونے کی صلاحیت پیدا کرنا چاہتا تھا، سب سے پہلے وہ ایتھوپیا سے لڑنا چاہتا تھا چنانچہ جنوری ۱۹۹۱ء میں صومالیہ کی راجدھانی موگا دیشو میں لڑائی زور پکڑ گئی اور صورت حال حکومت کے قابو سے باہر ہوگئی، ایک ماہ کی لڑائی کے بعد سیدباری کو دست بردار ہونا پڑا، اس وقت ملک افراتفری کا شکار ہوا، ۲۱ر جنوری ۱۹۹۱ء کے بعد جب کہ صدر مملکت سیدباری حکومت کی ذمہ داریوں سے الگ کردیئے گئے صومالیہ میں خانہ جنگی کی کیفیت ہے، ۲۹ر جنوری ۱۹۹۱ء کو ایک باغی لیڈر علی مہدی نے اقتدار سنبھالا مگر دیگر باقی رہنماؤں نے ان کی مخالفت کی، ان کے سب سے زیادہ مخالف محمد فرح اوید ہے حالانکہ ان دونوں کا تعلق ایک ہی قبیلے سے ہے لیکن نومبر ۱۹۹۱ء میں دونوں کے درمیان مکمل جنگ کا آغاز ہوا اس جنگ کے پہلے چھ ماہ موگا دیشو میں ۱۴ ہزار افراد مارے گئے اور ۲۷ ہزار زخمی ہوئے، سیدباری کے الگ ہوجانے کے بعد اس خانہ جنگی نے وہاں کے لوگوں کو بے حد مایوس کردیا، صومالی قومی تحریک کی حمایت خاص طور پر اسحق نامی قبیلے نے کی تھی اور سیدباری کو الگ کرایا تھا، مگر بعد کے حالات سے اس نے مرکزی سرکار سے علیحدہ ہونے کی آواز اٹھائی، اس نے شمالی صومالیہ میں الگ سے جمہوریہ صومالی لینڈ کے قیام کا مطالبہ کیا، چنانچہ ۱۸ر مئی ۱۹۹۱ء کو یہ جمہوریہ قائم ہوگئی اگرچہ اسے نہ تو کسی ملک نے اور نہ ہی کسی بین الاقوامی تنظیم نے تسلیم کیا مگر اس سے صومالیہ کا بحران اور گہرا ہوگیا۔

امن کا راستہ کیا ہو؟ : اس بحران کا حل آسان نہیں ہے، البتہ خوش آئند بات یہ ہے کہ متحارب گروپ بین الاقوامی دباؤ سے مارچ ۱۹۹۳ء میں عدیس ابابا میں ہونے والی امن کانفرنس میں شرکت کے لیے تیار ہیں، لیکن محض جنگ سے باز رہنا ہی تو امن کی ضمانت نہیں بن سکتا، ملک میں خوش حالی کے پروگرام شروع کیے بغیر اس بھیانک صورت حال سے باہر نکلنا دشوار ہے۔

(الحق، جولائی ۹۳ء)

بوسنیا کے متعلق پروفیسر اکبر احمد کی رپورٹ

(پروفیسر اکبر احمد صاحب کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں۔ بی بی سی [illegible] کی ایک ٹیم کے ساتھ وہ بوسنیا کے حالات کا جائزہ لینے گئے تھے۔ ان کی یہ رپورٹ چشم دید واقعات پر مشتمل ہے۔)

بوسنیا ہماری صدی میں انسانی نسل کشی اور مسلمانوں پر مظالم کا [illegible] واقعہ [illegible] ہے۔ اس سلسلہ کی ایک رپورٹ [illegible] ۱۲ مارچ کے شمارہ میں آئی ہے۔ ان وحشت ناک اور انسانیت سوز مظالم کے ساتھ بوسنیا کے مسلمانوں کی ہمت، جرأت اور اسلام پسندی بھی قابل داد ہے۔ اس کی جھلک بھی اس رپورٹ میں ملتی ہے۔ الفرقان [illegible] کے شکریہ کے ساتھ قارئین [illegible] کی خدمت میں رپورٹ پیش کی جا رہی ہے۔

پروفیسر اکبر احمد لکھتے ہیں:

"بوسنیا کی صورتحال کے بارے میں مختلف داستانیں لوگوں کی زبانوں پر ہیں۔ جہاں تک ہلاکت [illegible] وحشیانہ [illegible] اور سفاکی اور درندگی کے [illegible] داستانوں کا تعلق ہے تو بدقسمتی سے وہ سب سچ ہیں۔ سربیائی فوجوں کا عام دستور یہ ہے کہ وہ ایک مسلم گاؤں کو گھیر لیتی ہیں، وہاں کے باشندوں کو ایک الٹی میٹم دیتی ہیں، اگر گاؤں والے اپنے گاؤں کے حوالے نہیں کرتے تو ایک ایک شخص کو مار دیا جاتا ہے اور اگر ہتھیار ڈال دیتے ہیں تو [illegible] کہ تمام جوانوں کو قتل کر دیا جاتا ہے، جوان عورتوں کو اجتماعی آبروریزی کے لئے [illegible] کیمپوں میں لے جایا جاتا ہے اور بوڑھی عورتوں کو بالکل خالی ہاتھ کسی سمت میں [illegible] جاتا ہے۔ [illegible] کیمپوں میں ایسے بوڑھے لوگوں سے میں خود ملا ہوں جو بالکل [illegible] کے عالم میں [illegible] کلومیٹر کا فاصلہ پیدل طے کر کے کسی طرح ان کیمپوں تک پہنچے۔

عورتوں اور لڑکیوں کی آبروریزی کے بے شمار [illegible] میں جو کچھ ہو رہا ہے، [illegible] کسی کتاب میں اب تک نہیں [illegible] بالکل [illegible] ہے۔ بوسنیا میں ہونے والے مظالم کے یہ [illegible] اتنے وحشت انگیز ہیں کہ [illegible] انسان کی نگاہوں سے کچھ [illegible]

ہے۔ [illegible] بوسنیائی [illegible] ہیں جو قوت گویائی سے محروم ہو گئی ہیں۔ [illegible] ظالموں نے [illegible] جنسی ہوس [illegible] بار بار [illegible] کی ہے کہ ان کے [illegible] ایسی عورتیں ہیں جن کے پیٹ چیر کر [illegible] میں سور کا گوشت بھر دیا گیا ہے۔ ایسی [illegible] جوان اور بوڑھی عورتیں ہیں جنہیں [illegible] کر کے کتوں کی طرح ان کی گردنوں میں زنجیریں ڈال دی گئی ہیں۔ ان کے ساتھ اسی حالت میں بار بار بدفعلی کی جاتی ہے۔ اور کتوں کی طرح انہیں باندھ کر رکھا جاتا ہے۔ انہیں جو کچھ کھانے کو دیا جاتا ہے اسی حالت میں یعنی دونوں ہاتھوں اور دونوں پیروں پر چوپایہ کی طرح [illegible] اور اسی حالت میں پاخانہ پیشاب کرنے پر بھی مجبور کیا جاتا ہے۔

میں نے ایسی کئی بوڑھی عورتوں کو دیکھا، جنہیں دیکھ کر مجھے میری ماں یاد آگئیں۔ ان کے خاندان کا کوئی فرد نہیں بچا ہے۔ ان کے پاس نہ [illegible] تھا اور نہ کوئی چیز تھی۔ ایک کونے میں ایک بچی [illegible] رہی تھی۔ میں نے بوڑھے مردوں سے بھی [illegible] آنکھیں دہشت، شرم اور ذلت و بیچارگی کی ساری داستانیں سنا رہی تھیں۔ مگر زبان سے [illegible] ان کے پاس ایک لفظ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ جوانوں کا حال یہ ہے کہ غیظ و غضب اور نفرت کی چنگاریاں [illegible] کی طرح ان کی آنکھوں سے جھلک رہی ہیں۔ [illegible]

...... ان کا انجام اچھا نہیں نظر آتا۔ میرا یہ خیال [illegible] اور [illegible] ہے اور جلدی ہی [illegible] خدا کرے یہ خیال غلط ثابت ہو جائے۔

ایک دوسری بات یہ ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ بوسنیا میں جنگ اور خون کا یہ طوفان رکنے والا نہیں ہے۔ بلکہ وہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ایک مسلسل [illegible] کا آغاز ہے کہ [illegible] یورپ اور [illegible] مسلمان ہیں وہ بھی بالکل [illegible] ان کا [illegible] سے یہ وہ بہت [illegible] اسلام کو [illegible] کیا کر سکتی ہے [illegible] کیا کرنا چاہئے۔

بوسنیا کے لوگوں کی اس بیداری [illegible] ایک سمت [illegible] منظور ہو گیا [illegible]

مد آخر، مسلمانوں کی خودداری اور ان کی قوت برداشت ہے۔ میں بتا سکتا ہوں کہ اسے دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ مجھ سے کسی شخص نے کچھ نہیں مانگا۔ کسی چیز کا سوال نہیں کیا۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہم خود اپنا دفاع کرنے کے لائق ہو جائیں۔ ہمیں صرف ہتھیار درکار ہیں۔ وہ اپنی کھوئی ہوئی عزت بحال کرنا چاہتے ہیں۔ جان و مال کی اتنی بربادی کے باوجود انھوں نے اپنی خودی کو جس طرح محفوظ رکھا ہے وہ صد در صد غیر معمولی بات ہے۔ ہمارا بچپن کئی جگہوں میں اور جن میں پٹھانوں کو پیدائشی فرق جانتے ہوئے دریائی عمر کے بھی اور مصطفیٰ بھی اور عورتیں بھی ہوتے تھے۔ مگر اس حال میں بھی وہ ہماری تواضع نہ کر پانے کی وجہ سے ذہنی اذیت محسوس کرتے تھے۔ انھیں یہ احساس بہت شرمندہ کرتا تھا کہ وہ ایک بالکل جائے ہیں۔ کی ہماری خاطر نہیں کر پا رہے ہیں۔

ٹلازنگ سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک چھوٹے سے خوبصورت گاؤں میں پہاڑ کی بلندی پر ایک مسجد نظر آئی۔ میں بڑھ کر وہاں گیا۔ یہ مسجد صد سالہ پرانی اور ترکی کے حسین تعمیر پر بنی تھی اور بڑے اہتمام سے اس کی دیکھ ریکھ بھی کی جاتی تھی۔ نوجوان نمازیوں سے مسجد بھری ہوئی تھی۔ میں نے امام صاحب کے پاس ملنے اور ملاقات کی درخواست بھجوائی۔ وہ باہر تشریف لائے اور فوراً مجھ سے بغلگیر ہو گئے۔ وہ نوجوان نمازیوں کو انھوں نے خوشی سے متعارف کرایا۔ ان کے چہرے پر غیر معمولی مسرت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ایک پاکستانی مسلمان سے مل کر بہت خوش تھے۔ ان کی آنکھیں تر تھیں۔ یہ وہ علاقہ تھا جس میں ایک خاص قسم کی چمک، انسانی ہمدردی کے زندہ جذبے اس موسم کی شدت ہندوستان دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا۔ مگر جب میں وہاں سے رخصت ہوا تو یہ خوف اندیشہ میرے ذہن و دماغ پر چھایا ہوا تھا کہ جب سربیائی اس چھوٹے گاؤں کو مسلمانوں سے "پاک" کرنے کی مہم پر آئیں گے تو شاید سب سے پہلا نشانہ یہی امام صاحب ہوں گے اور اس کے بعد یہ چھوٹی سی مسجد۔

بوسنیا والوں کی کیفیت کا یہ پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ وہ اخوت اسلامی کے جذبے سے سرشار اور اپنے مسلمان بھائیوں کو دیکھنے کیلئے ترس رہے ہیں۔ جیسے ہی انھیں یہ پتہ چلا کہ میں ایک پاکستانی مسلمان ہوں ان کے چہرے خوشی سے کھل اٹھتے تھے۔ اس منظر کی تصویر کشی میں کیسے کروں جو میرے دل کی گہرائیوں کو چھو رہا تھا۔ اور نہ میں اپنی اس مسرت کو بھی کیسے بیان کروں کہ میرے پاس انھیں پیش کرنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ نوجوان بار بار مجھ سے ہاتھ ملانے کے لئے بار بار آتے تھے۔ خوشی اور محبت کے ملے جلے جذبات ان کے دل میں صرف اسی سے روشنی پیدا کرتے تھے۔ کاش کہ میں ان سے یہی کہہ سکتا کہ ان کے ہزاروں بھائی ان کی مدد کو آنے والے ہیں۔ کاش کہ میں ان سے کوئی وعدہ کر سکتا۔ بہت مسئلہ نے بوسنیا کے شہر میں جس سوچی اور بے دردی کا مظاہرہ کیا ہے۔ میں البتہ حیران بھی ہوں اور رنجیدہ بھی۔ مجھے اس میں شک نہیں ہے کہ بوسنیا کے مسلمان

کے معاملات نے عام مسلمانوں کی شدید بیزاری کی رگ رگ میں دوڑ جاتی ہے۔ خاص کر جیسے اس طرف کر دیا ہے کہ مساجد کے اثر حضرات نے اپنے جمعہ کے خطبوں میں بوسنیا، کشمیر اور فلسطین کے مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کی طرف عام مسلمانوں کی توجہ بار بار مرکوز کی ہے۔ لیکن شاید حقیقت بھی یہی ہے بالکل درست ہے کہ ان مظلوموں کی پاسداری کے سوا اور کوئی خاص تیر ان کی تحریروں کا نہیں نکلتا ہے۔ جو حقوق "تو ہیں" اور جو دولت والوں کا جو رد عمل رہا ہے وہ ہے، جو سمجھ سے باہر ہے۔ مسلمان قومیں کہاں ہیں؟ تیل کی دولت کہاں ہے؟ مسلمانوں کی وہ طاقت کہاں ہے جو سربیائیوں پر موثر دباؤ ڈال سکتی تھی؟ مگر جیسے یہ ان میں کوئی ہے ہی نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر ہر مسلم ملک سے صرف دو دو سو نوجوان بھی بوسنیا بھیج جائیں تو نہ صرف یہ کہ بوسنیا والوں کا نقشہ بدل سکتا ہے بلکہ سلب کو ایک واضح شکل بھی مل جائے گی۔ اگر اس نسل کشی کو انھوں نے مزید جاری رہنے دیا تو عالم اسلام اسے برداشت نہیں کرے گا۔ مگر ہائے افسوس کہ ایسا کچھ ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ تھوڑے سے نوجوان مجاہد بوسنیا پہنچے ہیں۔ ان کی تعداد اتنی کم اور ان کے پاس جو سامان ہے وہ اتنا معمولی سا ہے کہ ساری صورتحال پر وہ کیا اثر ڈال پائیں گے؟ یہاں ان کی موجودگی کو سربیائی لوگ اپنے پروپیگنڈے کے لئے بڑے موثر طریقہ سے استعمال کر رہے ہیں۔

اصل میں سب سے اہم مسئلہ مسلمانوں کی بے حسی کا ہے جو دنیائے اسلام کی طرف سے اب تک جو رد عمل سامنے آیا ہے وہ انتہائی سست رفتار اور بیزار ہے۔ اور کچھ دن بعد کسی نہ کسی مسلم ملک کے لیڈر کا بالکل سے سو چیز گے اور اسی قسم کا بیان سننے میں آتا رہتا ہے۔ اسلامی ملکوں کی تنظیم O.I.C کا بالکل سے اثر اتی ہم بھی ہم سن چکے ہیں۔ سیاسی لیڈروں کی خالی خولی باتیں بھی ہم نے بہت سنی ہیں۔ مگر بوسنیا میں ان میں سے کسی چیز کا ذرہ برابر اثر ہمیں نہیں نظر آیا۔ سربیائی فوجیں جو کچھ کر رہی ہیں وہ صرف بہت صاف دیکھ کر رہی ہیں۔

سربیائی اپنے کو بہت سنگ دل کہتے ہیں جو ایک خاص مذہبی جنگ میں مسلمانوں کا قتل عام کرنے کے لئے بار بار پکار رہی ہے۔ سربیائی فوجوں کا طرز عمل ان کے اصل ارادوں کو ظاہر کرنے کیلئے بالکل کافی ہے۔ سب سے پہلی چیز جو کسی گاؤں میں برباد کی جاتی ہے وہ مسجد ہے۔ اس کے تمام نشانات نہایت اہتمام سے بالکل مٹا دیئے جاتے ہیں۔ پھر اس زمین پر درخت لگا دیئے جاتے ہیں تاکہ مسجد کی یاد بھی ذہنوں سے محو ہو جائے۔ مسجد کے بعد باری آتی ہے اس شخص کی جو "اسلام" کے بارے میں کچھ جانتا ہے، چاہے وہ امام ہو یا گاؤں کا کوئی مسلم شخص۔ وہ یہ بھی شرط "ترتیب" کا ہے۔ دو ڈھائی لاکھ کسی کو نہیں پتہ۔ ۸۰ مسلمان علاقے بہت تیزی سے ختم ہو گئے ہیں۔ پانچ لاکھ ۲۰۰ باش اور دشمن گلیوں کے علاوہ سے بالکل بے گھر ہو گئے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ انھیں تو کوئی پہچان نہیں پاتے، اگر بچ گئے تو سربیائی عورتوں سے شادی بھی کر لی ہے۔ انھیں بھی نہیں بخشا جاتا، بلکہ قتل عام کی شہادت ملنوں کی ہے ہو گئی ہے۔

مدد فیصر اکبر نے بوسنیا میں جو کچھ دیکھا اس سے ان کے ذہن میں دو سوال پیدا ہوئے۔ ایک تو وہ جو انھوں نے بی بی سی کے اس ڈاکیومینٹری پروگرام میں بابت حالات کے کچھ مناظر دکھانے کے بعد دنیا بھر کے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے دنیا بھر کے لوگوں کے سامنے ان لفظوں میں رکھا تھا

"To me these people are fellow Muslims. And from a Muslim point of view they can be seen as victims of a struggle that is happening, not just here in former Yugoslavia in many countries and in many different forms. And I ask is this another Crusade. The last Crusade ?

یہ سب جیسے مسلمان بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اور ایک مسلمان کی نظر میں یہ سب ایک ایسی جدوجہد کا شکار ہو رہے ہیں جو صرف یہیں سابق یوگوسلاویہ ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے مختلف ملکوں میں شکلوں کے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ جاری ہے۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ ایک نئی صلیبی جنگ ہے۔ آخری صلیبی جنگ؟"

دوسرا سوال انھوں نے مسٹر اکبر کے ضمیر کے سامنے رکھا ہے۔ وہ ضمیر سے انھوں نے پہلے اپنے مشاہدات بیان کرتے ہوئے لکھا کہ

"اس سلسلے میں امت کے طرز عمل کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے ماضی کا یہ واقعہ بھی یاد آیا کہ بغدادی سپہ کے انہدام کے بعد بعض حلقوں میں رہنے والے یہودیوں بھی مسلمانوں نے اپنے ظلم و ستم کا سب کچھ بدلہ کر دیا تو وہاں کی سب حکومتوں نے ان ہی کو گرفتار کرکے اور ان کے بدلے منظور کرکے انھیں ۱۹۹۲ تک بند کر دیا — مجھے چند دن پہلے کی ہوئی یہ بات بھی یاد آئی کہ ایک عیب شہر سے نے صرف ایک دن اور ایک رات کے عوض فرانس کی ایک رشتہ دار عورت کو قتل کیا۔ ایک ۱۵ گھنٹے کا زبردست پیش کیا۔ اس وقت مجھے یہ خیال آیا تھا کہ صرف ایک ... کیا بوسنیائی مسلمانوں کی جان بچا سکتی تھی؟"

اور یہ سب سوچ کر جو سوال میرے ذہن میں آیا وہ یہ تھا کہ کیا میں یہ سمجھ کر سکتا ہوں کہ اگر مسلمانوں نے خوب مسلمانی کو بالکل ہی بھلا کر دیا تو خدا ان کی جگہ دوسری قوم لے آئے گا — میں سوچتا ہوں کہ کیا ہم اس حد تک پہنچ گئے ہیں۔ کیا واقعتاً ہم مسلمان کی حیثیت سے سوچنے اور اس حیثیت سے کچھ قدم اٹھانے کی صلاحیت بالکل ہی کھو بیٹھے ہیں؟"

بانگ درا لکھنؤ، جولائی ۱۹۹۳ء

اختر راہی

وسطی ایشیا اور علامہ اقبال

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند[۱]

عالمِ اسلام کی بدلتی ہوئی صورت حال پر نظر رکھنے والے علامہ اقبال کا مندرجہ بالا شعر اس حقیقت پر دال ہے کہ وہ اپنے پیغام کو برصغیر کی جغرافیائی حد بندیوں تک محدود نہ سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں ان تمام خطوں نے ان کے پیغام سے ولولۂ تازہ حاصل کیا تھا، جو ان کے ذریعۂ اظہار — اردو و فارسی — سے آگاہ تھے۔ بخارا اور سمرقند جو کبھی تہذیب اسلامی کے اہم مرکز تھے، اپنی مرکزی حیثیت کی بدولت اپنے ہمسایہ خطوں — ایران، افغانستان اور برصغیر — کی علمی و ثقافتی زبان فارسی کے جاننے والوں سے کسی دور میں خالی نہ رہے۔ ان دنوں یہ شہر ازبکستان میں شامل ہیں اور گزشتہ ستر سال کے اشتراکی نظام کے تحت یہاں روسی زبان کو پروان چڑھایا گیا یا مقامی زبان کو ترقی دی گئی مگر آج بھی ان شہروں میں فارسی بولنے والے مل جاتے ہیں۔ تاہم وسطی ایشیا کی ریاست جو فارسی زبان و ادب کے حوالے سے سب سے اہم ہے، وہ تاجکستان ہے۔

ازبکستان اور تاجکستان میں فارسی زبان کے حوالے سے مطالعۂ اقبال سے دلچسپی کے وسیع امکانات موجود ہیں۔ آمرانہ دور اقتدار میں تو اس بات کی امید نہیں کی جا سکتی تھی کہ احیائے اسلام کے داعی اقبال کے پیغام کو من و عن عوام تک پہنچنے دیا جاتا یا پورے کلام اقبال کے تراجم شائع ہوتے۔ تاہم ازبک اور تاجک زبانوں کو وسطی ایشیا کی دوسری زبانوں پر فوقیت حاصل ہے کہ ان میں کلام اقبال کے منتخب حصوں کے ترجمے موجود ہیں۔ ۱۹۶۶ء میں میر سعید میر شکر نے منتخب کلام اقبال کو تاجک زبان کا جامہ پہنایا اور چند سال بعد ۱۹۷۳ء میں منتخب اشعارِ اقبال کو ازبک زبان میں منتقل کیا گیا۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ کلامِ اقبال کو وسطی ایشیا کی ریاستوں میں عام کیا جائے اور یہ پاکستان، ایران، افغانستان اور ان ریاستوں کے درمیان ثقافتی اور علمی رشتوں کو مضبوط کرنے کا باعث بنے گا۔ اقبالیات کے عالموں اور وسطی ایشیا کی زبانیں جاننے والوں اور اقبال دوستوں کو اس جانب توجہ دینی چاہیے۔

علامہ اقبال کے افکار و خیالات کے حوالے سے یہ جاننا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ روس اور

وسطی ایشیا سے اقبال کی اولین دلچسپی ادب کے حوالے سے پیدا ہوئی تھی۔ ۱۹۰۵ء میں یورپ کے تعلیمی سفر کے دوران میں ان کی ملاقات ایک فرانسیسی پادری سے ہوئی جو بہت سی زبانیں جانتا تھا اور روسی زبان خوب بولتا تھا۔ علامہ اقبال ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"میں اس کے پاس جا کھڑا ہوا اور ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد پوچھا کہ کونٹ ٹالسٹائی کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے۔ اس نے میرے سوال پر نہایت حیرانی ظاہر کی اور پوچھا کہ کونٹ ٹالسٹائی کون ہے؟ مجھے یہ دیکھ کر نہایت تعجب ہوا کہ یہ شخص روسی زبان جانتا ہے اور کونٹ کے مشہور نام سے واقف نہیں ہے۔"

علامہ اقبال نے اپنے تشکیلی دور میں ادب و شعر اور فلسفہ کے حوالے سے مطالعہ کیا اور کونٹ ٹالسٹائی (۱۸۲۸ء--۱۹۰۰ء) ان کی دلچسپی کا مرکز رہے۔

یورپ کے تعلیمی سفر سے واپسی کے بعد علامہ کی زندگی کا جو دور شروع ہوا، اس میں برصغیر اور بالخصوص پنجاب کے مسلمانوں کی تعلیمی و علمی ترقی کو نمایاں مقام حاصل تھا۔ وہ ایسی انجمنوں کے رکن رہے اور ان میں فعال کردار ادا کیا جو مسلمانوں کو تعلیمی میدان میں آگے لانے کے لیے کام کر رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے "اسرارِ خودی" نظم کی۔ ۱۹۱۵ء میں اس کی اشاعت عمل میں آئی تو تصوف کے حوالے سے ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ علامہ نے اس عرصے میں تصوف پر غور و فکر اور تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا اور تصوف بالخصوص نقشبندی سلسلے کے مرکز وسطی ایشیا کے اہل علم و ... سے ان کی دلچسپی پیدا ہوئی۔

اس عرصے میں پہلی عالمی جنگ نے برصغیر کے مسلمانوں کو پریشان کر رکھا تھا۔ ایک طرف اپنی سیاسی حیثیت میں وہ اس امر کے پابند تھے کہ برطانوی حکمرانوں کی تائید کریں مگر دینی حیثیت سے ان کے دل ترک مسلمانوں کے ساتھ تھے، جنھیں وہ کسی صورت میں زک اٹھاتے نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ مسلمانانِ برصغیر نے یادداشتوں، بیانات اور تقریروں کے ذریعے اپنے حکمرانوں پر واضح کیا کہ ترکی کی خلافت اسلامیہ ان کے تصورات زندگی میں ایک مقام رکھتی ہے اس لیے خلافت کے ادارے کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ برطانوی حکمران زبانی طور پر اہل برصغیر سے یہ وعدہ کر رہے تھے کہ ترکی کی سلامتی کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا اور خلافت کا "مقدس" ادارہ محفوظ رہے گا مگر در پردہ برطانیہ نے اپنی حلیف استعماری طاقتوں کے ساتھ خفیہ معاہدات کر رکھے تھے کہ شکست کے بعد ترکی کا انجام کیا ہو گا اور ترکی کے کن حصوں پر کون قابض ہوگا۔

ابھی جنگ جاری تھی کہ روس میں اشتراکی انقلاب برپا ہو گیا۔ انقلابیوں نے امن اور مجبور و مقہور قوموں کی خیر خواہی کا تاثر دیتے ہوئے استعماری روس کی پالیسیاں ترک کرنے کا اعلان کیا۔ زارِ روس

نے ایران کے جن علاقوں پر قبضہ کیا تھا، وہ ایران کو واپس کر دیے گئے۔ استنبول پر ترکی کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا اور ان خفیہ معاہدوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا جو روس اور یورپ کی دوسری ترکی مخالف قوموں کے درمیان طے پائے تھے۔

مذکورہ بالا پس منظر میں استعمار مخالف مسلمانوں میں روسی کمیونسٹوں کے لیے کچھ اچھے جذبات کا پیدا ہونا فطری امر تھا۔ علامہ اقبال نے بھی کمیونسٹوں کی بعض پالیسیوں اور کمیونزم کے بعض پہلوؤں کی تعریف کر دی تو کچھ لوگوں کے ہاں یہ مشہور ہو گیا کہ اقبال سوشلسٹ ہیں تاہم اقبال نے اپنی تحریروں اور اخباری بیانات کے ذریعے یہ تاثر ختم کرنے کی کوشش کی کہ وہ کمیونسٹ یا بالشویک ہیں۔ انھوں نے زور دے کر بتایا کہ وہ کسی "ازم" پر یقین نہیں رکھتے۔ ان کے نزدیک بالشوزم کفر ہے۔

اشتراکی انقلاب سے پہلے مسلم وسطی ایشیا کی سیاسی صورت حال یہ تھی کہ روس نے ۱۸۶۰ء میں چار آزاد اور باہم دگر جنگ آزما ریاستوں — خیوا، فرغانہ، بخارا اور قازق — پر شدید حملے کر کے انھیں سرنگوں کر لیا تھا۔ قازق اور فرغانہ کو روس کا صوبہ بنا دیا گیا تاہم استعماری مصلحتوں کی خاطر بخارا اور خیوا کو زیرِ حمایت علاقوں کی حیثیت سے محدود خود مختاری دے دی گئی۔

بیسویں صدی کے آغاز میں وسطی ایشیا کے مسلمانوں میں جدیدیت کی تحریک کا آغاز ہوا۔ اس تحریک کا مقصد وسطی ایشیا (ترکستان) کی ثقافت اور معاشرتی زندگی کو از سرِ نو استوار کرنا تھا۔ اس تحریک نے وسطی ایشیا کے عوام میں اجتماعی شعور بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ جدیدیت پسند رہنماؤں اور کارکنوں کا ایک طرف کمیونسٹ تحریک سے ربط و تعلق تھا جو روس میں زار کی استبدادی حکومت کے خاتمے کے لیے کوشاں تھی۔ دوسری طرف جدیدیت پسندوں کی سرگرمیوں کا ہدف فرغانہ اور قازق میں براہِ راست روسی زار کی حکومت تھی اور خیوا و بخارا کے امیر جو زارِ روس کے حامی تھے۔ جدیدیت پسندوں اور روسی حکمرانوں اور ان کے حامیوں کے درمیان کشمکش جاری رہی جس میں جدیدیت پسندوں نے جانی و مالی قربانیاں دیں اور ایک حد تک عوامی سطح پر اثر و رسوخ پیدا کر لیا۔

اشتراکی رہنماؤں — لینن اور سٹالن — کے دستخطوں سے "روسی انقلاب کا اعلان" جاری کیا گیا جس میں روس کے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ ان کا دین و ایمان، رسوم اور روایات محفوظ ہوں گی، اسی طرح ان کے دینی و ثقافتی اداروں کو کام کرنے کی آزادی حاصل ہو گی۔ وہ قومی زندگی کی تعمیر اپنی روایات کے مطابق کر سکیں گے اور سوویت ریاست ان کی حفاظت اور تعظیم و تکریم کرے گی۔ تمام روسی اقوام کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ روسی قوموں کو حقِ خود اختیاری حاصل ہو گا اور اگر ان میں سے کوئی روس سے الگ ہو کر آزاد و خود مختار ریاست قائم کرنا چاہے تو اسے اس کی بھی آزادی حاصل ہو گی۔

روس میں اشتراکی انقلاب کے بعد ایک طرف اشتراکی خیوا اور بخارا کی امارتوں کے مخالف تھے

اور دوسری طرف جدیدیت پسند پرانے نظام کو بدلنا چاہتے تھے۔ اس صورت میں پہلے کوکند کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور پھر امیر بخارا کو جو خزانہ سمیٹ کر افغانستان چلا گیا۔ بخارا کے سقوط کے بعد خیوا بھی اشتراکی فوج کے کنٹرول میں آگیا۔[۴] اس کے بعد تاجکستان میں اشتراکی فوج اور مقامی آبادی کے درمیان ٹکراؤ جاری رہا جو بڑی حد تک ۱۹۲۳ء میں ختم ہوا۔ اگرچہ اس کے سات آٹھ سال بعد تک ٹکراؤ کی اکا دکا خبریں آتی رہی تھیں۔

انقلاب کے بعد اشتراکی قیادت اور وسطی ایشیا کے مسلمانوں کے درمیان تصادم اور تعاون کا جو سلسلہ جاری تھا، اس میں مختلف گروہ اپنے اپنے مقاصد کے لیے کام کر رہے تھے۔ وسطی ایشیا کی سابق مسلمان قیادت اپنے طرزِ عمل کی وجہ سے جدیدیت پسندوں کے لیے قابل قبول نہ تھی، جدیدیت پسند اس سے تعاون کرنے کو تیار نہ تھے اور جب اشتراکی فوج نے خیوا اور بخارا کے خلاف اقدام کیا تو جدیدیت پسند اشتراکی فوج کے خیر خواہ تھے۔ روایت پسند مسلمان قیادت کے لیے اشتراکیوں کے خلاف لڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، مگر اس کے لیے بہت زیادہ عرصہ مزاحمت کرنا مشکل تھا۔ بہر حال جدیدیت پسند اشتراکی فوج کی اس لیے حمایت نہیں کر رہے تھے کہ وہ اشتراکیت پر ایمان لائے ہوئے تھے بلکہ وہ تو انقلاب روس کے اعلان کے سنہرے الفاظ کے تحت اپنی آزادی اور جدید معاشرے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ جب اشتراکی قدیم مسلم قیادت کی مزاحمت ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو جدیدیت پسند اس پوزیشن میں نہ تھے کہ اشتراکیوں کو دیس نکالا دے سکتے اور یوں اعلیٰ آدرش کے خواب کے باوجود انہیں نہایت بھیانک تعبیر دیکھنی پڑی۔

۱۰ جولائی ۱۹۲۰ء کے ایک خط میں اقبال نے وسطی ایشیا کی صورت حال پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا۔[۵]

"وسطِ ایشیا کی ہانڈی ابل رہی ہے۔ خدا تعالیٰ اپنا فضل کرے۔

تا بروید لالۂ آتش رنگ از خاکِ شام

باز سیرابش ز خونِ مسلماں کردہ اند

کونٹ ٹالسٹائی — کا خیال تھا کہ لالۂ آتش رنگ منگولین قوم سے پیدا ہوگا اور اس وقت دنیا میں موجود ہے۔ اب یہ معلوم نہیں کہ اس کا عروج یا ظہور کب ہوگا اور وہ اس وقت روس میں ہے یا وسطِ ایشیا میں یا شام میں"

بحرانی کیفیت میں اقبال کسی "مردے از غیب" کے ظاہر ہونے کی بات کر رہے تھے۔ مگر اس لالۂ آتش رنگ کا تصور انھوں نے ٹالسٹائی سے لیا جس سے وہ اپنے ابتدائی دورِ زندگی میں واقف ہوئے تھے۔

اشتراکی انقلاب سے جن مسلمان رہنماؤں نے بہت زیادہ توقعات وابستہ [۷] رکھی تھیں، ان میں سے ایک مفتی عالم جان بارودی بھی تھے۔ ۱۹۲۱ء میں ان کا انتقال ہوا تو مسلم اسٹینڈرڈ (لندن) نے ان کے کچھ حالات شائع کیے۔ علامہ اقبال ان کے بارے میں مزید جاننے کی خواہش رکھتے تھے مگر اس سے پہلے کہ وہ سید سلیمان ندوی جیسے اہلِ علم و قلم سے درخواست کرتے کہ وہ مفتی عالم جان بارودی کے بارے میں کوئی مقالہ لکھیں، انھیں ماہ مئی ۱۹۲۲ء کا "معارف" موصول ہوا جس میں سید سلیمان ندوی کا مقالہ "علمائے روس" [۶] شامل تھا۔ اس مقالے کے پڑھنے پر انھوں نے سید صاحب کو لکھا کہ

"آج کے "معارف" میں میری آرزو سے بڑھ کر مضمون لکھا گیا (جزاک اللہ) معارف کا ایڈیٹر صاحبِ کشف نہ ہوگا تو اور کون ہوگا۔ حال کے روسی علماء کی بعض تصانیف اسلام کے متعلق اگر دستیاب ہو جائیں تو ان کا ترجمہ ہندوستان میں شائع ہونا چاہیے۔"

وسط ۱۹۲۲ء [۸] میں علامہ نے پروفیسر محمد اکبر منیر کو (جو ایران میں مقیم تھے) وسطی ایشیا کے حوالے سے لکھا۔ [۹]

"مغربی اور وسطی ایشیا کی مسلمان قومیں اگر متحد ہو گئیں تو بچ جائیں گی اور اگر ان کے اختلافات کا تصفیہ نہ ہو سکا تو اللہ حافظ ہے۔ مسلمانوں میں اتحاد کی سخت ضرورت ہے۔ میرا مذہبی عقیدہ یہی ہے کہ اتحاد ہوگا اور دنیا پھر ایک دفعہ جلالِ اسلامی کا نظارہ دیکھے گی۔"

علمائے روس اور بالخصوص مفتی عالم جان بارودی کے افکار سے علامہ اقبال کی دلچسپی کافی دیر قائم رہی۔ تقریباً دو سال بعد ایک اور خط میں انھوں نے سید سلیمان ندوی کو لکھا۔ [۱۰]

"کیا روسی مسلمانوں میں بھی ابنِ تیمیہ اور محمد بن عبدالوہاب کے حالات کی اشاعت ہوئی تھی اس کے متعلق آگاہی کی ضرورت ہے۔ مفتی عالم جان کا حال میں انتقال ہو گیا ہے، ان کی تحریک کی غایت کیا تھی؟ کیا یہ محض تعلیمی تحریک تھی یا اس کا مقصد ایک مذہبی انقلاب بھی تھا؟"

۱۹۲۴ء اور اس کے بعد "خطبات" کے سلسلے میں علامہ [۱۱] مسلم مصلحین کے افکار جاننے کی مسلسل خواہش رہی تاہم ۱۹۳۱ء میں انھیں دوسری گول میز کانفرنس (۷ ستمبر - یکم دسمبر ۱۹۳۱ء) میں شرکت کے لیے لندن کا سفر کرنا پڑا۔ واپسی پر فلسطین میں موتمر عالم اسلامی میں شریک ہوئے۔ اس سفر میں انھیں وسطی ایشیا کے مسلمان رہنماؤں سے ملاقات کا بھی موقع ملا۔ جن دنوں لندن میں مقیم تھے، رؤف بے اور سعید شامل ملاقات کے لیے آتے رہے۔ ۱۱۶ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو پہلی ملاقات ہوئی جس کے بعد دو تین تفصیلی ملاقاتیں ہوئیں۔

غازی رؤف بے (۱۸۸۱ء - ۱۹۶۰ء) ترکی کی بحریہ سے متعلق افسر تھے۔ انھوں نے جنگ طرابلس (۱۹۱۳ء) کے دوران میں کارہائے نمایاں انجام دیے تھے۔ پہلی عالمی جنگ میں مصطفیٰ کمال

اتاترک کے قریبی ساتھی کی حیثیت سے کام کیا تھا مگر قومی حکومت بننے پر مصطفیٰ کمال سے ان کے اختلافات پیدا ہو گئے اور وہ ملک چھوڑ کر فرانس چلے گئے تھے۔ اوائل ۱۹۳۳ء میں جامعہ ملیہ دہلی میں لیکچرز کے لیے آئے تھے۔ جب مصطفیٰ کمال نے جملہ جلاوطن ترک رہنماؤں کو وطن واپس آنے کی دعوت دی تو وہ بھی ترکی چلے گئے تھے۔ غازی رؤف یوں تو ترکی میں پیدا ہوئے تھے مگر ان کے اجداد کا تعلق شمالی قفقاز سے تھا۔

علامہ اقبال کے دوسرے ملاقاتی سعید شامل، قفقاز کے معروف مجاہد امام شامل کے پوتے تھے اور اشتراکی انقلاب کے بعد اپنے وطن کی آزادی کے لیے یورپ میں رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے برطانیہ، فرانس اور دوسرے ملکوں کے دارالحکومتوں میں اہم افراد سے ملاقاتیں کرتے رہتے تھے۔

علامہ اقبال سے اپنی ملاقاتوں میں سعید شامل نے شمالی قفقاز کے مسلمانوں کی جدوجہد آزادی پر روشنی ڈالی اور اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ انھوں نے اشتراکی قیادت پر اعتماد کر کے غلطی کی۔ اشتراکی قیادت نے ابتداء میں وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کی آزادی کے حق میں ہے مگر جب اشتراکی قوت پکڑ گئے تو انھوں نے مسلمان علاقوں کو سوویت جمہوریتوں کی شکل دے دی۔

دوران گفتگو میں اشتراکیت زیر بحث آ گئی۔ سعید شامل نے اس طرز زندگی کی شدید مخالفت کی مگر علامہ اقبال کو اس میں یورپی امپیریلزم کی تباہی کا ایک عنصر محسوس ہوتا تھا۔"

یورپ سے واپسی پر اقبال موتمر عالم اسلامی کے اجلاس منعقدہ بیت المقدس (۶ دسمبر - ۱۴، دسمبر ۱۹۳۱ء) میں شریک ہوئے۔ موتمر میں روس اور وسطی ایشیا کے مسلمان نمائندوں میں سعید شامل، علامہ موسیٰ جار اللہ اور عیاض اسحاقی شامل تھے۔ ان حضرات نے"

"بالشویک حکومت کے ظلم و ستم کی داستانیں سنائیں اور موتمر کے نمائندوں کو بتایا کہ مسلمان کس طرح اشتراکیت کی بھینٹ چڑھ رہے ہے۔ ان کی بستیوں کا صفایا کیا جا رہا تھا۔ اسلامی تہذیب و تمدن کے ہر ہر نقش کو محو کیا جا رہا تھا۔ مسجدوں میں تالے ڈال دیے گئے تھے۔ مدرسوں کی بڑی تعداد بند ہو چکی تھی۔ غرض روسی مسلمانوں کی اجتماعی حیثیت کو مختلف قومیتوں میں تقسیم کر کے انھیں کچلا جا رہا تھا۔"

موتمر عالم اسلامی میں شرکت سے علامہ اقبال کو وسطی ایشیا کے مسلمان رہنماؤں سے تبادلۂ خیال کا موقع ملا جو وسطی ایشیا سے ان کی دلچسپی میں اضافہ کا باعث بنا۔

مارچ ۱۹۳۳ء میں جب غازی رؤف بے جامعہ ملیہ دہلی تشریف لائے تو ان کی ایک تقریر کے موقع پر علامہ اقبال صدر جلسہ تھے۔ علامہ کے قیام دہلی کے دوران میں اسد ملتانی (م ۱۹۵۹ء) ان سے ملے۔ اسد ملتانی نے علامہ کی مجلس میں جو گفتگو ہوئی، اس کے نوٹس تیار کیے ہیں۔ علامہ نے ایک موقع

پر کہا کہ پچھلی چند صدیوں میں اسلام کا زمانۂ انحطاط رہا ہے اس لیے اعلیٰ شخصیتیں بہت وقفے کے بعد پیدا ہوئیں مگر کچھ عرصے سے رنگ بدلا ہوا نظر آتا ہے اور اعلیٰ ہستیاں پے در پے پیدا ہو رہی ہیں۔ انھوں نے اس سلسلے میں جن ہستیوں کا نام لیا ہے، ان میں مفتی عالم جان بارودی شامل تھے۔[۱۳]

جنوری ۱۹۳۵ء میں "بالِ جبریل" شائع ہوئی تو اس میں روس اور وسطی ایشیا کے مسلمانوں کی حالتِ زار اور ان کی خواہشات کو "تاتاری کا خواب" میں یوں پیش کیا گیا۔[۱۴]

کہیں سجادہ و عمامہ رہزن کہیں ترسا بچوں کی چشمِ بے باک
ردائے دین و ملت پارہ پارہ قبائے ملک و دولت چاک در چاک
مرا ایماں تو ہے باقی، و لیکن نہ کھا جائے کہیں شعلے کو خاشاک
ہوائے تند کی موجوں میں محصور سمرقند و بخارا کی کفِ خاک

بگرد اگرد خود چندانکہ بینم
بلا انگشتری و من نگینم

یکایک ہل گئی خاکِ سمرقند اٹھا تیمور کی تربت سے اک نور
شفق آمیز تھی اس کی سفیدی صدا آئی کہ "میں ہوں روحِ تیمور"
اگر محصور ہیں مردانِ تاتار نہیں اللہ کی تقدیر محصور
تقاضا زندگی کا کیا یہی ہے کہ تورانی ہو تورانی سے مہجور؟

"خودی را سوز و تابے دیگرے دہ
جہاں را انقلابے دیگرے دہ"

موتمرِ عالمِ اسلامی کے دوران میں علامہ اقبال کے ساتھ علامہ موسیٰ جار اللہ بھی شریک تھے۔ ۱۹۳۶ء میں علامہ کو ان کی تالیف "الوشیعہ" دیکھنے کا موقع ملا۔ سید سلیمان ندوی کو اس کی اطلاع یوں دی ہے۔[۱۵]

"موسیٰ جار اللہ کو آپ جانتے ہوں گے۔ انھوں نے حال میں ایک کتاب عقائدِ شیعہ پر شائع کی ہے۔ اس میں بعض لطائف ہیں جو بہت جاذبِ توجہ ہیں۔"

دوسرے خط میں موسیٰ جار اللہ کی کتاب کے ناشر کا پتہ لکھا ہے اور کتاب پر دوبارہ مختصراً تبصرہ کیا ہے کہ[۱۶]

"موسیٰ جار اللہ کی کتاب نہایت عمدہ ہے۔"

علامہ جن دنوں یہ خطوط لکھ رہے تھے ان کی خرابیٔ صحت بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ مطالعہ چھوٹتا جا رہا تھا اور لکھنے پڑھنے کا کام کم ہوتا جا رہا تھا۔ تاہم یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو انھوں نے سالِ نو کا جو پیغام دیا، کون کہہ سکتا ہے کہ اس میں وسطی ایشیا کے مسلمانوں کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ پیغام میں وہ لکھتے ہیں۔[۱۷]

ب زمان و مکان کی تمام پہنائیاں سمٹ رہی ہیں ـــ لیکن تمام ترقی کے باوجود اس زمانہ میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، اشتراکیت، فسطائیت اور نہ جانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ ان نقابوں کی آڑ میں دنیا بھر میں قدرِ حریت اور شرفِ انسانیت کی ایسی مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخِ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا گو ہمیں نئے سال کی ابتدا اس دعا کے ساتھ کرنی چاہیے کہ خداوند کریم حاکموں کو انسانیت اور نوعِ انسان کی محبت عطا فرمائے۔"

حواشی

۱۔ اقبال، ضرب کلیم، لاہور: شیخ مبارک علی تاجر کتب (۱۹۳۳ء)، ص ۱۵

۲۔ سید عبدالواحد معینی، مقالات اقبال، لاہور: شیخ محمد اشرف تاجر کتب (۱۹۶۳ء)، ص ۴۷

۳۔ علامہ اقبال اس دور میں تصوف اسلام پر ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے جو مکمل نہ ہو سکی تاہم اس کتاب کے خاکے اور اشارات میں علاء الدولہ سمنانی اور خواجہ محمد [پارسا] کے حوالے موجود ہیں۔ دیکھیے صابر کلوروی (مرتب)، تاریخ تصوف، لاہور: مکتبہ تعمیر انسانیت (۱۹۸۵ء)، ص ۲۷ اور ص ۳۱

۴۔ ۲۴ جون ۱۹۲۳ء کے روزنامہ "زمیندار" (لاہور) میں علامہ کا ایک خط شائع ہوا جس میں انھوں نے مدیر کو لکھا کہ

"میں نے ابھی ایک اور دوست سے سنا ہے کہ کسی صاحب نے آپ کے اخبار میں یا کسی اور اخبار میں (میں نے اخبار ابھی تک نہیں دیکھا) میری طرف بالشویک خیالات منسوب کیے ہیں۔ چونکہ بالشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے، اس واسطے اس تحریر کی تردید میرا فرض ہے۔" [محمد رفیق افضل، گفتار اقبال، لاہور: ادارہ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب (۱۹۶۹ء)، ص ٦]

"میرے نزدیک فاشزم، کمیونزم یا زمانۂ حال کے اور ازم کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ میرے عقیدے کی رُو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو بنی نوع انسان کے لیے ہر نقطۂ نگاہ سے موجبِ نجات ہو سکتی ہے۔" [مکتوب بنام آل احمد سرور مکتوبہ ۱۲ مارچ ۱۹۳۷ء، شیخ عطاء اللہ، اقبال نامہ، لاہور: شیخ محمد اشرف تاجر کتب (۱۹۵۱ء)، جلد دوم، ص ۳۱۳]

اشتراکیت اور علامہ اقبال کے حوالے سے تفصیلی مطالعے کے لیے دیکھیے: نعیم صدیقی، اقبال، مغربی مادیت اور سوشلزم، لاہور: دوش فکر (۱۹۶۹ء)، ڈاکٹر ایس اے رحمان، Iqbal and Socialism، کراچی: ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن (۱۹۷۳ء)

۵۔ اقبال، مکاتیبِ اقبال بنام خان محمد نیاز الدین خان، لاہور: بزمِ اقبال (۱۹۵۴ء)، ص ۳۳

۶۔ زیرِ نظر شمارے میں یہ مقالہ من و عن نقل کیا جا رہا ہے۔

۷۔ اختر راہی، اقبال: سید سلیمان ندوی کی نظر میں، لاہور: بزمِ اقبال (۱۹۷۸ء)، ص ۱۶۳-۱۶۴

۸۔ علامہ کے اس مکتوب پر کوئی تاریخ درج نہیں مگر اس میں "خضرِ راہ" کی تکمیل اور "پیامِ مشرق" کے قریب الاختتام ہونے کا ذکر ہے۔ "خضرِ راہ" انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ (۱۶ اپریل ۱۹۲۲ء) میں پڑھی گئی تھی اور "پیامِ مشرق" اس وقت زیرِ تالیف تھی۔ اس لیے یہ مکتوب وسط ۱۹۲۲ء میں کسی وقت لکھا گیا ہوگا۔

۹۔ شیخ عطاء اللہ (مرتب)، اقبال نامہ، حوالہ مذکورہ، ص ۱۶۳

۱۰۔ اختر راہی، حوالہ مذکورہ، ص ۱۷۱-۱۷۲

۱۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: محمد حمزہ فاروقی، سفر نامہ اقبال، کراچی: مکتبہ معیار (۱۹۷۳ء)، ص ۳۲-۳۵

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۷۰-۱۷۱

۱۳۔ اختر راہی، اسد ملتانی کے روزنامچے کے چند اوراق، سہ ماہی "اقبال" (لاہور)، اپریل ۱۹۷۶ء، ص ۸۲

۱۴۔ اقبال، بالِ جبریل، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز (س-ن)، ص ۳۹

بالِ جبریل کی اشاعت پر پروفیسر آل احمد سرور (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے علامہ اقبال کو ایک خط ارسال کیا جس میں "اشتراکیت اور فاشزم کے متعلق ان کی رائے دریافت کی تھی۔ دوسرے بعض نظموں میں جو تضاد نظر آتا تھا، اس کی طرف اشارہ کیا تھا۔ تیسرے خاص طور پر بالِ جبریل میں سولینی پر جو نظم ہے، اس پر اعتراض کیا تھا اور اس کا مقابلہ ضربِ کلیم کی نظموں سے کر کے دونوں کا فرق ظاہر کیا تھا۔ اس سلسلے میں تیموریت، چنگیزیت اور ملائیت کے تصورات پر کچھ بحث تھی۔" [آل احمد سرور، اقبال کا ایک خط، ماہنامہ ماہِ نو (کراچی)، اپریل ۱۹۷۰ء، ص ۳۳]۔ "تیموریت" کے حوالے سے بالِ جبریل کی نظم "تاتاری کا خواب" کی جانب اشارہ ہے۔

علامہ نے واضح کیا:

> آپ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے لیکچرر ہیں۔ اس واسطے مجھے یقین ہے کہ لٹریچر کے اسالیبِ بیان سے مجھ سے زیادہ واقف ہیں۔ تیمور کی روح کو اپیل کرنے سے تیموریت کا زندہ کرنا مقصود نہیں بلکہ وسط ایشیا کے ترکوں کو بیدار کرنا مقصود ہے۔ تیمور کی طرف اشارہ محض اسلوبِ بیان ہے۔" [شیخ عطاء اللہ، حوالہ مذکورہ، ص ۳۱۵]

۱۵۔ اختر راہی، اقبال: سید سلیمان ندوی کی نظر میں، حوالہ مذکورہ، ص ۲۲۸

۱۶۔ ایضاً، ص ۲۳۰

۱۷۔ نقوش (لاہور)، اقبال نمبر، ستمبر ۱۹۷۷ء، ص ۲۳

(اقبال، لاہور، جولائی ۹۳ء)

ڈاکٹر بشیر سیفی

نئے پاکستانی افسانہ نگار

نئے پاکستانی افسانے سے صرف وہی افسانہ مراد نہیں ہے جسے بالعموم علامتی افسانے سے تعبیر کیا جاتا ہے بلکہ میری رائے میں ۱۹۶۰ء کے بعد لکھے جانے والے وہ سب افسانے نئے افسانے کے ذیل میں آتے ہیں جو نئے معاشرتی، سیاسی اور نفسیاتی مسائل کو نئی چابکدستی سے پیش کرتے ہیں کیونکہ نیاپن محض علامت و تجرید سے مخصوص نہیں کہ علامت و تجرید کا اظہار ایک وسیلہ ہی مقصود بالذات نہیں۔

اردو ادب اور بالخصوص افسانے میں علامت کی ترویج کا ایک سبب ۱۹۵۸ء کا مارشل لا بتایا جاتا ہے جب سیاست و صحافت کے میدان میں آزادیٔ اظہار پر قدغن لگا دی گئی تھی مگر میرے خیال میں یہ درست نہیں کیونکہ ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء نے سیاستدانوں اور صحافیوں پر تو پابندیاں عائد کیں مگر خالص ادب اور ادیبوں سے کوئی تعرض نہیں کیا اولاً شاید اسی لئے کہ ایوب خان کو ادب کی محدودیت کا علم تھا ثانیاً اس سلسلہ کو قدرت اللہ شہاب، جمیل الدین عالی اور ابن انشاء وغیرہ نے تقریباً تمام قابل ذکر اہل قلم کو "رائٹرز گلڈ" کی تنظیم میں شامل کر رکھا تھا۔ البتہ یہ ان چند ادیبوں کا مسئلہ ہو سکتا ہے جو رائٹرز گلڈ سے منسلک نہیں تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۶۰ء کے آس پاس نمایاں ہونے والے بیشتر لکھنے والے علامتی انداز اختیار کئے ہوئے تھے نیز جس دور میں پاکستان میں علامتی افسانے کا آغاز ہوا تقریباً اسی زمانے میں بھارت میں بھی علامتی افسانے کا چرچا ہوا حالانکہ وہاں مارشل لاء جیسے حالات نہیں تھے لہذا علامت کو مارشل لاء سے منسلک کرنا ایک ایسا مغالطہ ہے جسے اب دور ہو جانا چاہیے۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ علامتی افسانہ ترقی پسندوں کی راست حقیقت نگاری اور مقصدیت کے ردعمل کے طور پر وجود میں آیا۔ اس خیال میں جزوی صداقت تو ہے مگر کلیتاً اسے قبول نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جب علامت نگاری کا رجحان پیدا ہوا اس وقت ادبی منظرنامے پر سماجی حقیقت نگار مثلاً کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی کے ساتھ ساتھ ممتاز مفتی، آغا بابر، غلام عباس، میرزا ادیب، بانو قدسیہ اور اشفاق احمد جیسے افسانہ نگار بھی موجود تھے لہذا یہ کہنا زیادہ قرین قیاس ہوگا کہ اردو افسانہ میں علامت کا استعمال دراصل مغربی ادب کی علامتی تحریک سے آگاہی کے علاوہ اظہار بیان کے نئے امکانات دریافت کرنے کی خواہش کا نتیجہ تھا کیونکہ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی

احمد ندیم قاسمی اور ممتاز مفتی ایسے افسانہ نگاروں کی موجودگی میں مروجہ افسانے کے حصار کو توڑے بغیر افسانے میں نام پیدا کرنا آسان نہ تھا۔ یوں نئی نسل کے افسانہ نگار راست اندازِ بیان کے بجائے علامتی انداز اپنانے کی طرف مائل ہوئے اور بعض تو اس دھن میں اتنا آگے نکل گئے کہ قاری سے ان کا رشتہ ہی منقطع ہو گیا اور علامت ایسا گورکھ دھندہ بن گئی جس کی توضیح و تعبیر قاری تو قاری ناقد کے بس کی بات بھی نہ رہی۔ ان کی دیکھا دیکھی بعض ایسے نوواردانِ ادب نے جو نہ صرف افسانے کی نئی روایت سے نابلد تھے بلکہ علامت و تجرید کے فرق سے بھی آگاہ نہ تھے، افسانے کے نام پر بے معنویت کی گرد بھی اڑائی مگر ایسا تو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے اس لئے سارے علامتی افسانے کو مطعون کرنا مناسب نہیں۔

اردو ادب میں علامت کے استعمال کا سراغ بہت دور تک لگایا جا سکتا ہے کیونکہ استعارہ کے علاوہ تمثیل ALLEGORY بھی علامت کی ابتدائی صورتیں ہیں اور اردو کے قدیم ادب کا دامن استعارہ و تمثیل کی دولت سے مالا مال ہے لیکن دورِ جدید میں علامت کا جو مفہوم متعین ہوا ہے اس کے مطابق احمد علی اور کرشن چندر کو علامتی افسانے کا پیش رو کہا جاتا ہے۔ سعادت حسن منٹو کے آخری دور کے دو ایک افسانوں میں بھی علامتی انداز موجود ہے یوں یہ مفروضہ بھی باطل ہو جاتا ہے کہ علامت محض نئی نسل کا طرۂ امتیاز ہے تاہم پاکستان میں علامتی افسانے کا باقاعدہ آغاز انتظار حسین اور انور سجاد سے منسوب ہے جبکہ بھارت میں بلراج مینرا اور سریندر پرکاش علامتی افسانہ نگاروں کے سرخیل سمجھے جاتے ہیں۔

انتظار حسین کا تعلق چونکہ افسانے کی کلاسیکی روایت سے ہے اس لئے انہوں نے اپنی علامات قدیم داستانوں اور دیومالا کی دیو ہیکل اساطیر سے اخذ کیں مگر نامانوس اور ناقابلِ فہم نہیں چنانچہ انہیں اس ردِعمل کا سامنا نہیں کرنا پڑا جس سے انور سجاد اور بعض دوسرے علامتی افسانہ نگار دوچار ہوئے۔ ان کے موضوعات کا دائرہ اگرچہ وسیع ہے جس میں تصوف تک شامل ہے مگر ماضی کی بازیافت ان کی خصوصی پہچان ہے چنانچہ ہجرت سے پیدا ہونے والی ذہنی بے چینی اور ایک خاص تہذیب سے انقطاع کا دکھ ان کا بنیادی المیہ ہے۔ شہرِ افسوس تک افسانوں میں انہوں نے ہجرت کے کرب کو دوسری ہجرت کے ساتھ منسلک کر کے اس المیے کو بانداز دگر نمایاں کیا ہے۔ ان کے افسانوں کو جو چیز دورِ جدید سے منسلک کرتی ہے وہ خوف، مایوسی اور تشکیک کے وہ عناصر ہیں جو عہدِ حاضر کی عطا ہیں۔ ان کے افسانے آخری آدمی، زرد کتا، کایا کلپ، شکوک، وگ اور وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے وغیرہ جدید کلاسیک کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ اسلوب، ہیئت اور موضوعات کے تنوع کے سبب وہ بلاشبہ دورِ جدید کے نمائندہ افسانہ نگار قرار پاتے ہیں۔

انور سجاد کا نام بھی انتظار حسین کے ساتھ ہی لیا جاتا ہے۔ شاید اس لئے کہ علامتی انداز انتظار حسین کے بعد انہی کے افسانوں سے عام ہوا ورنہ مزاجاً اور پیش کش کے لحاظ سے وہ انتظار حسین سے خاصے مختلف ہیں۔ ان کے موضوعات ماضی کے بجائے حال سے تعلق رکھتے ہیں اور غالباً اسی لئے انہوں نے اپنے ایک مجموعے کا نام ہی "آج" رکھا ہے نیز ان کی علامات بھی مختلف اور پیچیدہ ہیں جن کی تفہیم میں خاصی دشواری پیش آتی ہے اور بعض اوقات حقیقت خاصی کا روپ بھی دھار لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "گائے" ان کے ابتدائی دور کا افسانہ ہونے کے باوجود ان کے نمائندہ افسانوں میں شمار ہوتا ہے کہ اس میں کہانی علامت و تجرید کے جنگل میں گم نہیں ہوتی بلکہ قاری کو اپنی ذہنی استعداد کے مطابق تجزیہ کرنے پر مائل کرتی ہے۔ بحیثیت مجموعی انور سجاد نے کہانی سے زیادہ خیال اور تاثر کو اہمیت دی ہے اور ہیئت و اسلوب کے نت نئے تجربات کے علاوہ جنسی امیجز کے استعمال کی طرح ڈالی یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے موضوعات، پیش کش اور اسلوب ہر لحاظ سے تازگی کا احساس دلاتے ہیں۔ "یوسف کھو" اور "کونپل" ان کا کامیاب

افسانوں میں سے ہیں۔

انتظار حسین اور انور سجاد کے بعد جن لوگوں نے علامتی افسانے میں نام پیدا کیا ان میں خالدہ حسین، مسعود اشعر، رشید امجد، منشا یاد، احمد ہمیش، اسد محمد خان اور ظہیر الاسلام کے علاوہ آغا سہیل، عرش صدیقی اور نیر اعظمی کے نام شامل ہیں۔ اعجاز راہی، سمیع آہوجا، زاہدہ حنا، نعیم درانی، ستار طاہر، ذکاء الرحمٰن، سعیدہ گزدر، افسر آذر، شمس نغمان اور نجم الحسن رضوی وغیرہ کا تعلق بھی تھوڑے سے بہت فرق کے ساتھ اسی گروپ کے ساتھ بنتا ہے۔

خالدہ حسین کے افسانوں کی پراسرار فضا اول سے آخر تک قاری کی توجہ جذب کئے رکھتی ہے۔ یوں ان کا افسانہ داستانوی عہد سے کسی قدر ابہام مگر رمزیت اور علامتی اسلوب کے حوالے سے ان کے افسانے روح عصر سے منسلک رہتے ہیں۔ ان کی یہ خوبی بھی قابل ذکر ہے کہ ان کی کہانیاں عام سماجی حقیقت نگاری سے شروع ہوتی ہیں مگر جوں جوں پرتیں کھلتی ہیں ان میں ماورائیت اور تہہ داری آتی چلی جاتی ہے اور چونکہ وہ کہانی کا بنیادی مواد اردگرد کی زندگی سے حاصل کرتی ہیں اس لئے ان کی کہانیاں سماجی و سیاسی حقائق ہی کی نئی معنوی تعبیر پیش کرتی ہیں۔ سایہ، گم، بازگشت، ابلاور حمید وغیرہ اس انداز کی مثالیں ہیں۔ ہزار پایہ، سواری اور ایک زمین کا ٹکڑا ان کے نمائندہ افسانوں میں شمار ہوتے ہیں۔

سنئے علامتی افسانے میں شعری اسلوب کی مثالیں یوں تو انور سجاد، خالدہ حسین اور بعض دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں بھی ملتی ہیں مگر رشید امجد نے شعری اسلوب کے استعمال میں جس تخلیقی اپج کا مظاہرہ کیا ہے وہ صرف انہی سے مخصوص ہے۔ ان کے جملوں کی ساخت اتنی منفرد اور دلکش ہے کہ دور سے پہچانی جاتی ہے۔ شعریت کے علاوہ ان کے افسانوں کا وصف خاص تجسیم ہے۔ ان کے افسانوں کی اشیا بھی حسیات تک محسوس ہوتی ہیں مگر محسوس ہوتی ہیں۔ ان کے ابتدائی افسانے اگرچہ جنسی تشنگی اور معاشی ناآسودگی کے المیہ کا تخلیقی اظہار ہیں مگر بعد کے افسانوں میں انہوں نے حیات و کائنات کے مسائل کو ایک فلسفی کی نظر سے دیکھنے کی کوشش بھی کی ہے۔ "تم جو صدیاں ہوا" اور "سمندر مجھے بلاتا ہے" میں یہی رویہ نمایاں ہے۔ ان کا مجموعہ "سہ پہر کی خزاں" ایک خاص دور کے سیاسی مسائل کا بھی احاطہ کرتا ہے لہٰذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ رشید امجد کی افسانہ نگاری اپنے دور کے سیاسی، سماجی اور معاشی صورت حال کی نئی صورت گری کی ہے اور سفر رجحانات کے مطابق بھی ہے۔ وہ ایک ایسے صاحب اسلوب افسانہ نگار ہیں جنہوں نے ایک پوری نسل کو متاثر کیا۔ "بت پاسٹ"، "قطرہ قطرہ"، "تماشا طلسم تماشا"، "گملے میں اگا شہر" اور "تم جو صدیاں ہوا" ان کے اہم افسانوں میں سے ہیں۔

منشا یاد ایسے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے ایک مدت تک علامتی اسلوب کو قابل اعتنا نہیں سمجھا اور جب علامت کی طرف مائل ہوئے تو بھی کہانی کا دامن نہ چھوڑا۔ نتیجہ ان کے قارئین کا حلقہ وسیع رہا ہے۔ ان کے افسانے پنجاب کے اس دیہاتی کلچر کی عکاسی کرتے ہیں جو پھیلتے ہوئے شہروں کی وسعت میں دھیرے دھیرے اپنی پہچان کھو رہا ہے شاید اسی لئے وہ اپنے افسانوں میں مخصوص دیہاتی الفاظ سے بھی کام لیتے ہیں۔ اسی مقصد کے لئے وہ ایسے کرداروں کا انتخاب کرتے ہیں جو اس مخصوص کلچر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یوں ان کی کہانی کی جڑیں زمین ہی میں پیوست رہتی ہیں اور بظاہر انہونی باتیں بھی حقیقت معلوم ہونے لگتی ہیں یہی ان کا تخلیقی جوہر ہے۔ منشا یاد کی بیشتر کہانیاں اگرچہ دیہاتی پس منظر میں ہی ہیں مگر انہوں نے خود کو دیہات تک محدود نہیں رہنے دیا اور شہری زندگی بالخصوص ملازم پیشہ طبقے کی ذہنی کیفیات کو بھی اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ "اور وہ تماشا" اس انداز کا بھرپور افسانہ ہے۔ یوں ان کے اسلوب کی طرح ان کے موضوعات بھی محدود نہیں کیونکہ انہوں نے زندگی کو ایک افسانہ نگار کی نظر سے دیکھا اور دکھایا ہے۔

احمد ہمیش کے جو افسانے میری نظر سے گزرے ہیں ان کی روشنی میں وہ ایسے افسانہ نگار نظر آتے ہیں جو زندگی کے حقائق کو کھردرے اور کسی حد تک غیر تخلیقی انداز میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ کہانی پڑھتے ہوئے ایک شدید احتجاج کی لہر بھی پیدا ہوتی ہے۔ ان کا افسانہ "مکھی" اس کی نمایاں مثال ہے جس میں مکھی کی غلاظت کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ ان کی زبان بھی کچھ اکھڑی اکھڑی سی ہے حالانکہ بطور شاعر ان سے شعری اسلوب کی توقع کی جانی تھی چنانچہ ان کے افسانے پڑھتے ہوئے قاری اس جمالیاتی حظ سے محروم رہتا ہے جو فن پارے کے مطالعہ سے حاصل ہونا چاہیے شاید اسی لئے ان کے قارئین کا حلقہ زیادہ وسیع نہیں اور ردِعمل کے طور پر ان کی افسانہ نگاری کی رفتار بھی سست ہے۔

رشید امجد کی طرح مظہر الاسلام کا اسلوب بھی شعریت سے مملو ہے لیکن انہوں نے جو شعری استعاراتی نظام خلق کیا ہے وہ خاص ان کا اپنا ہے کیونکہ انہوں نے محض شعریت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ تشبیہ و استعارہ کے نئے امکانات دریافت کرنے کی سعی بھی کی ہے جس سے ان کا وہ اسلوب وجود میں آیا جو انہیں اپنے معاصرین سے ممتاز کرتا ہے۔ ان کے موضوعات معاصر سیاسی، سماجی اور معاشی و اخلاقی جبر کا تخلیقی اظہار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں المیہ کا عنصر خاصا قوی ہے حتیٰ کہ ان کی رومانی کہانیاں بھی کہ جن کا آغاز بڑے خوش گوار انداز میں ہوتا ہے، زندگی کے کسی جبر سے ٹکرا کر المیہ پر منتج ہوتی ہیں تاہم اس کے باوجود ان کے یہاں زندگی کے مسائل کا سامنا کرنے کا رویہ نظر آتا ہے جو ان کی فعال تخلیقی شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی، گڑیوں کے خواب، لہو رات، کتارا وغیرہ ان کی قابلِ ذکر کہانیاں ہیں۔

اسد محمد خاں کا شمار بھی منفرد افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے گو بہت کم افسانے لکھے ہیں مگر اس کے باوجود ان کی اہمیت مسلّم ہے انہوں نے تاریخی تلمیحات کو جدید عصری مسائل کے اظہار کے لئے بڑی ہنرمندی سے استعمال کیا ہے۔ موجودہ صورتِ حال سے عدم اطمینان نے ان کے ہاں طنز کو بھی ابھارا ہے جو ناگوار کو بحالتِ مجبوری گوارا کرنے کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت اسی خواہش کا تخلیقی روپ ہے جس کا تعلق معاشرے میں صحت مند اقدار کے فروغ سے ہے۔ باسودے کی مریم اور مئی دادا ان کے نمائندہ افسانے ہیں۔

آغا سہیل، عرش صدیقی اور نعیم اعظمی اگرچہ نسبتاً سینئر لکھنے والے ہیں مگر چونکہ افسانے کے حوالے سے ان کی شناخت ۱۹۶۰ء کے بعد کی بات ہے اس لئے انہیں اسی دور کے افسانہ نگار سمجھنا چاہیے۔

آغا سہیل چونکہ حقیقت نگاری کے بعد علامت کی طرف مائل ہوئے اور افسانے کی روایت سے بخوبی واقف ہیں اس لئے ان کی علامات متوازن اور قابلِ فہم ہیں۔ انہوں نے داستانی تلمیحات، بائبل اور اسلامی استعاروں کے حوالے سے اپنے دور کے جبر کی مؤثر عکاسی کی ہے "لمن الملک الیوم"، "دابۃ الارض" اور "تسمہ پا" اس انداز کی کامیاب مثالیں ہیں۔ "ڈبویا مجھ کو" بھی ان کے تاریخی و تہذیبی شعور کا مظہر ہے۔ ان کے چوتھے افسانوی مجموعے "بن برسا آسمان" کے بیشتر افسانے اسی کرب کو نمایاں کرتے ہیں جو منافقت زدہ معاشرے میں رہنے والے بچے اور گھر کے آدمی کا مقدر ہوتے ہیں۔

عرش صدیقی کا شمار ایسے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے بیانیہ کے تخلیقی امکانات کو رد کئے بغیر علامتی اسلوب سے بھی کام لیا۔ انہوں نے کامیاب بیانیہ افسانے بھی لکھے اور "باہر کفن سے پاؤں" میں علامت کو بھی بخوبی برتا بلکہ میری رائے میں تو "باہر کفن سے پاؤں" اردو کے چند اہم علامتی افسانوں میں سے ایک ہے۔ ان کے افسانے ان کے گہرے مطالعہ اور تہذیبی شعور کے بھی آئینہ دار ہیں۔ اس سلسلے میں "مور کے پاؤں" قابلِ ذکر ہے جس میں اپنی مٹی سے وابستگی اور طبقاتی استحصال کو فنکارانہ مہارت سے اجاگر کیا گیا ہے۔ عرش صدیقی کا مطالعہ چونکہ وسیع ہے اس لئے کہیں کہیں ان کا اسلوب علمی انداز بھی اختیار کر جاتا ہے۔ "ہم نفس کا عذاب" اس اسلوب کی واضح مثال ہے۔ شاید ایسا اس لئے بھی ہوا کہ یہ افسانہ

بنیادی طور پر کرداروں کے نفسیاتی مطالعے پر مبنی ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان کے بیشتر افسانے کرداری ہیں اور انہوں نے کرداروں کی نفسیات اور جنسی معاملات کو بڑی مشاقی اور ہنرمندی کے ساتھ بیان کیا ہے اور یہی ان کی کامیابی ہے۔

نسیم اعظمی اگرچہ بطور افسانہ نگار خاصی دیر میں متعارف ہوئے مگر تھوڑے ہی عرصے میں دو افسانوی مجموعوں کی اشاعت سے انہوں نے جدید افسانہ نگاروں میں اپنا مقام بنا لیا ہے۔ ان کے پہلے مجموعے "پھر کیا ہوا" میں بیانیہ کہانیاں بھی تھیں اور علامتی و تجریدی بھی مگر دوسرے مجموعے "معمہ" کی تقریباً سبھی کہانیاں علامتی و تجریدی ہی ہیں۔ گو یہ کہانیاں گہری معنویت اور تہہ داری کے باعث "پھر کیا ہوا" کی کہانیوں سے کئی قدم آگے ہیں مگر یہ الگ بات کہ افسانے کے عام قارئین کے نزدیک ان کا پہلا مجموعہ ہی زیادہ اہم ٹھہرے گا کہ اس میں کہانی پن کا عنصر نسبتاً زیادہ ہے۔ نسیم اعظمی کی کہانیوں کا خام مواد محض برصغیر کی ثقافتی، سیاسی اور سماجی زندگی تک محدود نہیں بلکہ تیسری دنیا اور یورپی ممالک تک پھیلا ہوا ہے۔ شایان اور لا یموت ایسی اہم کہانیاں اسی تناظر میں لکھی گئی ہیں۔ موخر الذکر کے مطالعے سے یہ حقیقت بھی آشکار ہوتی ہے کہ معاشی جبر صرف تیسری دنیا ہی کا المیہ نہیں بلکہ ترقی یافتہ ممالک کے عوام بھی اس کی لپیٹ میں ہیں۔ انسانی نفسیات اور جنسیات پر بھی نسیم اعظمی کو خاصا عبور حاصل ہے اور انہوں نے اپنے افسانوں میں اس موضوع کو بڑی ہنرمندی سے برتا ہے۔ "کنواں" اس کی عمدہ ترین مثال ہے۔ جنس کے علاوہ سیاست کے پیچ و خم کو بھی انہوں نے مشاقی سے عبور کیا ہے۔ شایان، لا یموت، پل، کاکروچ، اشاریہ گرد، کنواں، بگولا اور "کتے" ان کی قابلِ ذکر کہانیاں ہیں۔

۱۹۶۰ء کے عشرے میں نمایاں ہونے والے افسانہ نگاروں کی اکثریت اگرچہ علامتی افسانے کی دلدادہ تھی مگر اس دور میں کچھ ایسے افسانہ نگار بھی سامنے آئے جنہوں نے علامت کے سکۂ رائج الوقت ہونے کے باوجود بیانیہ کو اہمیت دی اور ایک ایسے دور میں جب افسانے سے کہانی غائب ہوتی جا رہی تھی، کہانی سے اپنا رشتہ برقرار رکھا۔ میری مراد فرخندہ لودھی، احمد داؤد، سائرہ ہاشمی، سلطان جمیل نسیم، منیر احمد شیخ، سلیم اختر، مستنصر حسین تارڑ وغیرہ سے ہے۔ ان میں سے بعض افسانہ نگاروں نے اگرچہ علامت کا استعمال بھی کیا ہے تو اسے حاوی نہیں ہونے دیا، اسی لئے میں انہیں بیانیہ روایت ہی کی کڑی سمجھتا ہوں۔

فرخندہ لودھی کی بیشتر کہانیوں کا خمیر اگرچہ محبت کے جذبے سے اٹھا ہے لیکن یہ محض رومانی کہانیاں نہیں بلکہ معاشرتی رویوں کی عکاسی بھی ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں نسوانی کرداروں کی ذہنی ساخت، ردِعمل اور جنسی معاملات کو جس ہنرمندی سے آشکار کیا ہے وہ قابلِ دید ہے۔ چار دیواری کی مس نفیسہ ہو یا پاربتی کی پارو، خزاں کی دُمپا اور دلہا ہو یا شہر کے لوگ کی بانو، بیگی کی مس مارگریٹ ہو یا آدمی کی صلیب، ان سب کرداروں کی فطرت کو بڑی جرأت اور فنکارانہ مہارت سے بیان کیا گیا ہے۔ وطن اور اہلِ وطن سے محبت بھی ان کے افسانوں کا ایک اہم جزو ہے۔ جو ان کے پہلے افسانوی مجموعے "شہر کے لوگ" سے تیسرے مجموعے "خوابوں کے کھیت" تک کہیں بین السطور اور کہیں نمایاں انداز میں موجود ہے۔ پاربتی، بیگی، شبنم، گھر کے راستے پر، ابو ٹیال اور ہجرہ ایسے افسانے اسی ذیل میں آتے ہیں۔

عذرا اصغر کو بھی وطن سے شدید جذباتی لگاؤ ہے اور وطنِ عزیز کی نظریاتی و جغرافیائی حدود کے اندر رونما ہونے والے واقعات و حادثات پر اپنے ردِعمل کو لپیٹ کا حقہ بنانے پر خود کو مجبور پاتی ہیں۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے حوالے سے ان کا افسانہ "کس پیچ" قابلِ ذکر ہے۔ "عافیت کی موت" میں انہوں نے انتقالِ آبادی کے حوالے سے قیامِ پاکستان کے وقت بھارت سے پاکستان کی طرف ہجرت کرنے والے مسلمانوں کے المیے کو جدید عصری حسیت کے تناظر میں اجاگر کیا ہے۔ ان کے بعض دوسرے افسانوں میں بھی وطن پرستی کا جذبہ موجزن ہے اور میں اسے ان کا اختصاص سمجھتا ہوں۔ عذرا اصغر کا شمار ایسے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے معاشرے میں ہونے والی طاری تبدیلیوں

کو کھلی آنکھوں سے دیکھا اور انہیں اپنے افسانوں کا موضوع بناتے وقت اس بات کی پرواہ نہیں کی کہ ان کا یہ کام بہت سی جبینوں پر شکنیں ڈالنے کا موجب بھی ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ "تیا پانچا" اور "طوفہ" جیسے افسانے نہ لکھ پاتیں۔ انہوں نے جو کچھ محسوس کیا اس کے اظہار میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیاں ہمیں اپنی کہانیاں معلوم ہوتی ہیں۔ چند کلے، "تنہا برگد کا دکھ"، "رابطہ" اور "اپنی بستی" وغیرہ ان کے فن کی مکمل نمائندگی کرتے ہیں۔

منیر احمد شیخ کے افسانوں میں تہذیبی شناخت اور جڑوں کی تلاش کا مسئلہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ پرانی تہذیب کے مٹنے اور نئی تہذیب کے وجود میں آنے سے معاشرے میں جو شکست و ریخت ہوئی ہے، ان کے افسانے اس کی صحیح تصویر پیش کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں سوانحی عنصر اتنا حاوی ہے کہ ان کے اکثر افسانوں پر آپ بیتی کا گمان ہوتا ہے۔ "اوریئنٹل بائی پاس" جو ان کا نمائندہ افسانہ کہا جاتا ہے حقیقتاً آپ بیتی ہی ہے۔ بہت سے دوسرے افسانے بھی ان کے تجربات ہی کا اظہار ہیں۔ شاید اسی لئے ان کے افسانوں میں افسانے کے بنیادی لوازمات کا فقدان نظر آتا ہے۔

سائرہ ہاشمی کے ابتدائی افسانوں میں محبت اور جنس کا موضوع نمایاں ہے اور غالباً اسی لئے ان کے اکثر افسانے عورت ہی کے گرد گھومتے ہیں مگر "ردی کاغذ کا ٹکڑا" تک آتے آتے ان کے موضوعات میں وسعت آگئی ہے۔ اگرچہ اس مجموعے میں بھی ان کے پسندیدہ موضوعات پر افسانے شامل ہیں مگر یہ مجموعہ ان کے ایسے افسانوں کی بناء پر اہم ہے جن کا تار و پود عصری سیاسی و سماجی مسائل کے خام مواد سے بنایا گیا ہے۔ اس مجموعے میں سانحۂ مشرقی پاکستان کے حوالے سے بھی ان کے افسانے اہمیت کے حامل ہیں بالخصوص "سوچ کا دائرہ" جس میں المیے کو موضوع بنایا گیا ہے وہ اکثر لکھنے والوں کی نظر سے اوجھل رہا۔

سلطان جمیل نسیم نے بھی بالعموم زندگی کے حقائق ہی کو افسانوی روپ دیا ہے اور اسی مقصد کے لئے انہوں نے شہری زندگی کی بے حسی اور بے ڈھنگے پن کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ہماری تہذیبی اقدار کو مادیت پسندی کے نتیجے میں جس شکست و ریخت کا سامنا ہے سلطان جمیل نسیم نے اسے بالخصوص محسوس کیا اور اپنے متعدد افسانوں میں اس کا تخلیقی اظہار کیا ہے۔ "نیلے کی گھڑی" اس ضمن میں قابل ذکر ہے مگر وہ صرف تصویر کا ایک رخ ہی نہیں دکھاتے بلکہ کبھی ایسے افسانوں میں مثبت روایات کا اثبات بھی کرتے ہیں۔ "گھر کا راستہ"، "عذاب" اور "مٹی جو رکشتی" ان کی اہم کہانیوں میں سے ہیں۔

سلیم اختر کی تنقیدی شہرت نے ان کی افسانہ نگاری کو پس منظر میں دھکیل رکھا ہے مگر حال ہی میں ان کے افسانوی مجموعوں کی اشاعت سے لوگوں کو یاد آیا ہے کہ وہ افسانہ نگار بھی ہیں۔ انہیں جنسیت، جنس اور نفسیات سے جو شغف ہے اس کی جھلک ان کے افسانوں میں بھی نظر آتی ہے کم از کم "مٹھی بھر سانپ" کی سبھی کہانیوں کا محور و مرکز جنس ہی ہے البتہ "کڑوے بادام" کے افسانے وسیع تر تناظر رکھتے ہیں جن میں اقتصادی احتیاجات، نفسی کیفیات اور سیاسی و سماجی معاملات شامل ہیں۔ سلیم اختر اگرچہ بنیادی طور پر حقیقت نگاری اور بیانیہ اسلوب کے افسانہ نگار ہیں مگر "کڑوے بادام" کے "مقتل"، "جزو بے حقیقت"، "بلا" کے سے سیاسی موضوعات میں انہوں نے علامت کو بھی کامیابی سے برتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کی اولین شہرت چونکہ سفرنامہ نگار کی ہے اس لئے ان کے بعض افسانوں میں سفرنامے کے عناصر کی موجودگی پر حیرت نہیں ہونی چاہیئے۔ ان کے افسانے سیاسی و سماجی نظام کے جبر کی موثر عکاسی کرتے ہیں اور اس لمحے کی کہانی سناتے ہیں جب اندر اور باہر کا موسم ایک ہو جاتا ہے اور قید و بیابان کا کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ "بابا بگلوس"، "گیسا چھیرا"، "کوٹ مراد" وغیرہ بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں۔ "آنولا کر ملنی ہو تو اور

سیاسی جبر ہی کا غماز نہیں بلکہ پورے نظامِ حیات کے منہ پر طمانچہ ہے جس کی کسک تا دیر کچوکے لگاتی رہتی ہے۔

۱۹۶۰ء کے عشرے میں لکھا جانے والا افسانہ مجموعی تھا اور اس دور میں علامت نگاروں ہی کے ناموں کا ڈنکا بج رہا تھا۔ اگرچہ کئی ایک افسانہ نگاروں اور ناقدین کی طرف سے علامت کے نام پر لکھی جانے والی اوٹ پٹانگ تحریروں کی دُھتا چلنے پر مخالفت بھی ہوئی مگر چونکہ بعض علامتی افسانہ نگار بحیثیت نقاد اس کا دفاع کرتے رہے اس لیے اس دور میں علامتی افسانہ کا غلغلہ رہا مگر ۱۹۷۰ء کے بعد دوراز کار علامتوں کا استعمال رفتہ رفتہ اعتدال پر آ گیا اور افسانہ میں کہانی پن کی ضرورت و اہمیت کا احساس کر لیا گیا۔ دو ایک افسانہ نگاروں کے ہاں اگرچہ اب بھی ابہام کا مسئلہ موجود ہے مگر مجموعی طور پر ۱۹۷۰ء کے بعد کا دور کہانی کی بازیافت کا دور ہے چنانچہ اس دور میں ۱۹۶۰ء کے عشرے میں نمایاں ہونے والے افسانہ نگاروں نے بھی کہانی کی طرف مراجعت کی اور علامت و بیانیہ کے امتزاج سے افسانے کو اس کا کھویا ہوا مقام واپس دلایا۔ ۱۹۷۰ء اور اس کے بعد نمایاں ہونے والے افسانہ نگاروں میں سے احمد جاوید، احمد داؤد، مرزا حامد بیگ، سلیم آغا قزلباش اور آصف فرخی کے علاوہ محمد قاسمی، طارق محمود اور یوسف چوہدری قابلِ ذکر ہیں۔ علی حیدر ملک، منیر ملال، مشرف احمد، علی تنہا، محمد سعید شیخ، ممتاز احمد خان، طاہر نقوی، امراؤ طارق، شمع خالد، افشاں جاسمی، ضیا ارشد اور شعیب خالق وغیرہ بھی اس دور میں سامنے آئے۔

احمد جاوید نے الفاظ سے صوتی آہنگ اور ان کی تکرار سے جو اسلوب وضع کیا ہے وہ ان کی بنیادی پہچان ہے۔ ان کے افسانوں کی مخصوص فضا بھی بآسانی پہچانی جاتی ہے اور ان کے موضوعات بھی جو کہ ان سرچروں کے عکاس ہیں جنہیں زبان نہیں مل سکی۔ لیکن وہ اسی حد تک ہمیں اپنی سوچوں میں شریک کرتے ہیں جتنا مناسب سمجھتے اور اتنا ہی منظر دکھاتے ہیں جتنا ہمیں نظر آتا ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ آج کے جس عذاب میں وہ گرفتار ہیں ہر شخص اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ان کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ انہوں نے بغیر کسی نعرہ بازی کے اپنے عصر کی تہذیبی و سیاسی تاریکی کو تخلیقی کا درجہ دینے میں کامیابی حاصل کی اور فرد کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی کو اہمیت دے کر بے معنویت کے اندھیرے میں معنویت کی روشنی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ گشت پر نکلا ہوا سپاہی، بانجھ آنکھ، پہلو سے، غیر علامتی کہانی ۲ اور کولہو کا بیل ان کے نمائندہ افسانے ہیں۔

احمد داؤد کے افسانوں میں معاشی جبر، بیگار، بے یقینی میں انسان کی شخصیت میں ہونے والی شکست و ریخت کے علاوہ سیاسی جبر سے آزاد ہونے کی خواہش ملتی ہے۔ جس میں تیسری دنیا۔ اکثر تو آزاد ممالک گرفتار ہیں چنانچہ ان کے افسانے ان کے سماجی شعور اور سیاسی وابستگیوں کا اظہار بھی ہیں کہ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں اسے پیرایہ بیان بھی لاتے ہیں اور اس کی گواہی بھی دیتے ہیں۔ وسکی اور پرندے کا گوشت، داستان شب رواں کی اور رنگ دینے والا جیسے افسانے ان کی فنی بصیرت کے گواہ ہیں۔ عروج کا زوال کا عروج اور جڑیں بھی ان کے قابلِ ذکر افسانے ہیں۔

مرزا حامد بیگ کی ماضی پرستی اور داستانوی انداز انتظار حسین کی روایت کا تسلسل ہے بلکہ مغلیہ تہذیب کی پیش کش کے حوالے سے وہ عصمت چغتائی سے متاثر معلوم ہوتے ہیں مگر چونکہ انہوں نے جس مغلیہ تہذیب کو رومانی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہ ان کا ذاتی تجربہ نہیں اس لیے محض نسلی تفاخر اور مریضانہ ذہنیت کی ایک صورت کہی جا سکتی ہے البتہ مقامی منظر نامہ ان کے ذاتی مشاہدے کا غماز ہے۔ گشت، کلات، مغل سرائے اور سایہ لوند کد کا آخری کتبہ وغیرہ ان کے انداز خاص کے مظہر ہیں۔

سلیم آغا قزلباش کی جزئیات نگاری ان کے گہرے مشاہدے اور تفکر کی غماز ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ کافی غور و فکر کے بعد کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں۔ وہ نہ صرف افسانے کے مرکزی نقطے کو ابھارتے ہیں بلکہ اس کی پیش کش پر بھی خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ تکنیک

کا مرکزی کردار ان کی کردار نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ انھوں نے جاپانیہ کو علامت سے ہم آہنگ کر کے افسانوں کے مرکزی خیال کو بھی نمایاں کیا ہے اور ان کی وساطت سے اپنے مخصوص تہذیبی پس منظر کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ "آسیب" اس انداز کی خوبصورت مثال ہے جبکہ "مسافتوں کے درمیان" میں انھوں نے اساطیری روایات کے حوالے سے عصری صورتحال کی ترجمانی کی ہے۔ "پیراگن" اور "مہر لب" میں بھی داستانی انداز کو کامیابی سے برتا گیا ہے۔

آصف فرخی ایسے افسانہ نگار ہیں جن کے افسانوں میں واقعے سے زیادہ واقعہ کا بیان اور خیال اہمیت رکھتا ہے۔ ان کا افسانہ واقعہ کے جذباتی اور فکری تموج سے نمو حاصل کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے چنانچہ ان کے ہاں خارج میں رونما ہونے والے واقعات کو ذاتی واردات بنا کر پیش کرنے کا رجحان پیدا ہوا ہے۔ صیغہ واحد متکلم کے استعمال سے ان کے افسانوں میں آپ بیتی کا جو انداز ابھرا ہے وہ ان کی کہانیوں کو حقیقت سے بہت قریب لے آتا ہے۔ "زمین کی نشانیاں"، "بحیرۂ مردار"، "ستارۂ غیب" اور "سمندر" وغیرہ اس انداز کی نمایاں مثالیں ہیں۔ وہ صرف اساطیری استعاروں سے استفادہ نہیں کرتے بلکہ نئی علامات سے بھی خاطر خواہ کام لیتے ہیں۔ نیز انھوں نے بچپن میں سنی ہوئی کہانیوں کی بھی تخلیقی بازیافت کی ہے اور اسی طرح ماضی کے حوالے سے دورِ جدید کے مسائل میں گھرے ہوئے انسان کی نفسی کیفیات کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

محمود احمد قاضی نے اپنے افسانوں میں اس کرب کو سمیٹنے کی سعی کی ہے جو موجودہ سیاسی و معاشی نظام کا پیدا کردہ ہے۔ ان کے افسانوں میں پرانی نسل اگرچہ ہوا اور روشنی سے بے نیاز تنگ گلیوں میں زندگی گزارنے سے سمجھوتہ کر لیتی ہے مگر نئی نسل اس سمجھوتے پر تیار نہیں ہوتی اور اسی سے وہ المیہ جنم لیتا ہے جو "ہوا" جیسے افسانے کی تخلیق پر منتج ہوتا ہے۔ ان کے ہاں اگرچہ رجائی پہلو بھی موجود ہے مگر یہ رجائیت ان کے کرب کو اور زیادہ نمایاں کر دیتی ہے کیونکہ ان کا ہر فرد ان کے خیالات کا قیدی بن کر رہنے پر آمادہ نہیں ہو پاتا اور یہی ان کا المیہ ہے جسے وہ مختلف افسانوں میں مختلف انداز سے پیش کرنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔

طارق محمود کو نئے افسانہ نگاروں میں موضوعات کے تنوع کا افسانہ نگار کہہ سکتے ہیں۔ ان کے ہاں دیہاتی زندگی کے مسائل کا بیان بھی ہے اور شہری و دفتری زندگی کی میکانکیت اور معاشرے کی کرپشن کا اظہار بھی، مغربی تہذیب کی تصویر کشی بھی ہے اور مشرقِ وسطیٰ میں کام کرنے والے پاکستانیوں کی جذباتی کشمکش کی عکاسی بھی اور اہم بات یہ کہ کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ سنی سنائی باتیں بیان کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں "سفر سستے خواب"، "اصلی گھر" اور "سرحد" وغیرہ بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ان کے اولین افسانوی مجموعہ "سرحد" میں زیادہ تر کہانیاں بیانیہ تھیں مگر "آخری چال" میں علامتی انداز بھی موجود ہے مگر یہ علامات اتنی واضح ہیں کہ کہیں بھی عدم ابلاغ کا مسئلہ نہیں اٹھتا۔

یوسف چوہدری نے اپنے افسانوں میں معاشرے کی دھوکہ باز اور خود غرض سرشت کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے اور "تیسری دنیا کے جانور" میں اس مسئلہ کو وسیع تر تناظر فراہم کیا ہے۔ معاشرتی تنقید کے حوالے سے وہ ترقی پسندوں کی صف کے آدمی معلوم ہوتے ہیں چنانچہ ان کے افسانوں میں طنز کی زیریں لہر ان کی معاشرتی اور سیاسی بصیرت کا وہ تخلیقی آئینہ ہے جس میں پورے معاشرے کا المیہ منعکس ہوتا ہے۔ "نواب دین" میں یہ طنز اپنے عروج پر ہے۔

۱۹۶۰ء سے قبل کا افسانہ سماجی تضاد اور معاشی ناہمواری کا تو غماز تھا مگر فرد کے بجائے معاشرے کو اہمیت دیتا تھا جبکہ ۱۹۶۰ء کے بعد کا افسانہ فرد کی انفرادیت کا علمبردار نظر آتا ہے۔ نئے افسانہ نگاروں نے خارجی مسائل کے مستقیم اظہار کے بجائے انسان کے باطن کی خواہش کو اپنا

شعار بنایا اور باطنی کشف کے حوالے ایسے سوالات اٹھائے جو قبل ازیں صرف شاعری سے مخصوص تھے ۔ یہاں شعری اسلوب اور شعری استعاراتی نظام کا رواج بھی ہوا اور باطنی سفر کی روداد کے بیان میں الجھاؤ بھی پیدا ہوا۔ ذاتی علامات کے استعمال سے لایعنیت بھی پیدا ہوئی اور روایتی کہانی سے انحراف کے سبب افسانے کردار بھی بنا ہوئے۔ نفسی کیفیات اور الجھنوں کے اظہار کے پردے میں کچھ عرصے تک جنس نگاری کا بھی زور رہا مگر رفتہ رفتہ اعتدال پیدا ہوتا چلا گیا اور اردو افسانہ اس بھول بھلیاں سے نکل آیا جس میں ۱۹۶۰ء کے عشرے میں پھنس گیا تھا جس کا ایک سبب قارئین کا شدید ردعمل بھی تھا۔ اس کے علاوہ ۱۹۷۰ء کے بعد ہمارے سیاسی و سماجی مسائل کی گمبھیرتا نے بھی ہمارے افسانہ نگاروں کو ذات کی تنگنائے سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا۔ آج کا نیا افسانہ اگرچہ ترقی پسندوں کی طرح محض خارج کا آئینہ دار نہیں مگر خارجی مسائل سے آنکھیں بھی نہیں چراتا۔ جدید علوم جس طرح زندگی پر اثر انداز ہو رہے ہیں اور جدید دور کا انسان جن نفسی اور مادی کا تجربہ مسائل سے دوچار ہے نیا افسانہ اسے بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہے گویا آج کا افسانہ خارج اور باطن دونوں کو ساتھ لے کر چلتا اور پوری زندگی کی نمائندگی کرتا ہے۔

(صریر، نومبر ۹۳ء)

کچھ ناقدوں کا خیال ہے کہ جدید افسانے میں سماج، معاشرہ یا ماحول کا عنصر نہیں ہونا چاہیئے، لیکن اگر غور کیا جائے تو سماج، معاشرہ اور ماحول ہی میں زندگی کی حقیقتیں ملتی ہیں جو کہانی کے محرکات ہیں۔ ان کی عکاسی کے بغیر کہانی لکھی ہی نہیں جا سکتی۔ ہاں اسلوب میں ضرور فرق ہوتا ہے۔ کسی خارجی حقیقت کو اپنی ذات سے الگ کر کے اگر محض سماج اور معاشرے کے سیاق و سباق میں بیان کیا جائے تو وہ یقیناً جدید افسانے کے معیار پر پوری نہ اترے گی۔ لیکن اگر خارجی حقیقتوں کو افسانہ نگار اپنی ذات کے حوالے سے بیان کرے اور اس میں اس کے داخلی تاثرات اور جذبات پوری طرح شامل ہوں تو وہ یقیناً جدید کہانی ہوگی۔ اکثر جدید افسانے میں مکان و زمان کا تعین ضروری نہیں ان کا احاطہ اتنا وسیع ہوتا ہے کہ ان میں آفاقیت ہوتی ہے اور اس میں آدمی اور اس کی زندگی کی عکاسی بغیر زمان و مکان کی قید کے ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر افسانے میں عصری ماحول کی عکاسی ہو، اس میں کہانی کار کی ذات کی شمولیت ہو، کسی فارمولہ یا تکنیک کے تحت نہ لکھی گئی ہو۔ طرز بیان روایتی ڈگر سے ہٹا ہوا ہو۔ کسی ایک موضوع تک محدود نہ ہو۔ اس کا احاطہ وسیع ہو اور کسی حد تک اس میں آفاقیت ہو۔ اظہار میں برجستگی ہو اور اسے منطق یا مقصدیت کے دائرے ہی میں محدود نہ کیا گیا ہو تو وہ جدید افسانے کے معیار پر پوری اترے گی۔ علامت اور تجرید طرز بیان اسے مزید جلا بخشتے ہیں لیکن جدید افسانے کے لازمی اجزا نہیں ہیں۔

عنوان: جدید افسانہ

نسیم انجم

قومی زبان، کراچی

اپریل ۱۹۸۵ء

عربی تحریر: سید ابوالحسن علی ندوی

ترجمہ: عبداللہ عباس ندوی

مولانا رحمت اللہ کیرانوی
اور
اُن کی تالیف "اظہارالحق"

میرے لیے یہ بڑی سعادت کی بات ہے کہ چند سطریں ایک ایسے جلیل القدر عالم دین کے بارے میں لکھوں جس کو اللہ نے قلعۂ اسلام کا محافظ بنایا تھا، جس کی ذات سے حق و صداقت کو فتح و نصرت حاصل ہوئی، جس کی عالمانہ بصیرت سے شکوک و شبہات کا ازالہ ہوا اور جس نے اسلام کی وکالت و حمایت کا فرض ان نازک حالات میں انجام دیا جس وقت اس طرح کا کام اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا اور بغیر جان کی بازی لگائے کوئی اس میدان میں ایک قدم آگے بڑھ نہیں سکتا تھا۔

میرا اشارہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی طرف ہے۔ (سن پیدائش ۱۲۳۳ھ، وفات ۱۳۰۸ھ، مدفین جنتہ المعلاہ، مکہ مکرمہ) جنھوں نے اپنے عیسائی حریف کو مناظرہ میں شکست فاش دی اور ایسے دلائل سے کام لیا جن کی طرف عام طور پر ذہن نہیں منتقل ہوتا تھا، تیرہویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) میں ان کی شہرت بام عروج پر تھی، وہ اپنے فن میں امامت کا درجہ رکھتے تھے، جس کا اعتراف ان کے تمام معاصر علماء کو تھا اور آج تک عالم اسلام کا ہر پڑھا لکھا اور باخبر آدمی ان کے کارنامے سے واقف اور ان کی علمی عظمت اور مجاہدانہ کارنامہ کا قائل ہے۔

مولانا کیرانوی کا وہ عظیم کارنامہ جس نے ان کو علمائے سلف اور مجاہدین امت کے درمیان ممتاز مقام عطا کیا، یہ ہے کہ انھوں نے اسلام کی مدافعت اس طرح کی کہ حق و باطل کو آئینہ کی طرح روشن کر کے دکھا دیا، اسلام کے خلاف غلط بیانیوں، تہمتوں اور شکوک واوہام کا طوفان دشمنوں نے کھڑا کر دیا تھا۔ مولانا نے نہ صرف یہ کہ ان تہمتوں کی حقیقت واضح کر دی بلکہ مسلمانوں کے اندر دین پر یقین و اعتماد کو پختہ سے پختہ تر کر دیا، مسلمانوں کو اپنے دین کی صداقت اور اپنے رسول کی لائی ہدایت پر از سر نو غیر متزلزل ایمان نصیب ہوا۔

حضرت کیرانوی نے یہ خدمت ایسے زمانہ میں انجام دی جو مسلمانوں کے لیے انتہائی نازک اور صبر آزما زمانہ تھا، ان کا حریف وہ تھا جس کو اس زمانہ کے سب سے بڑے فاتح گروہ کی پشت پناہی حاصل تھی، اور وہ بڑی دنیاوی طاقت اس کی سرپرست تھی جس کے قلمرو میں آفتاب نہیں غروب ہوتا تھا، اور جس کے تمدن، تہذیب، تعلیم کی پوری دنیا میں دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

دوسری طرف مولانا رحمت اللہ کیرانوی، اپنے حریف کے برعکس، ایسی قوم کے فرد تھے جو شکست خوردہ بھی تھی اور شکستہ دل بھی، اور آزمائش کے سنگین ترین وقت سے گزر رہی تھی، اس کو اپنے تابناک ماضی کا بھی ہوش نہیں تھا، اس کے نزدیک اسلاف کے مجاہدانہ کارنامے قصۂ پارینہ تھے جو اس کی سیاسی پسپائی اور اقتصادی بدحالی کا مداوا نہیں بن سکتے تھے، اور اس ذہنی پسپائی کے نتیجہ میں خود دین اسلام کی صداقت و حقانیت پر یقین میں کمزوری بلکہ کھوکھلا پن آچکا تھا، انگریز اس کو اپنا حریف اور حقیقی دشمن سمجھتے تھے اور اچھی طرح جانتے تھے کہ ایشیا اور افریقہ میں کہیں بھی ان کے دین و تہذیب کو کوئی علمی محاذ پر چیلنج کر سکتا ہے تو وہ صرف مسلمان ہیں۔ اس لیے ان کا سارا زور مسلمانوں کی حوصلہ مندیوں کو مٹانے اور ان کی معنوی قوت کمزور کرنے پر صرف ہو رہا تھا، یورپ کے عیسائی مشن پوری آزادی کے ساتھ حکومت وقت کی سرپرستی اور کفالت میں شہر شہر اور گاؤں گاؤں میں اپنے جال بچھائے ہوئے تھے، ہزاروں کی تعداد میں عیسائی مبلغین ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے، سیکڑوں ناخواندہ اور نیم تعلیم یافتہ افراد "اقبال مند فاتح قوم" کا مذہب اختیار کر رہے تھے، اور ان کی ظاہری شان و شوکت، حکومت و قوت، کمزور و ناخواندہ اشخاص کے نزدیک حقانیت کی دلیل تھی۔

عوام اور سادہ لوح لوگ تو الگ رہے، خود علمائے کرام کو عیسائیت کی پوری حقیقت نہیں معلوم تھی، ان کو بائبل کے عہد قدیم، عہد جدید، ان کی شرحوں اور تفسیروں سے واقفیت نہیں تھی، ان کتابوں کی تاریخ اور ان میں جو مختلف زمانوں میں اضافے ہوتے رہے، اور کتربیونت کی جاتی رہی، بائبل سوسائٹیوں نے جو تصرفات کیے، عیسائی "انجیل مقدس انجمن" نے جس طرح بائبل کو ایڈٹ کیا، ان سب سے سطحی واقفیت بھی پڑھے لکھے مسلمانوں کو نہیں تھی، علمائے کرام کی ذہنی جولانیوں اور علمی تحقیقات کے میدان یا تو فقہی جزئیات تھے یا یونانی منطق و فلسفہ اور علم کلام کی بحثیں، یا کسی درجہ میں احادیث و تفسیر پر حواشی و تعلیقات، عیسائیوں کے ان ہمہ وار حملوں کا مقابلہ کرنے کی کوئی تیاری انھوں نے نہیں کی تھی۔ یہ حملے ان کے لیے ایسے تھے جیسے کسی نے اچانک رات کی تاریکی میں ان کے گھر پر شب خون مارا ہو، ان حملوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بڑے دل گردہ کی ضرورت تھی، ہمت و جرأت کے ساتھ کتب سماویہ پر گہری نظر کی ضرورت تھی، اور اس بات کی ضرورت تھی کہ عیسائیت کا مطالعہ وسیع اور گہرا ہو اور عیسائیت کو عیسائیت کے بنیادی اور علمی مراجع سے سمجھا گیا ہو، جو ان پر تنقیدیں کی گئی ہیں اور ان کے تجزیے جس انداز میں کیے گئے ہیں، ان سے واقفیت بھی لازمی تھی۔ ان سب کے

لیے ایک طرف تو بھرپور غیرت ایمانی کی ضرورت تھی، دوسری طرف وسیع مطالعہ اور بصیرت مطلوب تھی، اور خاص مشکل یہ تھی کہ عیسائیت پر تحقیقی کام کرنے والے کے سامنے کوئی روشن شاہراہ نہیں تھی بلکہ ایک سُرنگ تھی جو اندر سے تاریک تھی اور اس میں پیچ در پیچ راستے تھے، کھانچے اور کھائیاں تھیں، یعنی اس کے علمی ماخذ نہ ہونے کے قریب تھے، اور جو تھوڑے بہت تھے وہ یورپین زبانوں میں تھے، ان زبانوں میں زیادہ مانوس زبان انگریزی تھی، اہلِ ہند نے ابھی اس زبان کو سیکھنا شروع ہی کیا تھا۔ اکثر مسلمان اور خاص طور پر علماء اس سے متنفر تھے کیوں کہ یہ ان ظالموں کی زبان تھی جنھوں نے ان سے حکومت چھینی تھی اور ان کی تذلیل کی تھی، دوسری طرف خود عیسائی مشن بھی نہیں چاہتے تھے کہ ان کی کتاب مقدس پر جو جرح ہوئی ہے اور اس کے جو تجزیے کیے گئے ہیں وہ ہندوستان لائیں، کیوں کہ ان کی مصلحتِ تبلیغ کا تقاضا یہ تھا کہ لوگوں کو اس سے بے خبر رکھا جائے، لہٰذا وہ یہاں کی لائبریریوں اور علمی مراکز کو ایسی کتابیں کیوں کر فراہم کر سکتے تھے بلکہ ان کی کوشش تھی کہ اس طرح کی کتابیں اس ملک میں آنے نہ پائیں۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے لیے یہ صورتِ حال پریشان کن ضرور تھی مگر ان کی حمیت و غیرت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اور ان کے وہ رفقاء جو اسلام کی مدافعت اور اسلام پر عائد کردہ تہمتوں کی حقیقت واضح کرنے کے لیے اپنی زندگی وقف کر چکے تھے، اپنے مورچہ پر جم کر مقابلہ کریں، عیسائی مبلغوں نے جو اپنے آپ کو مُبَشِّر (جنت کا مژدہ سنانے والے) کہلانا پسند کرتے ہیں، مسلمانوں کو دفاعی پوزیشن میں ڈال دیا۔ جنگ اور تجربہ کار و سیاسی بازی گروں اور امورِ جنگ کے ماہرین کا خیال ہے کہ مقابلہ کرنے کے لیے بہترین پوزیشن حملہ آور کی ہوتی ہے۔ اپنے حریف کو دفاعی پوزیشن میں ڈال دینا بڑی مہارت کا کام ہے، یہی سیاست عیسائی مبلغوں نے اپنی طاقت کے زور پر اختیار کی تھی۔ مگر مولانا کیرانوی نے اپنی دینی بصیرت سے محسوس فرمایا کہ عیسائیوں سے دوبدو مقابلہ ضروری ہے ورنہ نہ صرف [برصغیر کے] مسلمان ہمیشہ کے لیے سرنگوں ہو جائیں گے بلکہ عرب ممالک کو بھی انھی خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا، لہٰذا برصغیر میں عیسائیوں سے مقابلہ صرف یہاں کے مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ تمام عرب اور اسلامی ممالک میں مسلمانوں کے لیے ضروری ہے۔ یہاں کے مسلمان جو سیاسی لحاظ سے پسپا ہیں اور اپنی سلطنت کھو کر شکستہ دل ہیں، اگر اس مورچہ پر بھی شکست کھا گئے اور اس زبانی مناظرہ میں اپنے حریف کا کھوکھلا پن ثابت نہ کر سکے تو عیسائیت کا سیلاب پورے عرب اور مشرقی ممالک کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ اور اگر یہ زخم خوردہ اور شکستہ دل مسلمان اس مناظرہ سے سربلند و سرخ رو ہو کر نکلتے ہیں تو یہ سیلابِ بلا نہ صرف برصغیر سے بلکہ تمام مشرقی مسلم ممالک سے رک جائے گا۔

مولانا کیرانوی نے اللہ کا نام لے کر اس مہم کو سر کرنے کا عزم کر لیا، اور یہ طے کر لیا کہ عیسائیت کو عیسائیت کے اصلی مراجع و ماخذ سے سمجھیں گے، ان کا تجزیہ کر کے تحقیق کریں گے، ان

کے اس عزم کو اور پختہ اس بات نے کر دیا کہ اس زمانہ میں ایک مشہور عیسائی پادری، عیسائیت کا مبلغ اعظم فنڈر (Pfander) ہندوستان آیا اور علمائے دین کو للکارا، اور علانیہ مناظرہ کی دعوت دینے لگا، اور ملک کے ہر صوبہ اور ہر ضلع میں دورے کرنے لگا، بڑے بڑے جلسے کرتا اور ان میں تقریر کرتا، اپنے مذہب کی پیروی کی دعوت دیتا تھا، حضرت کیرانوی کو ایک اور مشکل کا سامنا تھا، وہ انگریزی زبان نہیں جانتے تھے، اور دوسری زبانوں کے سیکھنے کی ایک خاص عمر ہوتی ہے اس سے وہ تجاوز کر چکے تھے، زندگی بھر ان کا مشغلہ علوم دینیہ پڑھنا پڑھانا رہا، قرآن و حدیث سے سابقہ رہا یا علوم عقلیہ سے۔ دوسری طرف فنڈر صرف اپنی ہی زبان جانتا تھا، تھوڑی بہت عربی فارسی زبان سمجھ لیتا تھا، اب ضرورت تھی کہ کوئی ایسا شخص ہوتا جو ان دونوں کے درمیان واسطہ بنتا، اور ایسے شخص کی ضرورت تھی جو دوسری یوروپین زبانوں کے مراجع سے واقف ہوتا اور عیسائی وثائق کو پڑھ کر ترجمہ کر سکتا۔

اللہ کی مصلحت و حکمت نے حضرت مولانا کیرانوی کے لیے ایک ایسے شخص کو سامنے لا کر کھڑا کر دیا جس کی ضرورت تھی۔ اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، "وللہ جنود السمٰوٰت والارض" (یعنی اللہ کے کارندے سپاہی زمین و آسمان میں پھیلے ہوئے ہیں) وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت کیرانوی کی مدد کے لیے غیب سے کھڑا کیا وہ ڈاکٹر وزیر خان اکبر آبادی تھے، جو ۱۸۳۲ء میں لندن جا کر ڈاکٹری کی اعلیٰ سند حاصل کر چکے تھے اور انگریزی کے علاوہ یونانی زبان بھی پڑھ چکے تھے۔ انہوں نے عیسائیت کا اچھا مطالعہ کیا تھا اور اس کے مراجع خرید لیے تھے اور یہ کتابیں اپنے ساتھ ہندوستان لے آئے تھے، حضرت کیرانوی کے لیے یہ قوتِ بازو اور بہترین معاون ثابت ہوئے، اور وقت کا تقاضا جس جہاد کے لیے تھا اس میں وہ مولانا کے شریک و مددگار بن گئے۔

حضرت کیرانوی نے اس طرح پوری تیاری کر لی، اور معرکۂ حق و باطل کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ دوسری طرف فنڈر کی جولانیاں بھی شباب پر تھیں، [وہ]۔گ جرأت کے ساتھ اسلام پر ناروا حملے کر رہا تھا۔ حضرت کیرانوی نے محسوس کیا کہ سب سے پہلے اس شخص کا دہانہ توڑنا چاہیے اور اس کے ساتھ ہی دوسرے عیسائی مبلغوں کو سبق سکھا دیے جانے کی ضرورت ہے، اس طرح مسلمانوں کے اندر سے احساس کمتری کا ازالہ ہو گا اور ان کو اپنے دین کی حقانیت کا یقین حاصل ہو گا۔

حضرت کیرانوی نے محسوس فرمایا کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ فنڈر سے مناظرہ کیا جائے، اور علانیہ جلسے میں یہ مناظرہ ہو جس میں مسلمان اور اہل وطن، یوروپین حکام، عیسائی اور عیسائیت قبول کرنے والے ہندوستانی سب موجود ہوں، فنڈر کو اپنی کتاب "میزان الحق" پر بڑا ناز تھا اور اکثر اسی سے وہ استدلال کرتا تھا، اور اس کو وہم تھا کہ مسلمان اور ان کے علماء ان دلائل کا رد نہیں کر سکتے۔ مولانا کیرانوی نے اس پادری (فنڈر) سے مناظرہ کرنے کا تہیہ کر لیا، اس سے خط و کتابت کی اور دعوت دی کہ وہ سب کے سامنے آئے، جس میں مسلمان اور غیر مسلم سب ہوں۔ جب پادری فنڈر پر بہت زور پڑا، اور اس

نے دیکھ لیا، کہ اب بغیر مناظرہ کیے کوئی چارہ کار نہیں ہے تو اس دعوت کو چار و ناچار قبول ہی کر لیا، اگر اس کو اس مناظرہ کے نتائج کا اندازہ ہوتا تو شاید وہ کبھی سامنے آنا قبول نہ کرتا، بہر حال ۱۱ رجب ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۰-۱۱ اپریل ۱۸۵۴ء اکبر آباد (آگرہ) میں یہ مناظرہ طے پایا۔ یہ مقام عیسائیت کے فروغ کا مرکز تھا اور اس کے ایک محلہ کا نام "محلہ عبدالمسیح" ہی پڑ گیا تھا کیوں کہ وہاں عیسائیت قبول کرنے والے ہندوستانی کافی تعداد میں تھے۔

متعینہ تاریخ میں جلسہ شروع ہوا۔ ضلع کے حکام، عدالت کے جج، اور انگریزی چھاؤنی کے بہت سے عہدہ دار موجود تھے، پادری فنڈر اور پادری ولیم کلین (William Clean) اور شہر کے اعیان و سربر آوردہ اشخاص، ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب ہی موجود تھے۔ ڈاکٹر محمد وزیر خان حضرت کیرانوی کے مترجم و معاون کی حیثیت سے شریک تھے، مناظرہ کے پانچ موضوع تھے۔

۱۔ عہد نامہ قدیم (اولڈ ٹیسٹامنٹ) اور عہد نامہ جدید (نیو ٹیسٹامنٹ) میں تحریف ہوئی۔
۲۔ بائبل میں کچھ احکام منسوخ قرار دیے گئے۔
۳۔ عقیدہ تثلیث
۴۔ محمد ﷺ کی نبوت
۵۔ قرآن کی صداقت و صحت

اس مناظرہ میں شرط یہ تھی کہ اگر مولانا کیرانوی نے اس مناظرہ میں بازی جیت لی تو فنڈر اسلام قبول کر لے گا، اور اگر اس کے برعکس ہوا تو مولانا کیرانوی عیسائیت کو تسلیم کر لیں گے۔ اس شرط کی وجہ سے اس مناظرہ کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ پہلے روز کا مناظرہ ختم ہوا تو ہر جگہ اس کا چرچا ہونے لگا، ہر مجلس میں یہی موضوع تھا جس پر تبصرے ہو رہے تھے، کیوں کہ مناظرہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ پادری فنڈر نے یہ اعتراف کر لیا کہ آٹھ مقامات میں بائبل کے اندر تحریف موجود ہے۔

دوسرے روز جلسہ عام میں عیسائی، سکھ، ہندو اور مسلمانوں کی بڑی تعداد مناظرہ میں شریک ہونے کے لیے آئی۔ فنڈر نے کہا کہ انجیل میں جو غلطیاں ہیں، وہ کتابت کی غلطیاں ہیں، لیکن وہ عبارتیں جن میں عقیدہ تثلیث، حضرت عیسیٰ کی الوہیت، فدا اور شفاعت کا ذکر ہے، وہ تحریف سے محفوظ ہیں۔ پادری فنڈر کے ترکش کا یہ آخری تیر تھا جس کو اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ استعمال کیا۔ حضرت کیرانوی نے جواب دیا۔

"جب تم انجیل میں تحریف کو تسلیم کرتے ہو تو پوری کتاب مشکوک ہو گئی۔"

اس پر بحث ختم ہوئی اور پادری فنڈر تیسرے روز مناظرہ کے لیے آیا ہی نہیں۔ اس کے بھاگ کھڑے ہونے سے واضح ہو گیا کہ وہ مناظرہ کے میدان میں شکست کھا گیا، اور مسلمانوں کی یہ بڑی کامیابی تھی جس سے ایمانی قوت میں اضافہ ہوا اور پادریوں کا منہ توڑ جواب دینے کی صلاحیت عام مسلمانوں نے

اپنے اندر محسوس کی۔ عیسائیت کے عقلی و علمی دبدبہ اور بلند بانگ دعووں اور اسلام پر تمسخروں کی حقیقت سب کے سمجھ آ گئی۔

اس مناظرہ کے دو سال بعد ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا واقعہ پیش آیا جو ایک طرح سے مسلمانوں کی آخری کوشش تھی کہ انگریزوں کے بچھائے ہوئے جال سے نکل آئیں، لیکن اس جنگ میں مسلمان ناکام رہے، اور ان کی ناکامی کے بعد انگریز غضبناک، طاقت ور اور انتقام کے جذبہ سے بپھرے ہوئے دشمن کی طرح پیش آئے، اور وہ جانتے تھے کہ اس جنگ کی قیادت مسلمان کر رہے تھے اور انہی کا یہ پلان تھا اور وہی اس کی ہمت کر سکتے تھے، اور دوسرے ہم وطن ان کے ساتھ ہو لیے تھے، اس لیے مسلمانوں کے علماء ان کے جذبۂ انتقام اور غصہ کا سب سے زیادہ شکار تھے، اور آئندہ بھی انگریز کو خطرہ انہی مسلمانوں اور ان کے علماء سے تھا، عوام میں انہی کی مقبولیت تھی لہٰذا انگریزوں نے ایک ایک عالم کو پکڑ پکڑ کر قتل کرنا شروع کیا، ان کو پھانسی دیتے، سولی پر چڑھاتے، ان کی گردنیں درختوں سے لٹکاتے اور طرح طرح کی تذلیل واہانت کا سلوک کرتے، اور تلاش کر کے ایسے افراد کو ڈھونڈتے جن کی مسلمانوں کے درمیان عزت و توقیر ہوتی، اور لوگ جن کی بات سنتے۔ انگریزوں کو جن افراد کی تلاش تھی ان میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی صفِ اول کے لوگوں میں تھے، کیوں کہ مذہبی مناظرہ میں وہ ان کو شکست دے چکے تھے اور ان کے خلاف جو جہاد کیا گیا، اس میں شریک تھے۔ مصلحت وقت کا تقاضا تھا کہ مولانا کچھ عرصہ کے لیے ایک گاؤں میں روپوش ہو جائیں، جب انگریز ان کی تلاش میں اس گاؤں میں بھی پہنچ گئے تو مولانا نے کلہاڑی لے کر کسانوں کے بھیس میں کھیت میں کٹائی کا کام شروع کر دیا، اور اس طرح اللہ نے ان کو بچا لیا اور انہوں نے کسی طرح سورت کی بندرگاہ سے روانہ ہو کر بلادِ مقدسہ کی طرف ہجرت کر لی، یہ ۱۸۶۲ء کا واقعہ ہے۔ یعنی جنگ آزادی کے پانچ سال بعد، ان کی جائدادیں سب کی سب ضبط کر لی گئیں جو خاصی بڑی تھیں، اور ان کو نیلام کر دیا گیا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب مسلمانوں کے خلیفہ سلطان عبدالعزیز عثمانی تھے، اور مکہ مکرمہ میں ان کے گورنر شریف عبداللہ بن عون تھے، جب ان کی علمی منزلت کا پتہ چلا تو حرم شریف میں ان کو درس دینے کی اجازت مل گئی، اور اس وقت کے سربرآوردہ علماء سے ان کے تعلقات قائم ہوئے جن میں مکہ مکرمہ کے سب سے بڑے عالم شیخ احمد زینی دحلان تھے جو مولانا کیرانوی کے خاص احباب میں تھے اور انہوں نے ہی مولانا کیرانوی کو شریف مکہ سے ملایا اور علمائے مکہ سے ان کا تعارف کرایا۔

ایک اتفاقی بات پیش آئی کہ پادری فنڈر ایک عرصہ تک یورپ کے مختلف ملکوں جرمنی، سوئزرلینڈ، انگلینڈ میں رہا۔ اس کے بعد اس کو لندن کی تبلیغی انجمن نے قسطنطنیہ بھیجا کہ مسلمانوں کے مرکزی مقام، خلافت کے پایۂ تخت میں جا کر عیسائی تبلیغ کی مہم چلائے۔ اس نے سلطان عبدالعزیز سے ملاقات کی اور ہندوستان کے اس مناظرہ کا قصہ بیان کیا اور کہا کہ عیسائیت کو اسلام پر فتح حاصل ہو گئی،

سلطان عبدالعزیز خلیفۃ المسلمین تھے۔ ان کو اس بیان سے سخت حیرت ہوئی، انھوں نے شریف مکہ کو لکھا کہ ہندوستان سے آنے والے حاجیوں سے معلوم کریں کہ اصل واقعہ کیا ہے اور کس طرح پیش آیا؟ اور اس مناظرہ اور انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کی بغاوت (۱۸۵۷ء) کی صحیح نوعیت سے مطلع کریں۔ شریف مکہ کو شیخ العلماء سید احمد دحلان سے پورا واقعہ معلوم ہو چکا تھا، انھوں نے دار الخلافہ کو مطلع کیا کہ اصل واقعہ کیا ہے اور یہ کہ اس مناظرہ کے "بطل" (ہیرو) جو عالم دین ہیں وہ حسن اتفاق سے مکہ مکرمہ میں موجود ہیں، سلطان عبدالعزیز نے حضرت مولانا کیرانوی کو دار الخلافہ آنے کی دعوت دی، چنانچہ مولانا وہاں (۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۴ء میں) تشریف لے گئے۔ جب پادری فنڈر کو معلوم ہوا کہ شیخ (مولانا کیرانوی) قسطنطنیہ آرہے ہیں اسی وقت وہاں سے فرار ہو گیا۔ سلطان عبدالعزیز نے وہاں کے علماء کو جمع کیا، جس میں وزراء اور اعیان ملک شریک تھے، مولانا کیرانوی سے اس مناظرہ کا حال سُنا کہ کس طرح اسلام کو انھوں نے عیسائیت پر فتح یاب کیا، پھر ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی داستان سنی، سلطان نے اسی وقت عیسائی مشنوں پر پابندی لگا دی اور اس سلسلہ میں سخت قوانین نافذ کیے۔ سلطان اکثر و بیشتر نماز عشاء کے بعد مولانا کیرانوی سے ملا کرتا اور آپ کے نصائح و ارشادات سُنا کرتا۔ اس مجلس میں حکومت کے صدر اعظم خیر الدین پاشا تیونسی بھی شریک رہتے، وہاں کے شیخ الاسلام اور بڑے سربرآوردہ علماء بھی اس مجلس میں آیا کرتے تھے۔

مولانا سے جب صدر اعظم اور خلیفہ عبدالعزیز نے مناظرہ سنا اور ان کی علمی عظمت، وسعت مطالعہ اور مسیحیت پر ان کی ناقدانہ بصیرت کا اندازہ کیا تو یہ درخواست کی کہ وہ عربی زبان میں ایک مبسوط کتاب لکھ دیں جس میں ان پانچوں عناوین پر سیر حاصل بحث ہو جو مناظرہ کے لیے موضوع بحث قرار پائے تھے۔ مولانا نے اس تجویز کو قبول فرمایا اور "اظہار الحق" کی تالیف وہیں قسطنطنیہ میں شروع کر دی۔ رجب ۱۲۸۰ھ میں یہ تالیف شروع کی اور ذی الحجہ میں مکمل کر لی، یعنی صرف چھ ماہ میں یہ ضخیم دستاویز تیار ہو گئی، سلطان کی خدمت میں یہ ہدیہ پیش کیا اور مقدمہ میں تحریر فرمایا کہ یہ کتاب شیخ العلماء علامہ زینی دحلان کی تجویز پر لکھی ہے۔ صدر اعظم خیر الدین پاشا نے مولانا سے عرض کیا کہ آپ نے تو یہ کام امیر المومنین کی فرمائش پر کیا ہے، مناسب یہ تھا کہ امیر المومنین کا نام آپ لکھتے، خلیفۃ المسلمین کا اکرام اور حق و انصاف سے قریب تر بات بھی ہے۔ مولانا نے فرمایا یہ خدمت صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے میں نے انجام دی ہے، اس میں کوئی دنیاوی غرض شامل نہیں ہے اور حقیقت یہ ہے کہ شیخ العلماء دحلان نے مجھ سے پہلے اس کی فرمائش کی تھی اور کہا تھا کہ اس مناظرہ کی روداد قلم بند کروں، اور مکہ مکرمہ میں میں نے اس کتاب کے لیے مواد جمع کرنا شروع کر دیا تھا اور شیخ دحلان ہی وہ بزرگ ہیں جنھوں نے مجھے شریف مکہ سے متعارف کرایا اور آج دربارِ خلافت تک میری رسائی کا سبب وہی ہیں، لہٰذا ان کے فضل و کرم کا اعتراف ضروری ہے۔

اس طرح یہ کتاب معرضِ وجود میں آئی، اس کی اہم خصوصیات یہ ہیں۔

۱۔ مؤلف رحمۃ اللہ علیہ نے دفاعی موقف کے بجائے حملہ آور ہونے کا موقف اختیار کیا ہے، اور یہ موقف بہت ہی کار آمد ہوتا ہے کہ حریف کو دفاعی پوزیشن میں ڈال دیا جائے، اور اس کو مجبور کیا جائے کہ وہ ملزم کے کٹہرے میں کھڑا ہو اور وہ اپنی صفائی پیش کرے، پہلے علماء نے اس بات کو محسوس نہیں کیا تھا اور تورات و انجیل اور قرآن کو ہم پلہ سمجھ کر گفتگو کرتے تھے، اس طرح ان قدیم صحیفوں کو وہ اہمیت حاصل ہو جاتی ہے جس کے حقیقتاً وہ مستحق نہ تھے، حالانکہ خود حاملین تورات و انجیل یہ تسلیم نہیں کرتے کہ قرآن کی طرح بغیر کسی تغیر و تبدل کے آسمانی صحیفوں کا امتیاز ان میں پایا جاتا ہے۔

شیخ الاسلام تقی الدین احمد بن تیمیہ نے بہت مناسب قدم اٹھایا تھا کہ اپنی کتاب "الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح" میں جارحانہ موقف اختیار کیا تھا، کیوں کہ اہل تحقیق علماء کے نزدیک تورات و انجیل کی حیثیت دوسرے تیسرے درجہ کی احادیث و سیرت کی کتابوں سے زیادہ نہیں ہے، اور نہ ان صحیفوں کی ثابت شدہ سند ہے۔ ان صحیفوں کو حضرت عیسیٰ کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد مختلف مرحلوں میں مرتب کیا گیا ہے۔ ان میں کچھ حضرت مسیح کے اقوال ہیں اور کچھ ان کے معجزات کا بیان ہے اور کچھ ان کے اخلاق و اعمال کا ذکر ہے۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے بہت گہرائی کے ساتھ ان صحیفوں کا مطالعہ کیا تھا اور ان کی تہ کو پہنچ گئے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے اندازِ گفتگو سے مناظرہ کی نوعیت بدل گئی اور حریفوں کو جو پہلے بالادستی حاصل ہو جایا کرتی تھی، وہ ختم ہو گئی۔

۲۔ اس کتاب کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے مولانا کیرانوی نے زیادہ جزئیات سے بحث نہیں کی ہے، کیوں کہ اس میں بحث و مناظرہ اور چون و چرا کی گنجائش رہتی ہے۔ مولانا نے صاف نظر آنے والی اور آسانی سے سمجھ میں آنے والی باتیں ذکر کی ہیں، جن میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے بائبل میں ایک دوسرے سے متضاد باتوں کو نکال دکھایا ہے کہ کوئی الہامی کتاب جس میں تحریف نہیں ہوئی ہو اس طرح متضاد باتوں کا مجموعہ نہیں ہو سکتی، اس طرح کی ایک سو آٹھ کھلی ہوئی غلطیوں کو انھوں نے دکھایا ہے۔ یہ باتیں ایسی ہیں جیسے ریاضی کے فارمولے ہوتے ہیں، دو اور دو چار کی طرح جس کے نتائج سب کے سامنے ہیں، دوسرے کھلی ہوئی تحریف کے نمونے ہیں جہاں الفاظ کے اضافے ہیں، کہیں کمی ہے، کہیں تحریری جملے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب ایک آسمانی صحیفہ کا درجہ حاصل ہی نہیں کر سکتی۔

۳۔ عیسائیوں نے انجیل کو وحی منزل ثابت کرنے کے لیے جو عبارت آرائی کی ہے اور مغالطے میں ڈالنے کی کوششیں کی ہیں، ان کو نقل کرنے کے بعد انتہائی آسان اور قابلِ قبول اسلوب بیان میں ان کا رد کیا ہے۔

۴۔ حضرت کیرانوی نے عقیدہ تثلیث کو عقل کی کسوٹی پر رکھ کر اور اس کا علمی تجزیہ کر کے دکھایا ہے

کہ کوئی بھی صاحبِ عقل و ذوق اس کو تسلیم نہیں کر سکتا۔
۵۔ حضرت کیرانوی نے صرف یہی نہیں کیا کہ عیسائیت کے عقائد اور ان کے صحیفوں کی حقیقت کھول کر دکھا دی بلکہ قرآن کریم پر جو ان کے اعتراضات رہے ہیں، اس کا بھی تشفی بخش جواب دیا اور دکھایا کہ قرآن کریم کے کتاب اللہ ہونے میں کوئی شک کی گنجائش نہیں، اس سلسلہ میں عیسائیوں کے پیدا کردہ شبہات کا جواب دیا اور اسی سلسلہ میں رسول ﷺ کی سیرت مقدسہ اور معجزات کو بیان کیا اور آپ ﷺ کے حق میں انبیائے سابقین نے جو بشارتیں دی ہیں ان میں سے اشارہ بشارتوں کا ذکر کیا۔

ان اسباب کی بنا پر کتاب کی اہمیت بڑھ گئی اور ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لی جانے لگی، ایک ترکی عالم نے اس کا ترجمہ کیا اور اس کا نام "ابرازالحق" رکھا۔ ایک صاحبِ قلم نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا جو ہند و پاکستان کے کتب خانوں میں موجود ہے۔

مولوی غلام محمد راند میری نے اس کا گجراتی زبان میں ترجمہ کیا تھا، اردو میں مولانا اکبر علی سہارن پوری مرحوم نے تین جلدوں میں اس کا ترجمہ کیا تھا، جس کا نام "بائبل سے قرآن تک" ہے۔ اس پر مولانا محمد تقی عثمانی نے مفصل مقدمہ لکھا ہے جو فاضلانہ اور محققانہ ہے اور اس لائق ہے کہ علیحدہ سے شائع ہو۔

عیسائیوں کے پادریوں کا یہ معمول رہا کہ جہاں یہ کتاب بازار میں آئی اس کے تمام نسخے خرید کر جلا دیے تاکہ لوگ پڑھ نہ سکیں، اس لیے بار بار اس کی طباعت ہوتی رہی، مراکش کی وزارتِ اوقاف و امور مذہبی نے اس کو بہت آب و تاب سے شائع کیا ہے۔

شیخ عبدالرحمن بک باجہ جی زادہ نے اپنی کتاب "الفارق بین الخالق والمخلوق" میں اس کتاب کا بلند الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ علامہ رشید رضا نے "انجیل برنباس" کے عربی ترجمہ کے مقدمہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

عیسائیوں کے حلقے میں اس کتاب کے بارے میں کیا تاثر ہے وہ صرف ایک جملہ سے واضح ہو جاتا ہے، جو برطانیہ کے ایک اہم اخبار نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا،

"اگر لوگ اس کتاب کو پڑھتے رہے تو دنیا میں عیسائیت کو کبھی فروغ نہیں ہو سکتا۔"

[بہ شکریہ "ذکر و فکر" ۔ دہلی]

اضافہ بہ سلسلہ تراجم "اظہارالحق"

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنے مقالے کے آخر میں "اظہارالحق" کے تراجم کا سرسری انداز

میں ذکر کیا ہے۔ امداد صابری مرحوم کے الفاظ میں [1] "یورپ کی متعدد زبانوں میں حکومت عثمانیہ کی طرف سے اس کے ترجمے شائع کیے گئے جن کو پادریوں نے خاص اہتمام اور کوششوں سے تلف کیا۔" یورپ کی صرف دو زبانوں - فرانسیسی اور انگریزی - میں "اظہار الحق" کے تراجم ملتے ہیں مگر ان تراجم کی اشاعت میں خلافتِ عثمانیہ کا بظاہر کوئی عمل دخل نظر نہیں آتا۔ فرانسیسی ترجمہ تیونس کے ایک طالب نے کیا تھا، جس کا نام مطبوعہ نسخوں میں درج نہیں، البتہ اس ترجمے پر نظرِ ثانی کا فریضہ پی۔ سی۔ کارلٹی نے انجام دیا تھا۔ کارلٹی لندن یونیورسٹی میں عربی زبان کا استاد تھا اور ۱۸۶۰ء سے ۱۸۷۷ء کے درمیان تیونس میں مقیم رہا تھا۔ اس نے اپنا تعارف آزاد خیال (Free Thinker) کی حیثیت سے کرایا ہے۔ وہ عقلیت کے حوالے سے اسلام کو مسیحیت پر ترجیح دیتا تھا اور "اظہار الحق" کے ترجمے کی اشاعت سے اس نے اپنے ذوق کو تسکین دی۔ یہ ترجمہ دو جلدوں میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی زندگی میں ۱۸۸۰ء میں پیرس سے شائع ہوا تھا۔ کارلٹی نے ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی رائے میں [2] "ترجمہ و تصحیح کے کام میں کافی محنت اور دیانت داری" سے کام لیا ہے۔

"اظہار الحق" کو گجراتی اور انگریزی میں منتقل کرنے کا سہرا راندیر (ضلع سورت - گجرات) کے معروف عالم مولانا غلام محمد راندیری (م ۱۹۱۶ء) کے سر ہے۔ مولانا راندیری نے عربی، فارسی اور اردو کی متعدد کتابوں کو اپنی زبان کا جامہ پہنایا تھا۔ مطالعۂ مذاہب سے انہیں خصوصی دلچسپی تھی۔ [3] "مخالفینِ اسلام سے مقابلہ و مناظرہ کرنے کا آپ کو خاص شوق تھا اور اس میں آپ کو ایک خاص مہارت ہو گئی تھی، بڑے بڑے پادری اور پنڈت وغیرہ آپ کے سامنے آتے ہوئے گھبراتے اور اکثر اوقات آپ کا نام سن کر دم چرا جاتے تھے۔" اسی دلچسپی کا نتیجہ "اظہار الحق" کے تراجم تھے۔ گجراتی ترجمہ ۱۹۱۸ء میں سورت سے شائع ہوا تھا۔ انگریزی ترجمہ اس کے بعد منصۂ شہود پر آیا۔

انگریزی ترجمے کے بارے میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے سوانح نگار مولانا محمد سلیم کیرانوی نے لکھا ہے کہ [4]

> "ٹائمز آف لندن" نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "لوگ اگر اس کتاب کو پڑھتے رہیں گے تو دنیا میں مذہبِ عیسوی کی ترقی بند ہو جائے گی۔"

اور یہ بیان مسلسل دہرایا جاتا رہا ہے۔ [5] جب ۱۹۷۱ء میں "اظہار الحق" کا دوسرا اردو ترجمہ [6] "بائبل سے قرآن تک" شائع ہوا تو ڈاکٹر حمید اللہ نے اس بیان کی تائید و تصدیق کی کوشش کی۔ ان کے الفاظ میں [7]

> میں نے ۱۹۷۲ء میں لندن ٹائمز کے ایڈیٹر ہی کو ایک خط لکھ کر پوچھا کہ آیا اظہار الحق پر کوئی تنقید کبھی اس کے ہاں چھپی ہے؟ اور میں نے احتیاطاً لکھا کہ فرانسیسی ترجمہ ۱۸۸۰ء میں چھپا ہے۔ ممکن ہے کہ انگریزی ترجمہ بھی اس کے لگ بھگ زمانے میں چھپا ہو یا یہ بھی ممکن ہے

کہ فرانسیسی ترجمے ہی پر لندن ٹائمز میں تنقید چھپی ہو۔ جواب آیا کہ اس کے ہاں بر سہ ماہی اعداد جریدہ کے انڈکس مرتب ہوتے ہیں لیکن تلاش پر نہ ان میں، اور نہ دیگر فہارس کتب میں ایسی کتاب کا کوئی ذکر ملا۔ میں نے مکرر لکھا کہ انگریزی نہیں، فرانسیسی کتاب کی تنقید ہوئی ہو گی۔ دوسرا جواب بھی نفی ہی میں آیا۔ کسی روزنامے کے تقریباً سو سال پہلے کے نمبروں میں، جب تک ٹھیک تاریخ بھی معلوم نہ ہو، کسی چند سطری تحریر کا پتہ چلانا آسان نہیں۔

ڈاکٹر حمیداللہ نے آخر میں، اس خواہش کا اظہار کیا کہ "لندن ٹائمز" کے تبصرے کی تلاش کے لیے "دیدہ ریزی" بہرحال ضروری ہے۔ مولانا غلام محمد راندیری کا انگریزی ترجمہ زبان و بیان کے اعتبار سے خاصا پرانا ہے اور بہت عمدہ بھی نہیں۔ اس لیے ایک جدید ترجمے کی ضرورت تھی۔ مولانا محمد ولی رازی نے اس کا بیڑہ اٹھایا ہے اور لندن سے اس کے چند حصے شائع ہو چکے ہیں۔

۱۔ محمد سلیم، ایک مجاہد معمار، مکہ معظمہ: مرکزی دفتر دارالعلوم حرم صولتیہ (۱۹۵۳ء)، ص ۳۶، امداد صابری، آثار رحمت، دہلی: یونین پرنٹنگ پریس (۱۹۶۷ء)، ص ۳۸۳

۲۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ، اظہار الحق اور اس کا اردو ترجمہ، ماہنامہ "البلاغ" (کراچی)، مئی ۱۹۷۲ء، ص ۲۳

۳۔ مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی، گجرات کے چند برگزیدہ اور باکمال علمائے کرام، ماہنامہ "البلاغ" (بمبئی)، دسمبر ۱۹۵۴ء، جنوری و فروری ۱۹۵۵ء، ص ۱۳۹

۴۔ محمد سلیم، ایک مجاہد معمار، حوالہ مذکورہ، ص ۳۶

۵۔ مثال کے طور پر دیکھیے: امداد صابری، حوالہ مذکورہ، ص ۳۸۳، محمد انیس الرحمٰن قاسمی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور رد مسیحیت (مقالہ)، زبانِ حال: دارالعلوم حرم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ، کراچی: ٹیکنیکل پرنٹرز (۱۹۸۷ء)، ص ۱۳

۶۔ "اظہار الحق" کا پہلا اردو ترجمہ مولوی سلیم اللہ نے کیا تھا جو چھپ نہ سکا۔

۷۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ، حوالہ مذکورہ، ص ۳۱

(عالم اسلام اور عیسائیت، جولائی ۹۳ء)

اختر راہی

منشورِ محمدی

(مسلم - مسیحی مناظراتی ادب کا ایک نمائندہ جریدہ)

برصغیر پاکستان و ہند میں مسیحی مشنریوں کی آمد کے ساتھ دعوت و تبلیغ میں جن نئے ذرائع کا اضافہ ہوا، ان میں اخبارات و جرائد کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ اگرچہ برصغیر میں پرنٹنگ کی صنعت پرتگیزوں کے ساتھ آ گئی تھی اور سولہویں صدی سے یہاں چھاپہ خانوں کا وجود ملتا ہے تاہم پرنٹنگ کی صنعت سے بڑے پیمانے پر فائدہ انیسویں صدی میں اٹھایا گیا۔ بعض مشنری اداروں نے اپنے پریس قائم کیے اور ان پریسوں کے ذریعے نہ صرف مقامی زبانوں میں بائبل کے تراجم اور مسیحی کتب شائع ہوئیں بلکہ مسیحی منادوں نے مقامی زبانوں کے سیکھنے کے لیے جو محنت کی تھی، اس کے نتیجے میں زبان دانی کے حوالے سے بھی بہت سی کتابیں شائع ہوئیں۔

مسیحی مشنری ادارے جن سرگرمیوں میں مصروف تھے، ان کے پروپیگنڈے کے لیے انہیں کتابوں سے زیادہ رسائل و جرائد کی ضرورت تھی۔ اس پر مستزاد "کتاب" اپنے اندر تمام خوبیاں رکھنے کے باوجود اس "کمی" سے خالی نہیں ہوتی کہ اس میں بیک وقت مختلف موضوعات پر نہیں لکھا جا سکتا جب کہ جرائد اور رسائل میں وقت کی ضرورت اور قارئین کی پسند و ناپسند کے مطابق موضوعات کا انتخاب کیا جا سکتا ہے اور ضرورت کے مطابق اس پر کم و بیش لکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ مسیحی اداروں کی طرف سے برصغیر کی تقریباً ہر اس زبان میں رسائل و جرائد شائع ہوئے جس میں لکھنے پڑھنے کی روایت چلی آ رہی تھی۔

انیسویں صدی میں مسیحی اداروں اور افراد کی طرف سے متعدد رسائل و جرائد شائع ہوئے۔ ان میں سے بعض کے بارے میں ازحد کم معلومات حاصل ہیں کیوں کہ آج ان رسائل سے دنیا کے معروف ذخائر کتب خالی ہیں تاہم ۱۸۳۶ء سے ۱۹۰۰ء تک مسیحی اداروں کی جانب سے جو اُردو رسائل جاری ہوئے۔ اُن میں حسبِ ذیل نمایاں ہیں۔

- ۱۸۳۶ء صدر الاخبار (آگرہ)
- ۱۸۳۷ء خیر خواہ ہند (مرزاپور)

* ۱۸۵۹ء باہداد (بمبئی)
* ۱۸۶۳ء خیر خواہ خلق (سکندرہ)
* ۱۸۶۷ء مواعظ عقبیٰ (دہلی)
* ۱۸۶۸ء حقائق عرفان (امرتسر)
  مخزن مسیحی (الہ آباد)
  کوکب عیسوی (لکھنؤ)
* ۱۸۶۹ء کوکب ہند (لکھنؤ)
  شمس الاخبار (لکھنؤ)
* ۱۸۷۳ء نور افشاں (لدھیانہ)

برصغیر کے مسلمان صحافیوں نے جو رسائل اور اخبارات جاری کیے، اُن میں عمومی طور پر مسیحی اخبارات سے اخذ و اقتباس کے ساتھ ان پر تنقید بھی ہوتی تھی۔ مسیحی مبلغین کی سرگرمیوں سے وہ چنداں خوش نہ تھے مگر وہ مسیحی اہل علم کے مقالات پر تنقید اور دینی حوالے سے اپنا نقطۂ نظر تفصیل سے بیان نہ کرتے تھے۔ تاہم علمائے کرام نے مسیحی منادوں کے جرائد و رسائل میں اٹھائے گئے سوالات کا جواب دینے کے لیے جوابی رسائل جاری کیے۔ انیسویں صدی کے ان رسائل میں نمائندہ جریدے کی حیثیت بنگلور سے شائع ہونے والے دہ روزہ "منشور محمدی" کو حاصل تھی۔

"منشور محمدی" ابتداءً ہفت روزہ "قاسم الاخبار" (بنگلور) کے ضمیمے کے طور پر شائع ہوتا تھا۔ "قاسم الاخبار" بنگلور کے منشی محمد قاسم متخلص بہ غم نے ۱۸۶۱ء میں جاری کیا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں یہ ہفت روزہ سے پندرہ روزہ ہو گیا۔ "تاج التواریخ" نے "قاسم الاخبار" کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔[۱]

قاسم الاخبار بنگلور سے پندرہ روزہ جاری ہے جس کا سالانہ چندہ چھ روپے ہے۔ پرانا اخبار برمی تقطیع پر اس آب و تاب سے نکلتا ہے جیسے کہ بارونق اخبار کو نکلنا چاہیے۔ اس اخبار میں پرانا اور نیا دونوں رنگ عمدہ ہیں۔

منشی محمد قاسم شعر و ادب کے ساتھ تقابل ادیان سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اُنہوں نے مسیحیت کا بالخصوص مطالعہ کیا تھا اور مسیحی منادوں کا توڑ کرنے میں پیش پیش رہتے تھے۔ ۲۲ مئی ۱۸۷۲ء کو اُن کی کوشش سے "انجمن اسلامیہ" (بنگلور) وجود میں آئی جس کے مقاصد میں سرفہرست مسلمانوں کو مسیحی پروپیگنڈے سے بچانا اور مسیحیوں کو اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرنا تھا۔ انجمن کے صدر مولوی عبدالعلی اور سیکرٹری منشی محمد قاسم غم تھے۔

۲۵ اگست ۱۸۷۲ء/۱ جمادی الاخریٰ ۱۲۸۹ھ کو منشی محمد قاسم نے "قاسم الاخبار" کے ضمیمے کی حیثیت سے دہ روزہ "منشور محمدی"[۲] جاری کیا۔ ہر مہینے کی ۵، ۱۵ اور ۲۵ تاریخ کو شائع ہوتا تھا۔ شوال

۱۳۰۴ھ/جون ۱۸۸۷ء میں خریداروں کی عدم سرپرستی کے باعث بند ہو گیا۔ تاہم اس کی کمی شدت سے محسوس کی گئی اور محرم ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷ء میں اس کی اشاعت از سر نو شروع ہو گئی۔

منشی محمد قاسم کے بعد "منشور محمدی" کی ادارت منشی محمد شریف کے ہاتھ میں آئی۔ چودھری شیخ مولا بخش نے "مراسلات مذہبی" میں "منشور محمدی" کے بارے میں لکھا ہے۔[۳]

> اس میں لائق لائق کارسپانڈنٹوں کے مضامین عیسائیوں کے رد میں طبع ہوتے ہیں اور ہر قسم کے اعتراضوں کے جواب اس میں چھپا کرتے ہیں۔ اس فن کے شائقین کو اس کا دیکھنا بہت ضروری ہے۔ بالفعل اس کے مہتمم جناب منشی محمد شریف صاحب ہیں۔ اللہ اُن کی سعی کو مشکور کرے ---- اب نہ معلوم یہ رسالہ نکلتا ہے یا نہیں۔

"منشورِ محمدی" (بنگلور) کے ابتدائی پرچے کریمی لائبریری بمبئی (انڈیا) میں محفوظ ہیں۔[۴] جلد ۱۷ (بابت ۱۳۰۵ھ) کے ۳۳ اور جلد ۱۸ (بابت ۱۳۰۶ھ) کے ابتدائی ۲۱ شمارے پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور میں دیکھے جا سکتے ہیں۔[۵]

"منشور محمدی" کی زبان و بیان اپنے وقت کے مناظرانہ انداز کے عین مطابق ہے۔ زیر بحث موضوع کے ساتھ مصنف یا مؤلف کی ذات بھی زیر بحث آ جاتی ہے تاہم "منشورِ محمدی" نے مسلم۔ مسیحی مناظراتی ادب میں وسیع اضافہ کیا۔ اس کے لکھنے والوں میں اس دور کے سب ہی مناظرین شامل تھے۔ مرزا غلام احمد قادیانی، مولوی چراغ علی (م ۱۸۹۵ء)، مولانا محمد علی کانپوری، شیخ رحیم بخش پٹیالوی اور کئی دوسرے اہلِ قلم کی تحریریں "منشور محمدی" کے صفحات میں محفوظ ہیں۔

چودھری منشی مولا بخش مؤلف "مراسلاتِ مذہبی" نے "تردید عیسائیت" میں لکھی گئی ۱۸۸ کتابوں کی ایک فہرست مرتب کی تھی۔ اس فہرست میں ۱۱۸ ایسی کتابیں اکٹھی شامل ہیں جو پہلی بار "منشورِ محمدی" کے صفحات میں چھپے تھے، ذیل میں تفصیل دی جاتی ہے۔

- اِبطال عقائد دین عیسوی (تفضل حسین معین الواعظین) [جلد ۱۶ (۱۳۰۳ھ)]
- اعلیٰ برہان بہ تمجید القرآن
  یہ رسالہ "عدم ضرورتِ قرآن" (پادری ٹھاکر داس) کا جواب ہے۔ [جلد ۱۶، شمارہ ۲۰ (۱۳۰۳ھ)]
- تبصرہ
  اُن قرآنی آیات کی تشریح و تفسیر ہے جن سے مسیحی اہل علم بائبل کی حقانیت ثابت کرتے ہیں [جلد ۱۳ - شمارہ ۲-۶ (۱۳۰۱ھ)]
- تحفتہ الطلب فی الرد علی اہل الصلیب (عبداللہ)
  اس رسالے کے مؤلف نے مسیحیت ترک کر کے اسلام قبول کیا تھا اور ۱۸۲۳ھ میں یہ رسالہ

تالیف کیا تھا۔ تحفۃ الاریب کا اولین ترجمہ منشور محمدی [جلد ۸ (۱۲۹۶ھ)] میں شائع ہوا۔ بعد میں اس رسالے کا ترجمہ قاضی شمس الدین کے قلم سے "آئینہ عیسائیت" [راولپنڈی: اسلامی مشن (۱۹۶۱ء)] کے نام سے شائع ہوا۔

* تنویر الایقان (محمد عبدالغفور عظیم آبادی)
  ایک مسیحی پمفلٹ "وجہتہ الایمان" کا جواب ہے۔ [جلد ۱۶، شمارہ ۱۱ (۱۳۰۴ھ)]
* تحریر دلپذیر (الفت حسین) [جلد ۳ - شمارہ ۲۴]
* دافع الاسقام (مولانا رحمت اللہ کیرانوی)
  مولانا رحمت اللہ کی فارسی تالیف "ازالتہ اللاوہام" کا اردو ترجمہ ہے جو مولوی نور محمد مہتمم مدرسہ حقانی لدھیانہ نے کیا ہے۔
* دفع اللغالیط فی بحث الفارقلیط (محمد عبداللہ - مدرس کلکتہ) لفظ "فارقلیط" پر بحث کی گئی ہے۔ [جلد ۱۵، شمارہ ۲ (۱۳۰۳ھ)]
* دفع طعن نکاح زینب
  ماہنامہ "نور افشاں" (لدھیانہ) کے مضمون مطبوعہ ۱۸۸۶ء کا جواب ہے جس میں ام المومنین حضرت زینبؓ کے نکاح کے بارے میں اعتراضات کیے گئے ہیں۔ [جلد ۱۶، شمارہ ۵۵ (۱۳۰۴ھ)]
* الدلیل القوی لرد ذبیحتہ العیسوی (محمد محفوظ بلیاوی)
  یہ رسالہ نصیر الدین عیسائی کے کتابچہ "ذبیحتہ العیسوی" کا جواب ہے۔ [جلد ۱۶، شمارہ ۲۱ (۱۳۰۴ھ)]
* السیف المندی علی معذرات الکندی (محمد عبداللہ - مدرس کلکتہ) [جلد ۱۶، شمارہ ۳ (۱۳۰۴ھ)]
* صیانتہ الایمان من تراجم القرآن (محمد عبداللہ - مدرس کلکتہ)
  قرآن مجید کے اُن تراجم پر تنقید و تبصرہ ہے جو غیر مسلموں نے انگریزی اور فرانسیسی وغیرہ زبانوں میں کیے ہیں۔ [جلد ۱۶ - (۱۳۰۴ھ)]
* کلمات طیبات [جلد ۶، شمارہ ۱۲ (۱۲۹۴ھ)]
* مسکت الخصیم (حبیب علی ساکن مین پوری)
* کعبہ کی جانب سجدہ کرنے اور حجرِ اسود کو بوسہ دینے وغیرہ کی بابت اعتراضات کا جائزہ ہے۔ [جلد ۳ (۱۲۹۴ھ)]
* معجزات محمدی (بدیع الزمان)
  معجزات نبوی کی صداقت پر گفتگو ہے۔ [جلد ۱۷، شمارہ ۱۳ (۱۳۰۵ھ)]
* معراج نبی (حکیم محمد حسن امروہی) [جلد ۱۹ (۱۳۰۹ھ)]

* میزان النبوۃ (منشی اللہ دیا لدھیانوی)
  پادری فور مین کے رسالہ "تیغ و سپر عیسوی" (مطبوعہ ۱۲۹۶ھ) کا جواب ہے۔ [جلد ۸ (۱۲۹۶ھ)]
* نصرتِ احمدیہ (احمد حسن)
  پادری عماد الدین اور مولانا محمد عمر کے مابین مذہبی گفتگو ہے۔ [جلد ۱۸ (۱۳۰۶ھ)]

حواشی

۱۔ بحوالہ امداد صابری، تاریخ صحافت اُردو، جلد دوم (حصہ اوّل)، دہلی: جدید پرنٹنگ پریس (س۔ن)، ص ۱۶۴۔

۲۔ سیّد محمد الحسنی نے "سیرت مولانا محمد علی مونگیری" میں لکھا ہے کہ "۱۲۸۹ھ میں انہوں (مولانا مونگیری) نے [ردِ عیسائیت کے] مقصد کے لیے کانپور سے ایک اخبار "منشورِ محمدی" جاری کرایا اور اس میں عیسائیت کی تردید اور اُن کے عقائد کے ابطال میں مضامین شائع کرنا شروع کیے۔" [سیّد محمد الحسنی، سیرت مولانا محمد علی مونگیری، کراچی: مجلس نشریات اسلام (س۔ن)، ص ۳۸]

"منشورِ محمدی" کانپور سے نہیں، بنگلور سے شائع ہوتا تھا۔ اس کے مضمون نگاروں میں مولانا محمد علی مونگیری شامل تھے مگر اس کا اجراء اُن کی کوشش سے نہیں ہوا تھا۔ جمادی الآخریٰ ۱۲۸۹ھ میں جب کہ "منشورِ محمدی" کا اجراء ہوا تو مولانا محمد علی مونگیری کی عمر بمشکل ۱۷ سال تھی۔

مولانا محمد علی مونگیری نے ۱۸۹۲ء میں ایک جریدہ "تحفۂ محمدیہ" کانپور سے جاری کرایا تھا۔ تبلیغ" (جبل پور) نے تحفۂ محمدیہ پر یکم دسمبر ۱۸۹۳ء کے شمارے میں حسب ذیل تبصرہ شائع کیا ہے۔

> یہ ماہواری رسالہ محض اسلام کی تائید اور مسلمانوں کی ہمدردی کے لیے شائع ہوتا ہے۔ عیسائیت کی تردید بہت زور سے کرتا ہے۔ اسلام کی حقانیت و صداقت پُر زور دلائل سے ثابت کرتا ہے۔" [بحوالہ امداد صابری، تاریخ صحافت اُردو، جلد سوم، دہلی: جدید پرنٹنگ پریس (۱۹۶۳ء)، ص ۵۸۳]

۳۔ چودھری شیخ مولا بخش، مراسلات مذہبی (حصہ اوّل)، مونگیر: مطبع رحمانیہ (۱۳۳۱ھ)، ص ۳۰

۴۔ دیکھیے: امداد صابری، تاریخ صحافت اُردو جلد ۲، حوالہ مذکورہ، ص ۰۔

۵۔ ملک احمد نواز، اردو اخبارات و رسائل مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔ لاہور، ماہنامہ "کتاب" (لاہور)، اکتوبر ۱۹۶۶ء، ص ۷۶

۶۔ چودھری مولا بخش، حوالہ مذکورہ، ص ۱۳۔۳۰

* (عالمِ اسلام اور عیسائیت، جولائی ۹۳ء)

تاریخی ناول "ظہیر الدین بابر"

قارئین کے لیے یہ حقیقت دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ پچھلے سال تک تاشقند میں "رادوگا" اشاعت گھر کی شاخ اردو میں بھی کتابیں شائع کرتی رہی۔ ان میں زیادہ تر کتابیں جدید دور کے ادیبوں کی تخلیقات ہیں۔ مثال کے طور پر مجموعہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ جس کا عنوان ہے "ممتاز سوویت افسانہ نگار"۔ اس مجموعہ میں تیس برس (۱۹۲۰ء تا ۱۹۵۰ء) کے سوویت ادب کے ارتقاء کا اظہار ہوتا ہے، اس میں میکسم گورکی، الکسیئی تالستائی اور میخائیل شولوخو جیسے معروف نمائندہ ادیبوں کی کہانیاں شامل ہیں۔ شاندار ادبی اسلوب کے مالک دوسرے نثر نگار اندرئی پلاتونوف، کنستنتین پاؤستوفسکی اور لیونید سوبولیف کی بھی کہانیاں پڑھ کر قاری کو متنوع سوویت تہذیب کے بارے میں واقفیت حاصل کرنے کا موقع ملے گا۔ اس مجموعے کا ہر افسانہ خواہ وہ قدرت سے متعلق پاؤستوفسکی کا مختصر افسانہ ہو، خواہ ایک محنت کش سے متعلق پلاتونوف کا طویل افسانہ اپنے اپنے انداز سے دلچسپ ہے اور قارئین کو متاثر کرے گا۔

ریاستی انعام یافتہ روسی ادیب بورس واسیلیف بہت سے ملکوں میں شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی پہلی کتاب "سحر یہاں سکون ہے یہاں..." پانچ نوجوان سوویت لڑکیوں اور ایک سارجنٹ میجر کی شجاعت و بہادری کی داستان ہے جنہوں نے نازیوں کے خلاف جنگ میں اپنی زندگیاں قربان کیں لیکن پھر بھی ان کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

تاشقند سے اردو میں ایک شائع شدہ کتاب الکسیئی تالستائی کا ناول "دوشیزہ مریخ" ان کا ایک سائنسی خیالی ناول ہے۔ اس میں مریخ سیارے کی طرف جس پرواز کا تصور پیش کیا گیا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علم کی قوت کا آخری اور واحد مقصد بنی نوع انسان کی بھلائی ہوتی ہے اور اس کے برعکس جہالت اور کٹر پرستی برائی اور بدی پیدا کر سکتی ہے۔

تاشقند کی شاخ میں اردو میں کئی سوویت ریپبلکوں مثلاً ازبکستان، آذربائیجان اور آرمینیا کے ادیبوں کی تخلیقات شائع کی گئیں۔ پریمقل قادروف نامور ازبک سوویت ادیب ہیں جن کا تاریخی ناول "ظہیر الدین بابر" ان کی حالیہ تصانیف میں سے ایک ہے۔ مصنف نے اس ناول میں ظہیر الدین محمد بابر کی متاثر کن شخصیت کی بڑے بھرپور انداز میں عکاسی کی ہے۔ بابر سولہویں صدی میں ماوراء النہر اور ہندوستان جیسی عظیم الشان سلطنتوں کا حکمراں ہونے کے ساتھ ہی ساتھ اپنے زمانے کے بہت ہی عالم و فاضل اور روشن خیال افراد میں بھی شمار کیا جاتا تھا۔

●●

"اخبار اردو" جولائی ۱۹۹۳ء

ضمیمہ ۲

بعض اہم مضامین جو پیش نظر مجموعے کی ضخامت بڑھتے جانے کے سبب ضمیمہ نمبر۱ میں شامل نہیں کیے جاسکے مندرجہ ذیل ہیں۔

ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب	ابراحسنی گنوری	ابر	جولائی۔دسمبر ۱۹۹۳ء
استنبول کے کتب خانوں میں البیرونی کے مخطوطات	ڈاکٹر محمد صابر خاں	معارف	اکتوبر ۱۹۹۳ء
مفتاح الخزائن	ترجمہ: نثار احمد فاروقی	منادی	۶۸/۸
بحر المعانی اور اس کے مصنف	مسعود انور کاکوروی	"	۶۸/۱۲
حضرت بابا فرید اور ان کا پنجابی کلام	ترجمہ: نثار احمد فاروقی	"	۶۸/۸
مفتی شوکت علی فہمی	آصف علی فہمی	"	۶۸/۷
شعری بھوپالی	رحمت امروہوی	گلبن	اکتوبر ۱۹۹۳ء
مولانا محی الدین احمد قصوری	محمد اسحاق بھٹی	المعارف	جولائی ۱۹۹۳ء
تاباں صاحب: ایک رند پارسا	عبداللہ ولی بخش قادری	ابر	جولائی۔دسمبر ۱۹۹۳ء
وامق جونپوری کی خود نوشت، علی گڑھ اور کلکتہ	وامق جونپوری	منشور	اکتوبر ۱۹۹۳ء
اردو پڑھ کر کیا ہوگا؟ (اداریہ)	ظفر ہاشمی	گلبن	جولائی، اگست ۱۹۹۳ء
ہندوستان میں اردو کس کی زبان ہے؟	" "	"	ستمبر، اکتوبر ۱۹۹۳ء
آج مسلمان دنیا سے رخصت ہوتے وقت معلوم ہوتا ہے وہ مسلمان ہے۔	مولانا ابوالحسن علی ندوی	ہدایت (جے پور)	دسمبر ۱۹۹۳ء
کتاب تقلید و اجتہاد کے مسائل	مولانا رشید احمد گنگوہی	اذان بلال	ستمبر ۱۹۹۳ء
تحقیق کا اسلامی منہاج	صلاح الدین عمری	حیات نو	اکتوبر ۱۹۹۳ء
مکاتب و مدارس اسلامیہ میں ذریعۂ تعلیم کیا ہو۔	تاج محمد صدیقی	"	" "
جدید تعلیمی تجربات سے استفادہ پر غور و فکر کے لیے کمیشن کا قیام۔	منصور عالم	"	" "

ہندوستان میں احیار شریعت کی لہر	مختار احمد ندوی	البلاغ	اکتوبر ۱۹۹۳ء
ہندوستانی مسلمان کدھر؟	انقلابی مسلم کانفرنس	آل انڈیا مسلم کنونشن بمبئی	دسمبر ۱۹۹۳ء
حضرت بل درگاہ کا المیہ	رشید احمد جالندھری	المعارف	اگست ستمبر ۱۹۹۳ء
اسلامی دانشوروں کا نظریۂ تقسیم علوم	مہدی محقق	آیات	ستمبر۔ دسمبر ۱۹۹۳ء
جے سنگھ کورٹ کے مسلم ماہرین فلکیات	ویندر۔ این۔ شرما	"	" "
فیض احمد فیض کا "گاؤں والے"	وشیلی شوکش مترجم فیض احمد فیض	آج (کراچی)	جولائی۔ دسمبر ۱۹۹۳ء
داراشکوہ	سید ابوالخیر مودودی (مرحوم)	المعارف	اکتوبر ۱۹۹۳ء
حیات سرمد پر ایک نظر (تعارف)	" " "	"	جولائی ۱۹۹۳ء

ضمیمہ ۳

"اردو رسائل ۱۹۹۲ء میں"

مکمل فہرست

فہرست

رسالے جو تاخیر سے شائع ہوتے ہیں

ضمیمہ ۔ ۱

ضمیمہ-۲

تصحیحات

اردو رسائل ۱۹۹۲ء میں

صفحہ / کالم / سطر	
چار / ۱ / ۱۵	حریم (لکھنؤ)
چار / ۱ / ۱۶	حیات نو (اہریا گنج، اعظم گڑھ)
چار / ۲ / ۱۰	راہ اسلام (دہلی)
پانچ / ۲ / ۶	نقوش حیات (اگہر دلی بازار، بستی)
پانچ / ۲ / ۱۶	ضیاء (سر ضیاء الدین ہال مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ)، ۲۱۸
پانچ / ۲ / ۱۷	عصری آگہی (دہلی)، ۲۱۹
پانچ / ۲ / ۱۸	علی گڑھ میگزین (علیگڑھ)، ۲۲۱
پانچ / ۳ / ۹ — ۱۹۳ / ۳ / ۱	فصیل (کرناٹک)، ۲۲۳
پانچ / ۳ / ۱۰ — ۱۹۳ / ۳ / ۲	فکر و تحقیق (دہلی)، ۲۲۴
پانچ / ۳ / ۱۱ — ۱۹۳ / ۳ / ۳	فن اور شخصیت (بمبئی)، ۲۲۵
پانچ / ۳ / ۱۲ — ۱۹۳ / ۳ / ۴	قومی زبان (آندھرا پردیش)، ۲۲۷
پانچ / ۳ / ۱۳ — ۱۹۳ / ۳ / ۵	کاوش (لاہور)، ۲۲۸
پانچ / ۳ / ۱۴ — ۱۹۳ / ۳ / ۶	محسن (محسن الملک ہال مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ)، ۲۲۹
پانچ / ۳ / ۵ — ۱۹۳ / ۳ / ۱	معیار تحقیق (ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ)، ۲۳۱
پانچ / ۳ / ۳ — ۱۹۳ / ۳ / ۲	نیا دور (کراچی)، ۲۳۶
پانچ / ۳ / ۴ — ۱۹۳ / ۳ / ۳	وقار (وقار الملک ہال مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ)، ۲۳۳

اوراق پارینہ

"جامع الاخلاق"

از قاضی عبدالودود صاحب عظیم آبادی بی اے

انیسویں صدی کی ابتدا میں، نثر اردو کو ترقی دینے کے لئے ڈاکٹر گلکرسٹ اور ان کے ساتھیوں نے جو کوششیں کی تھیں ان کا تذکرہ آزاد نے آب حیات میں، اور مولوی عبدالحق معتمد انجمن ترقی اردو نے گلشن ہند کے مقدمہ میں کیا ہے، جو معلومات ان حضرات نے بہم پہونچائی ہیں قابل قدر ضرور ہیں لیکن تعجب ہے کہ اس عہد کی ایک ایسی کتاب جس کا ذکر اس لحاظ سے کہ کسی قدیم مستند علمی کتاب کو اردو میں منتقل کرنے کی یہ پہلی کوشش تھی، سب سے مقدم ہونا چاہئے تھا، سرے سے نظر انداز کر دیا، چونکہ اس کتاب کی اہمیت کے متعلق اختلاف رائے ناممکن ہے، اس لئے یقین ہے کہ یہ کتاب ان حضرات کی نظر سے نہیں گذری، میری مراد علم الاخلاق کی مشہور و معروف کتاب "اخلاق جلالی" کے اردو ترجمے سے ہے جس کو ۱۸۰۵ء میں مولوی امانت اللہ نے کپتان جیمس مونٹ کے حکم سے مکمل کیا، اور اس کا نام "جامع الاخلاق" رکھا۔

مترجم کا نام مولوی امانت اللہ ہے، ان کے مولد و موطن کا کچھ پتہ معلوم نہیں ہوتا، ان کی علمی قابلیت ضرور اچھی ہوگی ورنہ ایک دقیق علمی کتاب کے ترجمہ کی خدمت ان کے سپرد نہ کیجاتی، فورٹ ولیم کالج میں یہ منشی تفرقہ ہندی کے تھے، ایک کتاب "ہدایت الاسلام" بھی انہوں نے لکھی تھی جسکا ذکر وہ دیباچہ میں کرتے ہیں، شاعر بھی تھے اور شیدا تخلص کرتے تھے، چنانچہ خاتمہ اور دیباچہ میں ان کی طبعزاد حمد اور دعائیہ نظمیں موجود ہیں، پایۂ شاعری بہت ادنیٰ ہے، غالباً اسی وجہ سے کسی تذکرہ نگار نے ان کا حال نہیں لکھا، بلکہ نام تک درج کرنا غیر ضروری سمجھا، یہ ترجمہ انہوں نے ۱۸۰۵ء میں جبکہ مارکوئس ولزلی گورنر جنرل تھے،

کپتان جیمس موئٹ مدرس تفریق ہندی مدرسہ عالیہ دام اقبالہٗ کی تحریک سے تکمیل کو پہونچایا، دیباچہ میں مترجم نے ان دونوں صاحب بہادروں کی نظم و نثر میں بیحد مبالغہ آمیز تعریف کی ہے،

اصل کتاب میں کیا کچھ ردوبدل انھوں نے جائز رکھا ہے اور اصطلاحات کے متعلق کونسی روش اختیار کی ہے، اسکا بیان انھیں کے الفاظ میں مناسب ہوگا،

"یہ کتاب بغایت مغلق اور دقیق المضمون، اوّل سے آخر تک تمام مسائل حکمی اور تدقیقات علمی سے مشحون ہے، اور ترجمہ کرنا اس کا مستلزم تجرید مادہ جسمانی، اور اسقاط قوائے انسانی کا ہے لیکن بمقتضائے نمک خواری کے صورت انکار کی مناسب نہ دیکھی، اور فضال حقیقی پر توکل کر کے اس میں اقدام کیا، لیکن اس کے خطبے کے بدلے دوسرا خطبہ علیحدہ لکھکر ضمیمہ اس ترجمے کا کر کے حکمت عملی کی تقسیم سے شروع کیا، اور حتی المقدور اس کی تسہیل میں کوتاہی نہیں کی، مگر ان اصطلاحوں کا جبکہ ترجمہ اس زبان میں ممکن نہیں، انشاء اللہ تعالیٰ بعد اتمام کے ان اصطلاحوں کی تفسیر اشارے و کنائے سے کر کے جدا ایک فرہنگ مختصر تخمیناً مقدار دو تین جز کے آخر کتاب میں ملحق کیجائیگی، اور جابجا کمی زیادتی کر کے ترجمہ لفظی چھوڑ سہل ہونے کیلئے مطلب بیان کر دیا ہے، ترتیب اس ترجمہ کی مطابق اصل کتاب کے باقی رہی۔"

فرہنگ جس کا ذکر انھوں نے کیا ہے، یا تو وہ حسب ارادہ مرتب نہ کر سکے، یا بعد میں طبع کرانے والوں نے غیر ضروری سمجھ کر علحدہ کر دیا، میرے پاس اس کتاب کا جو نسخہ موجود ہے وہ مطبع احمدی کلکتہ میں اردو ٹائپ میں مولوی غلام حیدر ساکن بوج گلی کے اہتمام سے [illegible] میں طبع ہوا تھا، صفحات کی تعداد ۲۶۰ ہے اور ہر صفحے میں [illegible] سطریں ہیں، میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا، لیکن قرینہ ہے کہ یہ اس کتاب کا پہلا مطبوعہ نسخہ ہے، اردو نثر کے اس ابتدائی زمانے میں ایک دقیق علمی کتاب کے ترجمہ کرنے میں کتنی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا، اس کا اندازہ کرنا بہت دشوار ہے، تاہم میں اپنی طرف سے یہ نہیں کہنا چاہتا کہ مترجم نے کس حد تک

کامیابی حاصل کی، میں چند اقتباسات پیش کرتا ہوں تاکہ ناظرین خود فیصلہ کر سکیں،

(۱)

حکمت طبیعی کی بحثوں سے علم نفس کی بابت میں مقرر ہوا ہے کہ نفس ناطقۂ انسانی میں دو قوتیں ہیں، ایک قوت ادراکی جس کے سبب سے ہر ایک شی کو جان سکے، دوسری قوت تحریکی جس کے سبب ہر ایک طرح کا کاروبار کر سکے، پھر قوت ادراکی کے دو شعبے ہیں، پہلا عقل نظری وہ سبب ہے صور علمیہ کے قبول کرنے کا مجردات سے، دوسرا عقل عملی جس کے سبب سے ہر ایک آدمی اپنے بدن کو کاروبار میں مشغول کرتا ہے، پھر یہ شعبہ یعنی عقل عملی باعتبار علاقہ رکھنے اس کے قوت غضبی اور قوت شہوی کے ساتھ سبب ہوتا ہے فعل کا جیسا مارنا، کھانا، پینا، یا قبول فعل کا جیسے شرمندگی سے رونا، اور باعتبار اس کے کہ وہم و خیال اسے استعمال کریں سبب ہوتا ہے جزوی فکروں اور جزوی شغلوں کا، اور باعتبار نسبت کرنے عقل نظری کے ساتھ سبب ہوتا ہے اس فکر کلی کا جو سب کاموں سے علاقہ رکھے، جیسے معلوم کرنا اس کا کہ سچ کہنا اچھا، اور جھوٹ کہنا برا ہے اور مانند اس کے، پھر قوت تحریکی کے دو شعبے میں سے ایک قوت غضبی ہے اور وہ سبب ہے بری چیزوں کے دفع کرنے کا بطریق غلبے کے، دوسری قوت شہوی کہ وہ سبب ہے اچھی چیزوں کے لینے کا، لیکن قوت غضبی کو چاہیے کہ بدن کی سب قوتوں پر غالب رہے اس طور سے کہ ہرگز کسی سے کمزور نہ ہو بلکہ سب اس کے حکم کے تابع اور اس سے مغلوب رہیں، اور یہ قوت جس کو جس کام میں متعین کرے اس کو بخوبی انجام دیا کرے تاکہ اس کی موافقت اور اس کی حکومت سے آفرینشِ انسان کی بادشاہت کا بندوبست اچھی طرح انجام پائے، اور کسی وجہ سے اس انتظام میں خلل دخل نہ ہوئے اگر اسی طرح سے ہر ایک قوت اپنے کام میں جس طور سے کہ عقل کے موافق ہو اقدام کرے تو عقل نظری کی صفائی سے جو پہلا شعبہ قوت ادراکی کا ہے حکمت حاصل ہوئے، اور عقل عملی کی صفائی سے جو دوسرا شعبہ ہے اسی قوت کا عدالت پیدا

ہوئے، اور قوت غضبی کی درستی سے شجاعت، اور قوت شہوی کی صفائی سے پارسائی، اسی کا نام کمال قوت عملی ہے"

(۲)

"حکمت کی نوعوں میں سے مشہور سات نوع ہیں، ذکا، سرعت فہم، صفائی ذہن، سہولت تعلم حسن تعقل، تحفظ، تذکر، پس ذکا وہ قوت ہے کہ بسبب اس کے مقدموں سے نتیجوں کو بآسانی نکال سکے لیکن یہ موقوف ہے ان مقدموں کی مشاقی پر جو منتج ہیں، سرعت فہم نام ہے اس قوت کا جس کے سبب ملزومات سے ان کے لوازم کی طرف انتقال ذہن کا ہوئے بلا توقف، پر ان دونوں میں یہ فرق ہے کہ پہلی سرعت حرکات فکری میں ہوتی ہے اور دوسری ان کے غیر میں جیسے ملزومات تصوریہ سے ان کے لوازم کی طرف انتقال کرنا، یا قضایا سے ان کے عکوس مستویہ یا عکس نقیض کی طرف، صفائی ذہن اس ملکہ استعداد کو کہتے ہیں کہ بسبب اس کے بغیر رنج و تعب کے استخراج مطلب کر سکے، سہولت تعلم نام ہے استعداد کا جس کی وجہ سے توجہ کلی مطلوب کی طرف کھینچ تا کہ بخاطر جمعی آسانی سے اس کو حاصل کرے۔ حسن تعقل وہ ہے کہ بحث و مناظرے میں مطلب کی توضیح کرنے کیلئے حد لائق کو نگاہ رکھے تا بسبب غفلت کے کچھ اس پر واجب نہ ہو جائے اور نہ کسی شئی زائد کو استعمال کرے، تذکر بے تکلیف یاد کرنا ان چیزوں کا جو قوت حافظہ میں ہیں جب چاہے۔ تحفظ اس ملکے کا نام ہے کہ جس سے معقولات یا محسوسات کی صورتوں کو ضبط کرے "

(۳)

"میں نے عدالت کی تین قسم پر کی ہے، ایک وہ ہے کہ جس پر اقدام کرنا اس سے لازم حق تعالیٰ کی بندگی کا حق ادا کیا جاوے، کیونکہ اس کی مہربانی نے بے سابقہ استحقاق کے خلعت وجود کے تئیں ہر ایک موجود کو انعام فرمایا، اور اپنے خزانۂ احسان میں سے اس عالم امکان کی ہر ایک شئی کو بے شمار نعمتوں سے نوازش کیا؛

پس اقتضاء عدالت کا یہ ہے کہ ہر ایک شخص اپنے اور اس کے حق کے درمیان جو لازم ہے اس کے بجا لانے میں طریق مستحسن کو نگاہ رکھے اور اسکی بندگی کے چلن میں کسی طرح سے قصور نہ کرے، دوسری وہ جو متعلق ہے اپنی نوع کے شرکاء سے مثلاً بادشاہوں کی تعظیم یا علما اور ائمہ دین کی تکریم کرنی اما نتوں کو پھیر دینا، معاملے میں انصاف کرنا، تیسری وہ کہ جو گذرے ان کے حق سے ادا ہونا اس طور سے کہ ان کے اموال میں سے ان کے قرضوں کو ادا کرے، وصیتوں کو بجا لاوے اور جو اس کی مثال سے ہو۔

••

(معارف: نمبر ۵ جلد ۱۱)

* ہو الاول *

نام اس کتاب سعادت انتساب کا

جامع الاخلاق ہی

وریہہ ترجمہ ہی لوامع الاشراق فی مکارم الاخلاق عرف اخلاق جلالی کا اردو زبان میں سنہ ۱۲۲۰ بارہ سو بیس ہجری قدسی میں مطابق سنہ ۱۸۰۵ اٹھارہ سو پانچ عیسوی کے مولوی امانت اللہ مرحوم نے جو فورٹ ولیم کالج کے درمیان منشی تفریق ہندی کے تھے اسکو ترجمہ کیا تھا * اب سنہ ۱۲۶۴ بارہ سو چونسٹھ ہجری میں موافق سنہ ۱۸۴۸ اٹھارہ سو اڑتالیس عیسوی کے

زبدہ نوئینان عظیم الشان مشیر خاص ملکہ فرخندہ بارگاہ انگلستان

جیمس اندرو ارل دلہوزی گورنر جنرل بہادر کے

حکومت کے وقت اور جناب معلی القاب عدل و انصاف کے باب

کرنیل استیون دیوس ریلی بہادر کے

دور میں جو سکرتر کلکتے کے عربی مدرسے کے اور ممتحن کالج مرجم کے اور بکنگ جناب والا خطاب معدن اخلاق و آداب

میجر جارج ترنبل مارشل بہادر

سکرتر کالج مذکور کے ہیں

خادم الطلبہ احقر غلام حیدر

ساکن ہوڈل نے اس رجسٹر کو کا کٹہ کے بیچ مطبع احمدی میں،
تاکہ طالب العلموں کو اس سے فائدہ پہنچے
اور عاصی کو ثواب ملے

* قطعہ *

* ہرایک حکایت ہی حلاوت لب شیریں *
* ہرایک ورق اسکا نقاب رخ لیلی *
* گر خوان یہ تحسین کے سخن کا ہو مدارات *
* مہمان یہ ہوا ور رہوں سب اسکے طفیلی *

—ooooo—

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حمد اُس کریم کارساز کو سزاوار ہی کہ جسنے جواہر اخلاق حمیدہ کو
اپنے دریاے کرم سے خو احسان بحر کمال کو بخشا * اور یاقوت خصائل
پسندیدہ کے تئیں اپنے خزانۂ احسان سے طالبان مخزن فضائل کو
عنایت فرمایا * وہ ایسا حکیم ہی کہ اپنے فضل سے بیت المقدس
حکمت کو شیاطین جہالا سے محفوظ رکھا * سبحان اللہ کیا عادل
ہی کہ غایت انصاف سے تخت گاہ عدالت کو عدوان ظالم سے
بچایا * اور ثنا اسی پاک بے نیاز کی ہی کہ جسے دامن عفت کے تئیں

(JAUMAY-OOL-UKHLAUQ

Translated

FROM PERSIAN AKHLAUK E
JULALEE INTO OORDOO

MOULVY AMAUNUT OOLLAH

UNDER THE PATRONAGE

OF

CAPTAIN J. MOUAT.

The late Professor of Hindoostanee in the College of Fort William in the year 1805

PRINTED

By

MOULVY GHULAM HYDER

SIRISHTADAR OF THE COLLEGE OF FORT WILLIAM

AT THE PERIOD

OF

S. D. RILEY LT. COLL.

Eexaminer of the College of Fort William and officiating Secy. in place of

MAJOR G. T. MARSHALL

SECY. TO THE COLLEGE OF FORT WILLIAM

CALCUTTA

1848.

مراسلات

دیوانِ حافظ

نسخۂ شاہانِ مغلیہ

عبدالرؤف خاں
اودی کلاں
سوائے مدھوپور (راجستھان)

کل دیوانِ حافظ نسخۂ شاہانِ مغلیہ بذریعہ وی پی موصول ہوا۔

دیوانِ حافظ کے حصۂ انگریزی ص ۳۲ پر حافظ کے سالِ وفات "خاکِ مصلیٰ" (۷۹۱ھ) کے علاوہ جو بہت بعد میں کہا گیا، ایک دوسرا قطعۂ تاریخ

"بسال با و ضاد و دال ابجد" بھی دیا گیا ہے۔ جس سے سالِ مطلوبہ ۷۹۲ھ کسی طرح مستفاد نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر نذیر احمد
علیگڑھ

نسخۂ شاہانِ مغلیہ کے انگریزی مقدمہ کے صفحہ ۳۲ پر قطعۂ تاریخ کا مصرعۂ اول اس طرح چھپا ہے:

ع بسال با و ضاد و دال ابجد

اسے اس طرح ہونا چاہیے:

ع بسال با و صاد و ذال ابجد

اس طرح اس سے ۷۹۲ھ برآمد ہو سکیں گے۔

قاضی عبدالودود (مرحوم)
خدا بخش لائبریری جرنل شمارہ ۳ (۱۹۷۰ء)

فہرست توصیفی مخطوطات فارسی جلد اول (انگریزی) نمبر ۱۵۱ صفحہ ۲۳۱ پر دیوان حافظ کے ایک شاہی نسخہ کی تفصیل مذکور ہے جس پر جہانگیر اور جہانگیر کی خود نوشت تحریریں ہیں۔ فہرست نگار نے ذرا سے ... کے حوالے سے حافظ کا سن وفات ۷۹۲ھ کی دلیل میں مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ پیش کیا ہے:

بسال با و صاد و دال ابجد	ز روز ہجرت میمون احمد
بسوی جنت اعلیٰ روان شد	فرید عہد شمس الدین محمد

اس قطعہ کو (ب + ص + د) ۹۶ھ مستخرج ہوتی ہیں، ردیف بھی غلطی کی ہے، مصرعۂ اول کو جب تک اس طرح نہ پڑھا جائے ۷۹۲ مستخرج نہیں ہوں گے، بسال با و صاد و ذال ابجد (ب + ص + ذ)۔ مزید برآں بیت اول کا قافیہ محمد نہیں احمد ہونا چاہیے۔ اگر متن میں محمد موجود ہے تو مصرعے موزوں بھی نہیں رہتا۔

جناب الطاف حسین شروانی
۸۲ بی ۔ فتحپور (یو۔پی)

از بک رشتوں کی تلاش

ایک ہفتہ ہوا علی گڑھ گیا تھا، وہاں ان سے ملاقات ہوئی۔ میں نے آپ کی خیریت دریافت کی۔ انھوں نے فرمایا دو سال کے لیے خدا بخش لائبریری آپ کی سرپرستی میں اور رہے گی۔ دل خوش ہوگیا، حالانکہ میری دلی خواہش تھی کہ علی گڑھ میں جناب کا قیام ہوتا، اور ایک ایسا پروجکٹ ہوتا جس میں ہندستان کی قلمی کتابوں کے کاتبوں اور مصنفوں پر تفصیل سے تحقیق کے ساتھ کام ہوتا۔ میں نے ایک خط اور لکھا تھا غالباً وہ آپ کو نہیں مل سکا۔ اس کی ایک بات ضرور لکھوں گا۔ ملاحظہ فرمائیں: " ابھی علی میاں سے رائے بریلی و لکھنؤ میں ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ ان سے تو میں نے ان کی عمر دیکھ کر کوئی شکایت نہیں کی لیکن ان کے حلقے میں یہ ضرور شکایت کی کہ آپ لوگ اسی طرح مسلمان دانشوروں کو پریشان کرتے رہیں گے تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی دینی خدمت ہے؟"

ڈاکٹر صاحب لطف کی بات یہ ہے جو آج پہلی بار میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں وہ یہ کہ یاران نجد نیاز فتحپوری کے دوستوں کی تصاویر کا مجموعہ جو نیاز نمبر سالنامہ ۱۹۶۳ء حصہ اوّل میں ہے۔ اس میں آپ دیکھیں نیاز صاحب اور خان بہادر عبدالرؤف دونوں کے چہروں پر داڑھیاں ہیں لیکن ان علمار سو کی وجہ سے دونوں بزرگوں نے ایک ساتھ داڑھیاں منڈوائیں۔ افسوس کا مقام ہے۔ اس واقعہ کو پہلی بار تحریر میں لایا ہوں وہ انشاءاللہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ میں "دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو" کے نام سے شائع ہوگا۔ "اردو کے ہندو کاتبوں" اور "افسوس کیسے کیسے سخن ہائے گفتنی" آپ کی نظر سے تہذیب الاخلاق" جنوری، اگست ۱۹۹۲ء گذرا ہوگا۔

میرے ایک استاد ڈاکٹر محمد رفیق پروفیسر عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی کی وفات پر ایک مضمون "ایک چراغ اور بجھا اور بڑھی تاریکی" انشاءاللہ جلد تہذیب الاخلاق میں جگہ پائے گا۔ پروفیسر رفیق صاحب کیلئے ڈاکٹر تارا چند کہا کرتے تھے Date problem ان سے زیادہ اچھا کوئی حل نہیں کر سکا ہے۔"

سہ روزہ اخبار" دعوت" دہلی میں " از بک رشتوں کی تلاش " خدا بخش لائبریری میں سیمینار نظر سے گذرا۔ اس میں بابر پر بھی گفتگو ہوئی ہے۔ مجھے یاد ہے اردو اکیڈمی لکھنؤ میں ایک پروفیسر پشاور یونیورسٹی کے آئے تھے۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ " بابر مغل نہیں ترک تھا۔" اس سلسلے میں دنیا میں یہ سوال پیدا ہوا ہے۔ مجھے یاد

پڑتا ہے۔ یو۔پی۔ آرکائیوز الہ آباد میں "تزک بابری" ترکی زبان میں، ہے جو اصل ہے۔ اس کا ترجمہ غالباً اکبر کے زمانے میں فارسی میں ہوا۔

ایک صاحب احسان آوارہ ہیں جو چھاؤنی باندہ (یو۔پی) کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے "ازبک افسانے" نامی کتاب لکھی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی دوسری کتاب "سویرا تو سب کے لئے ہے" (ازبک مختصر افسانوں کا اردو ترجمہ) ہے۔ ان کو اس پر ۱۹۸۶ء کا سویت لینڈ نہرو ایوارڈ ملا ہے۔ باقی سب خیریت ہے۔ ان کا پتہ :

" Ehsan Awara, Moh. Chhaoni, Banda (U.P.)."

امریکہ سے میرے پاس ایک لفافہ خلیق انجم صاحب انجمن ترقی اردو کے سکریٹری کی معرفت پہونچا ہے جس میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے جشن امریکہ کے لیے مجھ سے ان کی شخصیت پر ایک مضمون مانگا گیا ہے۔ اس میں منہمک ہوں۔

●●

بیان ملکیت سہ ماہی خدا بخش لائبریری جرنل اور دیگر تفصیلات

مطابق فارم نمبر ۴، قاعدہ نمبر ۸

۱۔ مقام اشاعت : خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۴

۲۔ وقفہ اشاعت : سہ ماہی

۳،۴ پرنٹر و پبلشر کا نام : مصطفی کمال ہاشمی

قومیت : ہندوستانی

پتا : اسسٹنٹ لائبریرین، خدا بخش لائبریری پٹنہ

۵۔ ایڈیٹر کا نام : عابد رضا بیدار

قومیت : ہندوستانی

پتا : ڈائرکٹر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔۴

۶۔ ملکیت : خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔۴

میں مصطفی کمال ہاشمی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے ساتھ درست ہیں

دستخط پبلشر : مصطفی کمال ہاشمی

یکم فروری ۱۹۹۴ء

50 years of age, women, the palsied, the maimed, the blind, the insane and the poor who possessed not more than 200 dirhams were entirely exempt from the payment of this tax.

Now we ask : Can a tax so light, the payment of which relieved men from the dangers of military service—the institutions of which can be traced back to Noshirvan the Just— be the object of so much hatred and the cause of so much oppression as some Europeans have imagined it to be? Would any one abandon his religion merely to gain exemption from so light a tax? Could any man think his religion worth less than so trifling an impost? If there were any such, his conversion to another faith seems hardly to be a matter of for regret. We believe that no other nation could bestow such favours as Musalmans did on those who paid them jizya. But as this point lies beyond the scope of our present subject we will not discuss it here.

The objects on which the sums of money raised by the jizya were spent, were (1) the equipment of the army ; (2) the defence of the frontier ; (3) the erection of forts ; and whatever remained was spent on the building of bridges, making of roads and the promotion of education. There is no doubt that employed in this way jizya was useful to the Musalmans, as indeed was only right. The Musalmans fought the battles and sacrificed their lives to save the countries subject to them from all manner of dangers, and as non-Muslim nations benefitted from the blood their rulers shed in these wars, it was not at all unjustifiable for the latter to reap some benefit from the property of the former which was thus assured to them. Besides, in the sum raised exclusively from Musalmans for alms (*sadqa*), non-Musalmans shared equally with Musalmans. Omar gave instructions to the chief officer of the State treasury to remember that in the words of God, *viz.*, " Alms are for the poor and the needy," the word "needy" included both Christians and Jews. †

The largest sum taken annually as jizya from each person was never greater than 30 francs a head. Even a millionaire had never to pay more than this. The common rates of jizya were from 9 to 4½ francs annually. Persons below 20 and above

---

† *Kitab-ul khiraj* of Imam Abu Yusuf (Egypt, A. H 1302) p 72.

† انما الصدقات للفقراء والمساكين –

from the fact that if any non-Muslim tribe accepted military service, it was made as free from jizya as any Musalman tribe. In the reign of 'Uthman, when Habib Ibn Muslimah conquered the Jarajimah † tribe, they of their own accord elected to join the Muslim army in times of emergency, and for this reason the whole tribe was exempted from the payment of jizya. Not only the Jarajimah but many other tribes and clans of the surrounding country joined the army and thus released themselves from the payment of jizya. In the reign of the Caliph Wathiq Billah Abbasi, the Governor of these territories imposed jizya on these tribes by mistake. They accordingly laid a complaint before the Caliph, who gave a decision in their favour ‡ When it has thus been shown that jizya was taken from non-Muslims in exchange for the protection given them against their enemies, both internal and external, that when the Muslims were no longer able to give that protection they returned the money; and that tribes taking military service, thereby made themselves exempt from the payment of jizya, can any doubt remain as to the correction of the interpretation given of this word in the beginning of this essay ?

† The Jarajimah was a Christian tribe which lived in the town and district of Jurjoma, a description of which is given by Mu'ajam-ul-Baldan. Jurjoma was situated in the valley of Lukkam, near Antioch.

‡ See *Futuh al Buldan Balazari*, Ed. de Goege, p. p. 159—161.

condition that we should protect them against their enemies, but owing to our present circumstances we are unable any longer to undertake such a charge."

Abu 'Ubaidah also addressed the Christians in the following terms :—

"The money which we took from you we return, because we have heard that a strong force is advancing against us. The agreement between us was that we should protect you from your enemies, but as we are no longer able to fulfil our part of the agreement, we return what money we took from you." *

This order was fully carried out and large sums from the State treasury were returned to the people. The enormous sums received for taxes can well be guessed from the fact that eight lakhs of rupees were raised from Hims alone. When these sums were returned the Christians called down blessings on the Muhammadans and said : "May God give you rule over our towns again. The Romans on such an occasion, instead of giving us back our money, would have robbed us of all our possession." †

Again the correctness of the assertion that jizya was a compensation for protection is well proved

---

* انما رددنا عليكم اموالكم لانه قد بلغنا ما جمع لنا من الجموع و انكم قد اشترطتم علينا ان نمنعكم و انا لا نقدر على ذلك وقد رددنا عليكم ما اخذنا منكم –

† See *Kitab-ul-Khiraj* of Imam Abu Yusuf, p. 1^5-80—83 (Bulaq, 1302).

To which the people of Mesopotamia returned the following answer :—

"We have paid the amount of jizya which was agreed upon with Khalid, on condition that if any Musalmans or the people of any other nation do us any wrong, the Musalman people with its General will be responsible for our protection." †

From these and other historical instances that might be adduced, it is clear that the institution of jizya as it is found in Muslim times rested on the very same principle as Noshirvan had laid down. If any doubts on the question yet remain, the following instance cannot but put them to rest. In the reign of Omar, when Abu 'Ubaidah Jarrah had gained several victories in Syria, the Emperor Heraclius raised an enormous army to crush the rising Muslim power. The Musalmans had to march to meet this attack without delay, and all their attention had to be directed to this campaign and the army which was to conduct it. Abu 'Ubaidah Amin, the General of the army, wrote at once to the governors of the conquered towns of Syria to the following effect :—

"Refund to the people all the money that has been collected as tribute and jizya, and tell them that all that we took in this way was taken on the

---

† انا قدا دينا الجزيه التي عاهدنا عليها خالد * على ان يمنعونا و اميرهم البغي من المسلمين وغير هم — (تاريخ كبير طبري) ج

right to receive jizya : otherwise we have not. This was written in the month of Safar, A. H. 12." †

The following extract is from an agreement which bears the signatures of several of the companions of the Prophet, which was drawn up between the Governor of Mesopotamia and the people of that district :—

"To those who have consented to pay jizya at such and such rates and with whom Khalid Ibn Walid has made peace, this is a charter of freedom. The sum agreed upon by Khalid and the other Musalmans in the treaty has been duly received. If any other governor attempt to alter the terms of peace laid down by Khalid, do you compel him to desist, on condition that you continue to pay the jizya. To those to whom you grant quarter, we will grant quarter also ; with those with whom you make peace, we will make peace also." ‡

---

† Tabari : Annales, ed. Rosegarten, vol. II., p. 48,

† هذا كتاب من خالد بن الوليد لصلوبا بن نسطونا و قومه الي عاهدتكم على الجزية والمنعة فلك الذمة والمنعة — ما منعناكم فلنا الجزية والا — كتب سنة اثنتي عشرة في صفر — (تاريخ كبير طبري) —

‡ Tabari : Annales, ed Rosegarten, vol. II. p. 54.

‡ براءة لمن كان من كذا و كذا من الجزية التي صالحهم عليها الامير خالد بن الوليد و قد قبضت التي صالحهم عليه خالد والمسلمين — لكم يد على من بدل صلح خالد ما اقررتم بالجزية — و كففتم امنكم امان و صلحكم صلح — و نحن لكم بالوفاء —

tion of the word : they derived it from "*jaza*", (exchange or compensation), and explained it as being the tax taken in compensation for certain services rendered. However incorrect this may be from a philological point of view, yet it certainly harmonises with historical facts. Many treaties drawn up by the Prophet and the Caliphs which have been preserved to us *verbatim* in historical works show clearly that jizya was given in return for protection. The Prophet himself, in an order addressed to the Governor of Kiltah, states that "the inhabitants should be protected and defended against their enemies." * Among the admonitions given by Omar on his death bed was the principle that "non-Musalmans who are our subjects are under the protection of God and of His Prophet and it is the duty of Musalmans to resist their enemies in their defence." The translation of the following treaties will go further to prove most clearly that jizya was a tax paid in return for protection given, and that non-Musalman tribes paid it upon this very assumption ;—

"These are words of Khalid-Ibn Walid to Saloba bin Nastona and his tribe :—I have made an agreement with you in respect of jizya and protection. The responsibility of protecting you lies upon us. So long as this protection is given you, we have

---

* يحفظوا و يمنعوا —

* See *Fatah-ul-Baldan of Balazari* p. 59.

III.—According to the laws of Islam, every Musalman might at any time be called upon to serve in the army. As the burden that such service involved was very heavy, it naturally happened that attempts were often made to escape it. Such a case once occurred in the history of Sicily † when an exception had been made in favour of School Masters in that island, whereupon many persons abandoned their former occupations and adopted the scholastic profession. This being the case, and all Musalmans being looked upon as belonging *ipse facto* to the army, on this account they were exempted from the payment of jizya just as the soldiers of Noshirvan had been. Islam claimed no right to forcibly lay the burden of military service on any non-Musalman who happened to be a subject of any Musalman state and whose life and property were under its protection. Then, provided that these persons were not desirous of service in the army, it was only just that they should pay some tax for their protection, and this tax was the *jizya*. But if any non-Musalman tribe joined the army or promised to so, it was at once released from the payment of jizya, as will be seen from the historical instances quoted below.

Both in theory and practice protection was looked upon by the Musalmans as the legitimate equivalent of the jizya. This may explain why etymologists never looked to Persian for any historical explana-

† See *Mo'ajam-ul-Baldan of Yaquit Hamvi* under the description of Sicily.

country and risked their lives for its sake: it was then only right that the rest of the subjects of the crown should contribute some fixed sum in order to compensate them for their services." This account of Ibnul Athir is confirmed by the following verses of Firdousi (iv., 78) :—

" All the governors gathered themselves together and measured out the land and imposed a tax (*gazit*) in dirhams, provided that the husband man was in a prosperous condition : Six dirhams on fruitful vineyards and the same on date gardens. He who had wealth but no land, and had not to spend himself in tilling must pay a tax (*gazit*) of 10 to 4 dirhams every year. But the ministers and the courtiers were exempt"†. The difference between these two accounts is of no importance.

† همه پادشاهان شدند انجمن
زمین را بسنجید و هر زن رسن
گزیتی نهادند بر یک درم
گزیدند که دهقان نبودی دژم
گزیت رز بارور شش درم
بخرما ستان بر همین زد رقم
کسی کش درم بود و دهقان نبود
نبردی غم و رنج کشت و درود
گذارنده از ده درم تا چهار
بسالی ازو بستدی کار دار
دبیر و پرستندهٔ شهریار
نبودی به دیوان کسی را شمار
(شاه نامهٔ فردوسی)

count of the rules laid down by Noshirvan respecting the tribute and the army (Tarikh-ul-Kamil, Part I., p. 203, cairo, A. H. 1301) says that "Noshirvan caused a survey to be made of all the country, fixed the rates of the revenue and imposed *jizya* * on each of his subjects with the exception of those who were serving in the army or were connected with the nobles of the Court. The various rates of this jizya were 12, 8, 6 or 4 dirhams (a dirham-about five pence) a head. † After this account of the tribute the historian adds that Omar followed the same rules. In the same author's account of jizya he mentions that Omar excepted from this tax all below the age of 20 and above that of 50. The same author states Noshirvan's reasons for this exception as follows:—"Those who served in the army were defenders of their

---

* The use of the word "jizya" in this connection shows that it is not a term peculiarly applicable either to Muslims or non-Muslims. Noshirvan and his subjects both belonged to the old Persian religion and the word was used continously into the Muhammadan period.

† فامر الملک قباد بمسح الارضين ليضع الخراج عليها
فمات قبل الفراغ من ذلک فلما ملک انوشروان • امر باستتمام
ذلک و وضع الخراج • • والزم الناس الجزية ما خلا العظماء
و اهل البيوتات • و الجند والهرابذة والكتاب و من في خدمة
الملک — كل انسان على قدره اثنا عشر درهما و ثمانية دراهم
و ستة دراهم — و اسقطها عمر عمن لم يبلغ عشرين سنة او
جاوز خمسين سنة — (كامل ابن الاثير الجزري) —

nor act in accordance with it, that *jizya* may not be imposed upon us, as on the people of the book."†

There is not the slightest doubt that jizya is a word of Persian origin. There is strong historical proof, besides the evidence of lexicons, &c. It is certain that the word "jizya" was in use in Arabia long before the appearance of Islam, and it is also certain that in the Persian language the word "gazit" expressed just the same meaning. From historical sources (to be given later on) it may be proved that king Noshirvan first made regulations for the collection of jizya; and as the rule of Persia at that time extended also over Yaman and the surrounding country, consequently the word "gazit" came to be introduced into Arabia in its technical legal sense and in later times assumed the more Arabic form of jizya. The change was effected by the alteration of a single letter and some vowel points. The Arabic tongue has borrowed more words from Persian than from any other foreign language, and a conquered people would naturally first adopt the technical administrative terms of its conquerors.

II. The laws relating to tribute and jizya, which we meet with in Arabia and Persia under slightly altered forms can be traced back to the reign of king Noshirvan the Just. Ibn-ul-Athir in his ac-

† کتاب خویش نخوانیم وزو عمل نکنیم
ص ٤٤ گزیت ننهند زما چو اهل کتاب

was used as well in the general sense of tribute, as in the particular sense of capitation tax. According to the *Qamus* " Jizya is a tax on land and a capitation tax imposed on non-Muslim subjects". But neither the author of the *Qamus* nor *Johri* discuss the derivations. Lane (Arabic Dictionary, *sub voc.*) suggests two possible derivations: either (1) it is derived from " *Jaza*" exchange or compensation,'or (2) it is the Arabic form of *gizya*". The latter derivation has been copied by Pitris in his edition of the *Muhit-ul-muhit*, though he does not consider it satisfactory. Similarly, in the Persian lexicons under the word "*gazit*," *jizya* is said to be the Arabic form.

In *Burhan-i-Qati* (*sub voc.*) " gazit" is money collected by the officers of a Government from its subjects, and is also called *Khiraj* (tribute.) Also it means money levied on non-Muslim subjects, as the poet Nizami says: " Sometimes Pekin sends him the tribute of China, and sometimes Cæsar sends him the religious tax (gazit-i-din)."† The vulgar pronunciation is *gizyat*, and the word appears in Arabic under the 'form *jizya*". In support of the second of these meanings given in *Burhan-i-Qati*, the author of *Furhang-i-Jahangiri* quotes the following verse by Hakim Sozni : " We will not read our sacred book

---

† گهش خاقان خراج چین فرستد
گهش قیصر گزیت دین فرستد

THE JIZYA OR CAPITATION TAX

BY

SHAMSUL-ULAMA MAULAVI MUHAMMAD SHIBLI NOMANI, PROFESSOR OF ARABIC, M.A.-O. COLLEGE ALIGARH.

The discussion of this question by European scholars has been attended by a considerable exhibition of ill-feeling. They suppose the institution and very word that expresses it to have originated with the Muhammadans, whose bigotry prompted them to invent it as a mark of distinction between themselves and the followers of other faiths. It is represented as a measure so oppressive, that the subject races were forced against their will to accept Islam in order to escape the burden of this tax; and to this is attributed in large measure the spread of the Muhammadan religion. That this notion is a-piece with so many other mistaken ideas about Islam, is the object of the present essay to show; and this can best be done by considering, first, the etymology and the various meanings of the word "Jizya": secondly, the date of its institution in Persia and Arabia; and thirdly, the reasons which led the Muhammadans to adopt it.

I. The word "Jizya" has come to be generally used with a technical meaning: but originally it

THE JIZYA OR CAPITATION TAX

BY

SHAMSUL-ULAMA, MAULAVI MUHAMMAD

SHIBLI NOMANI, PROFESSOR

OF

ARABIC, M. A.-O. COLLEGE,

ALIGARH.

FELLOW OE THE UNIVERSITY

OF

ALLAHABAD,

TRANSLATED FROM URDU INTO ENGLISH

BY ONE OF THE AUTHOR'S FRIENDS

Printed at the Aligarh Institute Press,

1894

CONTENTS

1994

Price Rs.75/-

Printed by Liberty Art Press (Proprieters Maktaba Jamia Ltd.) 1528 Pataudi House, Daryaganj, New Delhi and published by Khuda Bakhsh Oriental Public Library, Patna

Khuda Bakhsh Library Journal

93-95

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
Patna

Khuda Bakhsh Library Journal

93-95

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
Patna